بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

دسمبر 2014

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

دسمبر 2014
جلد 29 شمارہ 4
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 91 بی ٹی ای، ڈی ایچ اے سوسائٹی کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

شعاع کا دسمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ایک اور سال اختتام کی جانب بڑھ رہا ہے۔

شہر قائد کے حالات، تھر میں بدترین قحط سالی، بھوک سے مرتے بچے اور غذائی کمی کا شکار عورتیں۔ دوسری طرف سرد موسم سے نبرد آزما کھلے آسمان تلے بیٹھے وہ دس لاکھ افراد ہیں جنہیں چند سو یا چند ہزار دہشت گردوں پر قابو پانے کے لیے بے گھر کر دیا گیا ہے۔ ان کے کاروبار ختم کر دیے گئے ہیں۔ کیا ان دہشت گردوں پر قابو پانے کے لیے کوئی اور طریق کار اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا؟

یہ حالات نئے نہیں ہیں۔ نئی صدی کے آغاز سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آج بھی اسی طرح جاری ہے۔ حالات بدلتے ہیں، نہ انہیں بدلنے کی کوئی سنجیدہ کوشش ہی نظر آتی ہے۔ یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ جب بھی سیاسی حکومت بنی ہے، استحکام پیدا ہونے نہیں دیا گیا ہے۔ دھرنے تو دھرے رہ گئے، اب جلسے جلوسوں کا سلسلہ جاری ہے۔

صرف ایک جلسے پر ہونے والے اخراجات، ایک دن کے دھرنے پر ہونے والا خرچ تھر کے نام کر دیا جاتا تو کتنے معصوم بچوں کی جانیں بچ سکتی تھیں۔ بات صرف احساس کی ہے۔

نیا سال۔ سروے

جنوری کا شمارہ سالنامہ ہوگا۔ اس میں قارئین کی شمولیت کے لیے حسبِ روایت سروے شامل ہوگا۔

سوالات یہ ہیں۔

1- یوں لگا مجھ کو نئے سال کا پہلا لمحہ
زرد شیشے پہ کوئی پھول گرا ہو جیسے

نئے سال کی آمد پر آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں؟

2- پہلے سے خدوخال ہیں نہ پہلے سے وہ خیال
ہم ایک سال کے اندر کتنے بدل گئے

گزرے سال میں وہ کون سی تبدیلیاں تھیں، جو آپ میں اور آپ کی زندگی میں آئیں اور آپ کی خواہشوں سے کتنی ہم آہنگ / قریب تھیں؟

3- گزرے سال میں شعاع کی کون سی تحریر، کس شمارے کا سرورق آپ کو پسند آیا؟

اس شمارے میں

- سمیرا حمید کا مکمل ناول۔ یارم،
- سدرۃ المنتہیٰ کا مکمل ناول۔ بند دروازہ،
- صدف آصف کا ناولٹ۔
- عائشہ ناز علی کا مکمل ناول۔ زندگی اک کہانی،
- نادیہ احمد کا مکمل ناول۔ تیرے قول و قرار سے پہلے،
- رخسانہ نگار عدنان کا سلسلے وار ناول۔ ایک تھی مثال،
- ایمل رضا، میمونہ صدف، سعدیہ رئیس اور قرۃ العین رائے کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ کیف غزنوی سے ملاقات،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا، اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

کوئی مانگے تو خدا سے لوگو
قفل کھلتے ہیں دعا سے لوگو

وہ دعاؤں کا بھرم رکھتا ہے
ہاتھ اٹھاؤ مرے پیاسے لوگو

وصل کا بھید چھپا ہے اس میں
خوف کیسا ہے قضا سے لوگو

ان کی سوچیں نہیں بنجر ہوتیں
جس کا رشتہ ہو دعا سے لوگو

وہ تو خوابوں سے تہی آنکھوں کے
روز بھر دیتا ہے کاسے لوگو

آفتابوں کو ملی روشنی ہے
عکسِ مہتاب حرا سے لوگو

بجھ گئے ہیں تو یہ حکم اس کا تھا
کیا الجھنا ہے ہوا سے لوگو

نعمان فاروق

یا رحمۃ اللعالمین
الہام جامہ ہے ترا
قرآں عمامہ ہے ترا
منبر ترا عرش بریں
یا رحمۃ اللعالمین!
آئینۂ رحمت بدن، سانسیں چراغِ فکر و فن
قربِ الٰہی تیرا گھر، الفقر فخری تیرا دھن
خوشبو تری جوئے کرم
آنکھیں تری بابِ حرم
نورِ ازل تری جبیں
یا رحمۃ اللعالمین!
تیری خموشی بھی اذاں، نیندیں بھی تیری رتجگے
تیری حیاتِ پاک کا ہر لمحہ پیغمبر لگے
خیر البشر رتبہ ترا
آوازِ حق خطبہ ترا
آفاقی تیرے سامعین
یا رحمۃ اللعالمین!
قبضہ تری پرچھائیں کا بینائی پر ادراک پر
پیروں کی جنبش خاک پر اور آہٹیں افلاک پر
گردِ سفر تاروں کی ضو
مرکب براقِ تیز رو
سائیس جبرائیل امیں
یا رحمۃ اللعالمین!
تو آفتاب غار بھی، تو پرچم یلغار بھی
عجز و وفا بھی، پیار بھی شہ زور بھی سالار بھی
یا رحمۃ اللعالمین
مظفر وارثی

ادارہ

دعا کی درخواست کرنے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور اس (بات) کی وصیت ابراہیم نے اپنی بیٹوں کو کی اور یعقوب نے بھی' اے بیٹو! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اس دین کو پسند کرلیا ہے' پس جب تمہیں موت آئے تو اس حال میں آئے کہ تم مسلمان ہو۔ کیا تم اس وقت حاضر تھے جب یعقوب علیہ السلام کو موت آئی' جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ انہوں نے کہا ہم آپ کے اور آپ کے باپ دادا' ابراہیم السلام' اسماعیل السلام اور اسحاق علیہ السلام کے معبود کی عبادت کریں گے جو ایک ہے اور ہم اس کے فرماں بردار ہیں۔"

فائدہ آیات : اس میں موت کے وقت وصیت کرنے کا ذکر ہے جس سے امام نووی رحمتہ اللہ نے استدلال فرمایا ہے کہ سفر کے وقت بھی وصیت کرنا جائز ہے کیونکہ موت کا تو کوئی وقت مقرر ہی نہیں ہے اور سفر میں موت کا امکان حضر (اقامت) سے زیادہ ہوتا ہے' اس لیے سفر کے وقت بھی وصیت کردینا بہتر ہے۔

کم تر لوگ

حضرت مصعب بن سعد بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ (ان کے والد حضرت سعد کو یہ خیال ہوا کہ انہیں اپنے سے کم تر لوگوں پر فضیلت حاصل ہے تو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم لوگ تو ان ہی کمزوروں کی وجہ سے مدد کیے اور رزق دیے جاتے ہو۔ (پھر ان سے برتر ہونے کے زعم کا کیا جواز ہے۔)"

فوائد و مسائل

اس میں بہرہ ور طبقات کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ اپنے سے کم تر اور بے وسیلہ لوگوں کو حقیر اور اپنے کو ان سے برتر نہ سمجھیں' بلکہ ان کا احترام اور ان سے تعاون کریں۔ کیا پتا اللہ تعالیٰ ان ہی کی وجہ سے تمہیں بھی روزی اور دشمن پر غلبہ عطا فرمارہا ہو۔

حضرت ابو درداعویمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھے تم کمزوروں میں تلاش کرو یقیناً" تمہاری اپنے ان ضعفاء کی وجہ ہی سے مدد کی جاتی اور تمہیں روزی دی جاتی ہے۔" (اسے ابوداؤد نے عمدہ سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ کمزور اور غریبوں کے دل زخارف دنیا (دنیا کی خوب صورتی اور جاذبیت) سے پاک ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں اخلاص اور انابت الی اللہ کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی دعائیں بھی بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوتی ہیں۔

اس کو سنن نسائی کی ایک دوسری حدیث میں زیادہ وضاحت سے بیان فرمایا گیا ہے۔ "اللہ تعالیٰ اس امت کی مدد فرماتا ہے۔ اس امت کے کمزور لوگوں کی دعا' نماز اور ان کے اخلاص کی وجہ سے۔"

ابو داؤد میں ہے۔ "میرے لیے کمزور مسلمانوں کو تلاش کرو۔" (تاکہ میں ان کی مخلصانہ

دعاؤں سے مدد حاصل کروں۔)

دین دار عورت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"عورت سے چار وجوہ کی بنا پر نکاح کیا جاتا ہے" اس کے مال کی بنا پر' اس کے خاندانی حسب ونسب کی بنا پر' اس کے حسن وجمال کی بنا پر اور اس کے دین کی بنا پر۔ چنانچہ تو دین دار عورت (سے نکاح کرنے میں کامیابی) حاصل کر' تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔" (بخاری و مسلم)

اس کے معنی ہیں کہ لوگ عام طور پر نکاح کرتے وقت ان چار چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ تیری خواہش یہ ہونی چاہیے کہ دین دار عورت سے نکاح ہو اور اسی کی کوشش بھی ہو اور اس کی رفاقت اختیار کرنے کی خواہش بھی ہو۔

فوائد ومسائل :

1۔ ایک دین دار عورت ہی صحیح معنوں میں نیک چلن' شوہر کی اطاعت گزار اور وفادار ہوتی ہے جس سے انسان کی زندگی بھی خوشگوار گزرتی ہے اور آئندہ نسل کی اصلاح و تربیت کے لیے بھی وہ مفید اور موثر ثابت ہوتی ہے جب کہ اس خوبی سے محروم دوسری تین قسم کی عورتیں انسان کے لیے بالعموم زحمت کا اور اولاد کے لیے بھی بگاڑ ہی کا باعث ہوتی ہیں' اس لیے عورت کے انتخاب میں دین کو مقدم رکھا جائے۔

2۔ لڑکیوں کے رشتے کرتے وقت بھی اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ لڑکا نیک ہو۔ مال و دولت کے لالچ میں بے دین کو رشتہ دینے کے بہت زیادہ مفاسد ہیں کہ دنیا میں پریشانی کے ساتھ ساتھ اپنی آئندہ نسل کو بھی اپنے ہاتھوں خراب کرتا ہے۔

مومن کو ساتھی بناؤ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کسی مومن ہی کو ساتھی بناؤ اور تمہارا کھانا صرف پرہیزگار ہی کھائے۔" (ابوداؤد اور ترمذی)

فوائد ومسائل :

1۔ اس حدیث میں کفار سے دوستی اور ہم نشینی کی ممانعت اور صرف اہل تقویٰ کے ساتھ دوستانہ اور برادرانہ تعلق قائم کرنے کی تاکید ہے۔

2۔ دعوت میں نیک اور متقی لوگوں کو بلایا جائے اور فی سبیل اللہ خرچ کرتے وقت بھی نیک نمازیوں کو منتخب کرنا چاہیے' البتہ انسانیت کے تقاضے کے مطابق کافروں کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر مسلمان اور کافر دونوں ضرورت مند ہوں تو مسلمان کو ترجیح دینا ضروری ہے۔

دوست کا دین

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے۔ چنانچہ تمہارا ہر آدمی یہ ضرور دیکھے کہ وہ کس کے ساتھ دوستی کر رہا ہے۔"
(اسے ابوداؤد اور ترمذی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں' یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ : اس میں بھی دین دار لوگوں کے ساتھ ہی دوستی کرنے کی ترغیب اور غیر دین داروں سے بچنے کی تاکید ہے۔ دور حاضر میں کیونکہ عزت اور وقار کے پیمانے بدل گئے ہیں' اس لیے کئی اچھے بھلے لوگ بھی نیک اور دین دار لوگوں کی بجائے بے دین' دنیا پرست لوگوں سے دوستی لگاتے ہیں اور دین داروں سے نہ صرف بے رخی برتتے ہیں بلکہ انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی اعتبار سے صحیح نہیں۔

محبت

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کی

محبت ہوگی۔" (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آدمی کچھ لوگوں سے محبت کرتا ہے، حالانکہ وہ ان سے ملا نہیں (یعنی ان کے ہم رتبہ نہیں)؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آدمی ان کے ساتھ ہوگا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں اہل خیر و صلاح کے ساتھ محبت رکھنے کی فضیلت کے علاوہ اللہ کے فضل و کرم کا بھی بیان ہے کہ وہ ان سے محبت رکھنے کی وجہ سے ان سے کم مرتبہ لوگوں کو بھی بلند تر درجوں پر فائز کر کے محبوبین کے ساتھ ملا دے گا۔

2۔ اس میں یہ ترہیب ہے کہ برے اور بد کردار لوگوں کے ساتھ خصوصی تعلق اور محبت نہایت خطرناک ہے کہ کہیں انسان کا حشر ان ہی کے ساتھ نہ ہو۔ اعاذنا اللہ منہ۔

اللہ کے لیے محبت کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر سخت اور آپس میں نرم دل ہیں...." آخر سورت تک۔ (سورہ فتح۔29)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اور (مال فے ان لوگوں کے لیے ہے) جنہوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے (ایمان لا چکے تھے) وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے۔" (الحشر۔9)

فائدہ آیات : ان دونوں آیتوں میں اس بات کا اظہار ہے کہ مومنوں کا تعلق آپس میں محبت اور دوستی کا ہونا چاہیے جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین آپس میں دوستی اور محبت تھی اور یہ دینی محبت صرف اللہ کے لیے تھی، اس سے کوئی دنیوی مفاد اور غرض وابستہ نہیں تھی۔ اہل ایمان کی محبت اسی طرح دنیوی اغراض و مفادات سے بالا ہونی چاہیے۔

ایمان کی لذت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تین خصلتیں ایسی ہیں جن میں وہ ہوں گی، وہ ان کی بدولت ایمان کی لذت اور مٹھاس محسوس کرے گا۔ یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اسے ان کے ماسوا ہر چیز (پوری کائنات) سے زیادہ محبوب ہو۔

اور یہ کہ وہ کسی آدمی سے صرف اللہ کے لیے محبت رکھے۔

اور یہ کہ وہ دوبارہ کفر میں لوٹنے کو، جب کہ اس سے اللہ نے اسے بچا لیا، اس طرح برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالے جانے کو وہ برا سمجھتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں محض اللہ کے لیے محبت رکھنے کو ان خصائل حمیدہ میں شمار کیا گیا ہے جن کی بدولت انسان کو ایمان کی لذت محسوس ہوتی ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس محبت میں دنیوی مفادات کے نشیب و فراز کے ساتھ اتار چڑھاؤ نہیں آتا، بلکہ یہ محبت ہر صورت میں قائم اور محبوب کا اکرام و احترام لازماً برقرار رہتا ہے، چاہے فریق ثانی (محبوب) کا رویہ پسندیدہ ہو یا ناپسندیدہ۔

2۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تو ایمان کی بنیاد ہے اور کائنات کی ہر چیز سے اس محبت کے زیادہ ہونے کا مطلب ہے کہ ان کے احکام و فرامین کی اطاعت اور ان کی رضامندی، بیوی بچوں، ماں باپ وغیرہ کی خواہشات اور دنیا کے ہر مفاد اور غرض پر بالا ہو اور جب ان دونوں کا ٹکراؤ ہو تو اللہ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو اولیت و اہمیت دی جائے۔

کفر سے کراہت کا مطلب، اللہ کی نافرمانیوں سے اجتناب ہے کہ کہیں ارتکاب معصیت، اللہ کی ناراضی کا سبب نہ بن جائے۔

سات قسم کے لوگ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

سات (قسم کے) آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس (قیامت کے) دن جب کہ اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا' اپنے (عرش کے) سائے میں جگہ دے گا۔

1۔ انصاف کرنے والا حکمران۔

2۔ وہ نوجوان جو اللہ عزوجل کی عبادت میں پروان چڑھے۔

3۔ وہ آدمی جس کا دل مسجد کے ساتھ اٹکا ہوا ہو (مسجد کی خاص محبت اس کے دل میں ہو۔ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں مسجد کے لیے بے قرار ہو)

4۔ وہ دو آدمی جو ایک دوسرے سے صرف اللہ کے لیے محبت کرتے ہیں۔ اسی پر وہ باہم جمع ہوتے اور اسی پر ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔

5۔ وہ آدمی جسے کوئی حسین و جمیل عورت دعوت گناہ دے لیکن وہ اس کے جواب میں کہے "میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔"

6۔ وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ کیا اور اسے چھپایا حتیٰ کہ اس کے بائیں ہاتھ کو علم نہیں کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

7۔ وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور (اس کے خوف سے) اس کی آنکھیں بہہ پڑیں۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس روایت میں سات افراد بیان کیے گئے ہیں ' جنہیں اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اپنے عرش کا سایہ عطا فرمائے گا۔ بعض اور روایات میں ان مذکورہ اعمال کے علاوہ بھی کچھ اور عملوں پر اسی مقام خاص کی نوید بیان کی گئی ہے۔ بعض علماء نے ان اعمال کی تعداد ستر تک بیان کی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعمال مختلف احوال اور اوقات میں بیان فرمائے ہیں ' اس لیے ان میں کوئی منافات نہیں ہے۔

2۔ جو شخص گناہ پر قدرت کے باوجود اسے ترک کر دیتا ہے تو اس کا ترک کرنا بھی اس کی نیکی شمار ہوگی اور یہ اتنی بڑی نیکی ہے کہ اس نیکی کا واسطہ دے کر کی گئی دعا سے غار کے دروازے سے پتھر بھی سرک گیا تھا۔

جنت میں داخلہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے ' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں نے ایک آدمی کو جنت میں چلتے پھرتے دیکھا' اس نے اس درخت کو کاٹ دیا تھا جو راستے کے درمیان میں تھا اور مسلمانوں کو تکلیف دیتا تھا۔" (مسلم)

کانٹے دار شاخ

بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے "ایک دفعہ ایک آدمی راستے پر چل رہا تھا' اس نے راستے پر ایک کانٹے دار شاخ دیکھی' اس نے اسے پیچھے کر دیا۔ اللہ نے اس کے اس عمل کی قدر فرمائی اور اس کو بخش دیا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ لوگوں کو تکلیف اور نقصان سے بچانا اللہ کو بہت پسند ہے' حتیٰ کہ راستوں سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دینا بھی اللہ کو بڑا محبوب ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس راستوں کو تنگ یا بند کر دینا' جس سے لوگوں کو تکلیف ہو' جیسے شادی بیاہ کے موقعوں پر لوگ نہایت دیدہ دلیری سے ایسی مذموم حرکتیں کرتے ہیں یا بعض دکان دار اور اہل مکان تجاوزات کھڑی کر کے لوگوں کو ایذا پہنچاتے ہیں ' یہ کام اللہ کی ناراضی اور اس کے غضب کا باعث ہیں۔

2۔ نیکی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے' خواہ ظاہری طور پر وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔

مسجد جانا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص صبح کو یا شام کو مسجد کی طرف جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں' جب بھی وہ صبح یا شام کو مسجد کی طرف جاتا ہے' مہمانی تیار کرتا ہے۔"
(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اس میں مسجد میں جانے اور نماز باجماعت پڑھنے کی ترغیب ہے۔
2۔ بادشاہ اگر کسی کی دعوت کرے تو اسے قبول کرنے کی وہ ہر ممکن کوشش کرے گا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے' اس کی مہمانی کو اگر ہم ٹھکرائیں گے تو اس سے بڑی بدبختی کیا ہے اور نماز باجماعت ادا نہ کرنا اس دعوت کو ٹھکرانے کے مترادف ہے۔

تحفہ کی اہمیت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اے مسلمانوں کی عورتو! کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن (کے ہدیے) کو حقیر نہ سمجھے' اگرچہ وہ بکری کا کھر ہی ہو۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ کسی کے ہدیے کو حقیر نہ سمجھا جائے کیونکہ وہ اخلاص سے بھیجا گیا ہو گا تو تھوڑا ہونے کے باوجود' وہ عنداللہ بڑا ہو گا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لیے ہدیہ بھیجنے کو حقیر نہ سمجھے' خواہ بکری کی کھر ہی ہو' یعنی اس کے ہدیہ بھیجنے کو بھی معمولی خیال نہ کرے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ہدیے کی قیمت کو نہ دیکھیے بلکہ دینے والے کے جذبات اور دل پر نگاہ رکھیے۔

حیا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"ایمان کی ستر یا ساٹھ سے کچھ اوپر شاخیں ہیں۔ ان میں سب سے افضل لاالہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ' راستے سے تکلیف دہ چیز (پتھر کانٹے وغیرہ) کا ہٹانا ہے۔ اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔"
(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ ایمان کے' عمل کے حساب سے مختلف مراتب ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں۔
2۔ حیا کی فضیلت و اہمیت بھی اس سے واضح ہے کیونکہ حیا انسان کو گناہوں سے روکتی اور نیکیوں پر

شبہ کی حالت میں

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بعض افراد نے عرض کیا۔
"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کچھ لوگ ہمارے پاس گوشت لے کر آتے ہیں' ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ (ذبح کرتے وقت) اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں (تو ہم کیا کریں؟)
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم اللہ کا نام لے لو اور کھالو۔"
یہ لوگ نئے نئے کفر سے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ (داری)
فائدہ : شبہ کی وجہ یہ تھی کہ یہ نو مسلم افراد شاید یہ مسئلہ نہ جانتے ہوں کہ اللہ کے نام سے ذبح کرنا چاہیے۔ تو بتایا گیا کہ شبہ نہ کرو بلکہ بسم اللہ پڑھ کر کھالو۔

شادی مبارک ہو

عمیر ہمراہ مریم

آسیہ رزاقی

"چلو چلو لاہور چلو۔ اب شروع عمیر تمیم کی شادی کی تقریبات۔"

عمیر تمیم۔ ابن انس تمیم۔ انس تمیم ہمارے نمبر دو بھائی ہیں (جی نہیں دو نمبری نہیں ہیں۔)

بھائیوں میں ان کا نمبر دوسرا ہے۔ ویسے بھی بے حد نیک۔ سیدھے اور شریف انسان ہیں۔

عمیر تمیم۔ ہمارا بہت پیارا بھتیجا ہے۔ تین بہنوں سے چھوٹا۔ خوب صورت اور وجیہہ۔

اب ایبٹ آباد سے لاہور کی تیاری۔ وسط اکتوبر میں ایبٹ آباد میں موسم خاصا خوشگوار بلکہ رات میں سردی ہو جاتی ہے۔ دونوں موسموں کا لحاظ ذرا رکھنا تھا۔ لاہور میں فی الحال گرمی۔ مگر نومبر سے موسم سرد ہونے کا امکان۔ اور چونکہ نومبر میں کراچی کا پروگرام بھی تھا۔ جہاں دسمبر میں تہمینہ کی بیٹی فہیما کی شادی طے ہے۔ کراچی میں بھی دسمبر میں سردی آہی جاتی ہے کوئٹہ کی ہوا کے طفیل۔ لہٰذا اب خاصی تیاری کرنی پڑی۔ اب بندے کو کئی ماہ جب علاقہ غیر۔ یعنی کہ دوسرے شہروں میں گزارنے ہیں تو بدلتے موسم کا لحاظ کرنا ہی تھا۔

ہلکی سردی۔ زیادہ سردی۔ پھر گرمی کا خدشہ۔ کچھ بھروسا نہیں کہ کراچی میں جنوری میں لان پہننے کی نوبت آجائے۔ اور ہمارے پاس ایبٹ آباد کی رہائش کی وجہ سے لان کے کپڑوں کی خاصی قلت۔ بہرحال۔

مکمل تیاری کے بعد ڈائیوو کا سفر۔ جو ایبٹ آباد سے لاہور کا عموماً" آٹھ گھنٹے میں ہوتا ہے۔ نو گھنٹے میں ہوا۔ وجہ تھی بس کی جگہ جگہ چیکنگ' ڈرائیور صاحب خاصی گھنی لمبی داڑھی والے تھے۔ شاید ان پر طالبان کا دھوکا ہوا ہوگا۔ بار بار بس رکتی۔ ڈرائیور صاحب اتر کر جاتے۔ پھر آتے۔ نہ جانے ان کو کس طرح چیک کیا جاتا تھا۔

لاہور آگیا۔ اب جناب نہر کے کنارے والی سڑک پر بڑی بڑی قیمتی گاڑیوں کا اژدہام۔ یوں سمجھیے ایک سمندر تھا۔ رکا ہوا۔ گاڑیوں کا سمندر۔ اف۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک غریب ملک ہے۔ جس کا بچہ بچہ مقروض ہے۔ ہمارے ملک میں امارت کے مظاہرے کے ہزاروں طریقے ہیں۔ غریب بلکہ فقیر' ملک کے امیر لوگ۔ جی۔

ٹریفک جس طرح رکی ہوئی تھی۔ جی چاہتا تھا۔ کاش اس ملک میں اتنی گاڑیاں نہ ہوتیں۔ امن سکون ہوتا۔ بے فکری ہوتی' بھائی چارہ ہوتا۔ دولت کمانے کی دوڑ نہ ہوتی' سادگی اور خلوص ہوتا۔ مہنگائی اور لوٹ کھسوٹ نہ ہوتی۔ اور اے کاش۔ ہمارے حکمران اتنے بے حس' بے درد نہ ہوتے۔ ملک کے خیر خواہ ہوتے۔ عوام دوست ہوتے۔ مگر۔ یہ جو قیمتی متاع یعنی گیس بسوں۔ ٹرکوں اور گاڑیوں پر ضائع ہو رہی ہے۔ اس سے فیکٹریاں اور ملیں چلتیں۔ ملک صنعتی ترقی کرتا۔ اے کاش۔ کوئی تو ملک کا ہمدرد ہو۔

سلمٰی کے گھر پڑاؤ کرنا تھا۔ جہاں برابر والے انس تمیم کے گھر سے نجم تمیم اور منزہ نجم ہم سے ملنے آئے۔ یہ دونوں کینیا سے لاہور آئے۔ پھر سلمٰی ان کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کرنے گئیں۔ ان کو دو دن ہوئے تھے آئے ہوئے۔

اگلے دن شام کو ڈھولکی انس کے گھر تھی۔ اور تمام حاجیانی خواتین کی حالت۔ یعنی تازہ تازہ دو دن کی آئی ہوئی جن میں سلمیٰ اور منزہ۔ ان کی تینوں بیٹیاں صنیعہ، مدیحہ۔ (نارو) اور عاشی جو والدین کے دوران قیام سعودی عرب کے، دو دو حج کر چکی تھیں۔ اور ہم چاروں بہنیں۔ یعنی بڑی بہن (سلمیٰ کی اور ارسلان کی امی) میں اور لبنیٰ، ثمینہ۔ چاروں حاجنیں۔ رمانہ مسز انس چار بہنیں چاروں حاجنیں۔

اب صورت حال یہ کہ تازہ تازہ حجن منزہ ڈھولک بجا رہی ہیں سلمیٰ گانا گا رہی ہیں۔ ساتھ ہی پرانی حاجنیں یعنی صنیعہ نارو عاشی بلند آواز میں سریلے گانے گا رہی ہیں۔ اور ہم بہنیں۔ رمانہ چاروں بہنیں

عارفہ منزہ بٹیا سب تالیاں بجا رہی ہیں۔

واہ۔ کیا سماں تھا۔ عموماً" شادیوں میں اب شادی کے مخصوص گیتوں کو چھوڑ کر فلمی گیت گائے جاتے ہیں۔ مگر یہاں سب غیر فلمی پاکستانی گانے گائے گئے۔ دانے پہ دانہ پر خوب رنگ جما۔ جس میں عمیر اپنی طرف سے مزاحیہ اضافہ کرتا رہا۔ قہقہے لگتے رہے۔ سندھی گانوں میں بہت رچاؤ اور رونق ہوتی ہے۔ مور تھوٹلے رانا پر بھی خوب رونق رہی۔ پنجابی گیتوں میں دھوم دھڑکا بہت ہوتا ہے۔

آخر میں عمیر نے بلھے شاہ کی کافی بہت سُر میں زبردست طریقے سے گائی۔ بہت داد ملی۔ انس نے اپنا کلام تازہ سنایا۔ جس میں گیت کا بند تھا۔ "مریم تیری خیر نہیں"۔ مریم دلہن کا نام ہے۔ شعروں میں مریم کو اس کی ساس کے غصے سے آگاہ کیا گیا تھا۔ کئی دن اسی طرح محفل جمی۔ پھر فلاح بھی شامل ہو گئی۔ عمیر جب بغرض تعلیم سویڈن گیا تھا، وہاں کئی کلاس فیلوز سے اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ انہیں عمیر نے شادی کی خبر سنائی۔ تو ان لوگوں نے مل کر ایک دستاویزی فلم بنائی۔ عمیر کے دوران تعلیم لیے گئے فوٹوز شامل کر کے اچھی دلچسپ مزاحیہ سی ویڈیو بنی۔

ایک کلاس فیلو جو بولیویا کی تھی۔ سویڈن میں زیر تعلیم۔ وہ تصویریں اتارنے کی ماہر تھی۔ اسی نے یہ ویڈیو سب کے تعاون سے بنائی اور شادی میں شرکت کے لیے آ گئی۔ ایوانا اس کا نام تھا۔ خاصی پاکستانی ٹائپ کی تھی۔ یہاں کے ڈھولکی مہندی وغیرہ کے فنکشن کے لیے اس نے لبرٹی جا کر ڈریس بھی خریدے۔ اور ہر موقعے کی تصویر بناتی رہی۔ ویڈیو کیمرے۔ بہت ہی حیران اور خوش تھی۔ اسے یہاں کے کھانے بہت پسند آئے۔

عمیر کا نکاح تو ایک مہینہ پہلے ہو چکا تھا۔ مہندی اور رخصتی کا فنکشن ایک ہی دن تھا۔ مریم سائیکلوجسٹ ہے۔ وہ نارو کی اسٹوڈنٹ رہ چکی ہے۔ نارو کے مشورے پر ہی یہ رشتہ ہوا۔

مہندی کے دن لڑکی والوں نے سنا تھا کہ بہت تیاری کی تھی۔ مگر ہماری لڑکیوں کے سریلے اور رونق دار گانوں اور ڈھولک کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں۔ درمیان میں بار بار عاشی نعرہ لگاتی۔

"ساڈی ڈھولک واہ وا۔ ساڈی ڈھولک شاوا۔"

مائیک کے ذریعے نعرہ بھی خوب گونجا۔ لڑکے والی ٹیم جیت گئی۔ عمیر نے بھی زبردست گانا سنایا۔ بلھے شاہ کا کلام۔ کسی نے فقرہ کسا۔

"بھئی اپنی شادی پر۔ دلہن کے گھر دولہا کا گانا پہلی بار سن رہے ہیں۔"

رخصتی کی دلہن روایت سے کچھ ہٹ کر۔ سادہ سی تھی۔ شوخ اورنج کلر کے دوپٹے گولڈن شرارے میں ملبوس۔ نتھ، جھومر، ٹیکے کے بغیر۔ گھر آ کر بہنوں نے دولہا دلہن کا راستہ روکا، سب نے کہا۔

"عمیر! دلہن کو گود میں اٹھا کر اندر لانا ہے۔"

فرماں بردار سعادت مند دولہا نے دلہن کو فوراً" گود میں اٹھا لیا۔ مگر بہنیں سماج کی دیوار بنی کھڑی تھیں۔ آخر منہ مانگے نیگ نے ان کا منہ بند کر دیا۔ وہ بے چارہ سسرال میں بھی جیب ہلکی کر کے آیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں سب آ کر بیٹھے۔ جہاں کھیر چٹائی کی رسم ہوئی۔ رسماً" ہی رسم ہوئی۔ دولہا دلہن چمچے سے ایک دوسرے

کو کھیر کھلاتے رہے۔

ناروکی بچیاں فاطمہ اور زینب پہلی بار شادی دیکھ رہی تھیں۔ بے حد حیران تھیں۔ امریکہ میں رہتے ہوئے بھی نارو نے انہیں اردو میں ہی بات کرنا سکھایا لیکن کیا کیا جائے۔ اردو بولتی ہیں۔ لہجہ امریکن ہوتا ہے۔

اگلے دن ولیمہ مین بلیوارڈ قصر نور میں ہوا۔ دلہن بھی خوب چمکتی دمکتی نمودار ہوئی۔ ہمارے عمیر بھی لشکارے مار رہے تھے ماشاء اللہ۔

بہنوں نے بھی زبردست ڈریسنگ کی تھی۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ اور قلفہ تو تھا ہی لاجواب۔

اگلے دن حاجی نجم تمیم نے گھر پر باربی کیو دعوت کی۔ بہت زبردست۔ سب ہی لوگ آگئے لان میں مردانہ انتظام تھا۔ اندر لاؤنج اور ڈرائنگ روم میں

خالد۔ تنویر ایم اے نے کباب تکے۔ ملائی بوٹی۔ حلوہ پوری کا انتظام سنبھالا۔ منزہ نے آلو اور چنے مختلف چٹنیاں بنائیں نجمہ کافی گھما گھما رہی۔ ایس ایم ظفر صاحب جو رمانہ۔ (مسز انیس) کے ماموں ہیں۔ ان کی بیگم نے ہم سب کو اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ نہر کنارے ان کا وسیع شاندار لان والا گھر ہے۔ دلہن مریم کے گھر والے اور ہم لوگ بھی ان کے گھر پہنچے۔

بیگم ایس ایم ظفر نے بہت اخلاق اور تپاک سے استقبال کیا۔ اپنی بہوؤں سے ملایا۔ روشانے ظفران کی بیٹی ہے اس کی بہت نیک نام اور کارگزار قسم کی مشہور و معروف ایوارڈ یافتہ این جی او ہے۔ بہت مصروف رہتی ہے۔ کچی بستیوں۔ غریب محلوں میں جا کر امداد۔ اور لڑکیوں کو کام سکھانا۔ کام دلانا۔ یعنی بے روزگاری کا تدارک کرنے کی کوشش۔ ہنر مند بنا کر انہیں اپنے مستقبل کو سنوارنا۔ بہت ہی کامیابی سے یہ کام ہو رہا ہے۔ اللہ سب کو ایسی توفیق عطا کرے۔ آمین۔

میں نے بیگم ایس ایم ظفر کو بتایا کہ میں صرف آپ کی بھانجی رمانہ کی نند ہی نہیں۔ آپ کی والدہ ملکہ پکھراج صاحبہ سے بہت پہلے سے یہ تعلق رہا کہ ان کا پالتو مور اڑ کر کئی بار ہماری چھت پر آجاتا۔ اور آس پاس والوں کو۔ یعنی اپنے بہن بھانجیوں کو بلا کر میں نے اس مور کا ڈانس بھی دکھایا' پکھراج کا ملازم مور کو لینے آتا۔ نہ جانے کس ترکیب سے وہ اسے لے جاتا

تھا۔

پھر جب ہم لوگ ایبٹ آباد سے کچھ پہلے بالڈ ھیٹر کی ٹیکسٹائل مل میں تھے' جہاں میرے میاں صاحب رئیس احمد رزاقی چیف ایڈمنسٹریٹر جنرل تھے۔ ہمارے ہاں کراچی سے میری نندیں اپنی بیٹیوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ میں انہیں لے کر ایبٹ آباد سیر کرانے لے گئی۔

وہاں ان دنوں ہمارے میاں کے ماموں آفندی ماموں نیشنل بینک کے منیجر تھے۔ ان کے گھر پورا قافلہ پہنچا۔ آفندی ماموں کی بیگم اپنی بیٹیوں کو لے کر ہم سب کو سیر کرانے شملہ پہاڑی کی طرف آئیں۔ سب

لڑکیاں (میرا شمار بھی ان دنوں لڑکیوں میں سمجھ لیں) بڑا بیٹا آٹھ نو سال کا اور چھوٹا پانچ سال کا تھا۔ تو سب نے سڑک کے بجائے پہاڑی عبور کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور سب بزور طاقت ہانپتے کانپتے ہنستے قہقہے لگاتے بالآخر پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ ان دنوں وہاں کوئی ریسٹورنٹ یا جھولے وغیرہ نہیں تھے۔ آج کل کی طرح۔

یونہی گھاس کی ہریالی اور جنگلی رنگ برنگے پھولوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایبٹ آباد کی مشہور و معروف بارش شروع ہو گئی۔ موٹی موٹی بوندوں نے سر پر جیسے پتھر برسانے شروع کر دیے۔ چیختی چلاتی سب لڑکیاں خطرے سے بے نیاز پہاڑی سے نیچے کو بھاگیں (کس مشکل سے اوپر پہنچے تھے) نیچے سامنے ہی ایک ریسٹ ہاؤس نظر آیا' جہاں ایک بے حد وجیہہ اور لمبے تڑنگے معزز صاحب کھڑے تھے۔ ان کے برابر میں ایک گڑیا جیسی خاتون تھیں۔ چونکہ ہم تو بے محابا ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں جا گھسے تھے۔ مگر میں نے ملکہ پکھراج کو پہچان لیا۔ وہ صاحب ان کے شوہر سید شبیر حسین صاحب تھے وہ دونوں ہاتھ اٹھائے حیرانی سے اپنی دبنگ آواز میں کہہ رہے تھے۔

"الٰہی خیر۔ الٰہی خیر۔ یہ فوجیں کہاں سے بھاگی ہوئی آئی ہیں۔"

میں ان کو بھی پہچان گئی۔ جھوک سیال ناول اور ڈرامے کی وجہ سے۔ وہ کئی ناولوں کے خالق تھے۔ ان دنوں ایس ایم ظفر وزیر قانون تھے۔ آفندی ماموں کی بیگم نے سید صاحب کو اپنا تعارف۔ ساتھ ہی ہم سب کی سیر کے لیے آمد کا قصہ سنایا۔

انہوں نے اپنی جیپ میں ہمیں گھر پہنچوایا۔ میں نے گھر آکر سب کو بتایا۔

ہم بہت نامور کپل سے مل کر آئے ہیں سید شبیر حسین صاحب اور ملکہ پکھراج صاحبہ۔ جن کی آواز آج بھی کانوں میں تازہ ہے۔ "ابھی تو میں جوان ہوں" واہ کیا آواز تھی اور کتنی ستھری گائیکی۔ انداز ہی جدا تھا تو جناب رمانہ کی مومانی جو کہ ملکہ پکھراج اور شبیر حسین صاحب کی بیٹی اور طاہرہ سید کی بڑی بہن ہیں وہ یہ قصہ سن کر بہت خوش ہوئیں۔

ان کی دعوت یادگار رہی۔ مریم کی والدہ سے بھی اچھی گپ شپ ہوئی۔ انہیں بھی پڑھنے پڑھانے کا بہت شوق ہے' بلکہ مریم کے والد اقبالیات کے ماہر ہیں۔ علامہ کی نظمیں فارسی سے اردو' اردو سے انگلش میں منتقل کر چکے ہیں۔ مریم نے بتایا کہ وہ بچپن سے ہی اردو ڈائجسٹ پڑھتی آئی ہے۔ خواتین ڈائجسٹ' شعاع اور پاکیزہ' سرگزشت' جاسوسی ڈائجسٹ وغیرہ ان کے گھر آتے ہیں۔ ابن صفی کی ہر کتاب پڑھی ہے۔ واہ بھئی۔ زبردست۔

اللہ عمیر اور مریم کو بہت سی خوشیاں عطا کرے۔ آمین۔ اور ان کے والدین کو بھی بچوں کی وجہ سے اطمینان ملے۔ مریم کی ایک بہن' ایک بھائی' ایک بھابھی' ایک کیوٹ سا بھتیجا ہے۔ ماشاء اللہ!

فلموں اور ڈراموں میں لڑکا اور لڑکی کے ملن کی کہانی دیکھ کر ہم یہی کہتے ہیں کہ ایسا بھلا حقیقی دنیا میں کہاں ہوتا ہے یہ تو سب فینٹسی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے اکثر اوقات اصل زندگی میں بھی فلمی سچویشن آجاتی ہے اور دو اجنبی ایک ہو جاتے ہیں۔ بندھن میں کیف غزنوی کی بھی کچھ ایسی ہی کہانی ہے... دھیمے لہجے میں بات کرنے والی کیف غزنوی بہت اچھی ڈرامہ آرٹسٹ ہیں۔ متعدد ڈراموں میں کام کر چکی ہیں آج کل ان کا سیریل "رسم" بہت پسند کیا جا رہا ہے اس سے قبل ڈرامہ سیریل "ادھوری عورت" میں بھی ان کی پرفارمنس بہترین تھی۔

"کیسی ہیں کیف غزنوی صاحبہ؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"آپ بندھن میں کیسے بندھیں' اس کو جاننے سے پہلے میں چاہوں گی کہ آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟"

"میں ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی ہوں۔ دو سال قبل والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کا اپنا

باصلاحیت فنکارہ

کیف غزنوی سے ملاقات

شاہین رشید

ٹیوشن سینٹر ہے۔ جب سے میں نے آنکھ کھولی ہے انہیں کام کرتے ہی دیکھا ہے۔ دو بھائی ہیں میرے ایک مجھ سے بڑا ہے اور ایک مجھ سے چھوٹا ہے... دونوں پڑھاتے ہیں۔ میں 27 مارچ کو حیدر آباد سندھ میں پیدا ہوئی۔ میری شادی کو ماشاء اللہ آٹھ سال ہو گئے ہیں۔"

"آپ کا نام کیف ہے' یہ تو لڑکوں والا نام ہے؟"

ہنستے ہوئے "میرا نام میری والدہ نے رکھا اور میرے دوست بہت حیران ہوتے ہیں۔ میرا نام سن کر۔ میری والدہ جب سیکنڈ ایر کی طالبہ تھیں جب انہوں نے یہ نام سنا تھا انہیں یہ نام بہت اچھا لگا اور بقول ان کے انہوں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ میری بیٹی ہوئی تو میں یہی نام رکھوں گی۔ انہیں یہ نام لڑکوں سے زیادہ لڑکی کے لیے پسند آیا تھا۔ غزنوی والد کا نام ہے۔"

"اچھا... لیکن شادی کے بعد تو لڑکیاں شوہر کا نام لگاتی ہیں؟"

"جی بالکل... مگر میرے شوہر کو کوئی اعتراض نہیں تھا اور ان کی طرف سے مجھے اجازت تھی... اور ویسے

بھی مجھے "کیف غزنوی" کا ساؤنڈ زیادہ پسند تھا اور ایمان داری سے بتاؤں کہ مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے جب لڑکیاں شادی کے بعد اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام لگاتی ہیں کیوں کہ ایک نام کے ساتھ اتنا عرصہ لڑکی نے گزارا ہوتا ہے اور وہی نام اس کی شناخت اس کی پہچان ہوتا ہے۔ یہ نام ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی، جاب کے زمانے میں بھی اور اداکاری کے حوالے سے بھی اور اس نام نے بہت سی جگہوں پر میری مدد بھی کی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا تھا کہ والد کا نام تو اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ رکھوں گی۔"

"ذیشان صاحب سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی اور شادی پسند کر کے کی ہے یا ارینجڈ ہے؟"

"جی ارینجڈ نہیں ہے۔ ہماری لو میرج ہے اور ذیشان سے پہلی بار NCA کے انٹری ٹیسٹ میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ "میرپور خاص" سے ٹیسٹ دینے آئے تھے اور میں لاہور سے آئی تھی کراچی اور انڈس ویلی اسکول آف آرٹ میں ہمارا انٹری ٹیسٹ ہوا تھا۔ اس ملاقات کے بعد ہماری بہت اچھی دوستی ہوگئی۔"

"ذیشان آئے میرپور خاص سے، آپ آئیں لاہور سے اور ڈومیسائل آپ کا سندھ کا تھا۔ انٹری ٹیسٹ ہوا... دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی پھر دوستی کیسے ہوگئی؟"

ہنستے ہوئے۔ "جی جی... آپ کو بتاتی ہوں۔ یہ میرے ساتھ والی سیٹ پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑا فنی سا سین ہوا... ہوا یہ کہ میں لائن لگانے کے لیے اپنا اسکیل لانا بھول گئی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی میری مدد کرے تو چونکہ یہ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اس لیے میں نے انگریزی میں ان سے اسکیل مانگا۔ انہوں نے مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھا اور سر ہلا کر اپنا کام شروع کر دیا، مجھے بڑا عجیب سا لگا کہ یہ بندہ چاہتا ہے کہ میرا ٹیسٹ اچھا نہ ہو اس لیے یہ میری مدد نہیں کرنا چاہتا... میں نے کہا کہ آپ کتنے خود غرض انسان ہیں۔ میں نے صرف ایک انچ کی لائن لگانی ہے... اسے سمجھ آگئی بات اور مجھے رولر دیتے ہوئے کہا کہ یہ لیں بی بی اور آئندہ کچھ بھی مانگنا ہو اردو میں مانگیے گا کیوں کہ مجھے انگریزی نہیں آتی... اس بات سے مجھے بڑا مزہ آیا اور چونکہ میں گرامر اسکول کی پڑھی ہوئی تھی تو مجھے توقع بھی نہیں تھی کوئی اتنا بولڈ بھی ہو سکتا ہے اور مجھے اس طرح کا جواب دے گا۔ میں ان کی اس بات سے کافی شرمندہ بھی ہوئی تھی... خیر یہ امتحان دے کر اپنے گھر گئے اور میں اپنے۔ پھر جب رزلٹ آیا تو پتا چلا کہ ہم دونوں کی تو ایک ہی کلاس ہے۔ پھر ایک دوسرے سے ہیلو ہائے ہوتی جو کہ آہستہ آہستہ دوستی میں بدلتی گئی اور تین چار سال ہم دونوں نے ایک ساتھ پڑھا تو دوستی بہت ہی پکی ہوگئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ذیشان بہت ہی اچھے انسان ہیں اور بہ حیثیت کولیگ وہ میرے لیے بہت اچھے ثابت ہوئے یہ بہت عزت کرتے ہیں خواتین کی اور بہت مدد بھی کرتے ہیں بہت پروگریسو انسان ہیں... اپنے سارے دوستوں میں یہ مجھے بہت اچھے لگے کیونکہ یہ میری پرسنالٹی کے مطابق تھے۔ ان کو نہ کبھی مجھ سے خوف آیا نہ کبھی ان سیکورٹی ہوئی کہ یہ تو بڑی ایگریسو لڑکی ہے بڑی ڈومینیٹنگ (Dominating)... بہت اچھا وقت گزرا ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ۔"

"پھر شادی کے لیے بات کیسے آگے بڑھی؟"

"ہم تھرڈ ایر میں تھے اور مجھے ایک اسائنمنٹ میں ان کی مدد کی ضرورت تھی، میں نے اپنی ٹیچر سے اجازت لی کہ ایک آؤٹ سائیڈر کولیگ سے اپنے اسائنمنٹ کے لیے ہیلپ لینا چاہتی ہوں۔ انہوں نے اجازت دے دی، ہم دونوں فائن آرٹ کے طالب علم تھے اور میں ڈیزائن کی تھی اور ہمیں اجازت نہیں ہوتی تھی کہ ہمارے اسائنمنٹ پہ کوئی کام کرے... اسائنمنٹ کے دوران ہی انہوں نے مجھ سے کہا کہ تو مجھے بہت پسند ہے (ان کی عادت ہے یہ تو کر کے بات کرتے ہیں) اور مجھے لگتا ہے کہ مجھے تجھ سے پیار ہو گیا

ہے۔
میں نے ان کی شکل دیکھی اور مجھے ہنسی بھی آگئی اور میں نے کہا "تم میرے دوست ہو اور میرا نہیں خیال کہ تم مجھے افورڈ کر سکتے ہو میں جس بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتی ہوں۔"

تو ذیشان نے کہا "میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تم میرے ساتھ ہو جاؤ۔ میں نے تو تمہیں اپنی (چاہت) Intention بتائی ہے تاکہ تمہیں یہ معلوم ہو کہ میرے دل میں تمہارے لیے کیا ہے۔ میں چوری نہیں کرنا چاہتا۔" بہت صاف گوئی سے انہوں نے مجھ سے کہا اور یہ بھی کہا کہ "اگر میں کسی دن کچھ بن گیا تو میں تمہیں شادی کے لیے بھی کہہ دوں گا۔"

پروپوز انہوں نے مجھے کبھی نہیں کیا پروپوز میں نے ہی انہیں کیا تھا اور یہ جو گفتگو میں نے آپ کو بتائی اس کے چار سال بعد میں نے انہیں پروپوز کیا کہ۔

"ذیشان میرا خیال ہے کہ اب آپ مجھ سے شادی کرلیں کافی ٹائم ہو گیا ہے۔"

انہوں نے کہا کہ "چلو ٹھیک ہے"۔

"گھر والوں نے اعتراض کیا؟"

"جی بہت اعتراض کیا میری والدہ نے 'انہیں بس یہ فکر تھی کہ یہ آرٹسٹ (پینٹر) ہے کس طرح کمائے گا۔ پینٹرز تو بھوکے مررہے ہوتے ہیں اور تم لاڈوں کی پلی ہوئی ہو۔ تم کس طرح گزارہ کروگی لیکن مجھ میں خود اعتمادی بہت تھی اور میں اپنی امی سے اکثر کہتی تھی کہ "میں ایسے شخص سے شادی کروں گی جو زندگی میں میرے ساتھ آگے بڑھے جو پہلے سے نہ بنا ہوا ہو جو ایک مقام پر پہنچا ہوا ہو اور پھر بیوی ڈھونڈنے نکلے۔" میری امی مجھے اس بات پر پاگل کہتی تھیں۔ مجھے ذیشان میں یہ کوالٹی نظر آئی کہ یہ بندہ آگے بڑھنے والا ہے۔ اسے میرے ساتھ کی ضرورت ہے اور مجھے اس کے ساتھ کی ضرورت ہے یہ ہم دونوں کے لیے ایک آئیڈیل میچ ہے پھر میں خود بھی تو جاب کرتی تھی۔ تو جناب شادی طے پا گئی اور میری امی کی میری رخصتی تک یہ خواہش تھی کہ زلزلہ آجائے اور کسی طریقے

سے یہ شادی رک جائے۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد جب میں نے ٹریول کرنا شروع کیا تو امی کو اطمینان ہوا کہ یہ تو بہت اچھا لڑکا ثابت ہو رہا ہے میری بیٹی کے لیے 'تو پھر وہ سکون میں آئیں اور اب تو ان کے لیے اس دنیا میں ذیشان سے بڑھ کر کوئی لڑکا ہے ہی نہیں' بہت پیار کرتی ہیں اپنے داماد سے ۔ میرے سسرال کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں آیا 'سسرال والوں نے بہت خوشی کے ساتھ مجھے قبول کیا اور بہت اہتمام کے ساتھ مجھے انہوں نے ویلکم کیا۔"

"ہوں گڈ۔۔۔ ساس کے ساتھ تعلقات کیسے ہیں؟"

"بہت اچھے اور میرے خیال میں میری ساس کی کوئی بھی بہو ایسی نہیں ہے جو میرے جیسی ہو کہ کھانا ہی نہیں پکاتی 'میں گھر پر بھی زیادہ نہیں ہوتی' ورکنگ وومن ہوں۔ انہیں مجھ میں گھریلو بہو والی کوئی بات نہیں ملی مگر پھر بھی انہیں میرے ساتھ مزہ آیا اور مجھے پیار دیا انہوں نے۔"

"بیاہ کر میرپور خاص گئیں اور جوائنٹ فیملی میں رہیں؟"

"میری والدہ بھی شادی کے بعد بارہ سال تک

جوائنٹ فیملی میں رہیں جب ہم حیدر آباد میں رہتے تھے پھر میری ساری سسرالی فیملی جوائنٹ فیملی میں رہتی ہے لیکن ذیشان کی طبیعت تھوڑی سی مختلف ہے۔ انہوں نے کبھی بھی جوائنٹ فیملی کو ترجیح نہیں دی اور وہ اکیلے لائف گزارنا پسند کرتے ہیں تو شادی کے پہلے دو سال ہم لاہور میں رہے' اس کے بعد دو سال کے لیے امریکہ چلے گئے دو سال بعد واپس لاہور آئے اور اب گزشتہ تین سال سے ہم کراچی میں ہیں۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی؟"

"شادی بہت سادگی سے ہوئی۔ ہمارے پاس صرف تین لاکھ روپے تھے جو ہم نے گریجویشن کے دوران جمع کیے تھے۔ تو منہ دکھائی میں ذیشان نے مجھے گاڑی لے کر دی۔ ان کے پاس پہلے موٹر سائیکل تھی میری والدہ اپنی گاڑی بیچنا چارہی تھیں تو ذیشان نے ڈھائی لاکھ میں امی سے گاڑی خریدلی اور کہا کہ یہ تمہارا گفٹ ہے اور باقی پچاس ہزار میں ہم نے ولیمہ کیا تھا.... مایوں' مہندی ڈھولکیاں کچھ بھی نہیں ہوا....

مجھے یاد ہے کہ شادی سے پہلے میں بھی پڑھاتی تھی NCA میں اور ذیشان بھی پڑھاتے تھے "ہنر کدہ" کالج میں تو شادی سے تین چار دن پہلے ان کے اسٹوڈنٹس نے مل کر ہمیں فون کیا کہ میڈم ہمارے امتحان ہو رہے ہیں تو ہمیں آپ دونوں سے کچھ ایڈوائس چاہیے اگر آپ آجائیں تو بڑی مہربانی ہوگی' تو ہم دونوں شام کو پہنچ گئے کالج' وہاں پر انہوں نے باقاعدہ سرپرائز مایوں کا اہتمام کیا ہوا تھا' ہمارے لیے دیے جلائے اور خوب رونق لگائی.... اس کے علاوہ ہمارا سمپل نکاح ہوا تھا جو کہ تین گھنٹے کا تھا اور اسی میں جلدی جلدی رخصتی کی اور پوری شادی میں جو چیز ہمارے لیے اہم تھی وہ یہ کہ شادی کے بعد والی زندگی کیسے گزرے گی اور "نکاح نامہ" میں کیا کیا چیزیں لکھوائی جائیں گی کیونکہ عموماً" لوگ نکاح نامہ کو اہمیت نہیں دیتے سوائے اس کے کہ دستخط کرتے ہیں۔ تو نکاح نامہ میں نے' ذیشان نے اور میرے نانا نے بیٹھ کر بھرا تھا۔ کچھ چیزیں کاٹیں اور اپنی طرف سے کچھ چیزیں شامل کیں۔"

"حق مہر اور جہیز پہ کوئی تنازعہ؟"

"نہیں بالکل نہیں' جہیز لینے سے ذیشان نے انکار کردیا تھا اور کہا کہ تم ایک جائے نماز اور ایک قرآن کے ساتھ آؤ.... اور وہی میں لے کر گئی تھی اور حق مہر میں میں نے کہا تھا کہ تمہاری جو پہلی چار پینٹنگز ہوں گی' وہ میں رکھوں گی' پیسوں میں حق مہر نہیں رکھا تھا۔"

"شادی کے بعد ذیشان کو کیسا پایا؟"

"شادی سے پہلے ذیشان بہت روکھے تھے' بالکل بھی رومانٹک نہیں تھے بہت لیے دیے رہتے تھے کیوں کہ ہم دونوں بزنس پارٹنر بھی تھے اور پتا نہیں کیوں شادی سے پہلے مجھے لگا کہ یہ بندہ میرے لیے ٹھیک رہے گا اور شادی کے بعد جب ان کی رومانٹک سائیڈ سامنے آئی تو میں بہت حیران ہوئی۔ شادی کے بعد ان میں جو چینج آیا وہ بہت رومانٹک بندے کا آیا تھا اور مجھے بہت اچھا لگا اور چونکہ اتنے سالوں سے میں ایک پریکٹیکل بندے کی حیثیت سے انہیں دیکھ رہی تھی تو شادی کے بعد ان کا یہ روپ مجھے بہت اچھا لگا اور کتنا خوب صورت سرپرائز تھا میرے لیے' میں سمجھا بھی نہیں سکتی۔ یہ ہر سال میرے لیے کچھ بنا کردیتے ہیں جس کی وجہ سے میرا پیار ان کے لیے بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔"

"کتنے سال ہوگئے شادی کو اور بچے؟ اور شادی کی ڈیٹ کیا ہے؟"

"شادی کو ماشاء اللہ 8 سال ہوگئے ہیں اور بچے نہیں ہیں۔ یہ چیز ہم نے شادی سے پہلے ہی سوچ لی تھی کہ بچے نہیں پیدا کرنے' میں نے پہلے ہی ذیشان سے کہہ دیا تھا کہ میں بچے پیدا نہیں کرنا چاہتی' بلکہ میں بچے ایڈاپٹ کروں گی اور جب میں نے ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے بے ساختہ کہا۔

ارے واہ میں بھی ایسا ہی کرنا چاہتا ہوں اور یہ ایک میجر فیکٹر تھا ہماری ریلیشن شپ مضبوط ہونے کا اور اب ہم سوچ رہے ہیں ایڈاپٹیشن کا۔ ہماری شادی 16 اپریل 2006 میں ہوئی۔"

"ذیشان مزاج کے کیسے ہیں' نرم ہیں یا گرم؟"

"ذیشان بہت ہی دھیمی طبیعت کے انسان ہیں۔ ان کو جب غصہ آتا ہے تو وہ سو جاتے ہیں اور میں بہت ایگریسو قسم کی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھے طریقے سے بیلنس کر لیتے ہیں۔ ہم دونوں میں شکر الحمد للہ لڑائی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہم بات کر کے آپس میں بہت سارے مسائل کو حل کر لیتے ہیں۔"

"اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے اگر ذیشان صاحب کا دل کسی اور پہ آ گیا تو؟"

"اگر ان کا دل آ جائے گا تو میں کون ہوتی ہوں روکنے والی' پر مجھے لگتا نہیں کہ ایسا ہو گا کیونکہ میں اپنے سسرال میں دیکھتی ہوں تو مجھے ایسا کوئی کیس نظر نہیں آتا۔ خواہ میرے سسر ہوں یا جیٹھ سب نے ایک ہی شادی کی۔ ہے تو ایسا ہوا تو میں انہیں روکوں گی تو نہیں لیکن ان کے ساتھ بھی نہیں رہوں گی۔"

"فضول خرچ کون ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو کس طرح بلاتے ہیں اور کیا ابھی بھی "تو تو" کر کے بات ہوتی ہے؟"

"ہم تو تو کر کے بات کرتے ہیں۔ لیکن جب کسی بات کو ڈسکس کر رہے ہوتے ہیں تو پھر ایک دوسرے کو آپ جناب کر کے مخاطب کرتے ہیں اور ہم ایسا جان بوجھ کر کرتے ہیں کیونکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ بات ہم نے مذاق میں کی ہے' بزنس کی بات ہو تو ہم دونوں بہت فارمل ہو کر بات کرتے ہیں میں انہیں ذش کہتی ہوں اور وہ مجھے کیف کہتے ہیں اور فضول خرچ پہلے میں تھی اب وہ ہیں۔ پہلے وہ بہت سادہ تھے۔ اب جیسے جیسے ان کا کام اور ٹریولنگ بڑھتی جا رہی ہے اور لوگ انہیں جاننے لگے ہیں تو وہ اپنے کپڑوں پہ اور اپنی پرسنالٹی پہ زیادہ توجہ دینے لگے ہیں۔"

"شادی کے فائدے ہیں یا نقصانات؟"

"یہ تو منحصر ہے دونوں انسانوں پر... شادی کے نقصانات بھی ہو سکتے ہیں اگر دو انسانوں کی سوچیں ایک جیسی نہ ہوں۔ میرے لیے شادی کے بہت فوائد ہیں۔ جب میں کام کرتی تھی تو میری والدہ کا بڑا مسئلہ ہوتا تھا کہ میں رات کے تین تین بجے تک گھر سے باہر ہوتی تھی۔ انہیں میرا کام سمجھ میں نہیں آتا تھا' یہ سمجھانا والدین کو بہت مشکل ہوتا ہے کہ اگر آپ کی بیٹی انٹرنیشنل لیول پہ کسی سے بات کر رہی ہے تو وہ اپنے وقت پر نہیں کرے گی بلکہ ان کے یہاں جو ٹائم ہو گا اس کے مطابق کرے گی... شادی کے بعد میں ایزی ہو گئی کہ ذیشان میرے کام کو سمجھتے تھے اور میرے ساتھ کام کرتے تھے اور انہیں میری روٹین کے بارے میں پتا تھا۔ تو میرے لیے شادی فائدہ مند ہی رہی۔ میرے لیے ٹریولنگ بہت آسان ہو گئی۔ میری والدہ پہلے ڈری رہتی تھیں کہ یہ کبھی انڈیا جا رہی ہے تو کبھی

سری لنکا۔ تو ذیشان امی کو سمجھاتے تھے کہ اسے کام کرنے دیں۔ اسے کام کرنا ہے اور کام کرنا ہوگا پھر امی

چپ ہو جاتی تھیں۔ شادی کے بعد ہی میں امریکہ پڑھنے گئی مجھے بہت ساتھ تھا میرے شوہر کا' وہاں رہ کر ذیشان نے میرے لیے کھانے بھی پکائے ہیں۔ گھر بھی سنبھالا' کیونکہ میں تو پڑھائی میں لگی رہتی تھی.... تو میرے لیے تو میرے شوہر کا ساتھ بہت اچھا رہا۔"

"کیف! آپ ذیشان کو کس روپ میں اچھی لگتی ہیں۔ سادگی میں یا بنی ٹھنی؟"

"انہیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی۔ جس دن میں تیار ہو جاتی ہوں۔ یہ تعریف کرتے ہیں اور جب سمپل ہوتی ہوں تو کچھ نہیں کہتے۔ ویسے میں زیادہ تر سمپل ہی رہتی ہوں.... ہمارا سمپل رہنا بھی بہت مختلف ہوتا ہے ہمارے بال بنانے کا اسٹائل بھی بہت مختلف ہوتا ہے۔ ذیشان کے لمبے بال ہیں۔ وہ زیادہ تر جوڑا بنائے رہتے ہیں اور میں اپنے بالوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ تجربات کرتی رہتی ہوں۔ تو ہم اپنی اس ایکٹویٹی کو انجوائے کرتے ہیں۔"

"شروع میں محبت زیادہ ہوتی ہے یا یہ آہستہ آہستہ بڑھتی ہے؟"

"شادی سے پہلے والی محبت اور شادی کے بعد والی محبت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مجھے 13 سال ہو گئے ہیں ذیشان کو جانتے ہوئے! اور میرے ساتھ ان کا ریلیشن بہت سارے فیزز Phases سے گزرا ہے بڑے مرحلے ہم نے طے کیے ہیں یعنی پہلے ہم دوست تھے' پھر بہ حیثیت کولیگ ایک دوسرے کی عزت ہمارے دلوں میں پیدا ہوئی۔ پھر اس ریسپکٹ میں محبت بھی شامل ہو گئی پھر شادی ہوئی تو ایسا لگا جیسے مجھے روگ لگ گیا ہے اپنے میاں کے لیے۔ یہ اتنے اچھے ثابت ہوئے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ ان کے بغیر رہنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی طبیعتوں اور مزاجوں کو سمجھنے لگے۔ یہ بھی ٹریول کرتے ہیں اور میں بھی۔ کبھی کبھی ہم ایک دوسرے سے مہینوں نہیں مل پاتے اور پھر جب ملتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے پہلی بار مل رہے ہیں' کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان شادی کے بعد مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔"

"کھانا گھر میں پکتا ہے یا باہر سے آتا ہے؟"

"جب سے ہم کراچی آئے ہیں' ہوٹلنگ زیادہ ہو گئی ہے۔ کراچی کی زندگی لاہور کی نسبت زیادہ فاسٹ ہے' ہمارے گھر ویسے تو کک بھی آتا ہے مگر ذیشان مجھ سے لاکھوں درجے بہتر کھانا پکا لیتے ہیں۔ مجھے تو دھنیا' پودینہ' کالی مرچ کی خوشبو کا فرق بھی نہیں معلوم۔ مگر انہوں نے کبھی برا نہیں مانا اور میں تو جب بھی چولہے کے پاس جاتی ہوں۔ کبھی ہاتھ تو کبھی انگلیاں جلا لیتی ہوں۔ ذیشان کہتے ہیں تم چولہے کے پاس جایا ہی نہیں کرو۔"

"اور اب آخری سوال کرتے ہیں۔ ذیشان نے کمرے میں آکر سب سے پہلا جملہ کیا بولا تھا؟"

ہنستے ہوئے۔ "جب ہماری رخصتی ہوئی تو ہمارے ساتھ ہمارے فرینڈز کی ایک پلٹن تھی۔ جو ساری رات ہمارے کمرے میں بیٹھے رہے۔ ہم لوگوں نے اتنا انجوائے کیا کہ بیان سے باہر ہے اور انہوں نے سب دوستوں کے جاتے ہی بہت رومانٹک جملہ کہا تو میں حیران ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگی۔ انہوں نے بہت خوب صورت انداز میں حق جتایا کہ میں ان کی بیوی ہوں اور پھر جس طرح سب کے سامنے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ہگ (Hug) کیا میرے لیے امیزنگ تھا۔"

اس جواب کے ساتھ ہی ہم نے کیف سے اجازت مانگی اور ان کی گفتگو کو بہت انجوائے کیا۔

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع ۔ 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔

آپ کی سلامتی' عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو' ہم کو اور ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے' ہمیں اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

پچھلے ماہ بہن فرحانہ ناز ملک کے خاندان کے ساتھ پیش آنے والے المناک سانحہ نے قارئین کو گہرے صدمے سے دوچار کیا۔ بے شمار آنکھیں اشک بار ہوئیں۔ دل غم میں ڈوب گئے۔ فرحانہ ناز ملک جیسی پیاری لڑکی اور رائٹر کی جواں مرگ نے سب کو رلا دیا۔ اس ماہ موصول ہونے والے تقریباً" تمام خطوط میں قارئین نے گہرے صدمے کا اظہار کیا ہے۔ ہماری بہت سی قارئین نے قرآن پاک پڑھ کر انہیں ثواب پہنچایا ہے۔ ان تمام خطوط کی اشاعت ممکن نہیں۔ بلاشبہ فرحانہ کے لیے اب بہترین تحفہ مغفرت کی دعا ہے۔

ہماری بہت سی قارئین نے ان کے بیٹے دانیال کی خیریت دریافت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ دانیال خیریت سے ہیں۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ فرحانہ ناز ملک کے گھر والوں اور بچوں کو آئندہ ایسے المناک حادثوں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

ثمینہ اکرم' بہار کالونی' لیاری کراچی

نومبر کا مہینہ تو ویسے بھی میرے لیے بہت اداسی لیے ہوئے آتا ہے مگر اس خبر نے تو گویا میرا زخم ہرا کر دیا۔ میں خود اس جدائی کے عذاب سے گزر چکی ہوں اور پھر رائٹر اور قاری میں تو ایک اٹوٹ اور گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ فرحانہ ناز ملک' ان کی ڈاکٹر بہن' والدہ اور بھائی کی ناگہانی موت کا اس قدر صدمہ اٹھایا کہ میں بیمار پڑ گئی۔

"پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں" میں دین سے متعلق مختلف احادیث عالم اور معلم سے متعلق احادیث نے دینی معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ واقعی یہ سلسلہ سب سے زیادہ زبردست ہے۔ جزاک اللہ خیرا" "پیر کامل" پر آمنہ زریں کا سیر حاصل تبصرہ پڑھا۔ اس سے بہترین تبصرہ شاید ہی کوئی اور کر سکتا ہو۔ اور اب اس کے دوسرے حصے "آب حیات" کا بے چینی سے انتظار ہے۔ عمیرہ احمد کی واپسی تمام قارئین کرام کو مبارک ہو۔ مکمل ناول میں مجھے راشدہ رفعت کا "ہنستا ہوا موسم" سب سے زیادہ پسند آیا۔ "محبت فاتح عالم" بھی بس ٹھیک ہی تھا۔ افسانہ "سرخ گلاب اور زرخیز مٹی" وطن کی محبت کی خوشبو سے مہکتے ہوئے لگے۔ جبکہ "دل کے فیصلے بھی عجیب ہوتے ہیں" یہ بھی ایک اچھا افسانہ تھا۔ ایک تھی مثال میں خدا کرے کہ مثال کو واثق کا بے لوث ساتھ مل جائے۔ رقص بسمل میں ماورا کے ساتھ کیا مسئلہ ہے (11 نومبر کو شہید معیز اکرم کا یوم شہادت ہے دعا مغفرت کی درخواست ہے) "یارم" (سمیرا حمید) پسندیدگی کے لحاظ سے ٹاپ آف دی لسٹ جا رہا ہے۔ تمام قارئین کی طرح مجھے بھی یہ بہت پسند آیا ہے۔ مگر اس میں قاری کے لیے کوئی سسپنس نہیں ہے' یہ یونیورسٹی لائف کے گرد گھومتی ایک کہانی ہے جس کا مرکزی کردار امرحہ ہے۔ پہلے عالیان امرحہ کے اردگرد گھومتا تھا اب امرحہ ہر جگہ عالیان سے دوستی کی بھیک مانگتی نظر آتی ہے۔ اب ایسا بھی کیا اپنی عزت نفس کو مجروح کرنا۔ اگر عالیان امرحہ سے

دوستی نہیں رکھنا چاہتا تو اس پر لعنت بھیجیے۔ اب عالیان میں کون سے سرخاب کے پر لگ گئے ہیں۔ وہ ہے تو اب بھی مار گریٹ کا بیٹا ہی۔ "یارم" میں مختلف ممالک کے مختلف اسٹوڈنٹس کا کلچر' ان کی عادات' ان کے رویہ وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مگر کارل جیسا کردار شاید ہی کسی یونیورسٹی میں پایا جاتا ہو۔ پھر اتنی ٹف پڑھائی میں سر اٹھانے کی فرصت بھی نہیں ملتی مگر صرف ان اسٹوڈنٹس کو جو پڑھنے کے لیے یونیورسٹی آتے ہیں۔ باقی دل بہلانے کی تو بہت سی باتیں ہیں۔ مگر امرحہ کی اپنے وطن پاکستان سے محبت اچھی لگی۔ ایک بات اور۔ گستاخ رسول کی سزا صرف اور صرف موت ہے۔ یہ مذہبی انتہا پسندی نہیں۔ مذہب ہے۔ اور مذہبی حکم بھی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں اپنے جانی دشمنوں کو معاف فرمادیا۔ کیونکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن سلوک تھا اور اللہ پاک نے اس عمل میں آپ کو بااختیار بنایا ہے۔ مگر اب کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کلمات کہے تو وہ واجب القتل ہے۔

ج: ثمینہ آپ کا کہنا بالکل درست ہے۔ ہمارا بھی اس پر یقین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والا کسی طور قابل معافی نہیں ہے۔ اس کی سزا موت ہے لیکن سمیرا حمید نے کہیں بھی یہ وضاحت نہیں کی کہ مقدس ہستیوں سے مراد کوئی نبی' رسول یا پیغمبر تھا۔ دراصل پال لادین تھا' اس لیے وہ تمام مذاہب اور ان کی تبلیغ کرنے والوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ امرحہ چونکہ مذہب پر یقین رکھتی تھی' اس لیے اسے غصہ آگیا' تب عالیان نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال دے کر سمجھایا کہ یہ طریق کار درست نہیں ہے۔ شعاع پر آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح جامع اور مکمل ہے۔ فرحانہ ناز ملک کے گھر والوں کے دکھ کو آپ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے آپ خود اس تکلیف سے گزری ہیں۔

معیز اور فرحانہ کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

افشین فاروقی لکھتی ہیں

ٹائٹل اتنا زبردست۔ ماڈل کا ہیر اسٹائل' ڈریس' نیل پینٹ' میک اپ ہر چیز پرفیکٹ تھیں۔ بندھن میں عامر سلیم مسز سلیم کا انٹرویو پڑھا بہت اچھا لگا آپ کے خط پڑھ کر مزہ آیا۔ رخسانہ نگار عدنان کی "ایک تھی مثال" اپنی مثال آپ کہانی ہے۔ "سلمیٰ فقیر حسین" دل کے فیصلے ایک دل کی کہانی جو بہت جامع ہے "راشدہ رفعت" یہ ہنستا ہو موسم پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ "سمیرا حمید" کی یارم کا گلے مہینے بھی بے چینی سے انتظار رہے گا' یہ ایک بہت اچھی سلسلہ وار کہانی ہے۔

"نبیلہ عزیز" رقص بسمل بہت اچھا ہے کہانی بہت جاندار ہے۔

ج: افشین! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

فرح ناز نین نے لاہور روڈ خانیوال سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

اگست 2014 کے شمارے میں سمیرا حمید کا ناول دیکھا بہت پسند آیا امر بیل کے بعد کسی ناول نے اتنا متاثر کیا ہے میں نے سوچا کہ خط لکھ کر مصنف تک اپنی رائے پہنچاؤں میں تو سمیرا حمید کے انٹرویو کی فرمائش کرنا چاہتی تھی مگر ناول کی پانچویں قسط پڑھنے کے بعد میرے خیالات بالکل پہلے جیسے نہیں رہے وہ باہر کی یونیورسٹیوں تک کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہیں تو پھر دین کے بارے میں معلومات کیوں نہیں ہیں۔ ان کے ناول نے بہت دل دکھایا ہے۔

ناول میں رائٹر نے پال کی بے ہودہ گفتگو پر امرحہ سے تھپڑ تو جڑ دیا مگر اس کے بعد عالیان کی باتیں' پھر امرحہ کا بھی ان سے متفق ہوجانا اور تو اور دادا جی بھی حمایتی ہوگئے۔ ان سب باتوں سے مجھے شدید اختلاف ہے۔ امرحہ کی پال سے معذرت پر اور زیادہ غصہ آیا' بات اگر امرحہ کی ذات کی ہوتی تو ٹھیک تھا مگر یہ معاملہ دین اور اس کی مقدس ہستیوں کا ہے رائٹر کو ہمارے معاشرے میں غازی علم دین شہید اور عامر چیمہ کے رتبے کا معلوم ہوگا یہ بھڑک جانے والے اور غصے میں آجانے والے مسلمان ہی ایسے کارنامے سرانجام دیتے ہیں جن پر پورے عالم اسلام کو ناز ہوتا ہے۔

عالیان نے جو باتیں کیں اس پر امرحہ کو اسے بھی تھپڑ ماردینا چاہیے تھا پھر چاہے یونیورسٹی چھوڑنا پڑتی۔ مسلمان

تو اس معاملے میں دنیا چھوڑنے کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ متعصب یورپ میں تو پادریوں کی توہین پر بھی سزا مقرر ہے یہودی ہولوکاسٹ پر کسی کو بات نہیں کرنے دیتے مگر ایک مسلمان سے تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ مقدس ہستیوں کی شان میں گستاخی پر خاموش رہے۔ اس کا جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اسلام معافی اور درگزر کا دین ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں تک سے رحم کا معاملہ کیا پتھر مارنے والوں کو دعائیں دیں۔ یہ باتیں درست ہیں آپؐ رحمت اللعالمین تھے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کریمی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معاف کر دیا کرتے تھے مگر رائٹر کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے۔ معاف کر دینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار بحق تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں جسے چاہتے معاف کر سکتے تھے مگر ایک مسلمان کا جذبہ ایمانی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کے سامنے مقدس ہستیوں کے خلاف گفتگو کی جائے اور وہ خاموش رہے۔

ج، پیاری فرح! ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا بھی یہی ایمان ہے کہ شاتم رسول صلی اللہ علیہ وسلم واجب القتل ہے اور سمیرا حمید بھی اس پر یقین رکھتی ہیں' سمیرا حمید نے "مقدس ہستیوں" لکھا' اس سے مراد کوئی نبی' رسول یا پیغمبر نہیں تھا اور نہ ہی ان کے ذہن میں ایسا کوئی خیال تھا۔ دراصل پال لادین تھا اور وہ سرے سے کسی بھی مذہب پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ تمام مذاہب کو اور ان تمام علمائے کرام کو برا بھلا کہہ رہا تھا جو دنیا بھر میں تبلیغ دین کا کام انجام دے رہے ہیں اور ان قابل احترام شخصیات کی وجہ سے بہت سے لوگ ایمان لا چکے ہیں۔ جس کی بنا پر ان کے خلاف نفرت انگیز پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ خصوصاً" انڈیا اور امریکہ اس میں پیش پیش ہے۔

صائمہ خلیل نے ملتان سے لکھا ہے

میں نمرہ احمد اور عمیرہ احمد کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی ہوں اگر آپ "نمل" اور "آب حیات" شعاع میں شائع کر دیتیں تو آپ کا کیا جاتا تھا؟ میں صرف شعاع پڑھتی ہوں' میں ایک مہینے میں دو رسالے افورڈ نہیں کر سکتی' اس لیے آپ پلیز بڑی رائٹرز کی کہانیاں شعاع میں شائع کیا کریں جو آپ اکثر خواتین کی زینت بناتی ہیں۔ لیکن اگر آپ نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا اور نمرہ احمد' عمیرہ احمد اور شعاع کی تحریریں بڑھانے کی خوش خبری نہ سنائی تو پھر میرا اور شعاع کا رشتہ ختم اور آپ زیادہ وہ خط شائع کیا کریں جن میں سوال پوچھے گئے ہوتے ہیں۔

ج: پیاری صائمہ! شعاع اور خواتین دونوں ہی ہمارے ادارے کے پرچے ہیں۔ عمیرہ احمد اور نمرہ احمد آپ کی پسندیدہ مصنفین ہیں ان کی کہانیاں شعاع اور خواتین دونوں پرچوں میں شائع ہوتی ہیں۔

نمرہ احمد کا ناول "جنت کے پتے" شعاع میں شائع ہوا تھا' اب نمل خواتین میں آرہا ہے۔ عمیرہ احمد کا پیر کامل شعاع میں شائع ہوا' "آبِ حیات" خواتین میں دے رہے ہیں سمیرا حمید کا یارم شعاع میں لگایا ہے' ایک بات قابل غور ہے ہم خواتین میں بڑی رائٹرز کی کہانیاں دیتے ہیں' خواتین میں زیادہ کہانیاں ہوتی ہیں' اس کے باوجود آپ خواتین نہیں شعاع ہی لیتی ہیں۔ اس کا مطلب تو یہی نکلتا ہے نا کہ شعاع میں بھی ہم بڑی مصنفین کی اور اچھی تحریریں شائع کرتے ہیں۔

نازیہ خالد نے چراغ دین راولپنڈی سے لکھا ہے

ٹائٹل تو بہت ہی زبردست تھا۔ ماڈل کا ہیئر اسٹائل بھی بہت اچھا لگا۔ کہانیوں پہ بات آئی تو یہ کیا "رقص بسمل" اتنا شارٹ کیوں تھا۔ "یارم" کے تبصرے بن کر

اعتذار

ہماری پیاری مصنفہ نبیلہ عزیز شدید علالت کا شکار ہیں۔ اسی باعث وہ اس ماہ "رقص بسمل" کی قسط بھی نہ لکھ سکیں۔ اس کے لیے ہم اپنی قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ آپ "رقص بسمل" کی قسط پڑھ سکیں گی۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ نبیلہ عزیز کی جلد صحت یابی کے لیے دعا کریں۔

کے بہت عجیب لگ رہا ہے۔ یہ قسط نہیں پڑھی۔ سلمیٰ فقیر حسین نے "دل کے فیصلے" میں درست لکھا کہ "واقعی محبت سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتی ہے"

میمونہ صدف نے ایک حقیقت بیان کی ہے سیلاب کی تباہ کاریوں کے بارے میں۔ راشدہ رفعت کا "ہنستا ہوا موسم" نے دل خوش کر دیا۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ "محبت فاتح عالم" نبیلہ نقوی کے ناولٹ میں ہیروئن کا نام بہت اچھا لگا۔ "رباح" بہت حسین دلربا نام ہے۔ میں نے اپنی بھانجی کا یہ نام رکھا ہے۔ جو کہ 15 دن کی ہے۔

ج: پیاری نازیہ۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

فرحانہ فاروق نے میانوالی سے لکھا ہے

15 سال سے شعاع خواتین اور کرن پڑھ رہی ہوں۔ کرن میری سہیلی پڑھتی ہے مگر اس کو بھی میں منگوا کے دیتی ہوں پہلے خود پڑھتی ہوں پھر سہیلی کو بھیجتی ہوں اس کے بعد لکی مروت بھیج دیتی ہوں وہاں میری بہن جو شادی شدہ ہے پڑھتی ہے اس کے بعد بیگ میں رکھ لیتی ہوں تاکہ بعد میں سب قسطیں اکٹھے پڑھ سکوں۔ جیسے ہی رسالہ ہاتھ میں آتا ہے میں ہر کام چھوڑ کے پہلے قسط وار پڑھنا شروع کر دیتی ہوں' اس کے بعد کچھ گھر کے کام اور کچھ سلائی کرتی ہوں تاکہ امی ڈانٹیں نہیں مگر ایک مسئلہ یہ بھی ہے جب ڈائجسٹ کے دن قریب آتے ہیں' ان دنوں سلائی کے کپڑے بھی زیادہ آجاتے ہیں مگر میں جب تک پڑھ نہ لوں کوئی کام ہی نہیں ہوتا مجھ سے۔ پندرہ سال میں آج پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں اور اس کی وجہ نبیلہ نقوی کا ناول "محبت فاتح عالم" ہے۔ جیسے ہی شروع کیا بغیر سمجھ کے ختم بھی کر لیا۔ مجھے تو ایسے ہی لگا ہے جیسے بھاگتے دوڑتے کہانی لکھی گئی ہو۔

یارم بھی بہت اچھا ہے اور خاص کر رقص بسمل میں عزت اور ولید کا کردار بہت پسند ہے۔

آپی میں نے کچھ سال پہلے ایک کہانی پڑھی تھی مگر مجھے یہ نہیں یاد کہ وہ شعاع میں تھی یا خواتین میں مگر اس کا نام مجھے یاد ہے "اترے میرے آنگن میں چاند" اس میں دادی جان نے جو سعدیہ کو کام سکھائے تھے میں نے بھی بہت کچھ سیکھ لیا تھا' آپ سے درخواست ہے پلیز اس کو ایک دفعہ پھر شائع کر دیں تاکہ آج کل کی اور لڑکیاں بھی کچھ سیکھ لیں۔

ج' پیاری فرحانہ! آپ نے جس کہانی کو دوبارہ شائع کرنے کی فرمائش کی ہے جہاں تک ہمیں یاد ہے' یہ فاخرہ جبیں کی کہانی تھی اور خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوئی تھی۔ اگر یہ صحیح نہیں ہے اور کسی بہن کو یاد ہے تو وہ ہماری تصحیح کر سکتی ہیں شعاع اور خواتین کے بارے میں آپ کی پسندیدگی جان کر خوشی ہوئی۔

تہمینہ روف نے بنوں سے لکھا ہے

(یارم) ہارٹ فیورٹ۔ امرحہ ویرا جیسی کیوں نہیں بن سکتی؟ عالیان کا غم بہت بڑا ہے' مگر وہ ایک دفعہ تو امرحہ کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھے کہ عالیان کے ساتھ کے بغیر وہ کتنی اداس اور ویران ہو گئی ہے۔ سمیرا جی اب عالیان کی

تھوڑی سی ناراضی ختم کر کے امرحہ کے ساتھ ساتھ ہماری بھی تشفی کر دیجیے۔ مجھے پکا یقین ہے کہ کارل امرحہ کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ عالیان کے بعد کارل میرا فیورٹ کردار ہے۔ راشدہ رفعت کے ناول نے بہت مزہ دیا۔ خاص کر ماہا کے کردار نے

"ایک تھی مثال" تو پسندیدہ ہے ہی۔" آپی آپ کے پرچے کے سارے سلسلے ہمیں بہت پسند ہے۔ حرا قریشی' نوال افضل گھمن' آمنہ اجالا اور نمرہ' اقرا اور فوزیہ ثمرینہ ان سب سے دلی انسیت سی محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے سب کو سلام۔

ج :۔ تہمینہ! امرحہ' ویرا جیسی نہیں بن سکتی' تو ویرا بھی امرحہ نہیں ہو سکتی۔ پاکستانی مسلمان لڑکی اور ایک روسی لڑکی میں کچھ فرق تو ہونا ہی چاہیے' جہاں تک عالیان کے سمجھنے کا تعلق ہے' اسے امرحہ کے الفاظ نے دکھ دیا ہے۔ اس کے جھوٹ نے دکھ دیا ہے۔ اگر امرحہ اسے صفائی سے اپنے ماحول اور پابندیوں کے بارے میں بتا دیتی تو وہ اتنا دکھی نہیں ہوتا۔ محبت تو بہت بعد کی بات ہے۔ اصل چیز تو عزت اور دوستی ہے ۔ دراصل عالیان' امرحہ کا دوست تھا کارل کے بارے میں آپ کا اندازہ کتنا درست ہے۔ یہ تو آئندہ اقساط میں ہی پتا چلے گا۔

ثنا اقبال... اسلام آباد

اکتوبر کے شمارے میں ناولٹ "اک ہاتھ ذرا بڑھا" پسند آیا۔ اب بات کرتے ہیں نومبر کے شمارے کی' ٹائٹل بہت

پیارا ہے۔ میمونہ صدف کا افسانہ اچھا ہے۔ "یارم" جب مکمل ہو جائے گا تب پڑھوں گی۔

ج :۔ پیاری ثنا! ہماری بہت سی قارئین قسط وار کہانیاں‘ جب وہ مکمل ہو جاتی ہیں‘ تب پڑھتی ہیں‘ ہم ایسی تمام قارئین سے کہیں گے کہ آپ قسط وار کہانیاں ہر ماہ پڑھیں‘ تاکہ مصنف تک اپنی رائے پہنچا سکیں۔ آپ کی حوصلہ افزائی‘ آپ کے مشورے‘ آپ کی تنقید و تعریف مصنف کی رہنمائی کرتی ہے۔ اس ماہ سے آپ "یارم" پڑھنا شروع کر دیں۔ ویسے بھی اب تو صرف دو ہی اقساط باقی ہیں۔

ماہ وش طالب نے لاہور سے لکھا ہے

فاخرہ جبیں‘ راحت جبیں‘ عنیزہ سید‘ نزہت شانہ حیدر‘ سمیرا حمید میری آل ٹائم فیورٹ مصنفین ہیں۔ کچھ رائٹرز اپنی کہانی میں اللہ تعالیٰ لکھنے کی بجائے "اللہ میاں" لفظ استعمال کرتی ہیں‘ جبکہ "میاں" کا لفظ صرف انسانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چند ایک رائٹرز باجود شعور ہونے کے اس بات سے لاعلم ہیں کہ ان سے میری گزارش ہے کہ وہ مصنفین آئندہ اس انجانے میں ہوئی غلطی سے احتراز برتیں۔

ج :۔ ماہ وش شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

عائشہ جمیل بلدیہ ٹاؤن کراچی سے لکھتی ہیں

سمیرا حمید کا ناول "یارم" ایک بے مثال تحریر ہے۔ ہر بار کی طرح اس مرتبہ بھی انہوں نے زبردست لکھا۔ یہ کارل نامی شے تو بہت حسین نکلی‘ مگر ہم تو کچھ اور ہی سمجھتے تھے۔ "رقص بسمل" نبیلہ عزیز بہت ہی بور کر رہی ہیں۔ ایک تو صفحات کی قلت اور دوسرا سولہویں قسط بھی سولہویں مہینے میں تو بعض بے ہیز دوڑنا بھی شروع کر دیتے ہیں اور اس ناول نے تو لگتا ہے۔ ست اور لاغر بچے کی طرح ابھی پیٹ کے بل کھسکنا شروع کیا ہے۔ "یہ ہنستا ہوا موسم" راشدہ رفعت کے مکمل ناول نے کہیں ہنسایا‘ تو کہیں مسکرانے بھی نہ دیا۔ بہر حال ایک اچھی تحریر تھی۔ کافی پسند آئی۔ "محبت فاتح عالم" نبیلہ نقوی کی کہانی صرف کہانی ہی لگی۔ افسانے سب ہی پسند آئے۔ خصوصاً "مٹی بڑی زرخیز ہے" اور "سرخ گلاب" "دل کے فیصلے" بھی اچھا لگا۔ مگر یہ تو بتائیں جناب "دل کی چولی" شاہین رشید کی تحریر ہے یا شاہین ملک کی۔

ج :۔ پیاری عائشہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید‘ نبیلہ عزیز کا ناول قدرے ست ہے۔ اس کا ہمیں بھی احساس ہے۔ دراصل نبیلہ اپنی بیٹی اور پھوپھی کی علالت کی وجہ سے پریشان ہیں اور ناول پر پوری توجہ نہیں دے پا رہی ہیں۔ اب تو وہ خود بھی بیمار ہو گئی ہیں۔ نبیلہ نقوی کی کہانی آپ کو پسند نہیں آئی۔ معذرت۔ ہماری بہت سی قارئین کا کہنا ہے کہ شعاع میں پرانی رائٹرز کی تحریروں کو بھی جگہ دی جائے۔ ہم نے ان کے اصرار پر نبیلہ نقوی کی کہانی شامل کی تھی۔

فاضل پور سے عمارہ رفیق اپنے گاؤں کے تعارف کے ساتھ شریک محفل ہیں‘ لکھا ہے

ایک بار شعاع میں کسی قاری بہن نے کہا تھا‘ کیا ہے یہ کیا گاؤں پر تبصرہ‘ نہ شعاع کی تعریف‘ نہ ہی تنقید‘ بھئی شعاع تو ہے ہی اپنا‘ مجھے ان قاری بہن کے یہ الفاظ دل میں خنجر کی طرح لگے ہیں‘ کیوں نہ بتاؤں میں گاؤں کے بارے میں جہاں ہمارا بچپن گزرا‘ جوانی گزری‘ اس کی ایک ایک گلی اچھی لگتی ہے۔ جہاں شہروں میں صبح کا آغاز ٹریفک کے شور اور آلودہ ماحول میں ہوتا ہے۔ وہاں گاؤں میں صبح کا آغاز خوب صورت ماحول میں چڑیوں کی چہچہاہٹ سے ہوتا ہے۔ جو اللہ کی حمد و ثنا کرتی ہیں۔ شام کو عصر کے بعد کا منظر

متوجہ ہوں

ہماری ایک قاری بہن نے لفافے میں 170 روپے بھجوائے ہیں۔ اور فرمائش کی ہے کہ انہیں خواتین ڈائجسٹ کا ستمبر 2003ء کا شمارہ اور اگست 2014ء کے خواتین اور کرن بھجوا دیے جائیں لیکن ان قاری بہن نے اپنا نام‘ پتا نہیں لکھا ہے۔ اگر وہ اپنا پتا بھجوا دیں تو ان کے ایڈریس پر مطلوبہ رسائل پوسٹ کروا دیے جائیں گے۔

بھی بڑا دل فریب ہوتا ہے۔ شاید کلفٹن میں ڈوبتے سورج کو مات دے جائے۔ (قسم سے) آئی لو مائی ولیج اور گاؤں میں جب بارش ہوتی ہے نا۔ واہ بارش کے بعد مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ایسی کہ دنیا کے قیمتی سے قیمتی پرفیوم کو مات دے دے۔

میرا گاؤں کوہ سلمان کے وسط میں واقع ہے۔ یہاں تعلیمی سہولیات' ہائر سیکنڈری مڈل اور پرائمری تک ہے۔ اس کے علاوہ جو خاصیت میرے گاؤں کی ہے شاید کسی اور گاؤں کی نہ ہو۔ کوہ سلمان کے مختلف پہاڑی سلسلے میں یہاں جو صحابہ کرامؓ مدفون ہیں' وہ حضرت خالد بن ولیدؓ کے لشکر میں سے ہیں' یقین کریں آپی یہاں اللہ کی اتنی رحمت برس رہی ہے کہ میرے پاس اپنے رب کی تعریف کے لیے الفاظ ہی نہیں' ہر طرف بیری کے درخت ہی درخت' اتنے سرخ اور میٹھے بیر' میرے تو منہ میں پانی آگیا۔ آپی ہم صحابہؓ کی جگہ پہ اپنی نانی کو لے گئے۔ میری نانی کو جوڑوں کا درد رہتا ہے۔ وہ چل نہیں سکتیں۔ لیکن وہاں بغیر سہارے کے تین گھنٹے مسلسل چلی ہیں۔ وہ عینک کے بغیر قرآن پاک نہیں پڑھ سکتیں' لیکن بغیر عینک کے ساری سورتیں پڑھ لیں۔ آپ کو ایک بات بتاؤں' میری نانی دونوں کانوں سے بہری ہیں۔ آخری نمبر کا آلہ لگا ہوا ہے۔ انہوں نے پانی کی آواز کبھی نہیں سنی تھی۔ جیسے ہم لوگ آبشار کے قریب بیٹھے نانی اتنی خوش ہوئیں کہ آج پہلی بار پانی کی آواز سنی ہے۔ اس کے بعد چلتے ہیں۔ انگزوں کی ٹھنڈ ہے نا عجیب نام' خیر اس جگہ کی خاصیت یہ ہے کہ اسے مچھلیوں کی جھیل کہا جاتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں مچھلیاں آ جا رہی ہوتی ہیں۔ واہ کیا منظر ہوتا ہے۔ یہ جھیل پانچ کلر کے پانی کی ہے اور اس کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ گرم پانی کا چشمہ ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے یہ کوئی خاص چیز تو نہ ہوئی۔ یہ عام پانی نہیں' بلکہ اس میں موجود کیمیکل سے ہر قسم کی جلدی بیماری ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً" چنبل' خارش ہر قسم کی' الرجی' داد وغیرہ وغیرہ اس پانی سے دھونے' نہانے سے ختم ہو جاتی ہے اور یہ اتنا گرم ہوتا ہے کہ انڈہ آپ فری ابال سکتے ہیں۔ میرے گاؤں کے پہاڑ خشک ہیں۔ اس کو حکمت کے گاؤں بھی کہہ سکتے ہیں' کیونکہ ان جڑی بوٹیوں میں شفا ہے۔ مرض کو سو فیصد ٹھیک کر سکتی ہیں۔ مثلاً" ایک بوٹی ہے جسے حکمت کی زبان میں کھوئی بھنگ کہتے ہیں۔ اس کو اگر سانس بند کر کے توڑا جائے تو دمے کا مرض ختم بالکل اور ایک بوٹی جس کو ہون بوٹی کہتے ہیں اس بوٹی سے جو آج کل گردے کی پتھری ہوتی ہے۔ بغیر آپریشن اس کا علاج نہیں' لیکن اس بوٹی کو ایک ماہ کھانے سے بغیر آپریشن پتھری غائب' ایک بوٹی ہے درماں گرمیوں کے موسم میں اس کو مٹی کے برتن بھگو کر رکھ کر صبح نہار منہ اس کا پانی پیا جائے' جلد صاف شفاف گرمی دانے پھوڑے پھنسی سے نجات مل جاتی ہے' لیکن یہ بہت کڑوی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سب قاری بہنوں کے لیے پسندیدہ چیز وہ ہے ملتانی مٹی جی ہاں یہاں پر ملتانی مٹی کے پہاڑ ہیں۔ دودھ ایک چٹکی ملتانی مٹی میں ملا دیں۔ داغ دھبے' جھری ختم۔ سو فیصد گارنٹی کے ساتھ ہے۔ ہے نا مزے کی بات تو کیا خیال ہے' اگر کوئی آنا چاہے موسٹ ویلکم۔

ج۔ پیاری عمارہ! آپ کا خط پڑھ کر ہمارا یہ یقین مزید پختہ ہو گیا کہ قدرت نے ہمیں بے بہا نعمتیں عطا کی ہیں اور ہمارا وطن پاکستان ہمارے لیے اللہ تعالٰی کا انعام ہے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم اس نعمت کی قدر نہیں کرتے۔ اللہ تعالٰی کی عطا کردہ ان نعمتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنے گاؤں کے بارے میں لکھا۔ آئندہ شعاع کے بارے میں بھی اپنی رائے دیجیے گا۔

رمشا ممتاز دبے والا ضلع بھکر سے لکھا ہے

آپی میں لکھنا چاہتی ہوں' لیکن مجھے پتا ہے میں کوئی کہانی لکھ نہیں سکتی' میرے پاس کچھ افسانے ہیں' بھیج دوں؟ نبیلہ عزیز جی "درد دل" کی طرح ایک ناول اور لکھیں "یارم" بہت زبردست ہے۔ سلمٰی فقیر حسین حذیفہ کو اتنا بے حس بنا کر پیش کرنا ہضم نہیں ہو رہا۔ اتنا بچہ تو نہیں تھا کہ رابیل کو اس طرح ٹریٹ کرتا۔ میں اور میری بہن زونیرہ ___ ان پرچوں کی دیوانی ہیں۔ ہمیں اس کام سے روکنے کے لیے رسالے پھاڑ بھی دیے گئے' مگر ہمت نہ ہاری۔

ج :۔ پیاری رمشا! اللہ تعالٰی آپ کے شوق اور ہمت کو سلامت رکھے آپ نے لکھا ہے کہ آپ کہانی لکھ نہیں سکتیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کے پاس سترہ افسانے

ہیں۔ جو آپ بھجوانا چاہتی ہیں ہمیں بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی، بہرحال آپ افسانے بھجوادیں قابل اشاعت ہوئے تو ضرور شائع ہوں گے۔

شازیہ ہاشم کھڈیاں خاص قصور سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

سب سے پہلے میں اپنے گاؤں کا تعارف کرواتی ہوں۔ میرا گاؤں کالی ویرے چک نمبر 2 پتوکی شہر سے تقریباً تین کلو میٹر دور ہے۔ اس میں نرسریاں بہت زیادہ ہیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ دادی اماں کی عیادت کے لیے ہم نے گاؤں جانے کا پروگرام بنایا۔ میری پوری فیملی' میری اسکول کولیگ فرزانہ اور میرے مدرسے کا پورا اسٹاف تین نومبر کو گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ موسم بہت پیارا یعنی رومانٹک تھا۔ اللہ اللہ کرکے گاؤں پہنچے' جہاں سب سے پہلے دادی اماں سے ملے۔ میری دادو بہت نیک اور پرہیزگار خاتون ہیں۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ چھوٹے تایا ابو آگئے جن کے ہاں کھانا کھانا تھا۔ انہوں نے کہا پہلے کھانا کھانا پھر ادھر ادھر جانا' لیکن ہمارے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ ہم کھیتوں کی طرف نکل گئے۔ بے حد پیارا موسم اور ہر طرف پھیلا سبزہ کھیتوں کی سیر سے فراغت کے بعد چھوٹے تایا ابو کے گھر کھانا کھایا جو بے حد لذیذ بنا ہوا تھا۔ پھر اپنے اسٹاف کو گھر دکھایا۔

پانچ نومبر کو شعاع ملا۔ حمد و نعت سے دل کو روحانیت بخشتے ہوئے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتوں سے استفادہ کیا۔ "بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا" پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتی۔ کیونکہ عمیرہ احمد پیر کامل کا دوسرا حصہ شروع کر رہی ہیں۔

ج:۔ پیاری شازیہ! آپ کے گاؤں کے بارے میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے گاؤں کو اسی طرح سرسبز اور شاداب رکھے۔ (آمین) شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فرخندہ لطیف نے رحیم یار خان سے لکھا ہے

رسالے کی جان' آن' بان' شان (ہی ہی ہی) اپنے "یارم" تک پہنچے۔ اوئے ہوئے سمیرا سندری! نہ کریا کرو یار' دہائی۔ اف' نظر بد سے بچو تم کارل ایسی پیاری حرکتیں کرتے ہو' کیوں کرتے ہو' نہ کیا کرو۔

اور امرحہ دیوانی! ایسی محبت کیوں گنوادی عالیان کی۔

ج :۔ فرخندہ! آپ کا بے ساختہ اور پر لطف انداز بہت اچھا لگا' صفحات کی مجبوری نہ ہوتی تو پورا خط شائع کرتے۔ شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ۔

کائنات عابد فیصل آباد سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

شعاع کا ٹائٹل پیارا لگا۔ اس کے علاوہ تمام ناولز بھی بہت اعلا تھے۔ خاص طور پر "یارم"۔ کارل کی شیطانیاں قسم سے بڑا مزا دیتی ہیں۔ رقص بسمل تو کچھ زیادہ ہی آہستہ جارہا ہے' بالکل کچھوے کی رفتار سے۔ "ایک تھی مثال" مثال کا کیا ہوگا؟ راشدہ رفعت کا ناول تو سب سے اچھا تھا۔ ماہا کی شرارتیں اور ان کی کھٹی میٹھی زندگی مزا دے گئی۔

ج :۔ پیاری کائنات! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

زرین سسٹرز نے چکوال سے لکھا ہے

آپی میں نے آپ سے پوچھنا تھا کہ میں نے شعاع 2012ء کا ایک ڈائجسٹ منگوانا ہے۔ اس کے لیے کیا طریقہ ہوگا؟

ج:۔ زرین آپ ہمیں اپنا ایڈریس بھجوادیں ہم آپ کو پرچا وی پی کردیں گے۔ خط میں جو شمارہ چاہیے اس کا نام اور مہینہ ضرور لکھیں۔

سیدہ مقدس گیلانی نے ایبٹ آباد سے لکھا ہے

آپ کو یقین نہ آئے' مگر میں بیس سال سے آپ کی

اعتذار

نومبر کے شمارے میں شاہین ملک کا افسانہ "دل کی چولی" شائع ہوا تھا۔ فہرست میں غلطی سے شاہین رشید کا نام شائع ہوگیا۔ یہ افسانہ شاہین ملک نے لکھا تھا۔ اس سہو کے لیے قارئین اور شاہین ملک سے معذرت خواہ ہیں۔

خاموش قاری ہوں۔ جب میں بیس سال کی تھی تب میرے بھائی نے مجھے شعاع لا کے دیا پڑھنے کے لیے۔ میں نے ٹائم پاس کرنے کے لیے پڑھنا شروع کیا تو پھر وقت کا احساس ہی نہ رہا۔ اب میری عمر چالیس سال ہے۔ مگر میرا اور شعاع کا رشتہ نہیں ٹوٹا' زندگی نے بہت دکھ بھی دیے۔

مگر شعاع نے ہمیشہ مجھے حوصلہ دیا اور میرے دکھ بانٹ لیے۔ مجھے جس کہانی نے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ "ایک تھی مثال" ہے۔ نجانے کیوں میرا بہت دل اداس ہو جاتا ہے۔ ایک کہانی بلکہ پہلی مرتبہ جب شعاع پڑھا تو وہی کہانی بھی پڑھی' اب نہ اس کا نام یاد ہے' نہ رائٹر کا آپ پلیز مجھے اس کہانی کا یا اس رائٹر کا نام بتا دیں۔ دراصل اس میں ایک لڑکی ہوتی ہے۔ اس کے ماں' باپ نہیں ہوتے' وہ اپنی بھابھیوں اور بھائی کے ساتھ رہتی ہے۔ ایک دفعہ یونیورسٹی جاتی ہے تو اس کی دوستیں اسے مذاق سے کہتی ہیں کہ یہ خط اس لڑکے نے تمہارے لیے دیا ہے۔ حالانکہ اس نے نہیں دیا ہوتا' پھر وہ لڑکی جا کے اس لڑکے کے منہ پہ تھپڑ مارتی ہے۔ اس لڑکے کے دوستوں کے سامنے پھر وہ لڑکا اس سے انتقام لیتا ہے۔ آپ پلیز یا مجھے اس رائٹر کا یا ہیرو' ہیروئن کا نام بتا دیں پلیز۔

ج :۔ مقدس! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ جس کہانی کے بارے میں آپ نے لکھا ہے' وہ ہمیں یاد نہیں' اگر کسی قاری بہن کو یاد ہو تو وہ ہمیں لکھ دیں' ہم شائع کردیں گے۔

اقرا لیاقت نے شاہ کوٹ پٹھان چک 51 سے لکھا ہے

شعاع سے میرا تعلق اتنا پرانا نہیں' یہی کوئی تین' چار سال پرانا' لیکن مستقبل میں آپ کا اور میرا ساتھ اور بھی پکا ہو جائے گا۔ وہ کیسے کیونکہ میری پیاری ساسو ماں آپ کے تمام پرچے باقاعدگی سے پڑھتی ہیں۔ اب وہ کافی عرصے سے ٹھیک نہیں رہتیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور صحت دے (آمین) نبیلہ جی! رقص بسمل کو جلدی ختم کریں۔ پڑھنے کا مزہ نہیں آتا۔ "یارم" اور "ایک تھی مثال" بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ راشدہ رفعت "یہ ہنستا ہوا موسم" واہ جی زبردست الفاظ نہیں ہے تعریف کے لیے' ہم تو ڈوب گئے ناول میں۔

ج :۔ پیاری اقرا! ہماری طرف سے مبارک باد قبول کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت باذوق ساس سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ساس کو صحت و زندگی دے۔ وہ ہماری باقاعدہ قاری ہیں۔ آئندہ آپ خط لکھیں تو ان کی رائے بھی لکھیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لئے شکریہ۔

قارئین متوجہ ہوں!

1 شعاع ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔
3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت صورت میں تحریر کی واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
7 شعاع ڈائجسٹ کے لیے افسانے' خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب' اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع۔ 37 اردو بازار کراچی۔

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال' ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً" بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کرکے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کرکے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔

عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ' نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی
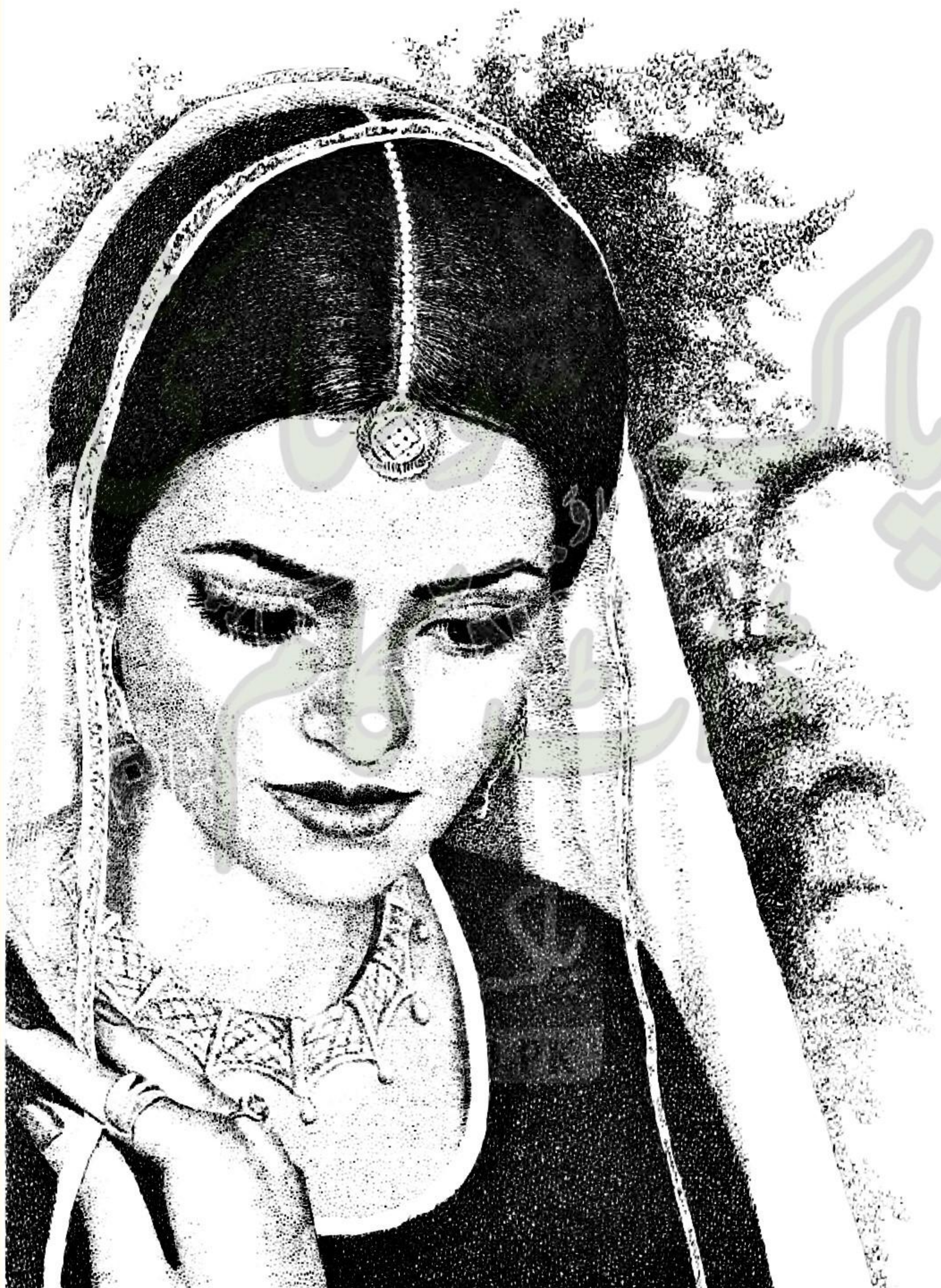
رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل، بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

حمیدہ خالہ، عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ دوران عدت انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور وہیں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر بہو اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خود کشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔

بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرچا کٹوا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہو جاتا ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل، مثال کو لے جائے، تاکہ وہ بشریٰ کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔

انسپکٹر طارق، ذکیہ بیگم سے بشریٰ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں، مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ ایک پر اسرار سی عورت عاصمہ کے گھر بطور کرائے دار رہنے لگتی ہے۔ وہ اپنی حرکتوں اور انداز سے جادو ٹونے والی عورت لگتی ہے۔ عاصمہ بہت مشکل سے اسے نکال پاتی ہے۔

بشریٰ کا سابقہ منگیتر احسن کمال ایک طویل عرصے بعد امریکا سے لوٹ آتا ہے۔ وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے، پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور دوبارہ بشریٰ سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشریٰ تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بشریٰ اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعوا کرتا ہے مگر بشریٰ قطعی نہیں مانتی، پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہو جاتے ہیں کہ مہینے کے ابتدائی پندرہ دنوں میں مثال، بشریٰ کے پاس رہے گی اور بقیہ پندرہ دن عدیل کے پاس۔ گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل عفت سے شادی کر لیتا ہے۔ والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھن چکر بن جاتی ہے۔ بشریٰ کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔ مثال کے لیے مزید زمین تنگ بشریٰ

اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد پڑ جاتی ہے۔ مثال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ملائیشیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر بھجوا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک نشئی تنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آکر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مثال اپنے ماموں کو فون کر کے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ نسبتاً "پوش ایریا" میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کوچنگ سینٹر خوب ترقی کر جاتا ہے۔ اسے مثال بہت اچھی لگتی ہے۔ مثال، واثق کی نظروں میں آچکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔

عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں اریشہ اور اریبہ کو اپنے بیٹوں وقار، وقاص کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور واثق بہت خوش ہوتے ہیں۔

مثال کو نیند میں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اسے گھسیٹ رہا ہے۔

۲۲
بائیسویں قسط

واثق کمرے میں آتے ہوئے بے اختیار ٹھٹک کر رک گیا۔

عاصمہ بہت دل سے تیار ہوئی تھی۔ ہلکے کاسنی اور نیلے امتزاج کے جارجٹ کے سوٹ میں سادگی اور وقار سے چشمہ لگائے وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

واثق ماں کو دیکھتے ہوئے جیسے بہت دور نکل گیا۔

شوہر کی زندگی میں عاصمہ بہت بن ٹھن کر تو تیار نہیں ہوتی تھی، مگر روز شام کو اس کے آنے سے پہلے اچھے کپڑے، ہلکی لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل ہی اس کے اہتمام سے تیار ہونے کا پتا دیتے تھے۔

اور عفان کی موت کے بعد اس نے اس تیاری سے بھی منہ پھیر لیا۔

پھر اکیڈمی کے بہت اچھے دنوں میں جب اسے پرنسپل کی کرسی پر بیٹھنا پڑا تو بھی اس سادگی کو قائم رکھا، حالانکہ واثق اور اریشہ وغیرہ بہت اصرار کرتے تھے، مگر وہ ہنس کر ٹال دیا کرتی تھی۔

مگر آج اس نے جانے کیسے خود پہ لگائی یہ پابندی توڑی۔ لائٹ سی لپ اسٹک میں اس کا سادہ سا چہرہ بہت پُر وقار لگ رہا تھا۔

واثق نے آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کرتے ہوئے بے ساختہ ماں کو کندھوں سے تھام کر ممنون نظروں سے دیکھا۔

"کر دیا فون تم نے مثال کے گھر؟" وہ اپنی سوچ سے نکلی تو اس کے احساسات سے بے خبر پوچھنے لگی۔

"ہوں کر تو دیا ہے مما، مگر میرا نہیں خیال مثال جیسی ڈرپوک لڑکی اپنے پیرنٹس سے آسانی سے بات کر سکے گی۔" وہ گہرا سانس لے کر مسکرا کر بولا۔

"تو پھر... ہم یونہی چلے جائیں۔" عاصمہ کچھ پریشان سی ہو کر بولی۔ وہ کچھ دیر یونہی سوچتا رہا۔

"تو نہ جائیں؟" وہ سوالیہ لہجے میں پوچھنے لگا۔

"نہیں جانا تو ہے اب جب ارادہ کر لیا ہے تو... آئی تھنک یونہی چلتے ہیں، وہاں جا کر دیکھیں گے جیسا ماحول ہو گا۔ اس کے مطابق کوئی بات بنا لیں گے۔ یا ایک اور بات کہ ہم نے کسی رشتہ دکھانے والی سے ذکر کیا تھا تو انہوں

نے آپ کی بیٹی کا بتایا تو۔"

"نہیں بھئی یہ بھی ٹھیک نہیں' رشتہ کرانے والی تو پھر ساتھ ہوتی۔ ہے خوامخواہ معاملہ بگڑ نہ جائے۔" وہ خود ہی فوراً" اس بات کو رد کرتے ہوئے بولی۔ تو واثق ہنس پڑا۔

"کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہیں۔ کوئی بھی جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں اگر انہوں نے پوچھا تو ہم آنے کا مقصد بتا دیں گے سمپل۔" وہاں کی مشکل آسان کرتے ہوئے بولا۔

عاصمہ کچھ دیر سوچتی رہی 'پھر سر ہلا کر مسکراتے ہوئے اپنا بیگ کندھے پر ڈالنے لگی۔

اسی وقت ورد اندر آتے ہوئے ٹھٹک کر رک گئی۔

"یہ آپ دونوں کہاں جا رہے ہیں؟" وہ ابھی سو کر اٹھی تھی ان دونوں کو یوں تیار ہو کے جاتے دیکھ کر حیران سی ہو کر بولی۔

"ابھی آتے ہیں کچھ دیر میں 'میں نے تمہارے لیے اسنیکس رکھ دیے میں کچن میں۔ ابھی گرم ہی ہیں۔ اپنے لیے چائے بنا لینا۔" عاصمہ عجلت میں کہہ کر جانے لگی۔

"مما! جا کہاں رہی ہیں۔ مجھے بتا تو دیں۔" وہ ان کے پیچھے آتے ہوئے کچھ متجسس لہجے میں بولی اور "اگر مجھے بھی ساتھ جانا ہو آپ کے تو پھر؟" وہ الٹا اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"ہم..... میں واثق کے دوست کے گھر جا رہی ہوں۔ اس کی مدر کی عیادت کے لیے..... تو اب تم چلو گی ہمارے ساتھ۔" عاصمہ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔

وہ فوراً" نفی میں سر ہلا کر دونوں کو بیزار سی شکل بنا کر دیکھنے لگی۔

"واپس کب تک آئیں گے؟" وہ جاتے ہوئے کسی خیال کے آنے پہ پلٹ کر بولی۔

"تو تم ساتھ چلو ناں ہمارے اتنی بے چینی ہے تو؟" واثق اسے چھیڑ کر بولا۔

"جی نہیں شکریہ..... مما مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا ہے آپ واپس آئیں گی تو کروں گی۔" وہ عاصمہ کو دیکھ کر بولی۔

"ارے ایسی کون سی ضروری بات ہے ورد! ابھی بتاؤ مجھے۔" عاصمہ کچھ فکر مند سی ہو کر بولی۔

"اب جانے بھی دیں آپ بھی کس کی باتوں میں آ رہی ہیں ان کی ضروری باتیں تو میں خوب جانتا ہوں 'کالج میں کوئی ویلکم پارٹی ہو گی۔ اس کے لیے بہت قیمتی اچھے سے ڈریس کی فرمائش ہو گی یا کسی دوست کے گھر کوئی برتھ ڈے پارٹی ہو گی 'اس کی پرمیشن کے ساتھ گفٹ اور ڈریس کی فرمائش ہو گی..... ہے نا۔ یہی کچھ کہو گی ناں سسٹر؟" واثق پورے یقین کے ساتھ اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

"آپ تو چپ ہی کریں بھائی! اور آپ بے فکر ہو جائیں ——— آپ کی گیس کی ہوئی کوئی بھی بات نہیں بلکہ میں آپ کی بولتی بند کروانے کا کچھ پروگرام بنا رہی ہوں۔" وہ جیسے مزا لے کر بولی۔

واثق نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔

"بولتی بند..... مطلب؟" وہ فوراً" متجسس لہجے میں پوچھنے لگا۔

"ابھی کچھ نہیں بتا سکتی 'واپس آئیں گے تو ہی پتا چلے گا۔ اب آپ لوگ جائیں ابھی یوں بھی میرا موڈ نہیں۔ وہ بہت ضروری بات کرنے کا۔" وہ ان دونوں کی بے چینی کو جیسے انجوائے کرتے ہوئے بولی۔

"چلیں مما! ان کو صرف شوق ہو رہا ہے اس وقت اپنی اہمیت جتانے کا ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" واثق کہہ کر باہر نکل گیا تو عاصمہ بھی سر ہلا کر اس کے پیچھے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

مثال سر جھکائے فائزہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔
فائزہ لباس اور چہرے سے ایک سلجھی ہوئی باوقار عورت نظر آتی تھی۔ مسکراہٹ اس کے چہرے کے خوب صورت خدوخال کا ایک مستقل حصہ تھی۔
وہ مثال کا ٹھنڈا یخ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے نرمی سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔
"ماشاءاللہ بھئی عدیل! اپنی مثال تو بہت پیاری ہو گئی ہے اور بڑی بھی ورنہ میرے ذہن میں ابھی بھی وہ تین چار سال کی پنکی سی بچی تھی جو مستقل اپنے پاپا کے ساتھ چپکی رہتی تھی۔" وقار مثال کو دیکھ کر محبت بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔
اگرچہ پری پنک اسٹائلش فراک میں اس محفل کی جان لگ رہی تھی مگر پھر بھی دونوں میاں بیوی مثال پر فریفتہ ہوئے جا رہے تھے۔ اسی کو دیکھے اور سراہے جا رہے تھے۔
"ایسا کیا ہے اس عام سی شکل کی لڑکی میں جس پہ یہ دونوں میاں بیوی لٹو ہی ہوئے جا رہے ہیں۔ میری پری کے آگے تو یہ کچھ بھی نہیں پھر یہ ہو گا کہ ان کا اپنا بیٹا بھی واجبی شکل و صورت کا مالک ہو گا تبھی انہیں مثال بہت حسین و جمیل دکھائی دے رہی ہے۔" عفت اس سارے کے دوران ان کے مستقل تبصروں پر دل میں کھولتے ہوئے خود سے اندازے لگائے جا رہی تھی۔

"ویسے عدیل بھائی! میں حیران ہوں مثال اور پری میں اتنا ڈیفرنس بھی نہیں لگ رہا ورنہ تو آئی تھنک ان کی عمروں میں سات آٹھ سال کا فرق تو ہے۔" فائزہ نے بالآخر وہ بات کہہ ہی ڈالی جو اسے کافی دیر سے کھٹک رہی تھی۔
عفت نے فخریہ نظروں سے پری کی طرف دیکھا۔
"جی بھابھی! ماشاءاللہ سے پری نے بہت جلد قد کاٹھ نکالا ہے۔ دونوں ہی برابر کی لگنے لگی ہیں دیکھ رہی ہیں آپ۔" عدیل نے محبت سے دونوں بیٹیوں کو دیکھ کر کہا دونوں مسکرانے لگے۔
"اللہ ان کی لمبی عمر کرے اور نیک نصیب کرے ہمیشہ اپنی زندگی میں خوش و خرم رہیں۔ بچیاں تو گھر کی رونق ہوتی ہیں۔" فائزہ نے محبت سے دونوں کو دیکھ کر کہا۔
"بالکل بھابھی ٹھیک کہا آپ نے یہ دونوں واقعی مجھے بہت عزیز ہیں۔"
"کہنے کی ضرورت نہیں عدیل صاحب! یہ بات تو ساری دنیا جانتی ہے۔ جس طرح تم آفس میں دوستوں میں ہر جگہ مثال مثال کرتے تھے۔" وقار ہنس کر بولا تو عدیل بھی مثال کو دیکھ کر محبت سے مسکرانے لگا۔
عفت کے دل میں برسوں کی چبھی سوئی اور بھی اندر کھب گئی وہ پری کو مثال کی جگہ کبھی بھی نہیں دے سکے گی۔ کم از کم عدیل کی نظروں میں نہیں۔
"چلیں آپ کے گھر کی ایک رونق تو ہم چرانے آ گئے ہیں آپ کے پاس اتنی پیاری پری ہے نا تو مثال ہمیں دے دیں۔" فائزہ مثال کو ساتھ لپٹا کر اپنائیت سے بولی۔
اور عفت کو جو مبہم سی امید تھی کہ شاید پری کی خوب صورتی اور معصومیت سے کہیں نہ کہیں وہ دونوں میاں بیوی متاثر ہو چکے ہیں وہ بھی دم توڑ گئی۔
مگر عفت ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھی اور اولاد کی زندگی کو بہترین بنانے کے لیے کوئی بھی ماں ہمت تو کبھی نہیں ہارتی اور جب مقابلہ سوتن کی بیٹی سے ہو پھر تو بالکل بھی نہیں! وہ دونوں جس شان دار گاڑی میں آئے تھے ان کا لباس ان کے پہناوے اور باڈی لینگویج انہیں جس اعلا کلاس کا بتا رہی تھی عفت اس سے بہت

متاثر ہو چکی تھی۔
"ہمارے گھر کی اصل رونق تو مثال ہے' پری تو بہت بے ضرر سی ہے پھر عدیل کی تو جان ہے مثال میں۔وہ اسے خود سے دور اور وہ بھی اتنی دور..... امریکہ میں ہوتا ہے آپ کا بیٹا وقار بھائی" عفت خوش اخلاقی سے دونوں کو کچھ جتاتے ہوئے بولی۔
عدیل نے عفت کی بات کو سمجھتے ہوئے کچھ ناپسندیدہ نظروں سے اسے دیکھا مگر کہا کچھ نہیں۔
"جی بھابھی! فہد امریکہ میں ہے اور ماشاءاللہ وہیں سیٹل بھی ہے بہت شاندار جاب ہے اس کی اور عدیل بھائی کو معلوم ہے فہد فی الحال آٹھ نو سال تو وہیں رہے گا۔اسے اپنا کیریئر بنانا ہے۔" فائزہ نے فوراً" صاف لفظوں میں کہہ ڈالا۔
"عدیل رہ لیں گے آپ مثال کے بغیر' اسے اتنی دور بھیج کر۔" عفت بظاہر ہنستے ہوئے جیسے زخمی لہجے میں بولی۔
"رہنا پڑتا ہے عفت بھابھی! جب معاملہ بچوں کی خوشگوار زندگی اور اچھے مستقبل کا ہو۔" وقار نے نرمی سے کہا۔
"اور ہم دونوں میاں بیوی تو سال کے سات آٹھ ماہ تو ادھر ہی ہوتے ہیں مثال اور فہد ہمارے پاس سال میں ایک بار تو چکر لگا ہی لیا کریں گے۔اس کی آپ بالکل فکر نہیں کریں۔" فائزہ نے کچھ دیر بعد کہا۔
"اصل میں مثال بہت لاڈلی ہے نا عدیل کی۔میں تو اس خیال سے کہہ رہی تھی لیکن بیٹیوں کا معاملہ ہی اللہ نے کچھ ایسا رکھا ہے کہ ماں باپ کو رہنا پڑتا ہے ان سے دور ہو کر بھی۔باقی اللہ ان کے نصیب اچھے کرے۔ماں باپ تو صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔" عفت کچھ بے ربطگی سے کہتی چلی گئی۔
اصل میں اس کی خود بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سارے معاملے کے بیچ میں کیا کرے۔خوشی کا اظہار کرے یا غصے کا!
"عفت چائے میں اور کتنی دیر ہے۔" عدیل کو بے تاثر لہجے میں کہنا پڑا۔
عفت نے کچھ گڑبڑا کر عدیل کی طرف دیکھا اس کی نظروں میں کچھ خفگی سی تھی۔
"آجاؤ مثال! میرے ساتھ چائے تو تیار ہے بس۔" عفت کوفت بھرے انداز میں کہہ کر کھڑی ہو گئی۔
"پری بیٹا! آپ جاؤ ماما کی ہیلپ کراؤ' مثال آپی ادھر ہی ہیں انکل آنٹی کے پاس۔" عدیل نے غیر متوقع بات کہی۔
لمحہ بھر کو پری نا سمجھی سے باپ کو دیکھتی رہی پھر بے دلی سے ماں کا اشارہ پا کر اٹھ کر باہر نکل گئی۔
کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی سی چھا گئی۔
"فہد کا پاکستان آنے کا پروگرام کب تک ہے۔" عدیل کو اس خاموشی کو توڑنا پڑا۔مثال اب فائزہ سے تھوڑا الگ ہو کر اپنا اعتماد کمپوز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے چہرہ ذرا سا اٹھا کر بیٹھی تھی۔
"انشاءاللہ تین چار ماہ میں آجائے گا فہد!" فائزہ نے شوہر کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔
"ہمارا یہی پروگرام ہے کہ ہم اس ہفتے..... وقار کی بڑی بہن نے آنا ہے پنڈی سے کل یا پرسوں تو ہم چھوٹی سی رسم کریں گے منگنی کے نام پر اور پھر فہد کے آنے سے کچھ دن پہلے شادی کی ڈیٹ فکس کر لیں گے آپ کیا کہیں گے عدیل بھائی؟"
"میرے خیال میں تو عدیل کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔" وقار نے مسکرا کر اعتماد بھرے لہجے میں عدیل کو دیکھ کر کہا۔

"ہوں... بلکہ میں سوچ رہا ہوں۔" عدیل مسکراتے ہوئے کچھ بولنے لگا تو مثال نے اسے متوجہ کیا تھا۔
"پاپا! مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت ہے آئی مین۔ اگر میں کچھ کہنا چاہوں تو۔" وہ کچھ اٹک کر بالآخر روانی سے کہہ گئی۔ عدیل نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا۔ جبکہ وقار اور فائزہ کھل کر مسکرائے تھے۔
"آف کورس بیٹا! آپ کو جو بھی کہنا ہے آپ بلا جھجک بلا خوف کہہ سکتی ہیں ہم غیر نہیں ہیں عدیل کے ساتھ میرے تعلقات ہمیشہ اس نوعیت کے رہے ہیں کہ ہم کبھی بھی ایک دوسرے کے لیے غیر نہیں رہے۔" وقار نے شاید اس کی حوصلہ افزائی کے خیال سے پوری طرح وضاحت کرتے ہوئے اسے بولنے کی اجازت دی۔
"پاپا!" اسے شاید عدیل کے این او سی کی زیادہ چاہت تھی۔
"کیا کہنا ہے مثال تمہیں؟" عدیل نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ لمحہ بھر کو مثال کا اعتماد متزلزل سا ہوا۔
مگر پھر اسے خیال آیا کہ اب اگر وہ نہیں بولے گی تو پھر کبھی بھی بول نہیں سکے گی۔
"پاپا... میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ رک کر ذرا نظریں جھکا کر بولی۔
عدیل کے چہرے پر ہلکا سا غصہ اور ناراضی جھلکنے لگی۔
فائزہ اور وقار نے بھی ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں بہرحال مثال سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔
"بلکہ انگیجمنٹ بھی نہیں۔ مجھے ابھی پڑھنا ہے۔ میری اسٹڈیز چل رہی ہیں ابھی... اس کے بعد مجھے جاب کرنا ہے اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے۔ اس لیے مجھے... ابھی شادی بالکل نہیں کرنی۔" وہ رک رک کر تیتوں کی طرف دیکھے بغیر سامنے ٹیبل پر موجود کرسٹل گلدان میں سجے گلاب کے گلابی پھولوں کی پنکھڑیوں پر بغیر پلکیں جھپکائے نظریں جمائے کہتی چلی گئی۔

عدیل کے چہرے کا اشتعال بڑھ سا گیا تھا مگر اس نے فوری طور پر خود کو کچھ بھی کہنے سے روک لیا تھا۔
فائزہ اور وقار نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
"مثال غلط نہیں ہے عدیل! میرے خیال میں یوں بھی پڑھنا، اپنی تعلیم مکمل کرنا آج کل لڑکوں کا ہی نہیں لڑکیوں کا بھی کریز ہے اور ہمیں اس بات کا پورا خیال رکھنا ہو گا کہ مثال کو اس معاملے میں کوئی مشکل نہیں ہو۔ شادی کے بعد بھی یہ آرام سے اپنی اسٹڈیز مکمل کر سکتی ہے۔ فہد اس معاملے میں اس سے کوآپریٹ کرے گا بلکہ وہ تو خوش ہو گا اس معاملے میں مثال کی مدد کر کے۔"
وقار نے جیسے مثال کے لیے فرار کا آخری کھلتا دروازہ بھی خوش اسلوبی سے بند کرنے کی کوشش کی۔
"بالکل فہد تو خود بہت کریزی ہے ہائر ایجوکیشن کے معاملے میں اور مثال بیٹا آپ بالکل بھی ٹینس نہیں ہوں اگر آپ کو کوئی پریشانی ہے تو میں خود نکاح نامے میں یہ کنڈیشن رکھ دوں گی کہ شادی کے بعد بھی مثال جب تک جتنے عرصے تک تعلیم آگے جاری رکھنا چاہے رکھے گی۔ کوئی بھی اسے نہیں روکے گا۔ او کے۔" فائزہ نے ہلکے پھلکے انداز میں جیسے اس کی پریشانی رفع کرنے کی کوشش کی جو کہ اور بڑھ چکی تھی۔
مثال نے پریشانی سے باپ کی طرف دیکھا جو پہلے خفگی بھری نظروں سے مثال کو دیکھ رہا تھا اب قدرے اطمینان سے اسے دیکھتے ہوئے خوش تھا کہ مثال کی شادی کا اس وقت کا اس کا فیصلہ بالکل درست ہے اور یہی مثال کے لیے بہترین ہے۔ باہر ڈور بیل بج رہی تھی۔
"میں دیکھوں ذرا جا کر اس وقت کون آ گیا۔" عدیل کو اٹھ کر جانا پڑا اور مثال بے بس ہو کر بیٹھی رہ گئی۔

✲ ✲ ✲

عاصمہ سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر کچھ دیر کے لیے گنگ سی رہ گئی۔ بہت برس پہلے کی ایک رات جیسے بالکل اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی' وہ بے یار و مددگار' بے آسرا' بے سہارا' ننگے پاؤں' ننگے سر چھوٹی سی بچی کو جو ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔ اسے گود میں بھرے اس ویران بیابان علاقے میں گہری ہوتی رات کے اس پہر اپنے وجود کے پامال ہو جانے کی تکلیف میں مبتلا کیسی دیوانی سی ویران گلیوں سڑکوں میں بھاگ رہی تھی جب اس کے سامنے گاڑی لے کر یہ فرشتہ آیا تھا۔

اور اس نے تو اس رات کے بعد سوچ لیا تھا کہ وہ واقعی میں کوئی فرشتہ تھا' جو اللہ نے اس کی اور اس کے بچوں کی مدد کے لیے زمین پر اس ویرانے میں اتارا تھا۔

مگر کمال حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اس فرشتے کی شکل کو ابھی تک... اتنے سال' صدیوں جیسے زمانے گزر جانے کے بعد میں اس طرح سے یاد رکھے ہوئے تھی جیسے وہ کل... چوبیس گھنٹے پہلے ہی تو اسے ملا تھا فقط اس کی کنپٹیوں پر سفیدی اتری تھی یا آنکھوں میں گزرتے ماہ و سال کی تھکن!

وہ اسے یک ٹک دیکھتی چلی جا رہی تھی۔

"محترمہ! کس سے ملنا ہے آپ کو... آپ نے ڈور بیل بجائی تھی۔" بہت دور سے عاصمہ کو آواز سنائی دی۔

واثق اچانک آجانے والی کال سنتے ہوئے ابھی تک ماں کو دروازے میں دیکھ کر جلدی سے فون بند کر رہا تھا۔

"یہ ریاض صاحب کا گھر نہیں ہے؟" عاصمہ بہت مشکل سے خود کو سنبھال کر تھکے ہوئے نڈھال سے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"جی نہیں آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے یہاں کوئی ریاض صاحب نہیں رہتے۔ اس سڑک کے آخر میں ایک نیم پلیٹ ہے آئی تھنک اس نام کی' آپ وہاں جا کر چیک کر لیں۔" عدیل کہہ کر مڑ کر دروازہ بند کرتے ہوئے واپس اندر چلا گیا۔

واثق گاڑی سے اتر کر حیران ساماں کے پاس آیا۔

وہ وہیں کسی پتھر کے بت کی طرح بے حس کھڑی تھی۔

"کیا ہوا مما! یہاں کیوں کھڑی ہیں آپ؟" وہ ماں کے کندھے تھام کر تشویش بھرے لہجے میں پوچھنے لگا۔ عاصمہ کے چہرے کا رنگ زرد سا ہو رہا تھا۔

"واثق..." وہ بہت مشکل سے بول سکی تھی۔

"مما... کیا ہوا ہے آپ ٹھیک ہیں نا؟" وہ فکر مند سا ہو کر بولا۔

"مم... مجھے گھر لے چلو... ابھی۔" اس کی آواز کسی گہرے کنویں سے آرہی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"مجھے گاڑی میں بٹھاؤ۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

واثق اسے سہارا دیتا ہوا لے کر آیا اور گاڑی کی سیٹ پر بمشکل بٹھا سکا۔

عاصمہ کا وجود بالکل بے جان ہو رہا تھا جیسے ابھی جھول کر اس کے بازوؤں میں آگرے گا۔

"مما... آپ ٹھیک ہیں نا؟" وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آکر تشویش سے پوچھنے لگا۔

عاصمہ کے چہرے کی رنگت لحہ بہ لحہ زرد ہوتی جا رہی تھی۔

وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ واثق سخت پریشانی میں گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوا کسی کلینک کی طرف گاڑی لے جا رہا تھا۔

عاصمہ نے اپنے منہ کو سختی سے بھینچ رکھا تھا اس کے چہرے پر اکڑاؤ سا تھا جیسے وہ بہت تکلیف برداشت کر رہی ہو۔

"مما... پلیز آپ ٹھیک ہیں نا۔ خود کو سنبھالیں۔" وہ رودینے کو ہو رہا تھا۔

وہ بہت بہادر تھا مگر اس لمحے اسے لگ رہا تھا اگر عاصمہ کو کچھ ہو گیا تو وہ یہیں خود بھی اپنی ساری ہمتوں کو کھودے گا وہ خود بھی ٹوٹ کر رہ جائے گا۔

"مما! آپ کو کچھ نہیں ہو گا... کچھ نہیں۔" وہ ریش ڈرائیونگ کرتے منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مبارک ہو مثال آپی! وہ انکل آنٹی لگ تو بہت زبردست رہے تھے بظاہر ان کا بیٹا بھی شاندار ہو گا۔"

وہ مہمانوں کے جانے کے بعد سے جو کمرے میں گھسی تھی تو عفت کے برتن پٹخنے بولنے جھکنے پہ بھی باہر نہیں نکلی تھی۔

اسے یوں لگا جیسے جھٹ پٹ اس کی قسمت کا فیصلہ کر لیا گیا ہو فائزہ اور وقار اسے برے نہیں لگے تھے مگر ایسے اچھے بھی نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے ان سے ناتا جوڑنے پر بہت خوش ہوتی۔ اس کے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔

وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی اور اس نے بیچ میں بول کر اس معاملے کو یہیں شروع ہونے سے پہلے ختم کرنے کی جو کوشش کی تھی اور جس پر عدیل نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا اسے لگ رہا تھا اب وہ پاپا کے سامنے کوئی بھی دلیل نہیں دے سکے گی اور وہ کچھ دیر میں اسے اپنے پاس بلائیں گے اور اس کی ہر دلیل خود ہی دم توڑ جائے گی۔

اور تین چار ماہ بعد اس کی شادی ہو جائے گی... اس فہد کے ساتھ جسے وہ جانتی بھی نہیں۔

اور وہ یہاں سے اتنی دور چلی جائے گی جہاں سے واپسی کے کسی راستے کا بھی اسے پتا نہیں۔

اس نے پری کے قدموں کی آہٹ سن کر غیر محسوس طریقے سے دونوں ہتھیلیوں سے آنکھوں کو رگڑا تھا۔

اس کے جملے پر بھی وہ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

"تم خوش نہیں ہو مثال آپی!" کبھی کبھی جب پری کو مثال پر کسی وجہ سے تھوڑا بہت پیار آتا تو وہ اسے آپی کہہ کر جتاتی ضرور تھی مگر اس وقت پیار جتانے کی بظاہر کوئی وجہ تھی تو نہیں۔

وہ پھر خاموش بیٹھی اپنے دونوں ہاتھوں کو جکڑے کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھتی رہی۔

"کیا کسی اور کو پسند کرتی ہو تم؟" وہ جھک کر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے بڑے اپنائیت بھرے لہجے میں اس سے اتنی گہری بات پوچھ رہی تھی۔

مثال گہرا سانس لے کر اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"بتاؤ ناں آپی! کون ہے وہ؟" وہ پیار بھرے اصرار سے پوچھ رہی تھی۔ اور مثال کی نظروں کے سامنے چھم سے واثق کا مسکراتا چہرہ آ گیا جو اسے اب اتنا اپنا اتنا قریبی لگنے لگا تھا جیسے وہ خود اپنے بارے میں سوچ رہی ہو جب اس کے بارے میں سوچتی تھی تو اس نے یونہی نفی میں سرہلا دیا۔

"وہ آیا کیوں نہیں۔ اس نے تو کہا تھا وہ آئے گا۔" اس کے دل نے چپکے سے فریاد بھری سرگوشی کی۔

"وہ وعدہ خلاف لگتا تو نہیں۔" اس کا دل واثق کی حمایت میں ہی بولتا تھا سو اب بھی معصومیت سے سوال کر رہا تھا۔

"مجھے نہیں بتاؤ گی آپی! وہ کون ہے۔ پلیز بتاؤ ناں اگر ایسا کچھ ہے تو بلیومی میں مما سے بلکہ پاپا سے تمہاری سفارش کروں گی بلکہ تمہیں فیور کروں گی۔ اگر ہم دونوں کے ووٹ ہوں گے تو پھر پاپا ضرور اس معاملے کو Consider کریں گے۔ ہے نا؟" پری بہت معصومیت بھرے لہجے میں اسے کچھ بولنے پر اکسا رہی تھی۔

جیسے وہ کچھ نہ کچھ ضرور بول ہی دے گی یا ان دونوں میں اتنا بہناپا اتنی محبت بھری دوستی ہے کہ مثال ضرور اپنا یہ راز اس کے ساتھ شیئر کرے گی۔

مثال کو پری کے اس اپنائیت بھرے رویے سے عجیب سی الجھن ہونے لگی۔ وہ جان چھڑانے کو ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"اور تمہارا سیل فون کہاں ہے۔ مجھے ایک فون کرنا تھا میرے پاس بیلنس نہیں ہے۔" وہ اس کے یوں راہ فرار ڈھونڈنے پر اچانک سے بولی اور ساتھ ہی مثال کا ہینڈ بیگ اٹھا کر اس میں سے خود سیل فون تلاش کرنے لگی۔

مثال اسے یونہی بیٹھی دیکھتی رہی۔

"کہاں ہے تمہارا فون بھئی؟" سارا بیگ الٹا کر بھی نہ ملنے پر وہ کچھ جھنجلاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"گم ہو گیا ہے۔" مثال اطمینان سے بولی۔

"واٹ.... گم ہو گیا اور تم کس تسلی سے بیٹھی ہو۔ کہاں گم ہوا' کسی کو بتایا بھی نہیں تم نے؟"

"اف!" مثال کو اس کے اس سارے مصنوعی اپنائیت بھرے لہجے سے عجیب سی وحشت ہونے لگی۔

"کالج میں گم ہو گیا تھا کل ہی اور آج تو میں کالج گئی نہیں' اگر جاتی شاید کسی کے پاس مل ہی جاتا یا میں لائبریری گئی تھی۔ وہاں بھول آئی ہوں۔ اب کل جاؤں گی تو پتا چلے گا۔ کیوں نہیں لے کر آیا۔"

بالکل روانی میں بولتے ہوئے وہ بے اختیار رک گئی تھی' وہ تو جیسے واثق سے خیالوں میں گلہ کر رہی تھی کہ وہ سیل کیوں نہیں لے کر آیا۔ یہ فراموش کیے ہوئے کہ اس کے سامنے کون بیٹھا ہے۔

پری اب اکتائے ہوئے انداز میں اس کے بیگ سے نکلنے والی چیزوں کو یوں ہی الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کچھ غیر متوجہ سی تھی۔

"اچھا بتاؤ نا تمہیں یہ لوگ پاپا کے فرینڈ کیسے لگے؟" وہ جانے اس سے کیا اگلوانے کے لیے آئی تھی۔ پھر اس ٹاپک پر آ گئی۔

"عفت ماما نے بھیجا ہو گا اسے۔" مثال اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"ٹھیک تھے اچھے...." وہ مبہم انداز میں جواب دے کر اٹھ کر خود اپنے بیگ میں سب چیزیں واپس رکھنے لگی۔

"تو تم رضامند ہو۔ آئی مین وہ لوگ تو شاید دو تین دن میں انگیجمنٹ بھی کر دیں گے۔ پاپا' ماما سے کہہ رہے تھے۔" پری اس کے چہرے پر نظریں جما کر پوچھ رہی تھی۔

مثال کو لگا جیسے پل بھر کو اس کا سانس رکنے لگا۔

"اگر ایسا ہو گیا تو.... واثق.... میں کیا کروں' میں اس سے محبت تو نہیں کرتی' مگر اس کا خیال جو مجھے بار بار آتا ہے' یہ کیا ہے' اگر منگنی یا رشتہ کچھ بھی ہو گیا اور وہ بعد میں اپنی ماں کو لے کر آ گیا۔ واثق نہیں کوئی اور میرا دل یہ سوچتے ہی بند سا کیوں ہونے لگتا ہے۔"

وہ بے قرار سی ہو کر ایک دم سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم نے جواب نہیں دیا مثال آپی! یا یہ بھی پہلے اپنی ماما سے پوچھو گی کہ تمہیں ہاں کرنا چاہیے یا نہیں؟" پری نے خود ہی اسے ایک اور راہ سجھائی۔

"ماما سے۔ ہاں مجھے ماما سے بھی بات کرنا چاہیے ' لیکن میرا سیل ہو تو میں بات کروں۔ کیا مصیبت ہے۔" وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں پری کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر باہر نکل گئی۔

✲ ✲ ✲

"آپ اگر انہیں فوری طور پر اسپتال نہیں لے کر آتے تو انہیں جتنا شدید اٹیک ہوا تھا تو شاید ان کا بچنا مشکل ہوتا۔۔۔"

عاصمہ کی حالت اب بہتر تھی۔ وہ انڈر آبزرویشن تھی' ڈاکٹر اس کی رپورٹس اور ای سی جی وغیرہ واثق کو دکھاتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں بتا رہا تھا۔

"مگر ڈاکٹر صاحب! یہ کچھ دیر پہلے بالکل ٹھیک تھیں۔۔۔ بہت خوش' میرے ساتھ کہیں جانے کے لیے نکلی ہیں اور ایک دم سے ان کی ایسی حالت ہوگئی۔" وہ واقعی عاصمہ کی حالت کی وجہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ اس گتھی کو سلجھانے کو ڈاکٹر سے پوچھ بیٹھا۔ ڈاکٹر عاصمہ کی رپورٹس دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

"اس انجائنا کے اٹیک کی بظاہر وجہ اسٹریس ہے۔ کوئی بہت تکلیف دہ بات تھی' جس نے ان کے دل کو اچانک شدید قسم کی توڑ پھوڑ میں مبتلا کیا اور ان کی ایسی حالت ہوئی۔" ڈاکٹر نے رک رک کر کہا تو واثق بے یقین سا اسے دیکھنے لگا۔

اسٹریس کیسا؟ وہ تو اپنی خوشی سے میرے ساتھ آئی تھیں اور مثال کو دیکھنے۔۔۔ مثال کے پاپا تھے وہ شاید جس سے مما بات کر رہی تھیں تو کیا انہوں نے بہت کچھ بول دیا تھا' جس کی وجہ سے امی کی یہ حالت ہوئی؟ اسے اچانک خیال آیا۔ وہ بے چین سا اٹھ کر باہر نکل آیا۔

مثال کے پاپا نے چند سیکنڈز میں کیا کہا ہوگا امی سے۔۔۔ یہ بہت عجیب سی بات ہے۔ وہ مضطرب سا عاصمہ کے کمرے کے باہر ٹہلنے لگا۔ اس کے سیل پر وردہ کی کال آرہی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی سیل کو دیکھتا رہا اور کال تو اسے لینی ہی تھی۔

"ہاں وردہ! ہم کچھ دیر میں آرہے ہیں گھر۔ سڑکوں پر رش بہت ہے۔ آتے ہوئے بہت ٹائم لگ گیا تو واپسی میں بھی شاید کچھ دیر ہو جائے گی۔ تم ساتھ والی نسرین آنٹی کو بلوا لو۔۔۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کر وردہ سے بات کی' کہیں اس کے لہجے کی پریشانی چغلی نہ کھا جائے۔

"بھائی! کتنی دیر۔۔۔ پتا نہیں۔ کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے پریشانی سی ہو رہی ہے' پلیز آپ بس فوراً" گھر آجائیں' مجھے بہت عجیب سا فیل ہو رہا ہے۔" واثق اس کی بات سن کر دنگ سا رہ گیا۔

اپنوں کے ساتھ جڑے دل کے تار کیسے دوسرے پر ٹوٹنے والی تکلیف اور مصیبت کا پتا دے دیتے ہیں۔ اسے فوراً" ہی احساس ہوا۔

"وردہ! ایسا کچھ نہیں ہے' تمہارا وہم ہے کچھ کھا پی لو یا ٹی وی پر کوئی اچھا سا پروگرام دیکھ لو۔ ہم کچھ دیر میں آجائیں گے نا گھر۔ تم پریشان نہیں ہو بالکل بھی۔۔۔"

"بھائی! ریئلی مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا' نہ مجھ سے کچھ کھایا جا رہا ہے۔ اور ٹی وی وغیرہ میں نہیں دیکھتی۔ بس آپ آجائیں' میری امی سے بات کرائیں۔ آپ!" واثق کو یہی ڈر تھا' وہ اب اسی بات کی فرمائش کرے گی۔

"بٹ امی! آنٹی کی عیادت کر رہی ہیں' ان سے بات کر رہی ہیں میں اب جا کر امی کو فون دوں کہ وردہ رو رہی ہے' امی آپ پلیز اس سے بات کر کے اسے تسلی دیں تو اچھا نہیں لگے گا نا۔ ہم آتے ہیں تھوڑی دیر میں۔۔۔ تم پلیز

نسرین آنٹی کو بلالو۔"

"او کے۔ دیکھتی ہوں لیکن آپ بس جلدی سے آجائیں۔ میں پھر کہہ رہی ہوں آپ سے۔" فون بند کرنے سے پہلے اس نے پھر تاکیدی انداز میں کہا تو واثق نے خاموشی سے فون بند کر دیا۔

"معلوم نہیں ابھی ڈاکٹر امی کو اور کتنا وقت یہاں رکھتے ہیں اگر انہوں نے رات یہاں رکنے کا کہا تو پھر۔۔۔" وہ پریشان سا آہستگی سے عاصمہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

وہ انجکشن اور ڈرپ کے زیر اثر گہری نیند میں تھی۔ چہرے پر برسوں کی تھکن تھی اور آنکھوں کے پپوٹے یوں جڑے تھے جیسے صدیوں بعد انہیں ایسی میٹھی پرسکون نیند نصیب ہوئی ہے وہ ماں کو دیکھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

"پاپا! وجہ میں بتا چکی ہوں۔" اس کی عدیل کے سامنے پیشی ہو چکی تھی وہ اسٹڈی میں عدیل کو کافی دینے آئی تھی اور عدیل نے ناراضی بھرے لہجے میں جتاتے ہوئے اس سے پوچھ لیا تھا۔

"اور میں شادی۔۔۔ کے بعد اسٹڈیز نہیں کرنا چاہتی پلیز۔" وہ کچھ اور بولنا چاہتی تھی یہی بول سکی۔

"مطلب۔۔۔ اس بات کا؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولا۔

"مجھے ابھی پڑھنا ہے۔ پلیز میں خود کو ان ایبل سمجھتی ہوں کسی بھی ایسی ذمہ داری کو نبھانے کے لیے۔۔۔ پاپا میں شاید آپ کو سمجھا نہیں پا رہی۔ بٹ ابھی مجھے نہیں کرنا شادی۔"

وہ رک رک کر الجھے ہوئے انداز میں کچھ بے بسی سے باپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

عدیل کے چہرے پر سرد مہری جو ایسے موقع پر اس کے چہرے پر بہت شدت سے محسوس ہوتی تھی نظر آنے لگی تھی۔

"اور میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ مجھے دو تین ماہ کے اندر تمہاری شادی کرنی ہے۔ فدے سے اچھا اور موزوں رشتہ ملنا مشکل ہے میں فیصلہ کر چکا ہوں۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولا۔

"اور تمہیں میری بات نہیں ماننی اپنی من مانی کرنی ہے تو بہتر ہے تم اپنی ماں سے بات کرو اور وہ تمہیں اپنے پاس بلا لے۔ میں اس سے زیادہ تمہاری ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔" اور مثال کو لگا۔ اس نے عدیل سے زیادہ اجنبی، بیگانہ شخص اس دنیا میں کوئی اور نہیں دیکھا جس قدر اجنبیت اور بے گانگی اس لمحے اس کے چہرے پر تھی وہ شاک کی کیفیت میں باپ کو دیکھتی چلی گئی۔

"اپنی ماں ... تمہارا باپ، اس عورت نے۔۔۔ اس شخص نے" اس کے کانوں میں بشریٰ اور عدیل کے مختلف موقعوں پر بولے ہوئے ایک دوسرے کے لیے ایسے ہی اجنبی انداز تکلم گونجنے لگے۔

وہ دونوں جب تک ایک رشتے میں۔۔۔ میاں بیوی کے رشتے میں بندھے تھے تو ایک دوسرے کے لیے انتہائی خوب صورت القاب ایک دوسرے کو کسی دوسرے کے سامنے یاد کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے اور جب ان کا رشتہ ختم ہوا جو کہ مثال کی وجہ سے بالکل بھی نہیں تھا۔ وہ ان کے رشتہ ٹوٹنے کی ذمہ دار ذرا بھی نہیں تھی مگر وہ دونوں حتی الامکان انداز میں جس سے مثال کو تکلیف پہنچے ایک دوسرے کے لیے ایسے ہی تکلیف بھرے انداز تکلم استعمال کرتے تھے اور مثال کو لگتا تھا جیسے وہ ان کی جائز اولاد نہیں ان دونوں کا کوئی گناہ جسے وہ دونوں ایک دوسرے کے سر پر تھوپ کر خود کو بری الذمہ قرار دینے کی ہر مرتبہ بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

وہ بوجھل قدموں سے خود کو گھسیٹتی عدیل کو کوئی بھی جواب دیے بغیر چپ چاپ وہاں سے چلی آئی۔

وہ کیا کہتی جواب میں کہ پاپا! مما تو مجھے آپ کے حوالے کر کے گئی ہیں۔ وہ اب کسی بھی صورت اپنا دوسرا گھر خراب کرنے کے لیے مجھے پھر بھی اپنے گھر نہیں لے کر جائیں گی تو میں کیسے انہیں قائل کر کے کہہ سکتی ہوں کہ وہ مجھے اپنے پاس بلالیں۔

اسے لگا وہ اس لمحے اس بھری دنیا میں بالکل اکیلی ہے بالکل تنہا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے کسی کے کندھے پر سر رکھ کر اتنے آنسو بہائے جو اس کی پیدائش کے دن سے لے کر اس کے مرجانے کی گھڑی تک کے لیے کافی ہوں وہ اتنا روئے کہ آنسوؤں کے ساتھ ہی اس کا یہ بھاری پتھر سا وجود بھی کہیں گھل کر پگھل کر بہہ جائے۔

وہ خنک سرد رات میں جانے کس دھیان میں گم ایک ایک سیڑھی چڑھتی اندھیری چھت کے اندھیرے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ سر پر تاروں بھرا خنک آسمان تھا مگر چاند نہیں تھا۔

اچھا ہی تھا جو چاند نہیں تھا ورنہ اس کی روشنی میں اسے یہ دھڑکا رہتا کہ وہ جو وہ اپنی پیدائش کے دن سے لے کر موت کی گھڑی تک کے لیے آنسو بہانے جا رہی ہے تو اسے کوئی دیکھ نہ لیتا۔

وہ وہیں چھت کے فرش پر بیٹھ کر بے آواز آنسوؤں سے روتی چلی گئی۔ اب اس کے دل میں کسی کندھے کی خواہش بھی مر چکی تھی کیوں کہ اسے معلوم تھا اسے ایسا کوئی کندھا بھی نصیب نہیں ہونے والا۔

"آپ کا کوئی دوست ہے۔ جس سے آپ ہر بات شیئر کرتی ہوں" وہ روتی جا رہی تھی تب بہت قریب میں کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم سے ڈر گئی۔

"واثق!" اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

اس نے سر اٹھا کر اندھیری چھت پر ادھر ادھر اور تاریک سایوں کی طرح کھڑی دیواروں کو دیکھا۔ سرگوشی کرنے والا کہیں بھی نہیں تھا۔

"تم بھی جھوٹے نکلے وعدہ خلاف.... اگر تم شام میں آجاتے پاپا سے بات کر لیتے تو شاید... پاپا عفت ماما کی لاجک کو مانتے ہوئے کہ وہ مجھے خود سے جدا کر کے اتنی دور نہیں بھیج سکیں گے تو وہ تمہارے پروپوزل کو بہتر سمجھتے مگر تم تو شاید مجھ سے مذاق کر رہے تھے کبھی بات نہیں کروں گی میں تم سے بھی۔" وہ اس سے بھی روٹھ گئی۔

✵ ✵ ✵

"اتنی جلدی عدیل! میں تو کہتی ہوں آپ ایک بار اس لڑکے سے تو مل لیں۔" عفت عدیل کی عجلت پر پریشان ہو کر بولی۔

عدیل نے اسے جانچتی نظروں سے دیکھا۔

اس جملے میں کہاں اس کی نیت کا فتور چھپا ہے۔ وہ اندازے لگانے لگا۔

"مجھے غلط نہیں سمجھیں عدیل! بھلے میں سوتیلی سہی۔ بھلے میرے دل کے جذبات و احساسات مثال کے لیے وہ نہیں جو پری اور دانی کے لیے ہیں لیکن جس طرح اس کی ماں اسے یہاں چھوڑ کر چلی گئی عدیل! اس دن سے میرا دل اس کے لیے عجیب سی ہمدردی ایک محبت بھرے احساس سے بھر گیا ہے کہ اب اس لڑکی کے ساتھ کچھ برا نہیں ہونا چاہیے وہ ساری زندگی آپ دونوں کے درمیان شٹل کاک بنی رہی ہے۔ دو گھروں کے درمیان ٹینس بال کی طرح اسے اچھالا گیا۔ وہ بھی انسان ہے اس کے سینے میں بھی دل ہے پلیز اب اس کے ساتھ کچھ برا نہیں ہونا چاہیے۔

اس کی ماں جیسی بھی تھی' مگر آپ تو اس کے باپ ہیں۔ آپ پلیز جہاں مرضی اس کا رشتہ کریں' مگر خوب دیکھ بھال کر۔ اس سے زیادہ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ کیا محاورہ ہے ماں سے زیادہ چاہے پھاپھا کٹنی کہلائے تو کہیں آپ بھی مجھے ایسا نہ سمجھنے لگیں۔" وہ خود ہی ہنس پڑی۔ اور عدیل تو گنگ سا اس کی "کہی" باتیں سن رہا تھا۔

"عفت مگر..... وہ سب بھی تو ہم نے مثال کی بھلائی کے لیے کیا تھا اسے ضرورت تھی اپنی ماں کی بھی اور....." وہ کہنا تو نہیں چاہتا تھا' مگر جانے کیوں صفائی دینے والے انداز میں بول گیا۔

"بھلائی۔ ہونہہ۔ اس کی بھلائی نہیں آپ دونوں کی خود غرضی کہوں گی میں تو اسے۔ آپ دونوں نے اپنی اپنی انا کی تسکین کے لیے اس بچی کو شٹل کاک بنایا' آپ دونوں میں سے جو بھی اس کا سچا خیر خواہ ہوتا' وہ اسے کسی ایک کے پاس رہنے دیتا تاکہ اس کی پرسنالٹی میں اتنے جھول نہیں ہوتے۔" وہ تیز لہجے میں بولتی گئی۔

"جھول۔ کیسے جھول.... کیا کہنا چاہتی ہو تم؟" اب کے وہ کچھ ناگواری سے بولا۔

"آپ نے دیکھا تھا شام کو ذرا جو اس مثال میں کانفیڈنس ہو اس سے بہتر ہے تو ہماری پری کر رہی تھی۔ مثال ان لوگوں کے سامنے ایک کنفیوز پرسنالٹی لگ رہی تھی۔ آپ نے شاید باپ کی محبت میں ایسا کچھ نوٹ نہیں کیا۔" وہ طنز سے بولی۔

عدیل کے کان جیسے سرخ سے ہو گئے۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو صاف کہو مجھ سے۔" وہ غصہ دبا کر بولا۔

"اس سے زیادہ آپ سن نہیں سکیں گے بہتر ہے سو جائیں۔" اس نے کہہ کر کروٹ لے لی۔

"آپ دونوں کی خود غرضی تھی اور کچھ بھی نہیں۔" عدیل چھت کو دیکھتے ہوئے ابھی کچھ دیر پہلے کی عفت کی کہی ہوئی بات کو نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار سوچے جا رہا تھا۔

"جھوٹ' بکواس۔ میری کوئی خود غرضی نہیں تھی کبھی۔ مثال کے لیے خالص محبت تھی اور کچھ نہیں۔ ابھی جو میں مثال اور فہد کا رشتہ کر رہا ہوں۔ اصل میں عفت اس پر جل بھن چکی ہے اس کے نزدیک یہ کسی شاک سے کم نہیں کہ مثال کا اتنی اچھی فیملی میں رشتہ ہو جائے اور وہ ایک شان دار زندگی گزارے گی۔"

اس نے کروٹ کے بل سوئی عفت کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے فوری توجیہہ پیش کی۔

"اور یہ جھوٹ تھا بھی نہیں' جس دن سے یہ پرپوزل آیا تھا۔ عفت ذرا بھی خوش نہیں تھی اور جس طرح اس نے پری کو خوب بنا سنوار کر وقار اور فائزہ کے سامنے لا بٹھایا۔ اس کا اور کیا مطلب تھا۔" عدیل دل میں حساب کتاب لگا رہا تھا۔

"یہ عورت کبھی بھی مثال کے لیے اچھا نہیں سوچ سکتی۔ اتنا تو میں جانتا ہوں تو پھر اس کے بارے میں اتنی سنجیدگی سے کیوں سوچ رہا ہوں۔ مجھے صرف مثال کے لیے جلد سے جلد اس رشتے کو فائنل کرنا ہے۔" اس نے مطمئن ہو کر فیصلہ کیا اور اپنی طرف کی لائٹ آف کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ الگ بات کہ اسے بے چینی سی رہی اور بہت رات تک گہری نیند نہیں آسکی تھی۔

☆ ☆ ☆

اور نیند تو واثق کی آنکھوں میں بھی کہیں نہیں تھی۔ رات کو بہت دیر میں ڈاکٹر نے انہیں اسپتال سے فری کیا تھا۔ اتنی ہی دیر میں عاصمہ نڈھال ہو چکی تھی۔

اس کے جسم کا سارا لہو جیسے ان چند گھنٹوں میں نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اس کے لب یوں سلے ہوئے تھے جیسے وہ اب کبھی کوئی بات نہیں کرے گی۔

واثق نے دو' ایک بار ہاں سے اس تکلیف کے اچانک ہونے کی وجہ پوچھنے کی کوشش کی' مگر وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی تھی۔
واثق اس کے انداز پر ڈر سا گیا تھا۔
اس طرح تو عاصمہ نے زندگی میں صرف ایک بار ری ایکٹ کیا تھا۔ جب وہ زبیر... ان کے ساتھ فراڈ کر کے ان کا سارا اثاثہ ہتھیا کر لے گیا تھا۔
بہت سال پہلے کی بات تھی' مگر واثق کو وہ خوف ناک خواب کے جیسا واقعہ یاد آیا۔
جس سے عاصمہ بہت سارے دن تک نہیں سنبھل سکی تھی اور پھر ہاشم ماموں آئے تھے اور پھر...
اس نے سوئی ہوئی عاصمہ کو دیکھ کر بے اختیار سر جھٹکا۔ وہ اتنے سال پرانی ان باتوں کو نہیں سوچنا چاہتا تھا' مگر سوچے چلا جا رہا تھا اور مثال... وہ کیا سوچتی ہوگی۔
شاید اس نے انتظار کیا ہو۔ شاید نہ کیا ہو۔
لیکن میں نے اس سے کہا تو تھا کہ میں امی کو لے کر آ رہا ہوں۔ اسے انتظار ہوگا... وہ مجھے جھوٹا سمجھی ہوگی۔
اس کا سیل بھی میرے پاس ہے۔ ورنہ میں اسے ضرور کال کر کے اپنی مجبوری بتا دیتا۔
وہ اب غنودگی میں جاتے دماغ کے ساتھ صرف مثال کو سوچ رہا تھا۔ وہ اس کے نیند میں اترتے دماغ میں کسی خوشنما باغیچے میں اس کا ہاتھ پکڑ کر ٹہلتی اس کی طرف دیکھتی' بڑی جان دار مسکراہٹ کے ساتھ مسکراتی چل رہی تھی۔
اس کی نظروں میں واثق کے لیے اعتماد' محبت اور خوشی تھی۔ واثق اس کو یوں مسکراتے دیکھ کر حیران تھا۔ مگر وہ بھی مسکرا رہا تھا۔
"آپ آئے نہیں شام میں' میں نے پاپا اور مما کو بتا بھی دیا تھا۔ ہم سب انتظار کرتے رہے۔ مگر آپ نہیں آئے۔" اچانک وہ کہتے آنکھوں میں آنسو لے آئی۔ واثق نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ کرسی پر بیٹھا بیٹھا سو رہا تھا۔
"تو وہ میرا انتظار کرتی رہی۔ کاش میں کسی طرح اسے بتا سکتا' اب میں صبح آفس جانے سے پہلے اس کے کالج جاؤں گا۔ ایک بار اسے دیکھ لوں' اپنی مجبوری بتا دوں۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ خود کو تسلی دیتے ہوئے سمجھانے لگا۔ اس کے بے چین دل کو مگر قرار نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز مثال کو تیز بخار تھا۔ وہ بے ہوش تھی۔
پوری رات خنکی میں چھت پر بیٹھے رہنے سے اس کا پورا وجود اکڑ گیا تھا۔ وہ آدھی رات کے بعد چھت سے نیچے آ کر اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹی تھی۔
صبح وہ ناشتے کی تیاری کے لیے نہیں نکلی تو مجبوراً "عفت کو غصے میں اسے جگانے کے لئے آنا پڑا۔ مگر وہ بے ہوش تھی اور آگ کی طرح دہکتا اس کا جسم۔ ایک پل کو تو عفت بھی ڈر گئی۔ عدیل کو ڈاکٹر کو کال کر کے بلانا پڑا۔
ڈاکٹر انجکشن لگا کر اور دوا دے کر چلا گیا۔ عدیل بہت دیر تک اس کے سرہانے فکر مند بیٹھا رہا۔ وہ ہوش و خرد سے بے گانہ بے سدھ سو رہی تھی۔
اور آج پہلی بار عدیل کو لگا بہت سرسری نظر سے دیکھنے پر بھی دیکھنے والا کہہ دیتا کہ یہ مثال بشریٰ کی بیٹی تو نہیں' وہ تو بالکل بشریٰ کا عکس تھی۔

اور عدیل کو کبھی ایسا محسوس ہی نہیں ہوا تھا یا ہوا بھی ہو گا تو اس نے بشریٰ کے تصور کو جھٹلانے کے لیے اس خیال کو جھٹک دیا ہو گا۔

وہ واقعی اپنی ماں کی کاپی تھی۔

"مگر اسے اتنا شدید بخار کیوں ہوا؟" وہ خود سے الجھ رہا تھا۔

"خوش نہیں ہے مثال اس بات کو لے کر' آپ جو بھی قدم اٹھائیں سوچ سمجھ کر اٹھائیں۔ میں مزید کچھ کہوں گی تو آپ میری نیت پر شک کریں گے۔" عفت اس کو وہیں ناشتا دے کر جاتے ہوئے طنزاً" جتا گئی تھی۔

وہ جواب میں کچھ بھی نہیں بولا۔

اور یہ تو وہ طے کر چکا تھا کہ مثال خوش ہے یا نہیں' وہ فہد کے اتنے اچھے پرپوزل کو منع نہیں کرے گا۔ تھوڑا وقت لگے گا' مگر مثال اس رشتے کو قبول کر لے گی۔

"میری بیٹی سمجھ دار ہے' پھر مجھ سے بہت محبت کرتی ہے اور میرے پیار پر بھی اسے شک نہیں' ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ خود کو تسلی دے رہا تھا۔

وہ مثال کے بخار ہلکا ہونے تک وہیں بیٹھا رہا تھا۔

"آج کیا آفس سے بھی چھٹی کریں گے۔" دوسری بار چائے لے کر آتے ہوئے وہ پھر اسی طنز بھرے لہجے میں کہہ گئی۔

اور آفس سے چھٹی تو وہ نہیں کر سکتا تھا۔ آفس کے جیسے حالات چل رہے تھے' وہ ایک بھی چھٹی نہیں کر سکتا تھا۔

چائے کا خالی کپ رکھ کر اس نے مثال کا ٹمپریچر چیک کیا۔ بخار کم ہو چکا تھا اور مثال کے چہرے کی زرد رنگت بھی بہتر ہو رہی تھی۔ وہ مطمئن ہو کر عفت کو اس کے لیے پرہیزی کھانے کی تاکید کر کے آفس کے لئے نکل گیا۔

"بس ایک ہی تو اولاد ہے مسٹر عدیل احمد کی اور تو کوئی بچہ پیدا ہی نہیں کیا' جو کسی اور کی فکر ہو' دانی کے کیا حالات چل رہے ہیں۔ کچھ بھی پروا نہیں' وہ پھر سے پرانی ڈگر پر آ چکا ہے' نہ پڑھتا ہے اور ٹیوٹر کو تو باہر ہی سے بھگا دیتا ہے۔ میں کچھ کہوں گی تو میری اولاد میری اولاد کہہ کر وہ طعنے ماریں گے۔" وہ بھنائی ہوئی مثال کے لیے یخنی رکھتی اپنا خون جلاتی رہی۔

"مجھے کچھ کرنا ہو گا۔ مثال کا رشتہ یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ کل ہمیں فہد کے گھر جانا ہے' ضرور کچھ نہ کچھ مجھے سوچنا ہو گا۔" وہ کام کے دوران سوچتی رہی۔

✲ ✲ ✲

وہ کالج نہیں آئی تھی۔

وہ صبح بھی آیا اور پھر دوپہر میں بھی اور پھر شام کو لائبریری بھی' مگر مثال کہیں بھی نہیں تھی۔

"وہ کہیں واقعی تو اس سے گم نہیں ہو گئی۔" اس کا دل سخت بے قرار ہو چکا تھا۔

دو بار ان کے گھر کے لینڈ لائن پر فون بھی کر چکا تھا۔ مگر ہر بار دو مختلف آوازوں نے کال ریسیو کی۔

واثق رات تک سخت مایوس ہو چکا تھا۔

وہ بہانے سے دو بار عدیل کے گھر کے باہر سے بھی گزر چکا تھا۔ مگر وہ گھر تو پتھروں کی دیواروں میں گھرا شاید مثال کو کہیں چھپا چکا تھا۔

کیا میں اسے کبھی نہیں دیکھ پاؤں گا۔ وہ مجھے اب کبھی نظر نہیں آئے گی۔ اسے لگ رہا تھا' اس کا دل بند

ہو جائے گا۔ کہیں بھی قرار نہیں آ رہا تھا۔
وہ تھوڑی دیر کے لیے فیکٹری گیا۔ پھر وہاں بھی سب کام یوں ہی چھوڑ کر نکل آیا۔
شام تک یوں ہی سڑکوں پر گاڑی لیے پھرتا رہا۔
عاصمہ کی دوبارہ کال آئی تو اس نے مصروفیت کا کہہ کر ٹال دیا۔
"واثق صاحب اگر آپ باہر ہیں تو سائٹ پر ہو آئیں، وہاں ہمارے کلائنٹ کے نمائندے موجود ہیں، انہیں آپ کو بریف کرنا ہوگا۔ آپ ایک گھنٹے میں پہنچ جائیں گے وہاں۔" آفس سے کال تھی اور اسے ہامی بھرنی پڑی۔
اس کی جاب کون سی پرانی تھی جو وہ اپنی مرضی چلاتا اور سائٹ پر جا کر لمحے بھر کو وہ ششدر سا رہ گیا۔ ان کے کلائنٹ کا نمائندہ عدیل احمد تھا۔
جس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور پر وقار سی خاموشی تھی۔
واثق اسے بریف کرنے کے دوران اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھنے سے گریز کرتا رہا کہ اس کا اعتماد ایسا کرنے سے ڈانوا ڈول ہو رہا تھا۔
"امید ہے سر آپ کو کچھ پوچھنا تو نہیں ہوگا۔" وہ اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا، سو آخر میں روانی میں اس کے منہ سے نکل گیا۔
"نہیں... آپ کے تمام پوائنٹس میں نے نوٹ کر لیے ہیں۔ آئی تھنک میری کمپنی کو کوئی ایشو نہیں ہوگا۔ باقی جو بھی ڈیٹیل ہوگی۔ آپ کی کمپنی کو میل کر دی جائے گی، تھینکس۔" عدیل بہت نارمل سے لہجے میں آنکھوں میں جمی ہوئی سرد مہری سی لیے نارمل انداز میں واثق سے مصافحہ کر کے وہاں سے گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔
واثق اس کی گاڑی کو دور تک جاتا دیکھتا رہا۔

❋ ❋ ❋

اور ایک بار پھر عفت جل بھن کر رہ گئی۔ جب اس نے فہد کے والدین کا شاندار بنگلہ دیکھا۔
"اللہ جانے اللہ نے ان ماں، بیٹی کی ایسی کروفر والی قسمتیں کہاں لکھیں اور میری... میری بیٹی... نہیں، نہیں، میری پری کی قسمت ایسی بالکل نہیں ہوگی۔ میری پری ہی اس بنگلے میں آ کر راج کرے گی۔ میرا دل کہتا ہے۔" وہ سب طرف پتھرائی نظروں سے دیکھتی دل کو جھوٹی تسلیاں دیتی رہی۔

شہر کے پوش ایریا میں شاندار ماربل لگا بنگلہ بہت خوب صورت تھا۔ پھر اس میں سجے آرائشی ساز و سامان، پردے، فرنیچر، ڈیکوریشن، شاندار بیڈ رومز، عالی شان لاؤنج، ڈرائنگ روم، عفت کی نگاہیں بھٹک رہی تھیں۔
اور عدیل کو گھر آ کر عفت کو خفگی سے بتانا پڑا کہ اس کا رویہ وقار اور فائزہ کے گھر بہت غلط تھا۔ چھچھوروں والا جیسے انہوں نے کبھی کچھ ایسا شاندار نہیں دیکھا۔
اگرچہ اس نے سیف سائیڈ کے طور پر چھچھوروں میں خود کو بھی شامل کیا تھا۔ مگر عفت جانے کس دھیان میں تھی۔ اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔
وہ خاموشی سے الماری میں کپڑے رکھتی رہی۔
"دو دن بعد منگنی کا چھوٹا موٹا سا فنکشن ہے۔ گھر میں ہی ٹھیک رہے گا۔ وقار لوگوں کی طرف سے چھ سے آٹھ یا زیادہ سے زیادہ دس تک ہوں گے۔ اتنے ہی تقریباً ہماری طرف سے ہو جائیں گے۔ کیٹرنگ کا انتظام ہوٹل سے ہو جائے گا۔ کیا خیال ہے۔" عدیل اس کی خاموشی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
اور عفت کو خیال آیا کہ اس کی بدحواسی کے دوران وہاں منگنی کا معاملہ بھی طے پا گیا تھا۔

"فہد آئے گا۔۔۔ میرا مطلب ہے منگنی میں۔" وہ الماری بند کر کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔
"نہیں۔۔۔ ابھی تو نہیں۔ کل وہ مجھ سے ویب پر بات کرے گا۔ بلکہ میرے خیال میں مثال بھی اس سے بات کرے تو اچھا رہے گا۔ کیسی طبیعت رہی اس کی دن بھر' دوبارہ بخار تو نہیں ہوا۔"
خیال آنے پر عدیل نے پوچھا تو عفت نے نفی میں سر ہلایا۔
"ٹمپریچر تو دوبارہ نہیں ہوا۔ بس خاموش تھی بالکل۔"
"اسے بتایا تمہاری پرسوں انگیجمنٹ ہے۔" عدیل نے کچھ خیال آنے پر پوچھا۔
"ابھی تو آئے ہیں ہم۔ وہ سو رہی تھی۔"
"چلو' صبح بتا دینا۔ ابھی اسے آرام کرنے دو۔" عدیل نے کہہ کر اپنی کتاب اٹھالی۔ عفت خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔

☼ ☼ ☼

تین دن ہو گئے تھے وہ کالج نہیں آئی تھی۔ شام میں لائبریری بھی نہیں' واثق کو لگتا تھا وہ پاگل ہو جائے گا۔
آج تو وہ آفس بھی نہیں گیا تھا۔۔۔ بے قراری سے شام ہونے کا انتظار کرتا رہا کہ وہ لائبریری ضرور ہی آئے گی۔
مگر جب شام کے سائے گہرے ہو گئے' پرندے اپنے آشیانوں کو لوٹ گئے۔ گہری شام نے سیاہ رات کی چادر اوڑھنا شروع کی تو اسے لگا اگر آج اس نے مثال کو نہیں دیکھا یا وہ اسے نہیں ملی تو وہ اپنے ساتھ کچھ کر بیٹھے گا۔
اس نے بغیر سوچے سمجھے مثال کے گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔
"اب چاہے کچھ بھی ہو۔ کچھ بھی ہو جائے گیٹ بند ہو اس کی مدر باہر نکلے یا فادر میں صاف کہہ دوں گا کہ مجھے مثال سے ملنا ہے۔ اگر انہوں نے پوچھ بھی لیا تو میں صاف بتا دوں گا۔ میں محبت کرتا ہوں اس سے ٹوٹ کر چاہتا ہوں' اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔" اسے لگ رہا تھا اس کے وجود میں کوئی جھکڑ سا چل رہا ہے اور وہ اس جھکڑ میں اڑتا چلا جا رہا ہے اور اسے لگا قسمت اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ اس کے گھر کا گیٹ کھلا تھا۔ وہ اندر چلا گیا۔ لان میں برقی قمقمے جل رہے تھے اور سامنے اسٹیج سجا تھا۔
واثق اندھیرے سے اتنی روشنی میں آ کر ٹھٹک گیا۔
وہ اجنبی نظروں سے دائیں بائیں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ ان میں کہیں نظر آ جائے تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے سب کچھ کہہ ڈالے۔
وہ شکستہ قدموں سے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا اور بے اختیار اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔
وہ لان میں لگی کرسیوں کے سامنے سجے اسٹیج کے پاس پہنچ گیا تھا۔
اسٹیج پر کافی لوگ تھے۔ اسے وہاں سے عدیل مسکراتا کسی سے بات کرتا مڑتا نظر آیا۔
واثق کو لگا عدیل نے اسے دیکھ لیا ہے۔
"میں ان سے بات کرتا ہوں کہ میں مثال سے ملنے آیا ہوں۔" وہ تیزی سے بغیر سوچے سمجھے آگے بڑھا اور دوسرے لمحے اس کے قدم وہیں ٹھٹک کر رک گئے۔
سامنے اسٹیج پر مثال دلہن کے سے لباس میں سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے ساتھ بیٹھی خاتون اس کے ساتھ ہنستے ہوئے بات کر رہی تھیں۔ اور واثق شاکڈ سا کھڑا دیکھتا رہا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سعدیہ رئیس

جا کے سسرال گوری

اس وقت کہ جب سہ پہر کی دھوپ دم رخصت پر تھی، عام طور پر سارے گھر پر سناٹے کا راج ہوتا تھا کہ یہ وقت خالدہ خاتون کے آرام کا ہوتا تھا، سو آرام میں خلل انہیں بہت گراں گزرتا تھا، اسی لیے اس سناٹے اور خاموشی کو برقرار رکھنے کے لیے اس وقت ہر قدم پھونک پھونک کے بے آواز اٹھانا پڑتا، تاکہ خالدہ خاتون کی نیند خراب نہ ہو۔ مگر اس بوریت کا کیا علاج ہو کہ اکیلے اور خاموش بیٹھ کر عارفہ کو لگ رہا تھا جیسے ہونٹ گوند سے چپک گئے۔ اسی لیے وہ گپ شپ لگانے سمیرا کے پاس چلی آئی۔ وہ بھی اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔ باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا ان دونوں ہی کو احساس نہ ہوا۔

جامن کے درخت کی شاخوں سے چھن چھن کر آتی دھوپ کب غائب ہوئی؟ انہیں احساس ہی نہ ہوا اور نہ یہ معلوم ہوا کہ کب خالدہ خاتون بیدار ہوئیں۔ نجانے عارفہ نے کیا لطیفہ سنایا کہ سمیرا کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ اس کا مدھر سا، مترنم قہقہہ خاموش فضا میں جھنکار سی پھیلا گیا اور خالدہ خاتون کی سماعتوں میں خراش کی طرح جا کر لگا۔ بیڈ پر کسلمندی سے کروٹیں بدلتی خالدہ خاتون چابک دستی سے اٹھیں اور دونوں کے سر پر جا پہنچیں۔ توقع کے مطابق ان دونوں کو ایک پُرمغز لیکچر سننا پڑا۔ زیادہ تر ان کے لیکچر کا شکار عارفہ ہی رہتی تھی۔ وہ اکثر و بیشتر ان کے عتاب کا نشانہ بنتی تھی۔

"ہزار بار سمجھایا ہے اتنی اونچی آواز میں ہنسنا لڑکیوں کو زیب نہیں دیتا۔۔۔ اور تم تو بچی بنی رہتی ہو عارفہ۔۔۔ ذرا جو بردباری تم میں آئی ہو۔۔۔ کنٹرول کرو خود پر یہ کیا وقت بے وقت ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوڑتی رہتی ہو۔"

اونچا قہقہہ تو سمیرا نے لگایا تھا۔ مگر سارا نزلہ عارفہ پر ہی گرا جو کہ صرف مسکرائی تھی۔ ان کی آمد پر دونوں کی ہنسی کو فوراً ہی بریک لگ گئے تھے، مگر خالدہ خاتون کی جھاڑ کے بعد عارفہ کے چمکتے چہرے پر تاریک سائے ڈول گئے۔ اس وقت سمیرا کو اپنی پیاری سی بھابھی پر بہت ترس آیا۔

ابھی اس کی شادی کو چھ ماہ ہی ہوئے تھے اور خالدہ خاتون کی آئے روز کی روک ٹوک نے اسے خاصا ڈسٹرب کر دیا تھا۔ جب وہ بیاہ کر آئی تھی تو خوش مزاجی کا یہ عالم تھا کہ جیسے ہنسی تو اس پر ختم تھی۔ مسکراہٹ ہمہ وقت چہرے پر رہتی تھی، یہاں تک کہ اس نے سمیرا جیسی ریزرو طبیعت کی لڑکی کو بھی ہنسنے بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ سمیرا مغرور تھی۔ دراصل دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اسے اپنی ہم عمر ساتھی یا بہن میسر نہ تھی۔ سوئے اتفاق ننھیال، ددھیال میں بھی عمر سے بڑی کزنز تھیں۔ سو اکیلے رہتے ہوئے خاموش اور سنجیدہ رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

عارفہ نے سسرال کی دہلیز پار کی تو جیسے ہر سو اجالا سا ہو گیا۔ جیسے اندھیری جگہ کو روشنی کی کرنیں جگمگا دیتی ہیں۔ وہ حسن و صورت میں یکتا تھی اور خوش اخلاقی تو جیسے اس پر ختم تھی۔ اس کی ہنستی مسکراتی دل موہ لینے والی شخصیت نے ماحول کو چار چاند لگا دیے۔ خاموشی، تنہائی یوں ———— ہو گئیں جیسے کبھی وہاں نہ تھیں۔ دو، چار دن میں ہی عارفہ کی گھلنے ملنے والی

طبیعت کی وجہ سے اس کی اور سمیرا کی بہت اچھی دوستی ہو گئی۔

پہلے پہل تو سمیرا اس کی باتوں پر صرف مسکراتی تھی وہ بھی بہت مختصر سا۔ تب وہ اس سے الجھ پڑتی۔

"تم تو مسکراتی بھی سوچ سوچ کر ہو... اب مسکرانے اور ہنسنے میں کیا کنجوسی، اس پر تو کوئی ٹیکس نہیں لگا ہوا نا۔" وہ اس انداز سے کہتی کہ سمیرا بے ساختہ ہنس پڑتی۔

کبھی کہتی "اوہو، تم تو بولتی ہی نہیں ہو، بولا کرو نا، کیا ایلفی لگا کر رکھتی ہو ہونٹوں پر..." بول بول کر وہ اسے بھی بولنے پر مجبور کر دیتی۔

اب سمیرا اسے کیا بتاتی کہ اسے بولنے کی عادت اس لیے نہیں ہے کہ گھر میں سب اپنی معمول کی مصروفیات میں اس قدر مگن رہتے ہیں کہ بات چیت کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ خالدہ خاتون خانہ داری میں مگن تو دونوں بھائی پڑھائی اور دوستوں میں مصروف رہے، بابا جان تو وہ سدا کے کتابوں کے رسیا... ہمہ وقت مطالعہ میں مصروف رہتے، کبھی اخبار، کبھی کوئی کتاب، تو کبھی اپنے دوسرے کام، اب وہ بولتی تو کس سے بولتی... کیا دیواروں سے بولتی۔

عارفہ کی شکل میں اسے ایک بھابھی کے ساتھ ساتھ ایک دوست بھی مل گئی تھی۔ عارفہ نے جہاں اسے ہنسنے بولنے پر اکسایا وہیں اسے رنگوں، خوشبوؤں کی طرف بھی مائل کیا۔ اکیلے رہ کر اسے سادہ رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ نہ لباس کا خاص خیال رکھتی، نہ اسٹائل پر توجہ دیتی۔ ادھر عارفہ تھی کہ شوخ چہچہاتے رنگوں کے اسٹائلش سے کپڑے پہنتی تھی۔ ایک سوٹ تیار کرنے کے لئے اتنا تردد کرتی کہ ایسا ہو اور ویسا ہو... جدید تراش خراش کا بھی ہو، دیکھنے میں بھی خوب صورت اور منفرد لگے۔ اسے آؤٹنگ کا بھی بہت شوق تھا۔

شروع دنوں میں تو اس کا شوہر فخراب بصد شوق اس کے ناز نخرے اٹھا کر کئی بار اسے گھمانے پھرانے لے گیا، لیکن پھر غم روزگار، ذمہ داریوں اور سب سے بڑھ کر خالدہ خاتون کے تیکھے چتونوں کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی مصروفیات میں مگن ہو گیا۔ تب عارفہ ہی زبردستی اسے آؤٹنگ پر چلنے کے لیے مجبور کرتی اور ساتھ میں سمیرا کو بھی زبردستی گھسیٹ لیتی۔ وہ منع کرتی رہ جاتی، یہ سنتی ہی نہیں... کبھی آئس کریم، کبھی کولڈ ڈرنک، تو کبھی برگر... خوب مزے کرتی اور کراتی... شاپنگ پر بھی وہ سمیرا کو ساتھ رکھتی۔ اس کی رفاقت میں سمیرا کو بھی فیشن ایبل کپڑے بنانے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ واپسی پر گرما گرم سموسے یا بوٹی رول پیک کروا کر گھر لے آتیں۔ پھر گرما گرم چائے کے ساتھ گپ شپ لگاتے ہوئے وہ نوش جاں کرتی رہتیں۔ سمیرا کے لیے تو زندگی ایک دم بدل سی گئی تھی۔ بہت جان دار، مزے دار اور رنگوں روشنیوں والی یہ زندگی اسے اچھی لگنے لگی تھی۔ اس کی شخصیت میں خاصا نکھار سا آگیا تھا۔

اس روز بھی دونوں اپنی شاپنگ سے گھر لوٹیں تو فرنچ فرائز لیتی ہوئی آئیں اور حسب معمول کھانے پینے کے ساتھ ساتھ شاپنگ پر بھی تبصرہ شروع ہو گیا۔

"سمیرا اگر تمہاری فضول کی بک بک ختم ہو گئی ہو تو ذرا ادھر آ کر میری بات سن لو۔" خالدہ خاتون نے عارفہ کا غصہ سمیرا پر نکالتے ہوئے اپنے کمرے سے ہی اسے آواز دی۔

"سر میں درد ہو جاتا ہے میرے تو... نجانے تمہاری یہ فضول باتیں کب ختم ہوں گی۔ خالی باتیں بنا کر زندگی تھوڑی گزرتی ہے۔ بہت کچھ ہے زندگی میں ابھی کرنے اور جھیلنے کو..." انہوں نے بری طرح سے سمیرا کو لتاڑا۔

در پردہ وہ عارفہ ہی کو بلند آواز میں سنا رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ فضول باتوں میں وقت گنوانا بے وقوفی ہے۔ زیادہ بولنا احمقوں کی نشانی ہے اور ان بے کار باتوں سے لڑکیاں بگڑ جاتی ہیں۔ ان میں نکمے پن کی عادت ہو جاتی ہے۔ وہ جان بوجھ کر عارفہ کو کام میں لگا دیتیں اور سمیرا کو اس کے پاس سے ہٹا دیتیں۔

کبھی کسی مہمان کی آمد پر عارفہ خوش اخلاقی سے ہنستے مسکراتے ان کو خوش آمدید کہتی تو خالدہ خاتون کو وہ بھی برا لگتا۔

"توبہ ہے.... ہر ایک کے سامنے کتر کتر زبان چلنے لگتی ہے۔ کیسی ہوائی دیدہ لڑکیاں ہیں آج کل کی.... ورنہ ہمارے زمانے میں مجال نہ تھی کہ ساس کے سامنے ایک لفظ بھی بول لیتے.... نہ ادب.... نہ لحاظ.... بس بولنے سے مطلب ہے۔" وہ عارفہ کو ٹھیک ٹھاک باتیں سنا دیتیں۔

انہیں یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں سمیرا، عارفہ کی صحبت میں بگڑ نہ جائے، کیونکہ ان کے نزدیک عارفہ بہت منہ پھٹ، بے باک اور بدتمیز ہے۔ (ہنسنا بھی بدتمیزی میں شمار ہوتا تھا۔) اسی لیے اب وہ سمیرا کو موقع ملتے ہی سمجھانے بیٹھ جاتیں۔

"لڑکیوں کو زبان پر قابو رکھنا چاہیے.... جب سسرال جاؤ گی تو پتا چلے گا کہ کیسے چلتی زبان رکتی ہے۔ لڑکیوں کا زیادہ بولنا اچھا نہیں ہوتا۔ ہر وقت کی فضول باتیں اور ہنسی مذاق زہر لگتے ہیں مجھے.... ابھی سے اپنے اندر سبھاؤ پیدا کرو۔" انہیں عارفہ کے ہنسنے مسکرانے پر بہت زبردست قسم کا اعتراض تھا۔

"ہر وقت کا ہنسی ٹھٹھول کوئی اچھی بات نہیں.... منہ پھاڑ کر ہنسنا بری بات ہے۔ لڑکیوں میں نزاکت، نفاست ہونی چاہیے۔ باوقار چال ڈھال اور کردار ہونا چاہیے۔ شادی کے بعد ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں، ایک نہ دو کئی کئی رشتے ایک ساتھ نبھانے پڑتے ہیں۔ لڑکیوں میں بردباری اور احساس ذمہ داری ہونا چاہیے۔" وہ عارفہ کو بھی بے لاگ لپٹ سمجھانے لگی تھیں۔

ان کی آئے دن کی روک ٹوک کا یہ اثر ہوا کہ سمیرا جو بمشکل اپنے خول سے نکلی تھی، پھر اسی خول میں بند ہو گئی اور زندگی عارفہ پر اپنے نئے اور تیکھے رنگ وا کرنے لگی۔ اب تو فخراب بھی اسے اکثر و بیشتر ٹوک دیتا تھا۔

"کتنا بولتی ہو تم.... آہستہ ہنسو.... کم ہنسا کرو.... یہ کیسے کپڑے پہنے ہیں تم نے.... اتنا تیز رنگ، اتنا بے کار ڈیزائن.... ذرا نفاست پیدا کرو اپنی پسند میں۔" اور عارفہ جو پہلے ان باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتی تھی۔ اب محسوس کر کے دل پر لینے لگی۔ اسی لیے اب اس کا خالدہ خاتون سے منہ بنا رہتا تھا۔ فخراب سے بھی اینٹھا رویہ رکھتی۔ اگرچہ۔ کبھی اس نے کسی سے زبان نہ چلائی تھی۔ مگر پھر بھی زبان پر لیکچر سنتی رہتی۔ نہ کبھی وہ کسی کا مذاق اڑا کر ہنستی تھی، مگر پھر بھی اس کا ہنسنا برداشت نہ تھا۔

اب تو وہ سب سے ہی ناراض رہنے لگی تھی۔ پہلے تو خود بڑھ کر سمیرا سے بولتی تھی۔ اب اس نے وہ بھی چھوڑ دیا، بلکہ اب تو ساس، بہو میں نئی جنگ چھڑ چکی تھی۔ دراصل اب وہ گھر کے کاموں میں زیادہ تر حصہ لینے لگی تھی، مگر وہاں بھی خالدہ خاتون کا تسلط تھا۔ ہر بات میں کیڑے، ہر بات پر اعتراض اور اپنی من مانی.... اس کے ہر عمل پر روک ٹوک ان کا فرض بنا ہوا تھا۔ اکثر وہ بچا ہوا کھانا ماسی کو دے دیتی، دروازے پر فقیر آتا تو اس کو دے دیتی تھی۔ تب خالدہ خاتون کو بہت برا لگتا۔

"اچھا خاصا تو تھا.... فریج میں رکھ دیتیں.... کل کھالیا جاتا۔"

وہ اپنی پسند اور مرضی سے کچھ خرید کر لاتی تو اس پر بھی اعتراض ہوتا۔

"کیا ضرورت تھی فضول خرچی کی.... گھر میں پلیٹیں ہیں تو سہی، بلا ضرورت نئی کیوں لائی ہو۔"

کفایت شعاری تو ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اب تک ۔ ان کا یہ حال تھا کہ پرانے کپڑوں کو ادھیڑ کر اس میں نیا کپڑا لگا کر پھر سی لیتیں اور اوپر سے اچھی سی لیس لگا لیتیں۔

"دیکھا کیسی بچت کی.... ایسے کرتے ہیں بچت۔" وہ فخریہ اسے دکھاتیں۔ اگر عارفہ اپنے لیے نیا سوٹ لے آتی تو اس پر بھی بے بھاؤ کی سنتی۔

"جہیز بری کے اتنے سوٹ رکھے ہیں' انہیں نکال کر پہنو۔۔۔ تنگ ہوگئے تو ٹھیک کر کے پہنو۔۔۔ وہ بھی تو پیسے خرچ کر کے بنائے گئے ہیں۔۔۔ بی بی اگر گھر چلانا ہے تو کفایت شعاری کا گر سیکھو۔"

عارفہ پر اثر ہوتا نہ ہوتا' مگر سمیرا اب ان کی ہر نصیحت' ہر تاکید اور ہر اعتراض کو اپنے پلو میں باندھتی جا رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ عارفہ کی درگت دیکھ کر وہ بہت خوف زدہ ہوگئی تھی۔ متوقع سسرال عجائب خانہ لگنے لگی تھی اسے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خاموش رہنے لگی۔ اس نے خالدہ خاتون کی باتوں اور عارفہ کی غلطیوں سے بہت سے سبق سیکھ کر خود کو پہلے سے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ آخر ایک روز اسے بھی تو سسرال جانا تھا۔ اسے عارفہ کے رویے کا بھی دکھ تھا کہ اب پہلے کی طرح عارفہ اسے لفٹ نہ کراتی تھی۔

آج کل اس کے رشتے بھی بہت آرہے تھے۔ اس نے وہ تمام اصول اپنے ذہن میں ازبر کر لیے تھے اور ان تمام نصیحتوں کو گھول کر پی لیا تھا جو خالدہ خاتون وقتاً فوقتاً عارفہ کو سناتی رہتی تھیں' تاکہ آئندہ زندگی اچھی گزرے۔

بہت جلد وہ دن آگیا کہ وہ فائق کی دلہن بن کر پیا دیس سدھار گئی۔ نیا ماحول' نئی زندگی اور نئے لوگ' وہ بہت ڈری ہوئی تھی' مگر ان سب نے محبت سے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا' بڑے ارمانوں سے ساری رسمیں ادا کیں۔ چاہتوں سے پھول نچھاور کر کے اس کا استقبال کیا۔ اس کا کمرہ بھی بہت اچھا سجا ہوا تھا۔ باقی ماندہ اندیشے فائق سے مل کر دور ہوگئے۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں اسے مطمئن و مسرور کر دیا تھا۔

نئی زندگی کا آغاز ہوا' زندگی اپنے بہاؤ پہ چلی اور سمیرا نے بڑے سبھاؤ سے اپنی ذمہ داریوں کی پتوار سنبھال لی۔ کام چور تو وہ پہلے بھی نہ تھی' سو اس نے بلا جھجک کچن سنبھال لیا۔ صبح کا ناشتا سب کے لیے بناتی' سب ہی کو اس کے ہاتھ کا ذائقہ پسند آیا۔ ساس کی تابعداری میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جی امی' جی امی کر کے ان کا ہر حکم بجا لاتی۔ فائق کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی' اس کے کپڑے استری کرتی' اس کا سر دباتی اور کبھی اسے چائے بنا کر پلاتی۔

اس کی نند انزلہ بھی بہت اچھی تھی' ہر کام میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ جب وہ کچھ پکاتی تو اس کے پاس ہی کھڑی ہو جاتی۔ اس کو اپنی سہیلیوں کے قصے سناتی' کبھی کالج کا کوئی واقعہ سناتی' تو وہ ہوں ہاں کر کے بردباری سے سنتی رہتی۔

فائق اسے پہلی بار شاپنگ کے لیے لے کر گیا تو اس نے صرف ساس اور نند کے لئے سوٹ خرید لیے' اپنے لیے کچھ بھی نہ لیا کہ جہیز بری کے بہت سوٹ تھے ابھی' مگر فائق نے اپنی خوشی اور پسند سے ایک سوٹ اس کو بھی دلا دیا۔

کئی ماہ سکون اور پیار سے گزر گئے۔ وہ حیران تھی کہ کیسے اس نے ان سارے رشتوں کو نبھایا اور سنبھالا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ بہت خلوص سے اپنے سارے فرائض ادا کر رہی تھی۔ اس نے کبھی فائق کو بے جا فرمائش کر کے تنگ نہ کیا تھا۔ نہ ہی ماحول بدلنے کی کوشش کی' ایک زبان پر قابو رکھ کے وہ بہت سی برائیوں سے بچ گئی تھی۔ بس اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔

رات سونے سے پہلے وہ سارا کچن سمیٹتی تھی۔ بچے ہوئے کھانے ڈش میں نکال کر فریج میں رکھ دیتی۔ دودھ کی پتیلی ڈھک دیتی اور جھوٹے برتن دھوتی' صبح اٹھتی تو کچن صاف ملتا۔

لیکن کچھ دنوں سے گھر میں غیر معمولی پن محسوس ہو رہا تھا۔ ایک نامحسوس سا کھنچاؤ اور تناؤ تھا جو وہ سمجھ نہ پا رہی تھی۔ فائق کا رویہ خشک سا تھا۔ ساس کی تیوری پر بھی بل نظر آرہا تھا اور نند بھی اکھڑی اکھڑی سی لگی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اندرونی طور پر کوئی ٹینشن ہے۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ فائق کے ماموں شارجہ سے آرہے تھے۔ ان کے لیے زبردست قسم کا پروٹوکول درکار تھا۔ بھرپور دعوت کا اہتمام کرنا تھا اور یہ

تو وہ چٹکی بجاتے کر سکتی تھی' اس کے لیے مسئلہ نہ تھا۔

فائق نے بطور خاص اس سے وہ سوٹ پہننے کے لیے کہا جو اس نے اپنی پسند سے دلایا تھا۔ وہ کمرے میں تیار ہونے آئی' مگر پھر سوچا کہ سارے کام نپٹا کر تیار ہو جائے گی۔ لیکن پھر اس کی نظروں کے سامنے ناراض سی نیند کا چہرہ آگیا۔ بلا سبب ہی نجانے اس سے وہ کیوں خفا تھی۔ اس نے فوری ایک فیصلہ کیا کہ اپنا نیا سوٹ انزلہ کو تحفہ میں دے دیا اور خود جہیز بری کے کپڑوں میں سے ایک جوڑے کا انتخاب کر لیا' تاکہ ساس خوش ہو جائیں۔ ابھی وہ تیار ہو ہی رہی تھی کہ فائق چلا آیا اور عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا... کیا اچھی نہیں لگ رہی۔" وہ خائف سی ہو گئی۔

"وہ سوٹ کہاں ہے' جو میں نے تمہیں دلایا تھا۔" اس نے سرد سے انداز میں پوچھا۔ تب اس نے فخریہ اپنا کارنامہ بیان کر دیا۔ بس وہ یہی سننے کا منتظر تھا۔ اس کے بعد وہ اس پر ایسا برسا کہ سمیرا کی ہوائیاں اڑ گئیں۔

"وہ سوٹ میں نے تمہیں دیا تھا یا انزلہ کو۔" اس نے سوال کیا۔

"وہ بہت اچھا سوٹ تھا' میں نے سوچا کہ وہ اپنے جہیز میں رکھ لے گی۔ میرے پاس تو جہیز بری کے بہت سے سوٹ ہیں۔" اس نے سمجھ داری سے وضاحت دی کہ کفایت شعاری کے سارے سبق اور نصیحتوں کی پوٹلی وہ اپنے پلو میں باندھ کے لائی تھی۔

"تم نے ہمیں کنگلا سمجھا ہے کیا... کیا میں اپنی بہن کے جہیز کے کپڑے نہیں بنا سکتا' کیا جتانا چاہ رہی ہو تم۔" وہ سیخ پا ہو گیا۔

"ارے مت پوچھو ان کی کفایت شعاریوں کا حال... باسی کھانے کھلا کھلا کر پیٹ خراب کر دیا اس نے ہمارا۔ اٹھا اٹھا کر فریج میں رکھ دیتی ہے کل کے لیے۔" ساس تو جیسے ایسے کسی موقع کی منتظر تھیں' فوراً ہی چلی آئیں۔

"اتنا سب کچھ ہے گھر میں' اتنے ڈھیر کپڑے ہیں اور یہ ماسی بن کر سادہ سودے کپڑوں میں پھرتی رہتی ہے۔ پتا نہیں کیا دکھانا چاہ رہی ہے دنیا کو۔" وہ غصے سے بولیں۔

"بڑی محبت آرہی ہے انزلہ سے... ہونہہ دکھاوے کی محبت... اتنی مغرور ہے کہ بچی سے بولتی ہی نہیں۔ بھابھی' بھابھی کر کے منہ سوکھ گیا اس کا' مگر مجال ہے کہ کبھی اس سے باتیں کر لے... کوئی مہمان آئے تو اسے تمیز نہیں کہ کیسے ملا جاتا ہے... نہ بات' نہ چیت... منہ میں لڈو ڈال کر بیٹھ جاتی ہے۔" ایک کے بعد ایک سنگین الزامات اس پر عائد کیے جا رہے تھے اور وہ حیران پریشان کھڑی سن رہی تھی۔

"بھائی... بھابھی تو گونگی ہیں گونگی... جانے کون سی خیالی دنیا میں رہتی ہیں۔" انزلہ کی آواز بھی کہیں قریب سے آئی۔

"غلطی ہو گئی' صرف شکل دیکھ لی' عادتیں معلوم نہ کیں۔" ساس کو پچھتاوا تھا۔ سمیرا بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اس کے پلو کی گرہ کھلتی گئی اور اس میں بندھے وہ سارے اصول اور نصیحتیں لڑھک لڑھک کر زمین بوس ہو گئے' جو اس نے اپنی خوشیوں کی بقا کے لیے سنبھال کر رکھے تھے۔

اس کا برف سا وجود' ٹھنڈا اور سرد سا وجود... اسے پانی بن کر اس سانچے میں سمانا تھا جسے سسرال کہتے ہیں۔

O

صدف آصف

دل تو ناطرے کی آئیئے

"اے ٹے، ہٹے لڑکی! کچھ عقل شعور ہے کہ نہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ اس پورے گھر پر وہ آنسہ بی ہی چھائی ہوئی ہیں۔ کچن میں ان کی مرضی چلتی ہے۔ کھانا ان کی پسند سے پکتا ہے۔ میاں بیٹے ان کے شیدائی، یہاں تک کہ تم بھی ان کے آگے پیچھے دم ہلاتی پھرتی ہو۔ میں کہتی ہوں۔ یہ کیا حماقت ہے۔ ایسے تو تم کبھی بھی رافع کے دل میں جگہ نہیں بنا سکو گی۔" رشیدہ ناز نے بیٹی کے سسرال سے لوٹتے ہی اندر اٹھنے والا ابال احمرین کو کال کر کے نکالنا چاہا۔ وہ وہاں کے حالات دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح ان کی زبان بلٹ ٹرین کی رفتار سے چل پڑی۔

یہ جانے بنا کہ احمرین کے موبائل کا اسپیکر غلطی سے آن ہو چکا ہے۔ ان کی قدرے بھاری آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ احمرین کی تو سٹی گم ہو گئی۔ آنسہ جو بہو کے برابر والے صوفے پر بیٹھی مزے سے کوکنگ شو دیکھ رہی تھیں۔ اپنی سمدھن کے ان الفاظ پر ششدر رہ گئیں۔

"امی۔ پلیز آپ ذرا، میری بات سنیں" احمرین نے ساس کا چھوٹا ہوتا منہ دیکھا، اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ گھبرا کر ماں کی بات کاٹنا چاہی، پر رشیدہ ناز تو الٹا بیٹی پر چڑھ دوڑیں، دل کی بھڑاس نکالے بغیر رکنا مشکل ہو گیا تھا۔

"بس۔ بھئی جو ڈھکوسلے تمہارے یہاں ہیں، وہ کہیں اور نہ دیکھے" رشیدہ نے بیٹی کی بالکل نہ سنی۔ دکھ سے چور لہجے میں گویا ہوئیں۔ احمرین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ اس کی امی فون پر ایسی باتیں کریں گی تو وہ کال ہی اٹینڈ نہ کرتی یا احتیاط برتتی۔ موبائل پر ماں کا نمبر دیکھ کر اس نے خوشی خوشی فون اٹھایا، غلطی سے اسپیکر کا بٹن دب گیا۔

"امی۔ پلیز سنیں۔" احمرین ماں کی تیزی کو روکنے کے لیے دوبارہ چیخی۔ ماں کی وجہ سے وہ اتنی خراب سچویشن میں گرفتار ہوئی کہ اس کے ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ شروع ہو گئی۔

"اے بی۔ اپنی چھوڑو! میری سنو۔ اس وقت رافع میاں آفس میں ہوں گے۔ شاید مجھے دوبارہ ایسی باتیں

کرنے کا موقع نہیں مل سکے۔ ویسے بھی ہر وقت تو ساسو ماں سکھی بنی تم سے چمٹی رہتی ہیں۔ بھائی انت ہو گیا۔" احمرین نے پہلا کام تو یہ کیا کہ ماں سے اجازت طلب کیے بغیر فوراً" لائن کاٹ کر سیل فون سوئچ آف کر دیا۔ اس سے زیادہ سننے کی احمرین کی ہمت تھی نہ آنسہ کی برداشت۔ وہ صوفے سے یوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جیسے وہاں کانٹے نکل آئے ہوں۔

"مما جانی۔ پلیز۔ معاف کر دیں۔ وہ۔ یہ سب" احمرین کا شرم کے مارے برا حال تھا۔ جملہ پورا بھی نہ کر سکی۔ آنسہ نے بھیگی بھیگی آنکھیں اٹھا کر بہو کو دیکھا۔ اس نے نگاہیں نہیں ملائیں۔ گلابی ہاتھ بری طرح سے کپکپا رہے تھے۔ آنسہ کے حلق میں ایک دم پھندا سا پڑا۔ وہ خود پر ضبط کرتی چپ چاپ بہو کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

"آج تو خیر نہیں۔ مما جانی نے اگر بیٹوں کے کان میں یہ بات ڈال دی تو۔ اماں کے لاڈلے نے میرا ہاتھ پکڑ کر میکے چھوڑ آنا ہے' امی آپ نے بیٹی سے کیسی دشمنی نبھائی؟" رشیدہ ناز کی اس بے وقوفی پر احمرین نے ماتھا پیٹ لیا۔

"کیا کروں... کیا کروں؟" وہ کمرے میں ننگے پاؤں ہی ٹہلنے لگی' دماغ قابو میں ہی نہیں رہا۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا کہ رافع کو اس بات کی ہوا بھی نہ لگنے پائے۔ یہ بات کسی طرح دب جائے' ورنہ میری امی کے ساتھ ساتھ ان کی نگاہوں میں' میں بھی گر جاؤں گی' فوراً" کوئی تدبیر لڑانی ضروری ہے۔" احمرین کا سوچ سوچ کر برا حال تھا۔ ایک دم مسکراہٹ لبوں کو چھو گئی۔ وہ ایک فیصلے تک پہنچ گئی اور اپنا سیل فون آن کر کے نمبر ملانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"میری اچھائیاں اور خلوص بھی دنیا والوں کو ہضم نہ ہوا۔" آنسہ کا دل دکھ کی شدتوں سے پھٹنے لگا۔

سمدھن کی گل افشانیوں نے پورے وجود کو ایک دھچکا پہنچایا۔ وہ غائب دماغی سے چلتی ہوئی کمرے کی طرف بڑھیں۔ ایک دم بند دروازے سے ٹکرائیں۔ چوٹ زور کی لگی۔ پر دل میں اٹھنے والا درد سوا تھا۔ کسی اور تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوا۔ آنسو ایک دم بہنے لگے۔

"یا اللہ۔ سب اچھا کر کے بھی میں ساس ہی رہی۔ کوشش کی کہ ماں بن کر دکھاؤں۔ ناکام ہو گئی۔ بعض رشتے اتنے مشکوک کیوں ہوتے ہیں۔ انسان کتنی بھی بھلائی کرے۔ دل سے کڑواہٹ نہیں جاتی۔ میں احمرین کی ماں نہ بن سکی۔ ساس ہی کہلائی۔" وہ روتی ہوئی واش روم کی طرف دوڑیں۔ درد بھرا ماضی۔ ان کی راہ میں منہ کھولے کھڑا تھا۔ پرانی باتیں پرت در پرت ذہن میں آ گئیں۔ وہ خود افروزنی کی بہو بن کر اس بڑے سے گھر میں زندگی گزار رہی تھیں تو کٹھن لمحوں کا زہر روح میں سرایت کر جاتا۔ وہ کڑواہٹ اب بھی ان کی زبان تک چلی آتی۔ ان جھمیلوں سے اپنی بہو کو دور رکھنے کے لیے جان توڑ محنت کی۔ اسے دوست بنایا۔ معاشرے کی فرسودہ روایت کو ٹھکرا کر نئی روایت قائم کرنے کی سعی کی مگر آج ٹھوکر کھا کے منہ کے بل جا گریں۔

☼ ☼ ☼

"وقت کبھی کسی کے لیے اپنی راہ کھوٹی نہیں کرتا' چلتا جاتا ہے' چلتا جاتا ہے رکتا نہیں اسی لیے' اچھا ہو یا برا گزر ہی جاتا ہے" آنسہ نے گھبرا کر ماں کے دامن میں چہرہ چھپا کر رونا شروع کر دیا' مریم بی بی نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔ وہ گود میں بیٹی کا سر رکھے اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

"امی جان۔ پلیز اب میں نہیں جاؤں گی۔ آپ کو کچھ نہیں پتا۔ میں نے اتنے سالوں چپ کی مہر ہونٹوں پر لگا کر زندگی گزار دی۔ پر اب تھک گئی ہوں۔ بس مزید نہیں' یقین کریں میری زندگی وہاں ایسی بے آواز گزر رہی ہے۔ جیسے میرا وجود منجمد ہو گیا ہو۔ شادی

کے سات سال ہونے کو آئے' مگر میں ان کے لیے ابھی بھی پہلے دن جیسی اجنبی ہی ہوں۔ عجیب بے حس لوگ ہیں' ان کی خوشی کے لیے میں نے خود کو سرتاپا تبدیل کرلیا' احساسات کو ختم کردیا۔ پتھر بن گئی' پھر بھی ان کے ماتھے کا ایک بل کم ہونے میں نہیں آتا۔ جس کا دل چاہتا وہ مجھ سمیت پورے خاندان کو پُن کرر کھ دیتا۔" آنسہ ماں کا مزاج جاننے کے باوجود بے اختیار پھٹ پڑی۔

"بیٹی۔ وہ کام کیا کرو۔ جو تمہاری ساس اور شریک زندگی کو پسند ہوں۔" مریم بی بی نے اٹھ کر اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو پونچھے اور نرمی سے کہا۔

"امی جان۔ ان کی خوشی کے لیے میں نے سب کرکے دیکھ لیا' ساری دنیا بھلادی۔ صرف ان لوگوں کے حساب سے چلنا شروع کردیا۔ وہ آنسہ جو شاعری کی کتابوں اور ناولوں کی شیدائی تھی۔ اب برتنوں کی چمک برقرار رکھنے کے ٹوٹکے آزماتی ہے۔ بقول میری ساس کے سلیقہ تو یہ ہے کہ برتنوں میں بہو کو اپنی صورت دکھائی دے۔ ادبی پروگرام کی شوقین آپ کی بیٹی اب سارے کوکنگ شوز شوق سے دیکھتی ہے' نت نئی ترکیبیں آزماکر دعوتوں میں ایک سے ایک نئی ڈش پکاکر ان لوگوں کا منہ دیکھتی ہے' سب سرجھکائے کھانا کھاتے چلے جاتے ہیں' مجال ہے جو حوصلہ افزائی کا ایک لفظ بھی منہ سے نکلے۔ آپ کی لاڈلی خواتین کی مخصوص قسم کی گھریلو باتوں سے چڑنے والی آپ کی آنسہ۔ شام کی چائے بناکر ان کے ساتھ آبیٹھتی ہے۔ چپ چاپ ساس اماں کو پورے خاندان کے بخیے ادھیڑتے دیکھتی رہتی ہے۔ اس کے باوجود ... وہ ان کے دلوں میں رتی برابر جگہ نہ بناسکی۔" آنسہ بلبلا کر بولی' مریم بی بی کے دل پر جیسے بڑے زور کا ہاتھ پڑا۔

"تمہاری ساس لڑاکا ہیں؟" انہوں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہاہا۔ امی جان! اتنے بڑے نامی گرامی خاندان سے تعلق رکھنے والوں کو ہر پل اپنے وقار کا خیال رہتا ہے۔ سوئی بھی گرے تو آواز باہر نہ جائے۔ ہمارے یہاں عام گھرانوں کی طرح لڑائیاں نہیں ہوتیں۔ نہ ہی تو تو میں میں۔ بس اک میری ذات کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ جیسے میں اس گھر کا حصہ نہیں' کوئی کمی کمین ہوں۔ جو گھر کا انتظام سنبھالنے اور ان کی نسل کو پروان چڑھانے کے لیے لائی گئی ہوں۔" آنسہ بالکل ہی ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھی' وہاں تو آنسو بہانا بھی جہالت کی نشانی' یہاں دل کھول کر روئے جارہی تھی۔

"بس میری جان۔ صبر۔ بچے ماں کو یوں ہلکان ہوتا دیکھیں گے تو پریشان ہوجائیں گے۔ بے چارے کتنے دنوں بعد تو نانو اماں کے یہاں آئے ہیں۔" مریم بی بی نے دودھ کا کٹورا آنسہ کے ہونٹوں سے لگایا۔

"امی جان۔ ذات کی نفی برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بھلا بتایئے اور کس طرح سے خوشنودی کی سند حاصل کی جائے؟" وہ ماں کی سننے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ آج تو بس اپنے دل کے زخموں پر مرہم لگوانے کا دن تھا۔ بلک کر ماں سے چمٹ گئی۔ مریم بی بی اندر سے تھرائیں۔ اس کے باوجود بیٹی کی ہمت بندھانا ان کا فرض اور تربیت کا امتحان ٹھہرا۔

"نہیں آنسہ۔ میری بچی۔ ابھی تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ ابھی سے تھکنے لگی ہو۔ تھوڑا وقت اور گزر جانے دو۔ سب اچھا ہوجائے گا۔ دیکھنے والی نگاہوں کو بھی کسی آرائشی گلدان کو اپنے ڈرائنگ روم میں سجا دیکھنے کی عادت ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ ہم سب تو پھر انسان ہیں۔ دل بڑا کرو۔ کچھ ان کو سمجھنے دو۔ تھوڑا خود کو سمجھاؤ۔" مریم بی بی نے بیٹی کو چاہ سے سمجھاتے ہوئے آخر میں ٹٹولا۔

"امی جان۔ سات سال بیت گئے۔ مجھ سے پوچھیں کیسے گزارا کیا ہے؟" وہ ایک دم چیخی۔

"اف میرا بچہ۔ یہ بتاؤ محمود میاں تو تمہارے ساتھ ٹھیک رہتے ہیں" وہ بیٹی کی بات پر کچھ کچھ قائل نظر آئیں' پھر داماد کا خیال آیا۔

"امی جان۔ اگر وہ ہی ساتھ دیتے تو زندگی کے سفر کی صعوبتیں کم ہوجاتیں۔ میں زبان پر شکوہ نہیں لاتی۔ مگر ان کی کیا پوچھتی ہیں؟ جیسے اپنی کوئی مرضی ہی نہیں۔

وہ تو صرف ماں کے اشاروں پر چلنے کے عادی ہیں۔ چلیں۔ ان کی فرماں برداری اچھی عادت ہے۔ پر کیا میرا کوئی حق نہیں۔ ہمارے بیچ ہونے والی ہر بات جا کر ماں کو بتانا کون سا ان پر فرض ہے؟ اب۔ انسان اپنے شریک حیات سے بھی دکھ درد بتاتے ہوئے ڈرے کہ ہمارے کمرے کی بات الم نشرح نہ ہو جائے۔" وہ بے اختیار بولتے ہوئے زبان دانتوں تلے دبا گئی۔ اپنے سرخ ہونٹوں کو بھینچا' جن پر پیڑیاں سی جم گئی تھیں' اس کی خوب صورت آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔

"خیر۔ یہ تو داماد جی بہت غلط کرتے ہیں۔ بیوی کی بات شوہر کے پاس امانت ہوتی ہے۔ اگر اچھی نہ لگے تو اسے ڈانٹ کر یا سمجھا کر وہیں ختم کر دینی چاہیے۔ مگر کسی دوسرے کو بتانا خیانت کے مترادف ہے۔" انھوں نے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

"یہ سب چیزیں کبھی کبھی ناقابل برداشت ہونے لگتی ہیں" آنسہ نے اداسی سے آہ بھری۔ مریم بی بی نے بیٹی کا زرد چہرہ دیکھا اور ہاتھ ملنے لگیں۔

"بیٹی مجھے معاف کر دو۔ مجھ بیوہ سے جو ہو سکا تم لوگوں کے لیے کیا۔ خوش تھی کہ بڑی بیٹی کا نصیب اتنے بڑے خاندان میں کھلا۔ میں تو فائزہ کے لیے ہی پریشان تھی کہ اس کے میاں کی تنخواہ قلیل تھی۔ پر وہ بڑے دل والا نکلا۔ بیوی کو کبھی تکلیف نہ دی۔ تمہارے معاملے میں تو کوئی تردد ہی نہیں تھا۔ کیا خبر تھی کہ اتنے چاؤ سے بیاہ کر لے جانے والی افروز بی ایسا سلوک کریں گی؟" مریم بی بی ایک دم دل تھام کر بیٹھ گئیں۔ آنسو گالوں پر بہنے لگے۔ آنسہ کے سسرال والوں کے بارے میں ان کا اندازہ کتنا غلط ثابت ہوا۔ ماں کی بگڑتی حالت دیکھ کر آنسہ کے دل کو کچھ ہوا' ابا جان کے گزر جانے کے بعد ان لوگوں کے لیے اب وہ سب کچھ تھیں۔ دوڑ کر کچن میں گئی ماں کے لیے گلاس میں گلوکوز گھول کر لے آئی۔

"او کے... امی جان۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ایک بار پھر وہاں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کروں گی۔" آنسہ نے جلدی سے ماں کو گلوکوز پلایا اور ان کا ہاتھ تھام کر نرمی سے دباتے ہوئے بولی۔

"ہاں میری بیٹی... اب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں... تمہارے بچے ہیں... وہ چند سالوں میں تمہارا سہارا بن کر کھڑے ہو جائیں گے تو زندگی سہل ہو جائے گی۔" مریم بی بی نے بیٹی سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

"امی جان... ان لوگوں کی وجہ سے تو جی رہی ہوں... وہ تو میرا مان سمان ہیں۔" آنسہ کے کمزور چہرے پر ممتا کی چاندنی چٹکی۔ اس نے اچھی بیٹی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے ماں کو تسلی دی۔

"ایک اور بات بیٹا۔ برا نہیں ماننا... مگر آئندہ یہاں آکر اپنے سسرال کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا' میں تمہاری ماں ہوں' جو دنیا میں سب سے زیادہ اپنی اولاد سے پیار کرتی ہے... جذبات میں آکر کوئی ایسا مشورہ نہ دے بیٹھوں' جو تمہاری عائلی زندگی کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔" مریم بی بی نے بیٹی کو سینے سے لگانے کے بعد دھیرے دھیرے سمجھایا تو' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم چھوٹے کو کچھ کھلاؤ... کافی دیر ہو گئی ہے۔ میں... ذرا عصر کی نماز پڑھ کر آتی ہوں۔" مریم بی بی نے کمر پر ہاتھ رکھ درد کو دبایا۔ زیر لب آنسہ کی خوشیوں کی دعائیں مانگتے ہوئے پلنگ سے سفید پاؤں لٹکا کر سلیپر پہنے۔ ماں بیٹی کافی دیر سے نیم کے درخت تلے ڈالے گئے پلنگ پر بیٹھی اپنے دکھ سکھ میں مشغول تھیں۔

"میری بیٹی... کتنی شوخ و چنچل' کھلا ہوا پھول لگا کرتی تھی' ایک دم بکھر کر رہ گئی ہے۔" مریم بی بی وضو کرنے کے بعد رسی پر پڑے تولیہ سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بے خیالی میں آنسہ کے اداس چہرے کو تکتے ہوئے سوچ میں کھو گئیں۔

مریم بی بی نے زندگی میں خوشیاں کم اور دکھ زیادہ جھیلے تھے... شوہر ناصر خان کو جوانی میں ہی پھیپھڑوں کے کینسر جیسا موذی مرض لگ گیا... وہ چھوٹی بچیوں کا

ساتھ۔ بیمار شوہر کو لیے۔ وہ کبھی اس اسپتال کے چکر کاٹتی۔۔۔ کبھی اس اسپتال کے' ساتھ ہی ساتھ معلمہ کا کورس کرکے بچوں کے ایک مدرسہ کی منتظمہ بن گئیں۔ آنسہ سولہ کی اور فائزہ چودہ سال کی تھی تو شوہر کا انتقال ہوگیا۔ زندگی کا ٹمٹماتا دیا بھی بجھ گیا۔

دنیا کی لمبی زبان سے ڈرتی تھیں۔ آنسہ کی شادی میں جلدی مچائی اور اٹھارہ سال کی عمر میں ہی اس کو رخصت کردیا۔ وہ زندگی میں ہی دونوں بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔ فائزہ کے مقابلے میں آنسہ حسن و جمال اور مریم کی اچھی تربیت کی بہترین مثال تھی۔ اسی لیے افروزبی نے بہت محبت اور چاؤ سے اس کا ہاتھ مانگا۔ خوبرو اور قابل محمود علی' انہیں اپنی شہزادی جیسی بیٹی کے جوڑ کے لگے۔ شادی میں جلدی مچائی۔

آنسہ کی جن خوب صورت آنکھوں سے کبھی بجلیاں کوندے مارتی تھیں۔ اب وہاں اداسی نے قبضہ جمالیا تھا۔

"میری پھول سی بچی۔۔۔ کیسے ناقدرے لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی' کتنی ذمہ دار ہوگئی ہے۔ پھر بھی کوئی خوش نہیں ہوتا۔" مریم کی آنکھیں بھر آئیں' دل کٹنے سا لگا' خود پر ضبط کے پہرے بٹھائے' وہ چپ چاپ اپنے چھوٹے بیٹے عارب کو چائے بسکٹ کھلا رہی تھی' چہرے کا الہڑپن اور معصومیت قائم تھی۔ مگر دکھوں کے نقاب نے چہرے کو دھندلا دیا تھا۔

"یا اللہ۔۔۔ مجھ سے کہاں ایک غلط اسٹروک پڑ گیا کہ میری زندگی کی تصویر کے رنگ گڈمڈ ہوگئے ہیں۔" عارب کھائی کر وہیں اس کے پہلو میں بیٹھا کھیل رہا تھا۔ آنسہ پلنگ پر لیٹی آسمان کو تکتے ہوئے سوچنے لگی۔

✿ ✿ ✿

"صاحب۔۔۔ پلیز شام کو سینما دیکھنے چلتے ہیں نا۔ سچ میں فائزہ بتا رہی تھی کہ۔۔۔ بڑی شاندار مووی لگی ہوئی ہے۔" آنسہ نے بہت دنوں بعد محمود علی سے فرمائش کی۔ تازہ تازہ میکے سے واپسی ہوئی تھی۔ پرانی والی آنسہ چھلک اٹھی' کچھ ماں کے سمجھانے کا اثر تھا۔

"بیگم صاحبہ۔۔۔ شاید آپ کے مزاج بخیر نہیں' ہماری سات پشتوں میں سے بھی کبھی کسی نے سینما کا رخ نہیں کیا' ضروری نہیں کہ جو آپ کی بہن صاحبہ کریں' ان کی حرص میں آپ بھی دوڑیں۔۔۔ ویسے بھی ان لوگوں کی تو رہنے دیں۔۔۔ اطوار ہی نرالے ہیں۔" محمود علی نے اپنے سے دس سال چھوٹی حسین و جمیل بیوی کو بلا ہچکچاہٹ لتاڑا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ تین بچوں کی ماں ہے۔

"کیوں کیا وہ لوگ مریخ سے آئے ہیں۔" آنسہ نے اپنے چمکیلے گھنے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے بےزاری سے پوچھا۔

"اب ہمارا منہ کھلوایا ہے تو سچ سننے کا حوصلہ بھی رکھیے گا۔ ان کے سسرال کے تو عجیب رنگ ڈھنگ ہیں' رات گئے تک جاگنا' دن چڑھے سونا۔ ہوہو۔۔۔ ہاہا۔۔۔ ہی ہی۔۔۔ ٹھی ٹھی۔۔۔ نہ وقت دیکھتے ہیں نہ موقع۔۔۔ چھوٹی سی بات پر بھی سارا گھر بےوقوفوں کی طرح ہنسی مذاق میں لگ جاتا ہے۔ چھوٹا ہو یا بڑا۔ ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا اور جہاں تک سالی صاحبہ کی بات ہے وہ تو سپر وومین ہیں' اپنی ساس کے ساتھ بیٹھ کر نہ صرف ڈرامے دیکھتی ہیں' بلکہ کسی آئے گئے کا لحاظ کیے بغیر دونوں خواتین ان پر سیر حاصل تبصرہ بھی کرتی ہیں۔ نا بھئی نا۔۔۔ ہم جیسے خاندانی لوگوں کے لیے ایسی باتیں برداشت کرنا مشکل ہے۔"

محمود علی جو چھٹی کے دن آرام فرماتے تھے۔ بیوی کے جوش دلانے پر چبا چبا کر وہاں کا آنکھوں دیکھا حال سنانے لگے۔ کوئی عورت بھی شوہر کے منہ سے اپنے میکے والوں کی برائی سننے کی روادار نہیں ہوتی۔ وہ محمود علی کے یوں کہانی سنانے پر چڑ گئی' یہ سچ تھا کہ فائزہ کے سسرالی۔۔۔ محمود کے گھر والوں کے مقابلے میں خاصے وسیع ذہن کے تھے' تاہم ان کے یہاں بھی ایک دوسرے کا احترام لازمی تھا۔ محمود علی ہمیشہ سے ان کے

معاملے میں تعصب دکھاتے آئے فائزہ بھی اپنے نام کی ایک تھی شروع سے ہی بہنوئی کی بے جا شیخیوں پر مرعوب ہونے کے بجائے ہنستے ہنستے انہیں سناتی آئی۔ بس یہ ہی برداشت نہ تھا۔ وہ ان لوگوں کے لیے دل میں عناد پال بیٹھے۔

"فائزہ کے سسرال والے۔۔۔ زندگی کو ایک ہی ڈگر پر نہیں چلاتے ہیں۔ نہ ہی وہاں۔۔۔ دقیانوسی پن ہے۔ اس گھر کے ماحول جیسا بوگس' بے تکے اصولوں میں لپٹا ہوا۔ بورنگ" آنسہ نے خون کے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے شوہر کو بغور دیکھ کر سوچا اور چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ کا لبادہ اوڑھ لیا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ فائزہ کے گھر کا ماحول بڑا خوشگوار اور کھلا کھلا ہے۔ اسی لیے تو بچوں کا خالہ کے یہاں بار بار جانے کو دل کرتا ہے۔ انصر بھائی اور ان کے گھر والے کتنے سادہ اور پر خلوص لوگ ہیں۔ مشکواۃ اور رافع بنا کسی ڈر و خوف کے وہاں آتے جاتے ہیں۔" آنسہ نے دبی زبان میں بچوں کے ساتھ ددھیال والوں کے امتیازی سلوک کے بارے میں بتانے کی کوشش کی۔

"اچھا۔ تو یہ کہانی ہے حق ہے۔ اماں جان کبھی غلط نہیں کہتیں۔ انہوں نے ہمیں پہلے ہی ہوشیار کیا تھا کہ آپ بچوں کو ہم سے باغی بنا رہی ہیں۔ ہم نے یقین نہ کیا۔ آج آپ نے اپنی کم عقلی کا ثبوت اپنی باتوں سے دے دیا۔ بچوں کا خالہ کے یہاں بہت دل لگتا ہے۔ اپنے گھر میں کیا ان کو کوئی کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے؟" محمود علی ایک دم لال پیلے ہو کر ہتھے سے اکھڑ گئے' ہاتھ میں تھاما اخبار زور سے میز پر پٹخا اور بیوی پر آنکھیں نکال کر بولے۔ وہ ڈر کر جلدی سے ان کے قریب جا بیٹھی۔ نرمی سے ہاتھ تھام لیا۔ بیوی کی اس ادا پر ان کا پارہ نیچے آنا شروع ہوا۔

"یہ گھر نہیں قید خانہ ہے بس ایک ہی روٹین پر چلو۔ قیدیوں کی طرح جیو۔ وقت پر سو جاؤ' نور کے تڑکے اٹھ کر جو کام میں جتو تو رات گئے جا کر چھٹی ملتی۔ زور سے نہ بولو۔ ہنسی مذاق نہ کرو۔ ایک انچ بھی اپنے معمولات سے نہ ہٹو۔۔۔ صاحب۔ بچوں کو تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بھی آزادی سے ہنسنا بولنا اور کھیلنا چاہتے ہیں' جب اپنے گھر میں انہیں اس کی اجازت نہیں تو وہ دوسروں کی طرف جائیں گے نا۔ آپ کی بہن کے بچوں کی طرح ان کا دل بھی والدین کے ساتھ تفریح کرنے کا خواہش مند ہے۔ نیا پن ہر انسان کو بھاتا ہے۔"

آنسہ نے آج شریک حیات سے دل کی بات کرنے کی ٹھانی۔ ان کے پاس بیٹھ کر بولتی چلی گئی۔ اب تو بچوں کو بھی گھر والوں کے رویے سے شکایت ہونے لگی تھی۔ رافع تو باقاعدہ غصے کا اظہار کرتا۔ وہ اپنے بچوں میں کوئی کجی یا کمی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے شوہر کو سمجھایا۔

"ہاں۔۔۔ تو آپ کو منع کس نے کیا ہے؟ گھر میں چار چار گاڑیاں موجود ہیں۔ بچوں کو ڈرائیور کے ساتھ جہاں دل چاہے گھمانے پھرانے لے جائیں۔" محمود علی نے اپنی کالی واسکٹ اٹھا کر جھاڑی اور یوں مخاطب ہوئے' جیسے پہلی بار اس گھر میں آئے ہوں۔ اماں جان کا مزاج۔ جانتے نہ ہوں۔۔۔ جس دن آنسہ نے بچوں کے ساتھ کہیں جانے کا عندیہ بھی دیا۔ پورے گھر میں طوفان آجاتا تھا۔

"صاحب۔۔۔ آفرین ہے۔ میں کب سے اتنی بااختیار ہو گئی۔۔۔ ویسے بھی میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں بچتا ہے؟ گھر کی' دال روٹی کی فکر کروں۔۔۔ صفائی ستھرائی کرواؤں۔ ورنہ مہمانوں کی تواضع کے انتظام میں لگی رہوں۔۔۔ میرا تو بس اتنا ہی رول ہے۔ زندگی نہ ہو گئی۔۔۔ حساب کا فارمولا ہو گئی۔ جو ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ پر لگاتے چلے جاؤ۔" آنسہ انہیں واسکٹ پہننے میں مدد دیتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولی۔ آج تو ساری حدیں کراس کرلیں۔ اندر سے دل ڈر رہا تھا کہ افروزنبلی کے کانوں تک ساری باتیں نہ پہنچ جائیں۔

"ہونہہ!" آئینے کے سامنے بال سنوارتے ہوئے انہوں نے بیوی کی بات پر ہنکارا بھرا۔ وہ چھٹی والے

دن پرانے دوستوں کی طرف نکل جاتے تھے۔

"ایسا کرتے ہیں آج بچوں کو لے کر ان کی پسند کے پارک اور وہاں سے ڈنر پر جاتے ہیں۔ بچے... یہ بھی خوش ہو جائیں گے۔" وہ بڑے جوش میں انہیں گھڑی اور موبائل تھماتے ہوئے بولی' خلاف توقع... صاحب کا مزاج گرم ہوتا نہ دیکھ کر حوصلہ پیدا ہوا۔ بات ختم کر کے سوالی کی طرح ان کا منہ تکا۔

"ہم کسی کو کہیں لے کر نہیں جا رہے ہیں... آپ کا لیکچر ختم ہو گیا ہو تو... اماں بی کے کمرے میں حاضری دیں۔ آمنہ کے سسرال والے رات کے کھانے پر آ رہے ہیں۔ وہ آپ سے دعوت کے بارے میں کوئی بات کرنے کی خواہش مند ہیں۔" محمود علی نے بیوی کا تمسخر اڑانے کے بعد ہدایت جاری کی۔ آنسہ لمبے چوڑے سرخ و سفید محمود علی کو دیکھ کر رہ گئی۔ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک ہی چیز کا تصور آیا "چکنا گھڑا" مجال ہے جو بیوی کی کہی کوئی بات ان کے دماغ میں ٹھہر جائے۔ دعوت کا سن کر ایک تکان سی رگ رگ میں سمانے لگی۔

"کمال ہے... مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرہ سمیٹنے لگی۔

چھوٹی نند آمنہ کی منگنی پچھلے مہینے ہوئی تھی۔ اس کے سسرال والوں کی ایک بڑی بری عادت تھی۔ وہ لوگ جب بھی یہاں آتے چھاپہ مار ٹیم کی طرح ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بجائے پورے گھر میں بے تکلفی سے دندناتے پھرتے۔ نیا نیا... رشتہ تھا' افروز بی... دل میں پیچ و تاب کھانے کے باوجود اوپری طور پر مسکراتی رہتیں' اسی لیے جس دن ان کی آمد ہوتی' اس کے سسرال میں سب کو ہائی الرٹ کر دیا جاتا۔

"بس ہو گئی صفائی... برائے مہربانی فوراً" بڑے کمرے میں پہنچیں۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں اماں جان کا نزلہ ہم پر گر جائے۔" محمود علی نے کالی پشاوری چپل میں اپنے پاؤں پھنسائے اور عجلت میں گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکلنے سے پہلے ایک منٹ مڑ کر دیکھا۔ آنسہ ہاتھ میں جھاڑن لیے کسی سوچ میں گم کھڑی تھی۔ اسے ٹوکنا ضروری سمجھا۔ وہ بھی بڑے کمرے کی طرف چل دی۔

* * *

"بوا... یہ قہوہ سب کے سامنے رکھ دیں میں خشک میوے لے کر آتی ہوں۔" آنسہ نے قیمتی سامان سے سجے اس بڑے سے ڈرائنگ روم میں نرم صوفوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف لوگوں پر ایک نگاہ دوڑائی اور بوا کو پکار کر ٹرے تھمادی۔

"چلو... تم لوگ بڑوں میں کیا کر رہے ہو؟ کتابیں نکال کر بیٹھو' میں آ رہی ہوں۔" اس نے کرسٹل باکس میں بھرے پستے' چلغوزے اور کاجو سب کے سامنے رکھنے کے بعد نند کے بچوں کے ساتھ مشکواۃ اور رافع کو بیٹھا دیکھا تو جل بھن کر رہ گئی۔ انہیں غصے میں ہدایات جاری کیں۔ عارب ابھی چھوٹا تھا' ماں سے چپکا رہتا... کام کے وقت وہ اسے بوا کو تھما دیتی۔

"اماں جان... آپ نے دیکھا۔ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی بھابھی کا منہ کتنا پھول جاتا ہے۔" ثریا نے رنگی ہوئی مخروطی انگلیوں والے ہاتھوں کو بڑی اسٹائل سے لہراتے ہوئے کہا۔ آمنہ کے سسرال والوں کی آمد ہو اور اماں جان اپنی شادی شدہ بیٹیوں کو جمع نہ کریں۔ ایسا بھلا کیسے ممکن تھا؟ دونوں کو صبح ہی فون کر دیا گیا تھا' شام ہوتے ہی میاں بچوں سمیت دونوں یہاں پہنچ گئیں۔ کافی سارے لوگ رات کے کھانے پر موجود تھے۔

بیگ ہاؤس میں بڑی بڑی دعوتوں میں بھی کھانا گھر پر پکانے کا ہی رواج تھا۔ وہ بھی کئی اقسام کے پکوان کے ساتھ کم از کم دو طرح کے میٹھے' آنسہ شوہر سے ہر دفعہ باہر سے کیٹرنگ کروانے کی خواہش کا اظہار کرتی' مگر سنتا ہی کون تھا؟ ایک دو دفعہ بیوی کے مجبور کرنے پر محمود علی نے دبی زبان میں ماں کو باہر سے کھانا پکوانے کا مشورہ دیا' چھوٹے بھائی شاہد نے بھی بھائی کی بات پر مثبت رائے دی' مگر افروز بی تو کسی طور نہ مانیں۔

"بھیا... یہ کون سا پہاڑ توڑنے جیسا کام ہے' گھر

میں چار چار عورتوں کے ہوتے ہوئے باہر سے کھانا کیوں پکوایا جائے؟ ابھی علی بیگ کے خاندان پر ایسا برا وقت نہیں آیا۔" افروز بی نے اپنے مہندی لگے ہاتھوں کو نچاتے ہوئے غصے سے کہا۔ ساس کے جلال پر پاس بیٹھی آنسہ کی جان ہی نکل گئی پر منہ سے ایک لفظ نہ نکال سکی دل بول پڑا۔

"اماں جان۔۔۔ چار میں سے آمنہ اور اپنے آپ کو تو اس لسٹ میں سے نکال ہی دیں۔۔۔ اب بچیں۔ بوا تو وہ اس عمر میں حتی المقدور ساتھ دیتی ہیں' مگر پکانے کی ساری ذمہ داری لینا ان کے لیے بہت مشکل ہے۔ مجبوراً" گھر کی بڑی اور فی الحال اکلوتی بہو ہونے کی حیثیت سے دعوت کا سارا بوجھ میرے ہی کاندھے پر آگرتا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں ان سے مخاطب ہو کر بھرپور احتجاج کیا۔

"میاں۔۔۔ ذرا ہمارے کمرے سے ہوتے ہوئے جائیے گا۔ ہم بھی تو سنیں۔۔۔ آپ کے دماغ میں نت نئی باتیں کہاں سے آنے لگی ہیں۔" وہ اپنے سفید دوپٹے کو نماز کے لیے سر کے گرد لپیٹنے کے ساتھ ساتھ آنسہ کو گھورتے ہوئے گویا ہوئیں۔ محمود نے ماں کی خوشنودی میں فوراً" ہی سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں ماں کے کمرے کے درشن کرنے کے پورے ایک ہفتے بعد تک محمود علی منہ ٹیڑھا کیے پھرتے رہے۔ بیوی تو بیوی۔ افروز بی کے سامنے بچوں سے بھی محتاط انداز میں یوں مخاطب ہوتے جیسے کوئی جرم کیا ہوا۔

وہ دن اور آج کا دن۔۔۔ پھر آنسہ نے باہر سے کھانا پکوانے کی فرمائش کرنے سے کان پکڑے۔ یہ اور بات تھی کہ اتنے لوگوں کی خاطر داری کرنے کے بعد اسے اپنا موڈ ٹھیک رکھنا مشکل ہو جاتا۔

"اماں جان۔۔۔ آپ نے آج کی دعوت میں بھابھی کے ہاتھ کی بنی ہوئی رس ملائی کھائی تھی' اف کتنی سخت تھی۔ ہمارے میاں کھاتے ہوئے منہ بگاڑ رہے تھا۔ ہم بھی تو بناتے ہیں' اتنی نرم بنتی ہیں کہ منہ میں جاتے ہی گھل جائیں۔۔۔ سچ میں پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ گھر کی بنی ہیں یا بازار سے منگوائی گئی ہیں۔" آنسہ کی نند رانیہ نے کاجو کو منہ میں رکھتے ہوئے ماں سے شکوہ کیا۔

"صحیح کہہ رہی ہو بیٹی! پچھلی دفعہ بھی جب ہم نے آپ سب کو کھانے پر بلایا تو۔۔۔ دلہن کا منہ اتر گیا تھا' اللہ معاف کرے۔۔۔ ایسی حلیم پکائی کہ دال کا ایک دانا الگ الگ دکھائی دے رہا تھا گھوٹا لگایا ہی نہیں تھا' چاٹ مسالہ بھی بازار سے منگوا کر ٹرخا دیا گیا۔ یہ تو آج کل سارے کھانوں کا ناس مارنے پر تلی رہتی ہیں۔ لگتا ہے۔ محمود علی کے کان مروڑنا پڑے گا۔"

افروز بی نے اپنے جوڑے میں پن کھبوتے ہوئے دانت پیس کر غلط بیانی کی انتہا کر دی۔ اس دوران عارب کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا' آنسہ نے روتے بلکتے بچے کے ساتھ بڑی مشکلوں سے سارے کام نمٹائے۔ شاید اسی لیے صرف حلیم میں کسر رہ گئی' مگر باقی سارے کھانے مزیدار تھے' مگر اس کا کوئی ذکر نہیں۔

"ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ایسی دلہن ہیں۔ ہماری برداشت کا امتحان ہی رہتی ہیں۔" افروز بی کریم رنگ کے ۔۔۔ کے کاٹن کے نفیس سوٹ' پر شیفون کا دوپٹا لیے مہندی لگے گھنے بالوں کو جوڑے میں لپیٹے اور کانوں میں پہنی سونے کی بالیوں میں موتیا پروئے' بہت پروقار لگ رہی تھیں۔ کاش ان کی باتوں میں بھی ایسا وقار قائم رہتا۔

"ہم تو کہتے ہیں کوئی پکا انتظام کر لیں۔ ماشاء اللہ۔۔۔ شاہد بھائی نے سی اے مکمل کر کے جاب شروع کر دی ہے۔ ان کی شادی کر دیتے ہیں۔ اس طرح گھر میں دو بھابیاں موجود ہوں گی تو صرف ایک کا منہ نہیں دیکھنا پڑے گا۔ دونوں ایک دوسرے سے مقابلے بازی میں لگ جائیں گی تو ہم سب کے آگے پیچھے پھریں گی۔" ثریا اپنے ہاتھوں میں پہنے سونے کے جڑاؤ کنگن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دور کی کوڑی لائی اور داد طلب نگاہوں سے ماں بہنوں کو دیکھنے لگی۔

"اماں جان۔۔۔ آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں ہماری شادی بھی ہو رہی ہے' آئے دن دعوتیں ہوں گی۔ بھابھی کا یہ

ہی حال رہا تو ہمیں کتنی سبکی اٹھانی پڑے گی۔" آمنہ بھی مسکراتی ہوئی ان کے بیچ آبیٹھی' اس نے چہرے کی کلینزنگ کرتے ہوئے روئی سے میک اپ صاف کیا جو سسرال والوں کی آمد پر جی بھر کے تھوپا گیا تھا۔

"نہیں... بھئی۔ ابھی سے دوسری بہو کے مسئلے میں الجھنا نہیں چاہتے۔ یہاں ایک کو ہی سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے' ہم تو ایک بات جانتے ہیں جس کو دنیا میں کوئی غم نہ ہو ایک بہو لے آئے' غم کا مطلب اچھی طرح سے سمجھ میں آجائے گا۔" افروزبی نے دلگیر لہجے میں کہا شاید نا قدرے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

"اماں جان... ویسے آنسہ بھابھی دل کی بہت اچھی ہیں۔ سب کا کتنا خیال رکھتی ہیں۔" آمنہ جو اس گھر سے جانے والی تھی' آج کل گھر کے ہر فرد کے لیے دل گداز ہو رہا تھا ایک دم سچ بول پڑی' اسے ماں بہنوں کے منہ کے ٹیڑھے میڑھے زاویے دیکھ کر احساس ہوا کہ کچھ غلط بول دیا ہے۔

"تم لوگوں کو کیا پتا کہ ساس بن کر کس طرح کی باتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں' ابھی ہم سے یہ سب کرنے کا نہ کہو۔" افروزبی نے تیوریاں چڑھا کر بیٹیوں کو صاف انکار کیا۔ رانیہ نے چھوٹی بہنوں کا منہ لٹکے دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے صبر کا کہا' اور اماں جان کے خرگوش سے سرخ و سفید پاؤں اپنی گود میں رکھ کر دباتے ہوئے دھیرے دھیرے جانے کون سا منتر پڑھ کر پھونکا کہ وہ نیم رضامند ہو گئیں۔ دونوں بہنوں نے ماں کے ہامی بھرنے پر خوشی سے جپھی ڈال دی۔

"ہماری اماں جان... زندہ باد۔" نندوں کے پر مسرت انداز میں بولنے پر آنسہ ایک دم چونک اٹھی۔ وہ ڈرائنگ روم سے متصل ڈائننگ روم میں ابھی برتن رکھنے آئی تھی۔ ان سب کو خوش باش ایک ساتھ بیٹھا دیکھ کر اپنے اجنبی ہونے کا احساس بڑھ گیا۔ وہ جب بھی ایک ساتھ بیٹھتی تو سب کو نولفٹ کا بورڈ دکھا دیتیں۔ آنسہ خوش اخلاقی دکھاتی کبھی ان کے درمیان جا کر بیٹھ بھی جاتی تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ وہ سب ایسے خاموش ہو جاتیں جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

بلوریں گلاس ٹشو سے صاف کر کے کیبنٹ میں رکھتے ہوئے آنسہ کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔ کام ختم کر کے اسے اپنے بچوں کی پڑھائی کی فکر ہوئی۔ بچوں کے ٹرم بھی چل رہے تھے' مگر اس شور و غوغا میں یکسوئی سے پڑھنا مشکل بات تھی۔ سب کو مگن دیکھ کر بچوں کو لے کر وہاں سے چلی گئی' جسے سب نے موڈ آف ہونے سے تعبیر کیا۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ پورے دن ایک پاؤں پر کھڑے رہنے کے بعد اب آنسہ کا وہ حال تھا جیسے تھکان کے تند و تیز ریلے نے اس کے وجود کو اپنی زد میں لے لیا ہو۔

٭ ٭ ٭

"برا وقت گزر ہی گیا۔" مریم بی بی نے بالکل درست تجزیہ کیا تھا۔ بیٹیوں کے مشورے پر افروزبی نے چھوٹے بیٹے کی شادی تو کر دی۔ آئمہ نئے زمانے کی لڑکی تھی' وہ بہت دنوں تک ان کے روایتی اور فرسودہ اصولوں کو برداشت نہ کر سکی۔ اس کے لیے یہاں ایڈجسٹ ہونا کافی مشکل ہو گیا۔ آئمہ نے خود کو بدلنے کے بجائے شاہد کو لے کر اپنا ٹھکانا بدل لیا' وہ لوگ شہر کے دوسرے سرے پر کرائے کے بنگلے میں شفٹ ہو گئے شاہد مقامی بینک میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا تنخواہ کے علاوہ کئی مراعات حاصل تھیں۔ آئمہ کیوں کسی کی بے جا سنتی' ایک سن کر دس سنا دیتی... بات ناقابل برداشت ہوئی تو علیحدہ ہو گئی۔

شاہد کے حوالے سے افروزبی کی آنکھوں میں جو خواب بسے تھے' ان کی کرچیاں چبھنے لگیں۔ بیٹے کو یوں ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر وہ شکست خوردہ سی ہو کر خاموش ہو گئیں۔ طنطنہ گیا تو اتنے سالوں بعد جا کر سب کو آنسہ کی قدر آئی۔ افروزبی اور ان کی بیٹیوں نے اب گھر کے ہر فیصلے میں آنسہ کو شمولیت کو ضروری سمجھا۔ محمود علی بھی بیوی کی قربانیوں کو سراہنے لگے۔ حالات بدل گئے' آنسہ کے اندر خوشی کا احساس نہ جاگا' اب دل میں وہ ولولہ نہ رہا' مگر یہ ضرور ہوا کہ اس نے سب کو معاف

کرویا۔ بوڑھی بیمار ساس کے علاوہ بھی وہ سب کا اتنا خیال رکھتی کہ اس کا دامن دعاؤں سے بھر جاتا' اب وہ کوشش کرتی جو کرے دکھاوا نہ ہو بلکہ اس کی مرضی کے مطابق ہو جو دلوں کے حال جانتا ہے۔ انسانوں کے لیے نہیں۔ دل میں جیسے سکون اترتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

آنسہ کی جوانی بڑھاپے کی سرحدوں کو چھو بیٹھی۔ سب کچھ بدل سا گیا' اماں بی نہ رہیں۔ محمود علی بھی ریٹائرڈ ہو کر چپ چاپ گھر کے معاملات سے بے خبر اپنا زیادہ وقت نماز روزے یا کتابوں کے بیچ گزارنے لگے۔ بچے قابل نکلے۔ ماں کو جیسے ہتھیلی پر بٹھا کر رکھتے مشکواۃ کی شادی کے بعد جب گھر کی تنہائی آنسہ کو کاٹ کھانے لگی تو فائزہ کے چھیڑنے پر بڑے بیٹے کی شادی کا سوچا۔

آنسہ کے اندر جیسے توانائی اُمڈنے لگی۔ پر اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے اس نے خود سے عہد کیا کہ وہ کبھی روایتی ساس نہیں بنے گی۔ بہو کی سانسیں گھونٹنے کے بجائے اس کو جینے کا مکمل حق دے گی۔ اپنی ماں سے کیا گیا ہر وعدہ ذہن میں دہرانے لگی۔ فراغت حاصل ہوئی تو ماں کی باتوں پر غور کرنے کا موقع ملا۔

"دیکھو آنسہ... عورت کو مکتب انسانیت کی پہلی معلمہ سمجھا جاتا ہے' اسی کے دم خم پر نئی نسل کی تعلیم و تربیت اور گھر کا نظام خوش اسلوبی سے چلتا ہے' وہ چاہے دنیاوی رشتوں میں ماں' بہو' بیٹی' ساس' نند' یا بھابھی ہو' پر ان سب سے پہلے ایک عورت ہے' رشتوں کی پاس داری اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ بدقسمتی سے کچھ خواتین اپنی روح کو حسد' جلن اور جہالت کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتی ہیں' اندھے جذبات میں آکر ایسے فیصلے کر بیٹھتی ہیں جس سے دوسروں کے علاوہ خود کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ اس کے برعکس مہذب' عقل مند اور تعلیم یافتہ خواتین اپنے گھروں کے لیے روشنی کا منبع بنی رہتی ہیں ان کے دم سے گھر کا ہر حصہ جگر جگر کرتا ہے' مجھے امید ہے کہ میری بیٹی تمام رشتوں سے بالاتر ہو کر عورت ہونے کی عظمت سمجھے گی۔ اپنے گھر میں روشنی پھیلانے کا سبب بنے گی۔"

مریم بی بی جب بھی بیٹی کو سمجھ داری کی ایسی باتیں بتاتیں' وہ اپنی ماں کا منہ حیرت سے تکتی رہ جاتی۔ انہوں نے ایسی مشکل باتیں کہاں سے سیکھیں۔ آج وہ تو دنیا میں نہ رہیں پر ان کی سچی اور نیکی کی باتیں پھولوں کی طرح آنسہ کے اردگرد مہکتی رہتیں۔

ماں سے میکہ اور ساس سے سسرال کی روایت کو بدلنے کی خواہش میں آنسہ نے اپنی ساری صلاحیتوں کو چیلنج کر دیا۔ سب سے پہلے تو رافع کے لیے گھر گھر جاکر لڑکی تلاش کرنے کی روایت کو بدلا۔ محمود علی سے مشورہ مانگا۔ شوہر اب ان کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرتے' اولادوں کے معاملات بھی ان پر ہی چھوڑ کر خود کنارہ کش ہو گئے۔

"پچاسوں لڑکیاں دیکھنے کے بعد ہمیں آپ کی آنسہ پسند آئی۔ بچے بہت ناراض ہوئے' مگر ہم نے اس معاملے میں کسی کی نہ سنی۔ خوب ٹھوک بجا کر بہو پسند کی' بھئی ایسے کیسے...؟ پہلی لڑکی کو دیکھ کر ہاں کر دیتے۔" آنسہ کے ہاتھ پر شگن کے پانچ ہزار روپے رکھنے کے بعد افروز بی نے بڑے فخر سے مریم بی بی کو جتایا تو سر جھکائے بیٹھی آنسہ کے دل میں نیزے کی انی گڑ گئی۔ اپنا رشتہ طے ہونے سے زیادہ اتنی ساری لڑکیوں کے مسترد کیے جانے کا غم اسے ستانے لگا۔

آنسہ نے جھرجھری لی اور ماضی کے جھونکوں کو بند کیا۔ اس نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہا اور فائزہ کے گھر روانہ ہو گئی۔ بہن کے گھر پہنچ کر شربت کا گلاس ختم کرتے ہی رافع کی دلہن تلاش کرنے کی ذمہ داری ہنستے ہوئے چھوٹی بہن فائزہ کے حوالے کر دی۔ فائزہ دراصل اپنی ہنسوڑ طبیعت کی وجہ سے آنسہ کے مقابلے میں خاصی سوشل واقع ہوئی تھی۔

"آپی... ایک لڑکی ہے تو' چلو آپ کو ملوانے کی کوشش کرتی ہوں۔ بھانجے کی شادی سے میں بھی تو خالہ ساس کے عہدے پر فائز ہوں گی نا۔" وہ چٹکی بجا

کر ہنسی۔ فائزہ کے پڑوس میں جو نئے لوگ شفٹ ہوئے تھے ان کی بڑی لڑکی احمرین بہت پیاری تھی۔ رشیدہ ناز نے فائزہ سے بہناپا جوڑتے ہی پہلی فرمائش احمرین کے لیے اچھا سا دولہا ڈھونڈنے کی کی۔

آنسہ کی فرمائش پر فائزہ کے ذہن میں یہ بات آئی۔ رافع جتنا ہینڈسم تھا۔ احمرین اتنی ہی پیاری 'اسے دونوں کا جوڑ ٹکر کا لگا۔

آنسہ کے سنہری خیالات کا بظاہر مذاق اڑانے کے باوجود وہ دل سے بہن کی قدر کرتی تھی۔ فائزہ نے ہتھیلی پر سرسوں جمائی 'فوراً' ہی پڑوس میں جا کر احمرین کو بلا کر بہانے سے آپی کو دکھا دیا۔

"واہ... جیو۔ فائزہ... لڑکی تو بہت پیاری ہے۔ رافع کے ساتھ بہت سجے گی۔" آنسہ لڑکی دیکھتے ہی کھل اٹھی 'دل سے بہن کو داد دی۔

"آپی... مانتی ہو نا... میری جوہری جیسی نگاہوں کو... کیسا ہیرا ڈھونڈ نکالا؟" فائزہ نے احمرین کے گھر واپس جانے کے بعد بڑی بہن کی آنکھوں سے جھانکتی خوشی اور ہونٹوں کے کنارے پہ چھپی ہنسی سے 'ان کی رضامندی جان لی۔ اترا کر بولی۔

"نیت ثابت 'منزل آسان۔" آنسہ نے بہن کا ہاتھ دبا کر سرگوشی کی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ گھر گھر جھانکنے کے بجائے پہلی باری میں ہی کم عمر سی گندمی رنگت اور تیکھے نین نقوش والی احمرین مل گئی۔ وہ شام کو بہن کے ساتھ رشتے کی بات کرنے رشیدہ ناز کے گھر پہنچ گئی 'جو اتنے اچھے اور بڑے گھر سے بیٹی کے لیے رشتہ کا سن کر آنسہ اور فائزہ کے قدموں میں بچھ بچھ گئیں۔

آنسہ جب گھر لوٹی تو سب کو بہو ملنے کی خوش خبری سنا دی۔ وہ لوگ ڈنر کے بعد بڑے ہال میں جمع ہو کر آنسہ سے معلومات حاصل کر رہے تھے۔ عارب زبردستی بڑے بھائی کو بھی گھسیٹ لایا جو لیپ ٹاپ پر آفس کا کام کرنے بیٹھا تھا۔

"میں... جیسی بہو چاہتی تھی۔ احمرین۔ ویسی ہی ہے۔" آنسہ نے محمود علی اور بچوں کو بتایا۔ محمود علی نے سر ہلا کر خوشی کا اظہار کیا۔ شادی کی بات پر رافع کے چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"واہ بھائی! اتنا تو مشک بھی اپنی شادی کے ذکر پر نہ شرمائی تھی... لڑکے! آپ نے تو لٹیا ڈبو دی۔" عارب نے بھائی کو بغور دیکھنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دہائی دی۔ رافع باپ کے سامنے جھینپ گیا 'جوان ہونے کے بعد بھی وہ محمود علی کے سامنے نگاہ اٹھا کر بات نہیں کرتا تھا۔ عارب البتہ باپ سے کافی مذاق کر لیتا۔

"بڑے بھائی... تمہاری طرح نہیں ہیں تم تو مما کو زحمت بھی نہیں دو گے۔ آپ ہی پسند کر کے بتا دو گے۔" مشک نے بڑے بھائی کی حمایت میں چھوٹے کو چھیڑا 'مگر اس کا موڈ کچھ آف سا تھا۔

"یہ کیا مما جانی... پہلی لڑکی کو دیکھتے ہی لٹو ہو گئیں 'یہ تو میرا اور مشی کا نقصان ہو گیا۔" عارب نے بہن کے دل کی ترجمانی کی 'ماں کے نرالے فلسفے پر شکوہ کیا۔

"بیٹا جانی۔ شادی کے بعد تو رافع بے چارے کو تا عمر قید با مشقت ہونے والی ہے۔ آپ دونوں کا کیسا نقصان۔" خوش گوار ماحول میں چائے پیتے ہوئے محمود علی نے بھی شوخی دکھائی۔

"ہم تو گھر گھر جا کر چائے ناشتے کے موڈ میں تھے۔ مما جانی۔ یہ کیا جلم (ظلم) کیا... دل توڑ دیا۔" عارب دل پر ہاتھ رکھ کر مصنوعی تکلیف کا اظہار کرنے لگا۔ آنسہ نے بیٹے کو آنکھیں دکھائیں تو باقی لوگ بھی ہنس دیے۔

مشک جس کی شادی کو سال بھر ہوا تھا گم صم سی تھی 'اس کا شوہر کاشف البتہ عارب کی باتوں پر خوب قہقہہ لگا رہا تھا۔

"مشی... کیا ہوا؟ بیٹا کچھ بولو نا... اس معاملے میں تمہاری کیا رائے ہے۔" آنسہ نے بیٹی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلایا۔ مشک ایک دم چونک اٹھی۔

"مما جانی اب میں رائے دے کر کیا کروں گی۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"مشی... کیا ہوا بچے خیر تو ہے؟" بیٹی کے انداز پر آنسہ ایک دم چپ ہو گئیں تو محمود علی ان کی مدد کو آگئے

بڑھے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔
"پاپا... مما جانی نے تو اکلوتی بیٹی کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اکیلے لڑکی پسند کر آئیں... بھابھی کے لیے میرے بھی کچھ ارمان تھے۔" مشک سے برداشت نہ ہوا تو روتے ہوئے شکوہ کیا۔ بیٹی کی آنکھ میں آنسو اور اس کا اترا چہرہ دیکھ کر آنسہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ایک ملاقات تو ان سب کا حق ہے۔ مشک کے رونے نے سب کو بے چین کر دیا۔ آنسہ نے اس کو سینے سے لگایا تو بھائی بھی بہن کے گرد گھیرا ڈال کر اسے منانے میں لگ گئے۔ کاشف البتہ بیوی کے بچپنے پر ہنستا رہا۔
محمود علی کی سفارش پر آنسہ نے اسی وقت احمرین کی امی کو فون ملایا اپنے بیٹی اور داماد کو ہونے والی بھابھی سے ملوانے کی اجازت طلب کی۔
"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے جی... آپ کا اپنا گھر ہے۔ جم جم آئیں۔" رشیدہ ناز نے خوش دلی سے انہیں جواب دیا۔
"رشیدہ بہن کوئی اہتمام نہیں کیجیے گا... ہم بس ایک کپ چائے پینے اور اپنی ہونے والی بہو سے ملاقات کرنے آرہے ہیں۔" انہوں نے فون رکھنے تک کوئی دس بار اپنی بات دہرائی۔
"آج کے زمانے میں بھی ایسے خاندانی اور وضع دار لوگ موجود ہیں۔" رشیدہ جیسی دنیا دار عورت حیرت میں مبتلا ہو گئی۔
"احمرین آپ نے کیا... کیا ہوا ہے؟" مشک نے پسندیدہ نگاہوں سے سبز کپڑوں میں ملبوس احمرین کو دیکھا اور اپنے پاس بٹھا کر اس سے بے تکلفی سے پوچھا۔
"جی... آپی نے تو ہم لوگوں کا ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ آپ لوگ جلدی سے بس لے جائیں۔ انہیں۔" اس سے پہلے کہ احمرین جواب دینے کے لیے منہ کھولتی' اس کے چھوٹے بھائی سنی نے ایک دم کہا۔ رشیدہ نے گھبرا کر ان سب کی طرف دیکھا۔ نیا نیا معاملہ تھا پر... وہاں تو ساری محفل کشت زعفران بن گئی۔ احمرین جو لجائی لجائی سی سر جھکائے بیٹھی تھی'

بھائی کی اس حاضر جوابی پر بے ساختہ مسکرا اٹھی۔ ہونے والی بہو اور باقی لوگوں کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر آنسہ کے دل سے دعا نکلی۔
"میری بیٹی فکر نہ کرو جب تم اپنے گھر میں قدم رکھو گی تو ان شاء اللہ وہاں بھی تمہاری یہ ہنسی سلامت رہے گی۔ ہم ساس بہو میں کوئی ٹکراؤ نہ ہو گا۔ بہتے پانی کی طرح جو راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو عبور کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی یہ رشتہ نبھائیں گے۔ کیوں کہ میں تمہیں بہو نہیں بیٹی بنا کر دل سے قبول کر رہی ہوں۔" آنسہ نے چلتے وقت احمرین کا ماتھا چوم کر دل ہی دل میں عہد کیا۔ وہ آنکھیں پٹپٹا کر بڑھ کر ان کے سینے سے جا لگی۔

☆ ☆ ☆
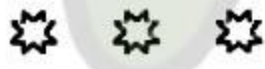
"کتنے اچھے لگ رہے ہیں یہ گجرے... دلہن کے ہاتھوں میں پہنا دیتی ہوں۔" آنسہ نے سوئی دھاگے کی نلکی میں لگاتے ہوئے پلیٹ میں رکھے سفید موتیا کے گجروں کو دیکھ کر سوچا۔ وہ اپنے لان میں لگے بیلا کے پھولوں کا گجرا بنا کر سب کے کمروں میں سجا دیتیں۔ احمرین کا خیال آیا تو بے ساختہ بہو کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ آنسہ کو ہمیشہ سے پھولوں سے بڑی رغبت تھی۔ شادی کے بعد ان کا بس چلتا تو کمرے میں روزانہ تازہ پھول سجاتیں۔ پھولوں کا زیور پہنے گھر میں گھوما کرتیں' مگر افسوس صاحب کو پھول پسند نہیں تھے۔ خوشبو سے انہیں چھینکیں شروع ہو جاتی تھیں۔ انہوں نے پھولوں کا داخلہ اپنی بیوی کی زندگی سے نامنظور کر دیا۔ وہ مجبوراً "دل مار کر رہ گئیں۔
اب جی کرتا' ان کے جو ارمان ادھورے رہ گئے۔ وہ بہو سے پورے کروائیں۔
"نئے دور کی لڑکی ہے۔ کیا خبر اسے گجرے پسند ہی نہ ہوں یا وہ محسوس کرے کہ میں اپنی پسند اس پر ٹھونس رہی ہوں۔ دخل اندازی کر رہی ہوں۔" ابھی وہ بیٹے بہو کے کمرے کے دروازے پر دستک دینا چاہ رہی تھی کہ ٹھہر کر سوچ میں پڑ گئی۔

"مما جانی... کیا ہوا خیریت تو ہے۔ یہاں کیوں کھڑی ہیں۔" احمرین اور رافع کسی دعوت میں جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ راہ میں اسے کھڑا پایا تو حیرانی سے پوچھا۔

"وہ... یہ گجرے بنائے تھے۔" انہوں نے قدرے تکلف سے کہا۔

"اوہ... مما... لویو سوچ... آپ کو کیسے پتا چلا؟ مجھے تو پھولوں سے عشق ہے' یہ آپ نے میرے لیے بنائے ہیں نا تھینک یو۔" احمرین نے خوشی خوشی گجرے ہاتھوں میں سجانے کے بعد جھک کر خوش دلی سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ آنسہ کی پیاسی روح سرشار ہوگئی' آنکھوں میں قندیلیں سی جل اٹھیں' انہوں نے نظر بھر کر بہو بیٹے کو دیکھا۔

"مما... جیسی ارمان بھری ساسیں اس دور میں ناپید ہوگئی ہیں۔ قدر کرنا ان کی۔" رافع نے شرارتی انداز میں کہا۔

"جی نہیں... میں نہیں مانتی۔" احمرین نے ناک چڑھا کر ایک ادا سے کہا' رافع نے چونک کر سولہ سنگھار سے آراستہ خوشبوؤں میں بسی بیوی کو دیکھا۔

"کیا نہیں مانتی ہو؟" رافع کا لہجہ تھوڑا روڈ ہوا' اس کو خوف ہوا کہ کہیں ماں کی موجودگی میں بیوی کے منہ سے کوئی ہلکی بات نکل جائے۔ ماں کی دل آزاری اس سے بالکل برداشت نہیں ہوپاتی۔ آنسہ بظاہر چہرے پر مسکراہٹ سجائے کھڑی تھیں۔ دل ان کا بھی دھک دھک کرنے لگا۔

"یہ نہیں مانتی کہ یہ میری ساس ہیں' ارے... یہ... تو میری مما جانی ہیں۔" احمرین نے اپنے سنہری آنچل کو سنبھالتے ہوئے شوخی سے کہا اور بڑھ کر آنسہ کے گلے لگ کر ان کے گالوں پر گرم جوشی سے بوسہ دیا۔ رافع نے پیار بھری نگاہوں سے دونوں کو دیکھا۔

☼ ☼ ☼

"احمر... آج تم نے میرا دل جیت لیا۔" احمرین جو دعوت سے واپس آنے کے بعد کپڑے تبدیل کر کے سونے کے لیے لیٹی تو رافع نے اس کی طرف کروٹ لی اور بیوی کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہوا۔

"میں نے ایسا کیا کر دیا جناب!" احمرین جان کر انجان بنی' شوہر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"تم نے مما جانی کا جیسے دل رکھا... سمجھو میرا دل رکھا..." وہ مسکرایا۔

"نہیں جی... مجھے واقعی پھول بہت پسند ہیں۔" وہ اٹھلائی تو رافع اس کے انداز پر کھلکھلایا۔

"مجھے پتا ہے... مگر تم نے میری ماں کو ساس کی جگہ مما جانی سمجھا۔ میرے لیے یہ بات بہت اہم ہے۔ خوب صورتی کے ساتھ ساتھ تم میں اچھی بیویوں اور نیک بہوؤں والے سارے ہنر موجود ہیں۔" رافع کا انداز تشکرانہ سا ہوا۔ احمرین سرشاری ہوگئی اسے رافع کے منہ سے ایسا اعتراف سننے کا یقین تھا۔ مگر اتنی جلدی... یہ ناقابل یقین بات تھی۔

☼ ☼ ☼

زندگی بھی کتنی عجیب ہے سوچنے بیٹھو تو بیت جانے والے لمحے پل بھر میں مٹھی میں ایسے سماجاتے ہیں۔ جیسے ملائم ریشمی کپڑا' تھوڑی سی دیر میں انسان سالوں کا سفر طے کر آتا ہے' آنسہ بھی آج ایسی کیفیات سے گزر رہی تھیں۔ ماضی اور حال جیسے ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"ماں کا گھر ہے نا... آرام کرلو... ساس سے واسطہ پڑے گا تو سارے کس بل نکل جائیں گے۔" افروز بی اکثر آمنہ کے بے وقت سونے پر اسے یہ ڈراوے دیتیں تو آنسہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی ہنسی رینگ جاتی۔ بہت سے گھرانوں کی طرح اس کے سسرال میں بھی وہ ہی رواج تھا' جہاں ساس کو ایک ہوا بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ افروز بی چن چن کر ایسی مثالیں دیتیں' جیسے ساس کوئی ممتحن اور سسرال امتحان گاہ ہو' جہاں بہو کی صلاحیتوں کے ایگزامز چلتے رہتے ہوں۔ جانے وہ یہ بات کیوں بھول جاتیں کہ خود بھی تو ایک ساس ہیں۔

آنسہ کی امی کو ایسی باتوں سے شدید اختلاف تھا۔

ان کا کہنا تھا کہ ایسی باتیں لڑکیوں کی نفسیات پر برا اثر ڈالتی ہیں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ لڑکی چاہے معصوم ' الھڑ شوخ و چنچل ہو یا سنجیدہ مزاج کی۔ تھوڑے سے اجنبی احساس میں لپٹی ہوئی سسرال کی دہلیز پار کرتی ہے۔ مریم بی بی نے اپنی دونوں بیٹیوں کو کبھی ہونے والی ساس اور سسرال سے بدظن نہیں کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

احمرین کو سسرال میں اپنے میکے سے بھی زیادہ پرسکون ماحول میسر آگیا' آنسہ نے کبھی بھی بہو اور بیٹے کے کہیں آنے جانے پر پابندی نہیں لگائی۔ وہ احمرین کی ٹوہ میں نہ رہتیں۔ نہ ہی بات بہ بات طعنے تشنیع دیتیں' احمرین نے تو اپنا بچپن ایسے ہی ماحول میں گزارا تھا۔ ماں اور ددھیال والوں کے یادگار معرکوں کی وہ چشم دید گواہ تھی' اسی لیے بہت ڈرتی رہی پر یہاں تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔

"کام کا کیا ہے ساری عمر پڑی ہے۔ عورت اس کے علاوہ کرتی ہی کیا ہے۔" آنسہ کا کہنا تھا۔ اسی لیے سب کی مخالفت اور باتیں سننے کے باوجود آنسہ نے بہو پر شروع سے ہی کچن کی ذمہ داری نہ ڈالی۔ وہ پہلے کی طرح خود ہی کھانا پکاتیں' اوپر کے کاموں کے لیے ایک عورت رجو موجود تھی۔ جو ان کی کافی مدد کر دیتی۔ احمرین نے ان سہولیات کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ سسرال میں بے جا ناز نخرے نہیں دکھائے۔ بیگ ہاؤس کی روایت برقرار رہی' آنسہ خود بھی اچھی بہو تھیں۔ آنسہ کو لگا کہ شاید قدرت نے ان کی قربانیوں کو قبول کرلیا' صلے میں اتنی اچھی بہو سے واسطہ پڑا۔ احمرین کبھی ساس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہ کرتی' ہر معاملے میں ان کی رائے کو مقدم جانتی۔ سب سے بڑھ کر ان کے پکائے ہوئے ہر کھانے کی یوں تعریف کرتی کہ وہ سیراب ہو جاتیں۔

دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں خوش باش تھیں کہ ایسا لگا جیسے مزے دار کھانا کھاتے کھاتے منہ میں کنکر آجائے۔ رشیدہ ناز کی باتوں نے آنسہ کی پوری ہستی بکھیر کر رکھ دی۔ یوں لگا جیسے ان کی آنکھیں کھل گئی ہوں۔ محبت بھرے دل پر شک اور بدگمانی کے بادل چھا گئے۔

اس وقت سے آنسہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ پھر بھی انہوں نے صبر کا دامن تھامے رکھا' عارب جو کالج سے واپس آیا تھا اس سے بھی اپنے آنسو چھپالیے' ورنہ بھونچال آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

"ٹپ... ٹپ... ٹپ..." آنسہ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی' ذرا سی دیر میں لان جل تھل ہو گیا' چہرے پر پڑنے والے بارش کے قطروں میں مل کر ان کے آنسو بہنے لگے پھول' پودے اور نیم کا پرانا درخت دھل کر نکھر گئے' پھر آنسوؤں کی برسات دل پر چھائی دکھوں کی کثافت کو کیوں نہ دھو سکی' شاید اب دیکھنے کا نظریہ بدل گیا تھا۔

"کیا... میری بہو میں بھی ایسا ہی زہر بھرا ہوا ہے۔ وہ بھی اپنی ماں کی طرح ہی سوچتی ہے۔" ان کے کانوں میں جب بھی رشیدہ کے الفاظ گونجتے وہ نئے سرے سے خود سے سوال کرتیں جتنا سوچتیں اتنا بکھرتیں۔

"ہو... بھی شاید شرمندگی کی وجہ سے اس وقت کے بعد سے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ اچھا ہے ہمارا آمنا سامنا نہیں ہوا۔"

آنسہ نے خود کو مطمئن کرنے کے لیے ایک طویل سانس لے کر سوچا۔ فضا میں کچی مٹی کی باس پھیلی ہوئی تھی' انہیں لگا ڈھلتی شام کی تنہائیاں ان کے من کے کواڑ کھولے دبے پاؤں اندر داخل ہو کر پورے وجود میں سما رہی ہو۔ ایک جھرجھری سی لی اور خود کو قنوطیت کے جال سے باہر نکالنے کی کوشش جاری رکھی' ابھی عارب کی فرمائش پر پسندے بھی پکانے تھے' پارچوں میں مسالا لگا کر تو صبح سے ہی رکھ دیا تھا' اب گوشت بگھارنا تھا۔ وہ ساڑھی کے پلو سے آنکھوں کے نم گوشوں کو پونچھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ محمود علی بارش کا مزہ لوٹنے لان کی طرف آئے تو تو بیوی کی اداس شکل پر چونک گئے۔ جانتے تھے وہ کچھ شیئر نہیں کریں گی' وہیں بیٹھ کر انہیں بھی پاس بٹھالیا۔ ادھر ادھر کی

باتوں سے آنسہ کا دل بہلانے لگے۔ شوہر کی توجہ پر وہ تھوڑا پرسکون ہوئیں۔

☆ ☆ ☆

"ہائے۔ ہائے۔ آنسہ بہن سو جوتے مارلو۔ پر معاف کردو۔ یہ دیکھو میرے ہاتھ۔ تمہارے سامنے جوڑیے۔" رشیدہ افتاں خیزاں روتی ہوئی آنسہ کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ جو کچن میں رجو کے ساتھ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ سمدھن کی ایسی ڈرامائی انٹری پر ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"بہن۔ کیا ہوا؟" آنسہ بھول بھال الشاان کی خیریت پوچھنے لگیں۔ وہ آنسو بہاتے ہوئے، عجیب سی آواز میں رونے کی کوشش کر رہی تھیں، جو بے انتہا بھونڈی لگ رہی تھی۔

"مجھے کیا ہونا ہے، وہ جو آپ کی سگی ہے نا۔ احمرین۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر میری مما جانی سے معافی نہیں مانگی تو وہ مجھ سے اپنا ناتا توڑ لے گی، کبھی بھی میکے کا رخ نہیں کرے گی۔ آگے بقر عید آرہی ہے۔ بھلا بتاؤ۔ بیٹی گھر نہ آتی تو پوری برادری میں میری ناک نہ کٹ جاتی۔" وہ کراہیں۔ آنسہ کا دل باغ باغ ہو گیا۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولیں۔ انہیں پاس پڑی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا، مگر وہ بے چین روح بنی کھڑی رہیں۔

"بہن۔ اس لڑکی کی دیدہ دلیری تو دیکھیں۔ باپ سے بات کر کے میری شامت بلوادی۔ دس دس فون کر کے ناک میں دم کر دیا۔ ارے وہاں تو پورا گھرانہ مجھ پر چڑھ دوڑا۔ اے یہ دیکھو۔ سفید چونڈے کے ساتھ معافی مانگ رہی ہوں۔ پیاری بہن معاف کر دو نا۔ بس بیٹی کی ماں ہوں نا جذبات میں آکر الٹا سیدھا بول بیٹھی۔"

رشیدہ ناز نے بڑی لجاجت سے معافی مانگی تو آنسہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ انہیں اپنے بڑے ہال میں لاکر صوفے پر بٹھایا، تاکہ آرام سے بات ہو سکے۔

احمرین بھی اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی ماں اور ساس کو تک رہی تھی، آنسہ نے اسے اشارے سے بلایا۔ بہو کے اس اقدام پر ان کا ملال غائب ہوا تو ہوا۔ دل بھی ایک دم صاف ہو گیا۔

"جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب پرانی باتوں پر مٹی ڈال دیں۔ میں بھی سب بھول جاتی ہوں، آپ بھی آئندہ یہ بات منہ سے نکالیے گا، خاص طور پر عارب اور رافع کو اس بارے میں کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔" آنسہ نے گھبرا کر دروازے کے باہر دیکھا کہیں کوئی سن نہ لے۔ محمود علی تو لائبریری میں چلے گئے تھے۔ عارب اپنے کمرے میں تھا۔ بہو نے جس طرح ان کا مقام اپنے میکے میں اونچا کیا تھا۔ وہ ہلکی پھلکی ہو کر مسکراتے ہوئے ان سے باتیں کرنے لگیں۔

"آپ نے اچھا نہیں کیا۔ مما جانی کو سوری کہیں۔" احمرین نے ماں سے نرمی سے کہا تو وہ منہ بنا کر بیٹی کو دیکھنے لگی۔

"احمرین بیٹا! تمہیں ماں سے اس انداز میں پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔" اتنی بڑی عورت کی اولاد کے ہاتھوں یوں درگت بنتی دیکھ کر ان سے برداشت نہ ہوا۔ فوراً "تنبیہہ کی۔

"نہیں مما جانی۔ آپ دونوں ماں ہیں میرے لیے۔ دونوں کی عزت مقدم ہے۔ امی کو ہمارے گھر کے معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔ میں اگر انہیں پہلے قدم پر نہ روکتی تو یہ سلسلہ چل پڑتا۔" احمرین نے آنسہ کا ہاتھ تھام کر لجاجت سے کہا تو انہوں نے بہو کی سمجھ داری کو دل میں سراہا۔

"چلو۔ چھوڑو بہو۔ بات ختم کرتے ہیں۔ اپنی امی کو کمرے میں لے جا کر آرام سے باتیں کرو۔ میں رجو سے چائے بھجواتی ہوں۔" آنسہ میں نئی توانائیاں جاگ اٹھیں۔ وہ خوشی خوشی دونوں کو تنہائی فراہم کر کے وہاں سے چل دیں۔ احمرین ماں کا ہاتھ تھام کر زبردستی اپنے کمرے میں لے گئی۔

"شاباش ہے بچے۔ ماں کو غیروں کے سامنے نیچا

دکھا کر کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔" رشیدہ ناز نے کمرے میں داخل ہوتے ہی برقعے کے بٹن کھول کر سائیڈ پر رکھا اور قیمتی نرم بیڈ پر کمر ٹکاتے ہوئے ناراضی دکھائی' احمرین نے پہلے دروازہ بند کیا۔ پھر ماں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیا۔

"امی پلیز' معاف کر دیں۔ مگر میری نئی شادی شدہ زندگی میں جو بکھیڑا پھیل گیا تھا' اسے سمیٹنے کے لیے مجھے آپ کو اس طرح یہاں زبردستی بلوانا پڑا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ رافع آفس سے گھر آجائیں اور مما کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیں۔" وہ ماں کو منانے میں لگ گئی۔

"ہاں! تو ہو گئی غلطی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اسپیکر کھلا ہوا ہے۔ اور اس میں تمہارا زیادہ قصور ہے۔ بھلا بتاؤ۔ کیسی لڑکی ہے میری' ماں کی باتیں ساس کو سنوا دیں۔" وہ بیٹی پر ہی الٹ پڑیں۔ احمرین کی ماں کے انداز بیان پر اس پریشانی میں بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

"امی! کیا کرتی۔ آپ نے بھی تو حال پوچھا نہ احوال' ایسے شروع ہوئیں۔ بس میں تو روکتی رہ گئی۔ پر آپ جب جوش میں آتی ہیں تو کسی دوسرے کی بھلا کہاں سنتی ہیں۔ اب بھلا میں مماجانی کے سامنے ان کی موجودگی کا کوئی اشارہ کیسے دیتی۔ رافع نے ٹچ سسٹم والا نیا سیل فون کل ہی دلوایا ہے۔ ابھی اس کا نظام سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ کال ریسیو کرنے کے ساتھ ہی غلطی سے اسپیکر کا بٹن آن ہو گیا۔ خیر۔ چھوڑیں۔ معاف کر دیں نا۔" وہ رشیدہ کے کاندھے دباتی ہوئی سمجھانے لگی۔ ان کے کچھ پلے نہ پڑا۔

"تیری ساس نے سن لیا تو کون سی قیامت آگئی۔ جو ہوا۔ اچھا ہی ہوا' دیکھو تو کیسے پورے گھر پر قبضہ جمایا ہوا ہے۔ تجھے کچن میں بھی گھسنے نہیں دیتی۔ ایسے میں تیرے میاں کے دل میں بیوی کی خاک قدر ہو گی۔ میں تو جاتے جاتے آنسہ بی کو جتاؤں گی کہ بس! اب آپ کے آرام کے دن ہیں۔ یوں لڑکیوں کی طرح دوڑ دوڑ کر اپنے نمبر نہ بڑھائیں۔" رشیدہ ناز بھری ہوئی تھیں۔ بیٹی کی بے وقوفی پر سر پیٹ لیا۔ احمرین نے اے سی کی کولنگ مزید بڑھائی کہ شاید ماں کا دماغ ٹھنڈا ہو جائے۔ پھر ان کا کاندھا دباتے ہوئے سمجھانے لگی۔

"نہ۔ نہ۔ امی ایسی غلطی بھی نہ کیجئے گا۔ اور تھوڑا آہستہ بات کریں۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کیا میرے ساتھ دشمنی کا ارادہ ہے؟ آپ نہیں سمجھیں گی۔ جیسا چل رہا ہے۔ چلنے دیں۔ ڈنر میں مماجانی نے بڑے مزے کے پسندے پکائے ہیں۔ کھا کر جائیے گا۔ ان کے ہاتھوں میں بڑا ذائقہ ہے۔ ہمارے گھر کی طرح نہیں پیاز لہسن ادرک اور گوشت کا گھولن بنا کر سالن کے نام پر کھا لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد رافع آپ کو گھر چھوڑ آئیں گے۔" احمرین نے ماں کو جتانے کے ساتھ پیشکش کی۔ وہ جو واپسی کے لیے پر تول رہی تھیں بستر پر مزید پھیل گئیں۔

"واہ بھئی واہ۔ چار دن میں ماں کے ہاتھ کا پکا ہوا گھولن لگنے لگا۔ تم۔ کچھ بھی کہو۔ ماں پر ساس کو فوقیت دے کر تم نے اچھا نہیں کیا۔" رشیدہ نے اپنی بے عزتی کو ایک بار پھر یاد کیا۔ آنکھ بھر آئی' ململ کے دوپٹے سے منہ پونچھا۔ احمرین نے فون کر کے اتنا شور مچایا کہ انہیں کپڑے بدلنے کا وقت بھی نہ مل سکا' گھر کے کپڑوں پر ہی برقعہ چڑھایا اور رکشہ لے کر ہانپتی کانپتی یہاں پہنچیں۔

"امی۔ پلیز۔ ناراضی کو بھول کر بیٹی کی سمجھداری کو داد دیں۔ وہ لڑکیاں کتنی پاگل ہوتی ہیں' جو بلاوجہ میں ساس سے عناد پال کر گھر کا ماحول خراب کرتی ہیں۔ شوہر الگ پریشان۔ میں تو منہ بند کر کے مماجانی کے دم سے سسرال میں عیش کر رہی ہوں۔ ساس تو خوش ہی خوش۔ میاں الگ شیدائی۔" احمرین نے اپنے روم فریج میں رکھی کولڈ ڈرنک رشیدہ کو پیش کرتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ وہ بیٹی کو یوں دیکھنے لگی' جیسے کہ اس کا دماغ چل گیا ہو۔

"عجیب لڑکی ہے بھیا! ہماری ساری زندگی تو ساس نندوں کے ساتھ برسرپیکار گزری۔ اب تم کوئی نئی کہانی سنا رہی ہو۔" رشیدہ نے ایک سانس میں کولڈ ڈرنک ختم کر کے لمبی سی ڈکار لی اور پریشانی سے پوچھا۔

"میری بھولی امی۔ وہ سب پرانے زمانے کی باتیں تھیں۔ اب تو کسی پر ہاتھ اٹھانے سے قبل اپنے سر کی فکر ضرور کر لیں۔" احمرین نے بخ کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لیتے ہوئے شفاف گلاس میں جھانکا اور بولی۔

"آئیں کیا مطلب۔ شادی کے بعد تم تو بڑی انوکھی باتیں کرنے لگی ہو" رشیدہ نے اپنا سر کھجاتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا دیکھیں۔ میں رافع سے مماجانی کے پکائے ہوئے ہر کھانے کی اتنی تعریف کرتی ہوں کہ وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ میرے سامنے ننھے بن کر ماں سے لپٹ جاتے ہیں' پر مجال ہے جو میں ذرا بھی حسد میں مبتلا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ کوفتے تو مما جیسے کوئی بنا ہی نہیں سکتا۔ میں ہامی بھرتی ہوں۔ کیوں کہ اس میں شک بھی نہیں۔ اف مما آج تو ہریالی چکن کھانی ہے' رافع کی دیکھا دیکھی عارب بھی ماں سے چونچلے دکھاتا ہے۔ میٹھے میں شاہی ٹکڑے بنائیے گا۔ میں ان دونوں کی بات کی تصدیق کرتی چلی جاتی ہوں۔ کھانے کی ٹیبل پر جب ان کی واہ واہ ہوتی ہے تو مما جانی خوشی سے پھولے نہیں سماتیں۔ میں بھی بغیر سبکی محسوس کیے' سچے دل سے ان کے کاموں کی تعریفیں کرتی چلی جاتی ہوں۔ آپ تو اپنی ساس کی تعریف کا سوچ بھی نہیں سکتی ہوں گی نا۔" احمرین نے ماں کو سسرال کے حالات سے آگاہ کیا۔ پھر شرارت سے مسکرا کر چھیڑا۔ وہ منہ کھولے سن رہی تھیں۔

"ہاں بھئی۔ اتنا حوصلہ ہمارے اندر نہیں تھا کہ منہ کھول کر ساس نندوں کی تعریف کر پاتے۔" رشیدہ نے فوراً" سے پیشتر انکار میں سرہلا دیا۔

"سچی بات یہ ہے کہ میری ساس جیسی باسلیقہ اور جفاکش عورتیں اس دور میں ملنا مشکل ہیں۔ میں تو سو بار مر کر بھی پیدا ہوں۔ تو ان کے جیسی سلیقہ مندی اور برداشت اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے مزاج سے کام کرنے کی عادی ہیں۔ میں نے شادی کے بعد یہ بات سمجھ لی۔ اسی لیے جو ہے جیسا ہے۔ اس میں دخل اندازی کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اسی میں میری عافیت ہے' جان بچی رہتی ہے۔" احمرین نے کھڑکی سے باہر نیم کے درخت پر پھدکتی ہوئی چڑیا کو دیکھ کر کہا۔

"واہ' تم تو مجھ سے بھی زیادہ عقل مند ہو۔ ایسی عقل کی بات کہاں سے سیکھی۔ اب لگ رہا ہے کہ میں نے تو زندگی بلاوجہ جلتے کڑھتے گزاری۔ جینے کا یہ ڈھنگ بھی برا نہیں۔" رشیدہ نے ستائشی نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ تو وہ فخر سے مسکراتی ہوئی بالوں میں برش پھیرنے لگی۔ رافع کے آفس سے لوٹنے کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ تیار ہونے لگی۔

"تو اور کیا۔ اب دیکھیں۔ مما جانی نے مجھے بتایا کہ یہاں عید تہوار میں بڑی بڑی دعوتیں ہوتی ہیں۔ گھر میں کھانے پکتے ہیں۔ جیسے ابھی جو بقر عید آرہی ہے۔ اس میں رافع کی ساری پھوپھیاں' چاچا اور میری نند اور اس کے سسرال والوں کی بڑی دعوت ہو گی۔ میری ساس نے بتایا کہ سارا کھانا گھر میں پکے گا۔ صرف باربی کیو کی دعوت نہیں بلکہ کئی قسم کے سالن اور فرائی گوشت اس دن پکے گا۔ مما جانی نے ابھی سے میرے ساتھ مل کر مینو بھی ترتیب دے دیا ہے۔ اب بتائیں' اگر میں کچن سنبھال رہی ہوتی تو کیا اتنی بڑی دعوت کا انتظام کر سکتی تھی۔" وہ تیز تیز لہجے میں بولی تو رشیدہ نے گھبرا کر نفی میں سرہلایا۔

"بیٹا! یہ سب ساری زندگی تو نہیں چل سکے گا؟ کل کو اگر تمہیں کچن سنبھالنا پڑا۔ اس وقت تم کیا کرو گی؟" وہ ماں تھیں۔ فکر مندی سے سوچا تو زبان سے خدشات جاری ہو گئے۔

"ہوں۔ یہ تو ہے۔ آپ تو جانتی ہیں میں شروع سے کچن کے کاموں سے بھاگتی آئی ہوں۔ پیاز کاٹنا دنیا کا سب سے مشکل کام لگتا ہے۔ روٹی پکاتے ہوئے' دنیا کے کئی ملکوں کے نقشے بنا دیتی ہوں۔ رافع جس دن میرے ہاتھوں کا پکا کھائیں گے سو عیب نکالنے بیٹھ جائیں گے۔ میں نے سوچ رکھا ہے۔ ایسا وقت آنے سے قبل مما جانی سے آہستہ آہستہ کھانا پکانا سیکھ لوں گی۔ ویسے رجو بھی یہاں مددگار کے طور پر موجود ہے۔

کچھ نہ کچھ کر ہی لوں گی۔ جب تک راوی نے چین لکھا ہے۔ مزے اڑانے دیں۔" احمرین کھلکھلاتے ہوئے گلابی لپ اسٹک ہونٹوں پر پھیرنے لگی تو رشیدہ نے بھی بیٹی کا ساتھ دیا۔ رجو نے چائے دینے کے لیے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"آپ چائے لان میں لگا دیں۔ ہم دونوں وہیں مما جانی کے ساتھ پینے آرہے ہیں۔" احمرین نے ڈیوڈرنٹ اسپرے کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ رشیدہ بیٹی کی سمجھ داری پر غش کھانے لگی۔

"واقعی۔ احمرین نے سچ کہا تھا۔ میں نے اتنا لذیذ کھانا زندگی میں نہیں کھایا۔" رشیدہ ناز نے پلیٹ صاف کرتے ہوئے بیٹی کو مسکرا کر دیکھا' آنسہ بہت اصرار سے ان کی پلیٹ میں مختلف چیزیں ڈالتی جارہی تھیں۔

"میری پیاری مما جانی۔ آپ اگر کسی کوکنگ شو میں چلی جائیں' سپرڈپر ہٹ ہوجائیں' سب کی چھٹی کردیں۔ آپ کے کھانوں کی ہر ریسپی بہت منفرد ہوتی ہے۔" احمرین نے ماں کو اشارہ کرتے ہوئے ساس سے کہا۔ آنسہ نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ بڑے نپے تلے انداز میں بات کرتی تھیں۔ بلا ضرورت باتیں کرنا انہیں پسند نہ تھا۔ اسی لیے بہت ساری پریشانیوں سے بچی رہتیں۔

"یہ تو سچ ہے۔ میری مما کے جیسا کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا۔" رافع نے بیوی کو پیار سے دیکھتے ہوئے ماں کی تعریف کی۔

"میں ہی بے وقوف تھی۔ ہمیشہ جنگ و جدل میں مشغول رہی۔ وقت سے پہلے جان کو شوگر لگالی۔ دوسروں کی خوبیوں کو دل سے مان لینے میں کوئی برائی نہیں۔ رشتے نبھانے کا یہ انداز کتنا اچھا ہے۔" رشیدہ ناز داماد کے ساتھ واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس گھر کا سکون دیکھ کر انہوں نے سچائی سے اعتراف کیا۔

☼ ☼ ☼

"میں جانتی ہوں کہ میری بہو بھی بشری کمزوریوں سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ پر میں نے جس طرح صبر تحمل سے اپنے پھر دل سسرال والوں کے دل میں محبت کے بیج بودیے۔ پھر احمرین تو میرے سامنے کی بچی ہے۔ میں ایک ساس نہیں۔ ماں بن کر اس کے اندر کے گدلے پن کو ——— اپنی بے غرض محبت سے دھو ڈالوں گی۔ صرف بہو پر نہیں اپنے خیالات پر بھی چیک اینڈ بیلنس رکھوں گی۔ کیوں کہ کسی کی برائیوں کا کھاتہ کھولنے سے پہلے اپنی نیکیوں کا حساب کتاب ضروری ہے۔ یہ نہ ہو کہ دوسروں کی فکر میں ہم اپنا سب کچھ کھو بیٹھیں۔"

آنسہ نے احمرین کے ساتھ کچن کا سامان سمیٹتے ہوئے اس کی جھولتی ہوئی لٹ کو پیار سے پن لگایا جو اسے مسلسل تنگ کررہی تھی۔ انہوں نے بیٹے کو ہدایت کردی تھی کہ کل جاکر بہو کو خوب شاپنگ کروادے۔ احمرین نے ساس کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ بھی خوش دلی سے ہنس دی۔

☼

عائشہ ناز علی

زندگی کی کہانی

"کہانیاں حقیقت سے جنم لیتی ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر حقیقت کہانی ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر کہانی حقیقت ہو۔" سر علوی نے پین پر ڈھکن لگاتے ہوئے کہا اور پھر ٹکڑے کو اگلی بات سے جوڑا۔

"ہم انسانوں کے معاملات عجیب ہوتے ہیں۔ کسی کی پوری زندگی ہی ایک کہانی ہوتی ہے اور کوئی اپنے ساتھ ہونے والے واقعات کو کہانی بنا لیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان کی کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کو ایسے کردار تلاش کرنے ہیں جن کی زندگی کو کہانی کی شکل دے کر صفحۂ قرطاس پر رقم کیا جا سکے۔"

انہوں نے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد طائرانہ نگاہ ان سب پر ڈالی۔ "کوئی سوال؟"

کمرے کے عین وسط میں بیٹھے عمر نے ہاتھ کھڑا کیا۔

"لیس عمر۔" انہوں نے سر کے اشارے سے اسے اجازت دی۔

"سر! ہم ایسے کردار ڈھونڈیں گے کہاں؟" اس

مکمل ناول
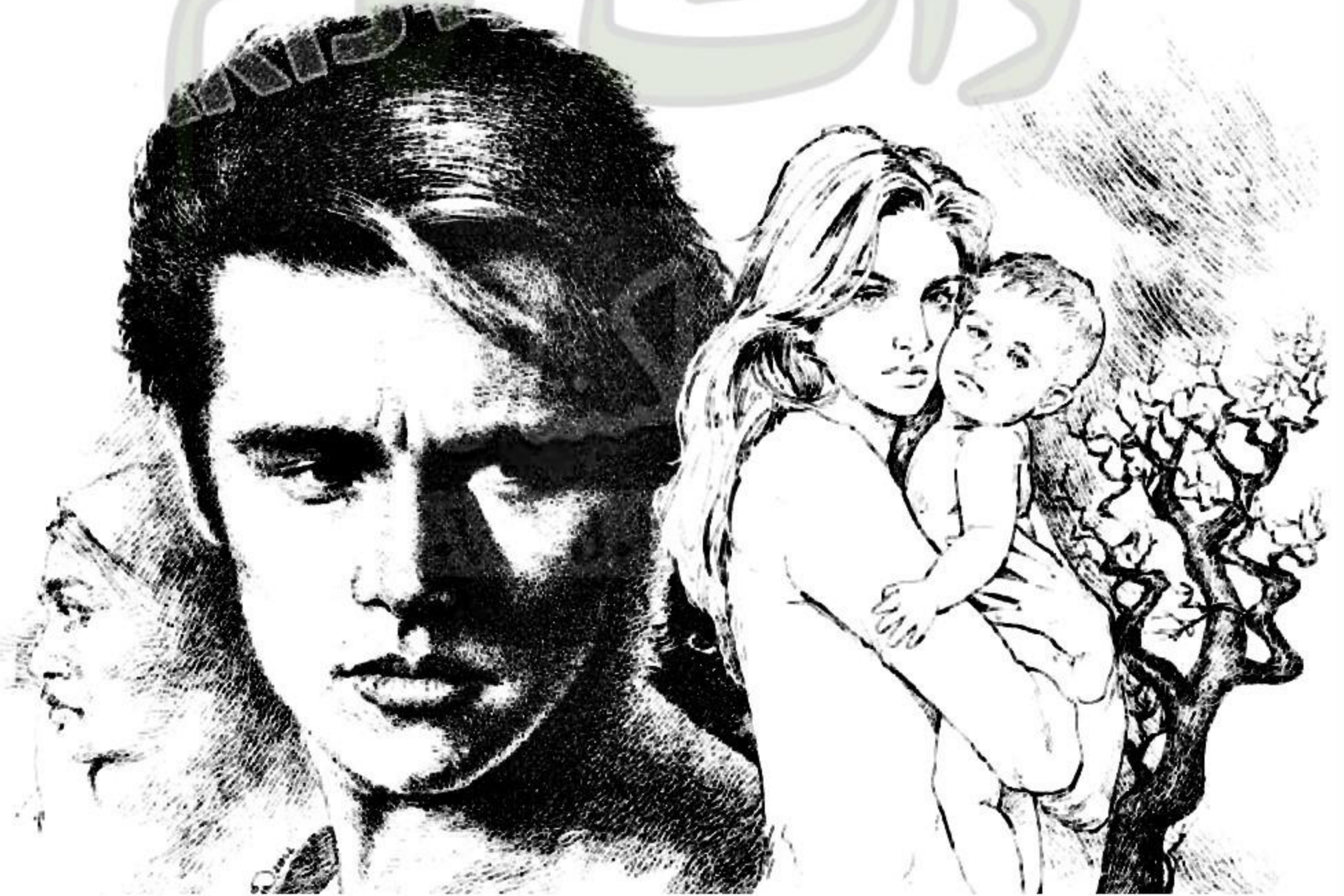
نے سوال کیا۔

"کردار تو اتنے ہیں کہ انتخاب آپ کے لیے ایک مرحلہ بن جائے گا۔ بس نظر چاہیے 'پھر اللہ نے آپ کو تفکر کرنے والا ذہن دیا ہے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

"لیکن سر! کوئی اپنی زندگی 'اپنی ذاتیات ہم سے کیوں شیئر کرے گا؟" شاہین نے نقطہ اٹھایا۔

"بالکل شیئر کرے گا۔ اعتماد 'بھروسا اور اپنائیت کسی بھی شخص کو اپنی زندگی کی کتاب کھولنے پر مجبور کر سکتی ہے اور پھر جب سبجیکٹ کو پوری طرح۔۔۔"

"جب سبجیکٹ کو پوری طرح سے شیشے میں اتار لو تو۔" کینڈی نے ان کی بات کاٹتے ہوئے شوشا چھوڑا۔ پوری کلاس ہنس پڑی۔

"نہیں قادر! سبجیکٹ کو شیشے میں نہیں اتارنا' اسے اعتماد میں لینا ہے اور اس کے بھروسے کا مان بھی رکھنا ہے۔ اسے سچ بتا کر اس کی اجازت سے سب کام کرنا ہے۔ نام اور مقام کی تبدیلی بھی ضروری ہے۔" سر علوی نے سنجیدگی سے تنبیہی انداز میں کہا۔

"سر! مجھے یہ کافی چیلنجنگ لگ رہا ہے۔ اس بار آپ نے اسائنمنٹ خاصا مشکل دیا ہے۔" عمر نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"زندگی میں چیلنج نہ ہوں تو زندگی' زندگی نہیں پنجرے میں بند طوطا بن جاتی ہے' جس کا مقصد حیات محض مالک کا دیا ہوا کھانا کھانا' پانی پینا اور جو وہ رٹوا دے' وہ رٹتے جانا ہوتا ہے۔ چیلنج سامنے آئیں اور انہیں ایکسیپٹ کیا جائے' یہی تو زندگی جینے کا اصل مزا ہے' اصل لذت ہے۔"

سر علوی کے بجائے کمرے کے ایک کونے سے جواب آیا۔ سر سمیت سب نے ہی توصیفی نظروں سے کونے میں بیٹھی حوریہ کو دیکھا۔

"حوریہ نے بہت اچھا آنسر دیا ہے عمر! میرا خیال ہے اب بوائز کو بھی گرلز کی طرح ایکٹو اور اسمارٹ ہو جانا چاہیے۔" وہ زیر لب مسکرا کر بولے اور نگاہوں

نے صرف لڑکوں کا طواف کیا۔

"ڈیٹس ناٹ فیئر سر! ہم ان لڑکیوں سے زیادہ ایکٹو اور اسمارٹ ہیں۔ پوچھ لیں کسی سے بھی۔" کینڈی کی مردانہ انا پر طمانچہ پڑا تو بلبلا کر دہائی دی "کسی لڑکی سے پوچھ لیا تو؟"

دانش جو اس کے عین پیچھے بیٹھا تھا' فوراً" منہ اس کے کان میں گھسیڑتے ہوئے ٹکڑا لگا کر اسی تیزی سے واپس پیچھے بھی ہوا۔ کینڈی نے تلملا کر اسے پیچھے مڑ کر گھورا تو وہ انجان بن کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"یہ حقیقت ہے کہ لڑکیاں تم لڑکوں سے زیادہ اچھا پرفارم کرتی ہیں اور زیادہ محنتی ہیں۔ حوریہ نے ابھی جو کہا' وہ بالکل ٹھیک تھا۔ ہمیں اپنی اپنی زندگیوں کو قید خانوں سے چھڑا کر ایک لمبی اڑان بھرنے کا حوصلہ رکھنا چاہیے۔ آپ لوگ شروع کیجئے۔ کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ جہاں تک ممکن ہو سکا میں آپ لوگوں کی مدد کروں گا۔" سر علوی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا قلم کیس کی جیب میں لگایا اور ڈائس پر سے کاغذات سمیٹ کر فائل میں رکھنے لگے۔

سر علوی ہر بار اپنے اسٹوڈنٹس کو دلچسپ اور مشکل اسائنمنٹس دیتے تھے۔ ماس کمیونیکیشن کے یہ استاد صرف پیپر ورک پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے۔ ان کے سامنے نہ رٹا چلتا تھا اور نہ ہی عقل کام آتی تھی۔

"ایک ضروری بات بتانا بھول گیا تھا۔" سر علوی جاتے جاتے رکے۔ کلاس سوالیہ نظروں سے ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ "جس کی اسٹوری زیادہ اچھی ہو گی' اسے میری طرف سے اسپیشل پرائز ملے گا۔" وہ مسکرائے۔

"اسپیشل پرائز ۔۔۔ وہ کیا سر؟" مختلف کونوں سے سرگوشی ابھری۔ "میں اس کی اسٹوری اپنے پبلشنگ ہاؤس میں پرنٹ کراؤں گا۔" ان کے اعلان پر ایک مسرور سی سرخی لڑکے اور لڑکیوں کے چہروں پر دوڑ گئی۔

وہ طائرانہ نگاہ کلاس پر ڈالتے ہوئے باہر نکل گئے۔

"سر! کینڈی سے تو امید لگانا گناہ ہے۔" ذیشان نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

"اپنا نام ضرور لگانا میرے ساتھ۔" سر علوی نے تو اس کی بات نہیں سنی البتہ کینڈی نے دانت کچکچاتے ہوئے جواب ضرور دے دیا۔

"تم دونوں کے نام تو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں آنے چاہئیں۔" حوریہ نے ان کی نوک جھونک سے تنگ آ کر کہا۔

"پیش گوئی ہے یا مشورہ؟" ذیشان نے فوراً" سے پیشتر پوچھا۔

"تیرے لیے تو پیش گوئی ہے۔" کینڈی نے ذیشان کی گردن دبوچی۔

"یہ سب چھوڑو اور بتاؤ کہ کہانی کے لیے کردار کہاں سے ڈھونڈیں گے؟" دانش نے کتابیں اور فائل اٹھاتے ہوئے کہا۔ تقریباً" پوری کلاس خالی ہو چکی تھی۔ صرف ان ہی کا گروپ رہ گیا تھا۔

"اگر لڑکی ہوتا تو ناں تو خواتین کے رسالوں سے کوئی اچھی سی کہانی نکال لاتا اور اپنے سیاق و سباق کے ساتھ سر کے حضور پیش کر دیتا۔" کینڈی نے جیب سے موبائل فون نکال کر ان باکس چیک کیا۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے محترم! کہ سر علوی نے منٹوں میں تمہاری چوری پکڑ لینی ہے اگر تم نے اس طرح کی کوئی حرکت کی۔" صندل نے اس کی بات کاٹی۔

"اینڈ بائے داوے۔ خواتین کے رسالے تم کیوں نہیں پڑھ سکتے۔ میرے خیال میں تو مرد حضرات بھی پڑھتے ہیں۔" اس نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ ان رسالوں میں خالصتاً" زنانہ باتیں ہوتی ہیں۔ نری بکواس۔" کینڈی نے سیل واپس جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔ بہت مفید اور اصلاحی باتیں ہوتی ہیں۔ کبھی پڑھو تو پتا چلے۔" ریشم نے تلملا کر جواب دیا۔

"یار! مجھ سے نہیں ہوتی محنت۔ میں تو کہیں کسی

پرانے ناول کی کہانی چوری کر کے لکھ کر دے دوں گا۔" کینڈی بھی اپنے نام کا ایک تھا۔

"تمہیں صحافی بننا ہے یا چور؟" حوریہ نے ڈپٹا۔

"دونوں میں اب زیادہ فرق نہیں رہا۔ وہ دور گیا جب صحافی سچائی کا سمبل ہوا کرتے تھے۔ اب تو قلم بھی بکتے ہیں۔ صحافت اپنے معنی تبدیل کر چکی ہے۔" کینڈی نے بے نیازی سے جواب دیا۔ وہ سب کلاس روم سے نکل کر کاریڈور کی طرف گامزن تھے۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کے بکاؤ ہو جانے سے پوری صحافت کے معنی و مطلب تبدیل نہیں ہو سکتے۔" حوریہ نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی کہو۔ آج کے دور میں "قلم" بک چکا ہے۔ ہمارے سامنے کتنی ہی مثالیں ہیں۔ کرارے نوٹوں نے قلم کی سیاہی میں مفادات و جھوٹ بھر دیا ہے۔ اب نہ پہلے جیسے صحافی ہیں اور نہ ہی قلم کی نوک میں وہ بے باک طاقت۔" کینڈی اپنے موقف کو بدلنے پر راضی نہ تھا۔ جیب سے چیونگم کا پیکٹ نکال کر کھولنے لگا۔

"چند گندی مچھلیوں کی وجہ سے پانی کی ساری مچھلیوں کو گندا نہیں کہا جا سکتا۔ پانی میں رنگ ان ہی اچھی مچھلیوں کی بدولت ہیں۔" حوریہ کو روشن پہلو اجاگر کرنے کی عادت تھی۔

"تم بھول رہی ہو لڑکی! کہ اس پانی میں مگرمچھ بھی ہیں، جو صاف مچھلیوں کو سالم نگل جاتے ہیں۔" کینڈی نے چیونگم کا ریپر نکالتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے رے واپس دے یار... میری منگیتر نے بڑے پیار سے دی ہے۔" عمر نے کینڈی کے ہاتھ سے پیکٹ اچک کر ایک چیونگم خود نکالی۔ باقی پیکٹ دانش کی طرف اچھال دیا۔

"بس کر دے یار... کتنی منگیتریں بدلے گا؟" ذیشان نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔

"غالباً "چوتھی" ہے۔" دانش نے سوچتے ہوئے کہا۔

"تیسری۔" کینڈی نے فوراً اس کی تصحیح کی۔ عمر نے آدھی چیونگم حوریہ کی طرف بڑھا دی "شرم آنی چاہیے کینڈی تم کب سنجیدہ ہو گے؟" حوریہ کو اس کی اس عادت سے چڑ تھی۔

"کمینو! میری ساری چیونگم کھا گئے۔ امپورٹڈ تھی۔ پچھلے ہفتے ہی اس کے پاپا نے امریکہ سے آنے والے سامان سے ماری تھی۔" حوریہ کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ روہانسا ہو کر دہائی دے رہا تھا۔

"کیا مطلب؟" صندل نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"مطلب یہ ہے کہ ہاشیہ کے فادر کسٹم آفیسر ہیں۔" اس کے ایک جملے نے ساری داستان بیان کر دی تھی۔

"او... اس بار لمبا ہاتھ مارا ہے تو نے۔" دانش نے اس کی ٹانگ کھینچی۔

"ان لوگوں کا کچھ نہیں ہونا۔" حوریہ نے تاسف سے سر دائیں بائیں ہلایا۔ وہ لوگ اب لابی کی طرف آ گئے تھے۔

"چلو یارو! میں تو چلا۔ آج آپی کے سسرالی آنے والے ہیں اور امی نے مجھے ڈرائیور کم ملازم کم باورچی کا عہدہ عطا کیا ہے۔" دانش نے الوداعی نگاہ ان پر ڈالی۔

"چل میں بھی چلتا ہوں، مجھے ذرا "فکشن" پر

ڈراپ کردے۔" کینڈی بھی چل پڑا۔
"مگر فکشن اور میرے گھر کے روٹس الگ الگ ہیں۔" دانش نے فوراً" کہا۔
"تو کیا ہوا.... تو دوستی کی خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتا۔" کینڈی نے معصوم سامنہ بنایا۔
"چل مر.... مگر آئندہ یہ سب نہیں چلے گا سمجھے؟" دانش نے وارننگ دی۔ ایسی وارننگز وہ ہفتے میں نجانے کتنی بار دیتا تھا قادر عرف کینڈی کو۔ مگر وہ کینڈی ہی کیا جس پر کسی بات کا اثر ہو جائے۔
"او کے گائز...." دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔
"یہ نہیں سُدھر سکتا۔" ریشم نے سرہلاتے ہوئے ہنس کر کینڈی کو دیکھا۔
"جس دن یہ سدھر گیا ناں' اس روز پاکستان میں انقلاب آجائے گا۔" عمر نے مسکرا کر کہا تھا۔

* * *

وہ اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ آج اسٹاپ پر رش بھی زیادہ تھا اور بس بھی لیٹ ہو گئی تھی۔ وہ بے خیالی میں سڑک پر دوڑتی بھاگتی گاڑیوں اور ٹریفک کو دیکھ رہی تھی۔ چونکی تب' جب سلور مرسڈیز اس کے پاس آکر رکی۔
"سوری! میں نے تمہیں ڈرا دیا' حالانکہ یہ کام بہت مشکل ہے۔" عمر نے شیشہ نیچے کرتے ہوئے شرمندگی سے کہا۔
"نہیں' میں اپنے ہی دھیان میں تھی۔" وہ بولی۔
"چلو میں ڈراپ کر دوں۔" اس نے کہا۔
"میں چلی جاؤں گی۔ بس آنے والی ہو گی۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"بس نہیں آئے گی۔ شہر میں ہڑتال کی کال آئی ہے۔ جس روٹ سے تمہاری بس نے آنا تھا وہیں پر ہنگامہ ہوا ہے۔ چلو جلدی آؤ۔ کم آن۔" عمر نے عجلت میں کہا۔
حوریہ نے اضطراب سے ہونٹ بھینچے اور پھر لمحہ بھر کچھ سوچا۔ اور بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی عمر نے کار آگے بڑھادی۔
"ویسے تمہیں کس طرح پتا چلا کہ اسٹرائیک کی کال آئی ہے؟ مجھے تو سب نارمل لگ رہا ہے روڈ پر۔" اس نے سوال کیا۔
"اس شہر میں اسٹرائیک کبھی بھی کال کی جا سکتی ہے۔" عمر نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے جواب دیا اور گیئر بدلا۔
"عمر! یہ تو میرے ہی روٹ کی بس ہے ناں؟" حوریہ نے سائیڈ مرر میں بس کو دیکھا تو پوچھا۔
"ہوں.... ہے تو۔" عمر نے چونکہ بیک مرر میں پہلے ہی بس کو دیکھ لیا تھا لہٰذا سچ بولتے ہی بنی۔
"تم نے جھوٹ بولا؟" وہ پوری کی پوری اس کی طرف مڑ گئی۔
"میں نے صرف سچ چھپایا ہے۔" وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔
"بات مت کرنا مجھ سے۔ جھوٹ اور پھر ڈھٹائی۔" وہ چلائی۔
"ارے یار! ویسے" تو تم نے آنا نہیں تھا۔ لہٰذا یہ ڈراما کرنا پڑا۔ سوری۔" عمر نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔
تم بہت مین (Mean) ہو عمر...." وہ مٹھیاں بھینچ کر بولی۔
"اچھا چلو' اب یہ غبارے کی طرح پھولا ہوا منہ ٹھیک کرو۔ مجھے بابا سے ملے کافی دن ہو گئے تھے' سوچا آج اسی بہانے مل بھی لوں گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔
"بابا سے ملنے کے لیے ایسی کسی ڈرامے بازی کی ضرورت نہیں۔" حوریہ نے آنکھیں دکھائیں۔
"نوٹ کر لیا ہے۔" عمر نے شوخی سے جواب دیا۔
حوریہ نے سن گلاسز اتارتے ہوئے اسے گھورا۔
"پروجیکٹ کا کیا کرنا ہے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔
"دیکھتے ہیں.... ہیں ایک دو اسٹوریز.... یا پھر۔" وہ غیر مبہم سا جواب دے کر چپ ہو گیا۔
ہربات آدھی کرتے ہو۔" حوریہ کو برا لگا۔
"بتاؤں گا۔ پہلے مجھے خود تو ڈیسائیڈ کرنے دو یار!"

اس نے کیئریر بدلا اور موضوع بھی۔

✲ ✲ ✲

ریشم نے لائبریری سے نکلتے ہوئے کیچو کھول کر دوبارہ لگایا۔ صندل کسی سوچ میں گم تھی۔

"دیر ہو گئی۔ فون کر لوں امی کو۔ پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ذرا یہ پکڑو۔" ریشم نے بیگ اور کتابیں اسے تھما دیں اور پرس میں سے موبائل نکالنے لگی۔

صندل اسے ایک نظر دیکھ کر پھر کسی سوچ میں گم ہو گئی۔ وہ جوتے کی نوک سے زمین کرید رہی تھی۔

"جی امی! مجھے کچھ دیر ہو جائے گی آنے میں۔ فکر مت کیجئے گا اوکے بائے۔" ریشم نے فون بند کرنے کے بعد اس کے ہاتھ سے کتابیں لے لیں۔

"تم نے گھر کال کرنی ہے تو میرا سیل لے لو۔"

"تھینکس.... میں دیر سے گھر پہنچوں بھی تو کسی کو پروا نہیں ہوتی، تم خوش قسمت ہو کہ تمہاری ماں ہے، جو گھر میں تمہارا انتظار کرتی ہے۔" صندل نے افسردگی سے کہا۔ ریشم نے تاسف سے اسے دیکھا۔ اور اس کے کاندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

صندل کی سوتیلی ماں کو اس کی موجودگی، اس کی ذات سے ایسے ہی تکلیف تھی جیسے کہ ایک روایتی سوتیلی ماں کو ہونی چاہیے، ماحول بدلنے کی غرض سے ریشم نے موضوع ہی بدل لیا۔

✲ ✲ ✲

کار چھوٹے سے بنگلے کے آہنی گیٹ کے باہر آ کر رکی۔

"گاڑی اندر ہی پارک کر لو۔ ہماری گاڑی تو دو دن سے ورکشاپ میں ہے۔" حوریہ نے کہا۔

عمر کی گاڑی گھر کے ملازمین پہچانتے تھے سو چوکیدار نے دور سے ہی سلام جھاڑ دیا۔ عمر نے سر کو جنبش دے کر سلام کا جواب دیا اور گاڑی اندر لے آیا۔ چھوٹے سے پورچ میں صرف اتنی گنجائش تھی کہ اسی کی گاڑی کھڑی ہو سکتی تھی۔

"سلام عمر میاں! کیسے ہیں؟ بڑے دنوں بعد آنا

ہوا۔" پرانا نمک خوار حوریہ کو سلام کرنے کے بعد عمر سے مخاطب تھا۔

"بس فضلو چاچا! مصروفیت تھی۔ آپ ٹھیک ہیں ؟" اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"بابا گھر پر ہیں فضلو چاچا؟" حوریہ نے پوچھا۔

"جی بٹیا! آج تو روز رنگ منایا جا رہا ہے۔" فضل دین نے اطلاع دی۔

"او نو...." حوریہ نے سر پکڑ لیا۔

"یہ روز رنگ کیا ہے بھئی ؟" عمر نے حیرت سے حوریہ کو دیکھا۔

"جس طرح ہفتہ صفائی ہوتا ہے ناں اسی طرح ہر سال بعد یہ "روز رنگ" منایا جاتا ہے اور وہ بھی صرف اور صرف ہمارے گھر میں ۔یہ لفظ بابا کی خالصتاً ایجاد ہے۔" وہ اندر کی طرف بڑھتے ہوئے بتا رہی تھی۔

"مائی گاڈ۔" لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پورا لاؤنج تلپٹ ہوا تھا۔ سارا سامان کمرے کے وسط میں تھا اور کارپٹ فرش سے ہٹا ہوا تھا۔ فرش پر جابجا رنگ کے دھبے نظر آ رہے تھے اور بابا خود لکڑی کی چوڑی سی سیڑھی پر "ٹنگے" رنگ کا ڈبا اور برش لیے دیوار پر رنگ کرنے میں مصروف تھے۔ سیڑھی کو نیچے سے پرانی ملازمہ نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ ساتھ ساتھ تبصرے بھی جاری تھے۔

"ارے بھئی شاہینہ! دیکھو سیڑھی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ کہیں تمہارے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑی تو اس عمر میں تم پر بوجھ بڑھ جائے گا۔" وہ برش کو ڈبے میں بھگوتے ہوئے بول رہے تھے۔

"ارے صاحب ! میرا بوجھ کیا بڑھے گا سیڑھی پکڑنے سے۔ آپ بھی کچھ بھی بول دیتے ہو۔" شاہینہ نے بابا کی بات کا کچھ اور مطلب اخذ کرتے ہوئے ازحد برا مان کر کہا۔

"افوہ.... تم نے تو جملے کا مفہوم ہی بدل دیا.... کتنا کہتا تھا تم سے کہ مجھ سے اردو کی کلاس لے لیا کرو۔ مگر مجال ہے جو کچھ اثر ہو۔" بابا جھلا کر بولے۔ عمران کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور حوریہ بھی دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹے مسکراتے ہوئے انجوائے کر رہی تھی۔

"رہنے دو صاحب.... اب اس عمر میں آپ مجھے کیا پڑھائیں گے ؟" شاہینہ نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے میں کہہ رہا ہوں شاہینہ! مضبوطی سے پکڑو سیڑھی ۔ سیڑھی سرکی تو میں گر جاؤں گا اور اگر خدانخواستہ ٹانگ وانگ پر چوٹ لگ گئی تو تمہیں میری خدمت بھی کرنی پڑ جائے گی۔ کام بڑھ جائے گا تمہارا ۔" بابا نے اس بار آخری جملہ خاصی تیز آواز میں بولا تھا۔

"آئے ہائے صاحب! بہری نہیں ہوں۔ ذرا آہستہ بات کیا کیجیے۔" شاہینہ نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ ہی رکھ لیا۔

"ارے رے رے...." سیڑھی یک دم ڈگمگائی اور اسی پل عمر نے دوڑ کر سیڑھی کو تھام لیا۔

"شکر ہے خدا کا.... تم نے بچا لیا عمر میاں.... ورنہ محترمہ شاہینہ نے تو آج مجھے مروانے کا پورا پورا ارادہ کر ہی لیا تھا۔" بابا نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا۔ "ویسے تم کب آئے ؟" بابا نے سیڑھی سے نیچے اترتے ہوئے پوچھا۔

"جب آپ اور بوا میں گرما گرم چل رہی تھی،" عمر نے ان کے کان میں سرگوشی کی۔ جانتا تھا کہ شاہینہ نے یہ جواب سنا تو پھر شروع ہو جائیں گی۔ ساتھ ہی انہیں سلام بھی کر دیا۔

"اف بابا! یہ سب تو اگلے مہینے ہونا تھا ناں.... پھر یہ اچانک پروگرام کیسے بدلا ؟" حوریہ نے سامان کی مختصر سی پہاڑی کے قریب سے بچ بچا کر گزرتے ہوئے پوچھا ۔

"میرے بچے ! کراچی کے موسم اور ہمارے پروگرام کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ کبھی بھی تبدیل ہو سکتا ہے۔" بابا نے نیچے اترتے ہوئے جواب دیا۔

"عمر لنچ کرنے آیا تھا.... وہ بھی آپ کے ہاتھ کا بنا ہوا

لنچ۔ مگر آپ تو خود کو رنگوں میں ڈبوئے ہوئے ہیں۔"
حوریہ نے بتایا۔ شاہینہ بکھیڑا سمیٹنے میں لگی تھیں۔
"سو بسم اللہ.... لنچ تو تیار ہے۔ تم دونوں چل کر ہاتھ دھولو اور میرے کمرے میں بیٹھو۔ آج دعوت ہمارے دولت کدہ میں ہوگی۔" بابا نے برش نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ "شاہینہ تم کھانا لگاؤ۔ چلو بھئی برخوردار! تم میرے کمرے میں چلو۔ میں ذرا ہاتھ دھو کر آؤں۔" بابا نے اسے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔
"اور یہ سب؟" عمر نے اس دیوار کی طرف اشارہ کیا جس پر ابھی روغن کرنا باقی تھا۔
"یہ لنچ بریک کے بعد....." وہ خوش دلی سے بولے۔
"چلیں.... پھر میں بھی آپ کی مدد کردوں گا۔" وہ دوستانہ انداز میں بولا۔
"اچھا.... چلو ٹھیک ہے تمہارا ابھی پتا چل جائے گا کہ کتنے پانی میں ہو۔" وہ شوخی سے ہنسے۔ عمر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔
بعد میں حوریہ نے اسے بتایا کہ بابا پورے گھر کو سال میں ایک مرتبہ خود اپنے ہاتھوں سے پینٹ کرتے ہیں۔ عمر اس بات پر خاصا حیران ہوا تھا۔
"اچھا۔ مگر یہ تو خاصا مشکل اور محنت طلب کام ہے۔ بابا تھک جاتے ہوں گے۔" اس نے کہا۔
"خود کم تھکتے ہیں شاہینہ بوا اور فضلو بابا کو زیادہ تھکا دیتے ہیں۔ بیچاروں کی شامت آجاتی ہے۔ خود کو مصروف رکھنے کے لیے اور اس گھر کے سناٹے کو دور بھگانے کے لیے بابا اکثر اسی قسم کے ہنگاموں میں مگن نظر آتے ہیں۔ بابا کے بہت پرانے دوست ہیں رحمان انکل.... ہمارے پڑوسی بھی ہیں۔ وہ بھی بابا کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔ اس گھر میں رونق میرے بابا کی وجہ سے ہے عمر! میرے بابا جیسا کوئی نہیں ہے۔"
حوریہ کے انداز میں، لہجے میں اپنے باپ کے لیے محبت بھی تھی اور فخر بھی۔ عمر چند لمحوں کے لیے بس اسے دیکھتا رہا۔ وہ جب بھی اپنے بابا کے بارے میں بات کرتی تھی اس کے چہرے پر روشنی بکھر جاتی تھی۔
"بابا کو باغبانی کا بہت شوق ہے۔ مختلف ملکوں سے اور دوسرے شہروں سے پودے اور پھول اور گھاس منگوا منگوا کر لان میں لگاتے ہیں۔ بابا ان کی دیکھ بھال خود کرتے ہیں۔"
ایک بار گھر کے لان کی سیر کراتے ہوئے اس نے بتایا تھا۔ "یہ پرندے بابا کے فیورٹ ہیں۔ آسٹریلیا سے خاص منگوائے ہیں۔ ان سے پہلے انڈیا سے چڑیاں منگوائی تھیں۔ میں نے وہ سب اڑا دیں۔ مجھے پرندے فضا میں اڑتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ بابا سے میری لڑائی ہوگئی تھی۔ بہت مشکل سے منایا تھا انہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بنگلے کے پچھواڑے بنے بڑے سے پنجرے میں پھڑپھڑاتے پرندوں سے متعارف کرا رہی تھی۔
"بابا کوکنگ اور بیکنگ بہت اچھی کرتے ہیں۔ امی کی ڈیتھ کے بعد سے وہ سارے کام خود ہی کرتے رہے ہیں۔ شاہینہ کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ کہتے تھے کہ شاہینہ پلاؤ کے نام پر کھچڑی پکاتی ہے اور سالن پر تو سوپ کا گمان ہوتا ہے۔ وہ ایک چیز ہی اچھی بناتی ہے اور وہ چائے ہے۔ اسی کو غنیمت سمجھو۔ کیونکہ صبح صبح اٹھ کر چائے بنانا مجھے بالکل پسند نہیں۔"
وہ اس طرح کے بے شمار قصے اسے سنا چکی تھی۔ بابا کی شخصیت بہت دلچسپ اور پرکشش تھی۔ عمر کو ان سے خاص انسیت ہو چکی تھی۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں ان سے اتنا متاثر ہو گیا تھا اور بے تکلف بھی کہ بلا جھجک انہیں حوریہ کی طرح بابا کہہ کر بلانے لگا تھا۔ اس بے تکلفی میں زیادہ ہاتھ بابا کا ہی تھا۔ ان کی طبیعت کی شگفتگی اور بے ساختگی عمروں کے فرق کو مٹا دیتی تھی۔ کبھی بھی عمر نے ان کے ماتھے پر شکن نہیں دیکھی تھی۔ عمر کی دوستی حوریہ سے زیادہ بابا سے تھی۔ وہ اپنے دل کی ہربات ان سے شیئر کرلیتا تھا۔
کھانے کے دوران بابا ہی بولتے رہے۔ وہ کبھی کبھی درمیان میں کوئی ٹکڑا جوڑ دیتا۔ حوریہ بھی کوئی نہ کوئی پیوند لگا دیتی۔ اس نے انہیں اپنے اسائنمنٹ کے بارے میں بتایا۔
"اچھی بات ہے بھئی، تم لوگوں کو ابھی سے محنت کرنی چاہیے۔ ابھی سے دنیا کو سمجھنا شروع کردو۔"

انہوں نے کھیرے کے ٹکڑے کو اٹھا کر کترنا شروع کر دیا۔

"اس اسائنمنٹ سے دنیا کا کیا تعلق ہے بابا! اس کے بغیر بھی ہم دنیا کو سمجھ سکتے ہیں۔" حوریہ نے پلاؤ پر رائتہ ڈالتے ہوئے اپنا نظریہ پیش کیا۔

"ہاں... کر تو سکتے ہو۔ مگر تمہارے استاد محترم چاہتے ہیں کہ تم لوگ کھیل کھیل میں یہ مشکل کام آسانی کے ساتھ سیکھ جاؤ۔ زندگی بہت تلخ ہوتی ہے۔ اچھا ہے اس کی حقیقت کو کھیل کھیل میں ہی جان لو۔" وہ مسکرا کر بولے۔ عمر نے ان کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

"گنے کھاؤ گے؟" انہوں نے اچانک پوچھا۔

"گنے...؟" عمر نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"گنے کہاں سے آئے بابا؟" حوریہ نے سوال کیا۔

"رحمان کا سالا گیا تھا پنجاب، وہاں اس کے سسر کی زمین ہے۔ ڈھیر اٹھا کر لے آیا۔ تمہارے لیے میں نے کہا کہ میں بھی کھاؤں گا تو میری بتیسی کا مذاق اڑانے لگا۔ خیر... میں نے بھی سوچ رکھا ہے کہ اس سے بدلا کس طرح لینا ہے۔ حور! جاؤ شاہینہ سے کہو گنے لے آئے۔" انہوں نے بیٹی سے کہا۔

"جی۔" وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

"آپ کی زندہ دلی مجھ میں بھی حوصلے بھر دیتی ہے بابا۔" وہ محبت سے بولا۔

"حوصلے تو بلند ہی رکھنے چاہئیں بیٹے۔ پست حوصلوں کے ساتھ جینا ناممکن ہوتا ہے اور مردہ بن کر جینے سے اچھا ہے کہ بندہ مر ہی جائے۔" وہ ذو معنی الفاظ میں بولے۔

"بابا! اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہنی تھی۔" عمر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں۔ کہو..." بابا نے نیپکن سے ہونٹوں کے کنارے صاف کیے اور اس کی طرف دیکھا۔

"میں آپ کی زندگی پر لکھنا چاہتا ہوں..." اس نے ہچکچاتے ہوئے اپنی خواہش بیان کی۔ بابا لمحہ بھر کو ٹھٹکے مگر اس کی طرف دیکھا نہیں۔ پھر آہستگی سے انہوں نے نیپکن ٹرے میں رکھ دیا۔

"آپ نے مائنڈ کیا؟" ان کے چہرے پر پھیلنے والے عجیب و غریب تاثرات نے اس کو پشیمانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

"آئی ایم سوری... اگر میں۔" عمر نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

بابا نے اپنی چمک دار آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی شرمندگی کے تاثرات دیکھ کر وہ مسکرا دیے۔ پھر اپنا ہاتھ عمر کے ہاتھ پر رکھ کر محبت سے تھپتھپایا۔

"تم نے ایسا کچھ نہیں کہا کہ سوری کرو۔ بس کچھ پرانا پھر سے یاد آ گیا۔" وہ مسکرائے۔ بڑی ہی کھوئی کھوئی سی اور افسردہ مسکراہٹ تھی۔

"میری کہانی..." وہ جیسے خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائے۔

"اگر آپ نہیں چاہتے تو رہنے دیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ وہ ان سے محبت کرتا تھا اور ان کو ناراض یا افسردہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے... لکھ ڈالو یار۔" کچھ لمحے سوچنے کے بعد وہ کھل کر مسکرائے۔ جیسے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔

"تھینکس بابا۔" وہ یکدم پرسکون ہو گیا۔

"کس بات کے لیے تھینکس کہا جا رہا ہے؟" حوریہ اندر آتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہی شاہینہ گنوں کو ٹرے میں اٹھائے اٹھائے اندر داخل ہو رہی تھیں۔

"ہر بات تمہیں بتانی ضروری نہیں ہے۔ یہ میری اور بابا کی بات ہے۔" عمر نے پانی کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

"آئے ہائے... بھئی یہ کیا مصیبت بھیج دی رحمان میاں نے... پہلے کم پھیلاوا تھا جو یہ کمبخت گنے بھی آن پہنچے۔ حوریہ کے کچھ کہنے سے قبل ہی شاہینہ کا فسانہ شروع ہو گیا۔

"ارے میں کہتی ہوں چھیلے گا کون انہیں؟ ارے

تحفے بھیجنے بھجوانے کا اتنا جنون چڑھا تھا تو کچھ ڈھنگ کا بھیجتے۔" شاہینہ نے گنوں سے بھری ٹرے قالین پر دھڑام سے رکھی۔

"ارے دانتوں سے چھیلے ہیں ہم نے۔" بابا کو جوانی کے دن یاد آ گئے۔

"جب ہی تو آج دانتوں کا یہ حال ہے۔ اس وقت خیال کیا ہوتا تو آج کچھ بچے ہوتے۔" شاہینہ نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں سنائیں۔

"عمر! تمہاری بھی شوگر مل ہے ناں؟" حوریہ نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

"میری نہیں میرے فادر کی۔" اس نے تصحیح کی۔

"ایک ہی بات ہوئی ناں۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"ایک بات نہیں ہے۔۔۔" وہ ناقابل فہم انداز میں بولا۔

"کیا مطلب؟ بھئی جو ماں باپ کا ہوتا ہے۔ وہ اولاد کا ہی ہوتا ہے۔ کیوں بابا؟" اس نے باپ سے تائید چاہی۔

"بالکل۔" انہوں نے بھی تائید کرنے میں دیر نہ لگائی۔ عمر نے کوئی جواب نہ دیا۔

"گنے کھائیں؟" وہ آلتی پالتی مار کر قالین پر بیٹھ گیا۔ حوریہ نے حیرت سے اسے دیکھا تھا مگر کچھ بولی نہیں۔

٭ ٭ ٭

وہ اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ جتنی دیر میں وہ دروازے کا لاک کھول کر اندر آیا تھا' گھنٹی بند ہو چکی تھی۔ اس نے سی ایل آئی پر نمبر چیک کیا۔ پھر کال بیک کرنے کے بجائے اپنے بیڈ روم میں گیا اور وارڈ روب سے کپڑے نکال کر غسل خانے میں گھس گیا۔ اطمینان سے غسل کرنے کے بعد وہ تولیے سے گیلے بالوں کو رگڑتا ہوا باتھ گاؤن میں ملبوس باہر نکلا ہی تھا کہ ڈور بیل بجی۔ اس نے بجائے دروازے کی طرف جانے کے آگے بڑھ کر ڈیک آن کر دیا ۔۔۔ پُر شور آواز کمرے کے سناٹے میں گونجنے لگی۔ گھنٹی متواتر بج رہی تھی۔ میوزک کی دھن پر چٹکی بجاتا ہوا وہ اسی حلیے میں بیرونی دروازے کی طرف چل پڑا اور بغیر پوچھے اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے کھڑی شخصیت کو دیکھ کر نہ وہ چونکا اور نہ ہی حیران ہوا۔

"کب سُدھرو گے تم۔۔۔ نہ فون ریسیو کر رہے ہو نہ دروازہ کھول رہے ہو۔ سیل بھی آف کر رکھا ہے۔ تمہارا بچپنا کب جائے گا عمر؟" وہ اندر داخل ہوتے ہوئے قدرے خفگی سے کہہ رہی تھیں۔ عمر نے ایک طرف ہٹ کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا تھا۔ ان کے اندر آنے کے بعد اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"آپ ہیں تو دروازہ کھول بھی دیا۔ آپ کے شوہر نامدار ہوتے تو یہ مزید ایک گھنٹے تک بند رہتا۔" وہ بد لحاظی سے بولا۔

"بُری بات ہے عمر! جاؤ چینج کر کے آؤ۔ میں یہیں ویٹ کر رہی ہوں۔" انہوں نے سرزنش کی۔ "کھانا کھایا تم نے؟" انہوں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"خوب پیٹ بھر کر۔" وہ بغیر مڑے جواب دیتے ہوئے کمرے میں گھس گیا۔

"میں کافی بناتی ہوں تب تک۔" انہوں نے ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے اطلاع دی اور کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ عمر نے انہیں روکا نہیں۔ جتنی دیر میں انہوں نے کافی تیار کی' عمر ڈریس اپ ہو کر باہر آ گیا تھا۔

"تمہاری یہ عادت مجھے بہت پسند ہے کہ تم بہت صفائی پسند ہو۔ ہر چیز جگہ پر رکھنے کے عادی ہو۔ بہت سلجھی ہوئی عادت ہے تمہاری۔" وہ مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرائیں۔

"آپ کو مجھ سے واقعی محبت ہے۔ جب ہی میری ہر چیز کی تعریف کرتی ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"ماں کو اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہی ہے عمر! اس میں حیرت کیا؟" مگر میں ماںتا سے ہٹ کر حقیقت بیان کر

رہی ہوں۔" ان کی نگاہوں میں وہی شفقت اور مامتا تھی، جو وہ بچپن سے دیکھنے کا عادی تھا۔

"مگر سوتیلی مائیں آپ کی طرح نہیں ہوتی ہیں ممی!" عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

"سوتیلی اور سگی نہیں، ماں تو بس ماں ہوتی ہے۔" انہوں نے نرمی سے جواب دیا۔

"نہیں... کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جیسا میرے ساتھ ہوا ہے، ورنہ سگے اور سوتیلے کا فرق تو زمین اور آسمان کے فرق جتنا ہی ہوتا ہے۔" اس نے ان سے اختلاف ظاہر کیا۔

"چلو چھوڑو یہ بیکار بحث..." انہوں نے موضوع بدلا۔

"تم نے فون کیوں ریسیو نہیں کیا؟" انہوں نے پوچھا۔

"میں سمجھا آپ کے ہزبینڈ کا فون ہے۔ اگر پتا ہوتا کہ آپ ہیں تو کال بیک کر لیتا۔" اس نے مگ منہ سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"بری بات... پاپا ہیں تمہارے وہ، میرے ہزبینڈ بعد میں ہیں۔" انہوں نے پھر سرزنش کی۔

"کافی آپ لاجواب بناتی ہیں۔ ترستا رہتا ہوں آپ کے ہاتھ کی کافی کے لیے۔" اس نے خالی مگ میز پر رکھ دیا۔

"تو میرے پاس ہی رہو ناں۔ اتنی بڑی حویلی ہے۔ نوکر چاکر ہیں اور تم اس فلیٹ میں رہتے ہو... مانتے بھی تو نہیں ہو کسی کی۔" انہوں نے ناراضی سے کہا۔

"آپ کو پتا ہے سب، پلیز مجھے فورس مت کریں۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"اچھا اسٹڈیز کیسی چل رہی ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ فائنل ایر کے بعد باہر جانا چاہتا ہوں ہائر اسٹڈیز کے لیے۔" اس نے اپنا پلان بتایا۔

"اچھی بات ہے۔ اور فیوچر کے لیے کیا سوچا ہے تم نے؟ تمہارے پاپا تو تمہارے لیے پلان بنائے بیٹھے ہیں کہ تم ان کے ساتھ پالیٹکس میں آجاؤ۔ تمہارے لیے بہت پریشان رہتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"اچھا۔" عمر تلخی سے ہنسا "دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔"

"عمر! دل بڑا کرو۔ اب تم بچے نہیں ہو۔ بھول جاؤ سب۔ اسی میں عافیت ہے میری جان!" انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے گھنیرے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

"میرا دل آپ جتنا بڑا نہیں ہے چھوٹی ممی!" اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اچھا... میں اب چلتی ہوں۔ واپس بھی پہنچنا ہے۔ تم تو جانتے ہو اپنے پاپا کے مزاج کو۔" انہوں نے ساڑھی کا پلو سنبھالا اور کھڑی ہو گئیں۔

"چلیں میں ساتھ چلتا ہوں۔"

عمر انہیں گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا۔

"حوریہ کیسی ہے؟ کبھی ملواؤ اس سے۔" انہوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آج میں اسی کے گھر گیا تھا۔ اس کے فادر بہت نائس ہیں۔ ملواؤں گا۔" اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اوکے اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔" انہوں نے مسکرا کر کہا اور سن گلاسز آنکھوں پر چڑھائے۔ وہ تب تک وہاں کھڑا رہا جب تک ان کی پجارو گیٹ سے باہر نہ نکل گئی۔

وہ جا چکی تھیں مگر نجانے کون کون سی یادیں چھپے ہوئے بلوں میں سے سانپ بچھو بن کر باہر نکل آئی تھیں۔ "اسی لیے آپ سے بھی نہیں ملتا ہوں ممی! کہ پھر یہ زہریلے کیڑے مجھے ڈستے رہتے ہیں... دنوں تک... پھر میں خود کو سنبھال نہیں پاتا۔" اس نے نہایت تکلیف سے سوچا اور سست قدموں سے واپس پلٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

دن بہت تیزی سے گزر رہے تھے۔ ان کے پاس وقت بہت کم تھا۔ عمر نے بابا کو اپنا سبجیکٹ بنایا تھا۔

جبکہ باقیوں نے ایک ہفتہ تو صرف سبجیکٹ کو ڈھونڈنے میں لگا دیا تھا۔ ان سب میں ایک کینڈی تھا جو ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی سبجیکٹ ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا۔

"آخر تم کر کیا رہے ہو یار! آخر کب پوری کرو گے اسائنمنٹ۔" دانش نے ایک روز جھنجلا کر اس سے پوچھا۔

"یار! کیا کروں؟ تم لوگ ہی ہیلپ کرو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ روہانسا ہو کر بولا۔

"تم خود پر کیوں نہیں لکھ لیتے کہانی؟" حوریہ نے مشورہ دیا۔

"خود پر؟ خود پر کیا لکھوں؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔

"لو... اور سنو... اگر تم خود پر لکھنے بیٹھو تو کتاب نہیں کتابیں لکھ ڈالو۔" ذیشان نے ٹکڑا لگایا۔

"تمہیں اس سبجیکٹ میں انٹرسٹ نہیں تھا تو اس کے بجائے کچھ اور لے لیتے۔" صندل نے مونگ پھلی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"مجھے لگا یہ ایزی ہو گا۔ بس دو سال ہی تو گزارنے ہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ گلے میں اٹک جانے والا مچھلی کا کانٹا ثابت ہو گا..." وہ روہانسا ہو گیا۔ وہ لوگ باتیں کرتے کرتے لابی کی طرف آگئے تھے۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ اگر تمہیں شوق نہیں تھا تو سیدھے سیدھے اپنے ڈیڈی کا بزنس سنبھال لیتے جیسے کہ تمہارے دوسرے بھائی کر رہے ہیں۔" عمر نے اپنی جینز کی جیب سے موبائل نکالتے ہوئے کہا اور سیل کی اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔

"اسی ڈر سے تو یہ گھنٹی گلے میں ڈال لی ہے۔ مجھ سے نہیں ہوتا وہ کام جو میرے باپ، بھائی، چچا، تایا کرتے ہیں۔ میرا ذہن اس بزنس کو قبول ہی نہیں کرتا۔ میں تو آزاد پنچھی کی طرح بس اڑتے رہنا چاہتا ہوں اور میرے ابا ہیں کہ میرے پر کاٹتے رہتے ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"بھئی صحافت کو بزنس نہیں سمجھنا چاہیے۔" حوریہ نے کہا۔

"حالانکہ اب یہ ایک اچھا بزنس ہی بن چکا ہے۔" عمر نے ٹکڑا لگاتے ہوئے موبائل جیب میں رکھا۔

"تجھے کیا فکر ہے۔ ڈگری لے کر سیدھے زمینیں سنبھالنی ہیں... گردن تو ہم جیسوں کی پھنسنی ہے۔" کینڈی نے پھر دہائی دی۔

"مگر صحافت تو ایک مقدس پیشہ ہے۔" حوریہ احتجاجی انداز میں بولی۔

"کون سے ڈریم ورلڈ میں رہتی ہیں آپ پرنسز حوریہ... صحافت بھی ایک مقدس پیشہ ہوا کرتا تھا۔ اب "بکاؤ" ہو چکا ہے۔ جو چند ایک بیچارے "قلم کا جہاد" کر رہے ہیں ان کا حشر سب کے سامنے ہے۔ ان کو ان ہی کی تلوار سے شہید کیا جا رہا ہے۔" عمر نے کڑوے لہجے میں اس کی بات کاٹی۔

"مگر تم اتنا تاریک پہلو کیوں دیکھتے ہو؟ یہاں بھی ابھی امید کی روشن کرنیں موجود ہیں۔ اور اندھیرے کو ختم کرنے کے لیے روشنی کی ایک کرن بھی بہت ہوتی ہے۔" حوریہ نے دلیل دی۔ کینڈی نے اسی دوران جیب سے چیونگم کا پیکٹ نکالا اور پھر وہی ہوا جو پہلے ہوا تھا۔ اسے آدھی ہی مل سکی۔

"ایکسکیوزمی گائز! کیا میں بھی آپ سب کو جوائن کر سکتا ہوں؟"

عقب سے آتی بھاری آواز پر سب چونکے۔ ان کے پیچھے سر علی عزیز کھڑے تھے۔ وہ سب چونکے۔

"سوری سر! مگر چیونگم تو ختم ہو گئی۔" کینڈی نے معصومیت سے خالی پیکٹ ان کی طرف بڑھایا۔ سر علی عزیز اس کی شوخی سمجھ گئے۔

"کوئی بات نہیں، چیونگم مجھے پسند نہیں۔ تم سوفٹ ڈرنک پلا سکتے ہو مجھے۔" وہ بھی برجستہ بولے تو کینڈی نے جھینپ کر سر کھجایا۔

"شیور سر... وائے ناٹ۔"

"جسٹ کڈنگ... میں آپ لوگوں کی باتیں سن کر یہاں آیا ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"حوریہ نے ٹھیک کہا ہے، اندھیرے کو ختم کرنے

کے لیے روشنی کی ایک کرن ہی کافی ہوتی ہے۔ جن کرپٹ لوگوں کی بات آپ کر رہے ہیں۔" وہ عمر کی طرف متوجہ تھے۔ "وہ بلاشبہ تعداد میں زیادہ ہیں مگر یقین رکھیے کہ وہ بزدل ہیں۔ ہم جیسے مٹھی بھر لوگ انہیں بالکل ایسے ہی مسل کر پھینک سکتے ہیں۔۔۔" سر عزیز کہہ رہے تھے۔

"جیسے بھنے ہوئے چنوں کے کالے چھلکوں کو ہتھیلی سے مسل کر ان کا چھلکا الگ کر کے پھینک دیا جاتا ہے۔" کینیڈی نے اپنی پٹاری سے مثال نکالی۔

"ہاں بالکل۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ لوگ دراصل ایسے ہی چھلکے ہیں جنہیں صرف ہتھیلی سے مسل کر پھینکا جاسکتا ہے۔"

"جیسے کسی پھل کا سڑا ہوا حصہ۔۔۔ جسے اگر کاٹ کر نکال دیا جائے تو باقی کا پھل صاف اور شیریں ہی رہتا ہے۔ قابل نوش۔" ریشم نے ٹکڑا لگایا۔

"بالکل۔" سر علی عزیز نے ان سب سے اتفاق ظاہر کیا۔

"سوری ٹو سے سر! مگر یہ کہنا آسان ہے۔ دینے کو تو دس مثالیں میں بھی دے دوں۔۔۔ مگر ساری بات عمل کی ہے۔ جب بھی عمل کا وقت آتا ہے ساری حب الوطنی اور سدھار کے لیکچر ٹھس ہو جاتے ہیں۔" عمر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"سب ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں عمر! ایسے بھی ہیں جو آگ کے اس دریا میں کودنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔

"سوری سر! مگر ان حوصلہ مندوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟ یا تو انہیں دوسری دنیا پہنچا دیا جاتا ہے یا پھر خرید لیا جاتا ہے۔ جو بکتا نہیں اس کا جینا حرام کر دیا جاتا ہے۔" عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

"مشکلیں تو زندگی میں آتی ہی ہیں۔ اللہ نے زندگی دی ہے تو اس کا مصرف بھی بہترین طریقے سے کرنا چاہیے۔ کھیل کود میں زندگی ضائع کرنا بھی کفران نعمت ہے۔" سر علی عزیز جیسے اسے قائل کرنے پر تلے تھے۔

"آپ کس دور کی بات کر رہے ہیں اور کس معاشرے کی؟ میں یہاں پڑھنے اس لیے آتا ہوں سر! کہ مجھے ایک اچھی جاب کرنی ہے۔ اس ملک کا سسٹم فرسٹ ٹو آل خراب ہے۔ ایک ایسا "بلیک ہول" ہے یہ سسٹم کہ جو اس میں جاتا ہے، وہ غرق ہو جاتا ہے۔ یہ ملک تب تک نہیں بدل سکتا جب تک یہاں کے لوگ خود اپنی قسمت نہ بدلیں اور لوگ اپنی قسمت سے صرف شکوے کرنے کے عادی ہیں۔ بدلنا کوئی نہیں چاہتا۔"

وہ بغیر لحاظ کیے کہہ رہا تھا۔ سارے گروپ کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کی کڑوی باتوں کا پتا سب کو تھا مگر اس کے اندر اس قدر زہر بھرا ہے اس کا اندازہ انہیں آج ہو رہا تھا۔

"میں تمہاری کچھ باتوں سے اتفاق کرتا ہوں مگر تمہارے کچھ نظریے غلط ہیں۔ تم یوتھ ہو۔ تم لوگوں کی سوچ مثبت ہونی چاہیے اور عمل بھی اس کے مطابق۔ اگر ہر کوئی یہی سوچ لے کر بیٹھ جائے جو تمہاری ہے تو اس ملک کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔" وہ سب چپ چاپ ان کی باتیں سن رہے تھے۔

"صحافت کی تلوار ہے تم لوگوں کے پاس۔ تم لوگ اپنے قلم سے جہاد کرو۔۔۔ صرف ڈگری یافتہ بننا تھا تو تمہیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم میں سے زیادہ تر تو اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانوں کے سپوت ہو۔ اگر محض ڈگری ہی لینی تھی تو پھر یہ سیٹیں کسی مستحق و ضرورت مند کے لیے خالی چھوڑ دیتے۔" انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا تو سب کے سر شرمندگی سے جھک گئے۔

"میرا مقصد تم لوگوں کو شرمندہ کرنا نہیں۔ محض تم لوگوں کے اندر سوئے ہوئے احساس ذمہ داری کو جگانا ہے۔ تم لوگ نئی نسل ہو۔۔۔ تم لوگ ملک کی بدحالی اور غیر منظم نظام کو ایک مضبوط اور قابل عمل پلیٹ فارم فراہم کر سکتے ہو۔ انہوں نے ایک نظر سب کو دیکھا مگر بالخصوص وہ عمر سے مخاطب تھے۔

"ویل انجوائے کرو، پھر ملیں گے۔" سر عزیز نے

الوداعی مگر پرامید نظروں سے سب کو دیکھا۔ ان کے جاتے ہی وہ سب بھی وہاں سے سرک گئے۔

"یار! یہ سرتو جہاں دیکھتے ہیں پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں اپنے ابا سے پریشان ہوں۔ گھر پر وہ ہٹلر۔۔۔ یہاں پر یہ۔۔۔ جائیں تو جائیں کہاں؟" کینڈی نے ترنم کے ساتھ دہائی دی۔

"تمہاری دردمندانہ دہائی کے بدلے چلو میں تمہیں کیفے سے چائے پلواتا ہوں۔" ذیشان نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا اور حاتم کی قبر پر لات بھی۔

"ارے تم کیوں روتے ہو؟ تم نے تو ڈگری لے کر بھی اور بنا ڈگری کے بھی اپنے ڈیڈ کے آفس کو سنبھالنا ہے۔" صندل نے اسے گھورا۔

"تم میرے ڈیڈ کو نہیں جانتیں۔ اگر مجھے زندہ رہنا ہے تو ڈیڈ کی مرضی کے مطابق سبجیکٹ پڑھنا ہے ' ڈگری لانا ہے اور پھر ان کے آفس میں جاب کرنی ہے۔ اس مہنگائی کے دور میں بھی مجھے صرف ہزار روپیہ پاکٹ منی دیتے ہیں۔" وہ منہ بسور کر بولا

"چچ چچ بیچارہ غموں کا مارا۔" ریشم نے اسے چھیڑا۔

"وہ تو بیچاری امی ہیں جو آڑے وقتوں میں مدد کرتی ہیں۔ مگر بدلے میں ڈھیروں کام بھی کرواتی ہیں۔"

"تمہارا المناک فسانہ ختم ہو گیا ہو تو میری بھی سن لو۔ میرے والد محترم کا بھی کچھ ایسا ہی افسانہ ہے۔ جیسا کہ سر عزیز کا۔۔۔ یعنی ان کا موٹو ہے۔ ساری دنیا کا بوجھ ہم اٹھاتے ہیں۔" دانش کی بات کاٹتے ہوئے ذیشان نے اپنی کتھا شروع کر دی۔

"کیا مطلب؟" کینڈی نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی "مجھے میرے ابا نے زبردستی اس ڈپارٹمنٹ میں "ایڈمٹ" کرایا ہے۔ کہتے ہیں صحافی بن کر ملک اور قوم کی خدمت کرو۔ میں تو ہائر اسٹڈیز کے نام پر "ملک بدر" ہو کر آزاد پنچھی کی طرح رہنا چاہتا تھا مگر ظالم سماج نے کہہ دیا کہ کوئی ضرورت نہیں باہر کی ہوا کھانے کی۔ پہلے یہاں کچھ سال کام سیکھو۔ پھر باہر بھجواؤں گا۔ تم ابھی بچے ہو۔" ذیشان نے رونی صورت بنائی۔ عمر مسکراتے ہوئے ان کی کہانی سن رہا تھا۔

"اگر اتنی ہی دکھی کہانیاں ہیں تم لوگوں کی تو پلیز رحم کھاؤ صحافت پر۔۔۔" حوریہ نے کانوں کو ہاتھ لگالیا۔

"جس ملک کا مستقبل تم جیسے نکمے نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہو گا۔ اس ملک کی صحافت پر تو جھاڑو پھر جائے گا۔" عمر نے کہا۔

"سر عزیز کے لیکچر کا اثر۔۔۔" یہ سب کی متفقہ رائے تھی۔

"چلو بھئی مجھے بریانی کھلاؤ آج تو ناشتا بھی اسکیپ کر دیا۔ سخت بھوک لگی ہے۔" عمر نے حوریہ کا بیگ پکڑ کر کھینچا۔

"بھوک تمہیں لگی ہے اور عیاشی میرے پیسوں سے۔"

"تم سے اچھے تو بابا ہیں۔ کتنا مزے دار کھانا کھلاتے ہیں۔"

"تو روز گھر آجایا کرو۔" اس نے کیفے کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔

"ہم بھی آرہے ہیں۔" باقیوں نے بھی کورس میں اعلان کیا۔

"تم لوگ اپنا اپنا بل خود دو گے۔ کیونکہ تم لوگوں کا پیٹ نہیں عمرو عیار کی زنبیل ہے۔ جتنا ڈالو خالی ہی رہے گا۔" عمر نے پلٹ کر کہا۔

"امریکن سسٹم ان اسلامی جمہوریہ پاکستان' دس از ناٹ فیئر۔" ملی جلی احتجاج میں ڈوبی آوازیں آئیں۔

عمر نے شوخی سے حوریہ کو دیکھتے ہوئے آنکھ ماری۔ وہ اس کی شرارت پر اسے گھورتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ابھی وہ لوگ کیفے کے پاس ہی پہنچے تھے کہ کینڈی کو اپنی سابقہ محبوبہ نظر آگئی۔

"ا۔۔۔ ر۔۔۔ ے۔۔۔ ا۔۔۔ رم۔" وہ ہڑبڑا کر ہکلایا۔

"یہ کیسا نام ہوا؟" دانش نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ا۔۔۔ ے۔۔۔ رم۔"

"کان صاف کر لیا کرو' میں نے "رم" نہیں ارم کہا ہے۔" کینڈی جل کر بولا۔

الحمدللہ پانچ وقت وضو کرتا ہوں' تیری طرح نہیں
کہ عید کے عید ہی غسل کر کے خود کو نکھارے۔ تیرا تو
وہ حال ہوگا بیٹا کہ والد صاحب بقول شاعر فرمائیں گے۔
تیری شادی کی باتیں چل رہی ہیں آج کل بیٹا
سو تیرا صاف ستھرا ہر گھڑی ہونا ضروری ہے
مرا مطلب مہینے تک نہانے کی نہ ہو فرصت
تو پھر ہفتے کے ہفتے منہ دھونا ضروری ہے
دانش ترنم سے گنگنایا' سب بے ساختہ مسکرا دیے

عمر کو شرارت سوجھی۔ اس نے بلند آواز میں ارم کو پکار لیا۔ وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ ان کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ عمر کے پکارنے پر پلٹی... ارم انگلش ڈپارٹمنٹ میں تھی اور ان سے جونیئر تھی۔ پچھلے دو مہینوں سے کینڈی ارم کے ساتھ افیئر چلا رہا تھا۔ مگر

کچھ دن پہلے ہی اس کی ندا حمید سے ملاقات ہوگئی تھی جو سائنس کی طالبہ تھی' سو اب وہ ارم سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں تھا۔

"چھوڑوں گا نہیں تجھے۔" کینڈی نے عمر کے پیچھے چھپتے ہوئے سرگوشی میں دھمکی دی۔ وہ بھی اٹھ کر چلی آئی۔

"تو نبٹ اس سے۔" کینڈی نے کھسکنے کی کوشش کی۔

عمر نے اس کا کالر پکڑ لیا۔ کینڈی اپنی ہر نئی دوست کو منگیتر کہہ کر متعارف کراتا تھا۔

"ہائے' کیسے ہو عمر؟" اس نے قریب آتے ہوئے خوش دلی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔ یہ کینڈی تمہیں بڑا مس کر رہا تھا۔ اچھا ہوا تم نظر آگئیں۔" عمر نے کینڈی کو آنکھ ماری۔ وہ بری طرح تلملایا۔

"ریئلی..." ارم نے بے یقین نظروں سے کینڈی کو دیکھا۔ "جب ہی پورے ایک ہفتے بعد مل رہا ہے۔" وہ شاکی نظروں سے کینڈی کو دیکھ رہی تھی مگر مخاطب عمر سے تھی۔ باقی سب کینٹین میں جا چکے تھے۔ حوریہ

نے اندر جاتے جاتے ان تینوں کو دیکھا تھا۔

"اب تم لوگ گلے شکوے کرو۔ میں جا رہا ہوں۔" عمر کینڈی کو ٹھوکا دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

"کہاں ہوتے ہو تم؟ نہ فون اٹینڈ کرتے ہو نہ ٹیکسٹ کا جواب دیتے ہو۔" ارم کا جملہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے آگے بڑھ چکا تھا اور پھر سر جھٹک کر کینٹین میں داخل ہوگیا۔

"کینڈی ٹھیک نہیں کرتا۔ اس کی یہ عادت کسی کے دل کا آزار بن سکتی ہے۔ تم اسے سمجھاتے کیوں نہیں؟" حوریہ اس سے کہہ رہی تھی۔

"میں کیا سمجھاؤں؟ اس کا پرسنل میٹر ہے۔ وہ بچہ تو نہیں ہے۔" عمر نے کندھے اچکا کر کہا۔

ذیشان آرڈر دینے گیا تھا۔ باقی گروپ وہیں موجود تھا۔

"دوستی کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ مگر کسی کو اس حد تک اپنا عادی بنا لینا۔ دیٹس ناٹ فیئر۔ لڑکیاں ہرٹ ہوتی ہیں۔" صندل نے بھی حوریہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اوکے بابا! سمجھائیں گے اسے... تم بتاؤ' پروجیکٹ کہاں تک پہنچا؟" ذیشان نے بات ٹالی جبکہ عمر کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

✲ ✲ ✲

گھڑی نے رات کے دس بجائے تو ساتھ ہی کمرے کا دروازہ کھلا۔ رومیصہ کے گردش کرتے ہاتھ لحظہ بھر کو رکے اور نقوش تن گئے۔ اندر آنے والے نفس کو انہوں نے ڈریسنگ ٹیبل کے سہ رخی آئینوں میں لب بھینچ کر دیکھا اور کلینزنگ ملک کو ٹشو کی مدد سے اتارنا شروع کر دیا۔

"آج کچھ دیر کر دی آنے میں۔ میٹنگ طویل ہوگئی تھی؟" رومیصہ نے ہاتھ روک کر پوچھا۔

"ہاں... تمہیں تو پتا ہے دیر سویر ہو جاتی ہے۔ تم

سناؤ.... مل آئیں شہزادے سے؟" فراز نے کوٹ اتارتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" انہوں نے مختصر جواب دیا اور ٹشو مسل کر ڈسٹ بن میں پھینکا۔

"کیسا تھا؟ کبھی باپ کی یاد نہیں آتی اسے؟ پورے آٹھ مہینے ہو چکے ہیں اسے مجھ سے ملے۔" وہ بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگے۔

"بزی ہے اپنی اسٹڈیز میں۔" وہ مجبور تھیں جواب دینے پر ورنہ فراز سے ہم کلام ہونے کو ان کا دل نہیں کرتا تھا۔

"اتنی بھی کیا مصروفیت۔ ایک فون تک نہیں کرتا ہے مجھے۔" وہ ناگواری سے بولے۔

"کھانا تو کھالیا ہوگا آپ نے؟" انہوں نے تیکھی نظروں اور تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"ہوں ظاہر ہے۔" انہوں نے رومیصہ کی طرف دیکھا۔ اتنے سالوں بعد بھی وہ ویسی ہی تھیں۔ اتنی ہی مدہوش کر دینے والی.... اتنی ہی پرکشش.... وہ ان کو بے خودی کے عالم میں دیکھنے لگے.... رومیصہ ان کی نگاہوں کی گرمی کو خود پر محسوس کر رہی تھیں۔ ان کے لب بھینچ گئے۔ وہ اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

فراز نے ایک گہری سانس لبوں سے خارج کی اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگے۔

باتھ روم کی طرف بڑھے ہی تھے کہ موبائل بج اٹھا۔ انہوں نے جیب سے فون نکالا۔ اسکرین پر چمکتے نمبروں کو دیکھ کر ہی ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یس" کے بٹن کو دبا کر انہوں نے فون کان سے لگا لیا۔

"ہاں بولو یار...." انداز بڑا ہی بے تکلفانہ تھا "یاد ہے۔ مجھے کل کسٹم میں اپنے ہی آدمی ہوں گے۔ ڈونٹ وری۔ میری بات ہو گئی ہے، تمہیں پریشانی نہیں ہوگی... اوکے۔"

انہوں نے فون بند کر دیا اور شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کا انداز مطمئن تھا مگر چہرے پر سوچ کے آثار تھے۔ ان کا موڈ بدل چکا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھے۔

☼ ☼ ☼

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ڈیک پر چلنے والی انگریزی دھن نے ماحول کو خاصا مسحور کن بنا رکھا تھا۔ کمرے کی تمام فینسی لائیٹس آف تھیں صرف سائیڈ ٹیبل لیمپ روشن تھا جس کی زرد روشنی کمرے میں پرسکون سا اجالا پھیلا رہی تھی۔ کینڈی نائٹ سوٹ کی پینٹ میں بنا قمیص کے اوندھا بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور دھیمی آواز میں فون پر بات کر رہا تھا۔ اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ دوسری طرف موجود شخصیت خاص ہے۔ اسی پل کمرے کے بند دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو گیا۔

"ڈارلنگ! جسٹ ہولڈ پلیز۔" اس نے ریسیور سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور دروازے تک گیا۔

"کون؟" اس نے لاک کھولنے سے پہلے پوچھا۔
"بھائی جان! میں ہوں منی۔۔۔" دوسری طرف اس کی چھوٹی بہن تھی۔ "کیا ہے۔ نیند نہیں آتی رات کو ؟ چڑیلوں کی طرح پورے گھر میں منڈلاتی رہتی ہے۔"
اس نے دروازہ کھولتے ہوئے بدمزاجی سے کہا۔
"مجھے شوق نہیں ہے اس کباڑ خانے میں آنے کا۔" منی نے نخوت سے اس کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ "ابا یاد فرما رہے ہیں حضور والا کو۔" وہ زبان نکال کر اس کا منہ چڑاتے ہوئے بھاگ گئی۔
"ابا۔۔۔ باپ رے۔۔۔ ارے۔۔۔ موڈ کیسا ہے ان کا ؟" اس نے چلا کر پوچھا۔
"سخت غصے میں ہیں۔" منی نے جاتے جاتے ڈرایا۔"
مارے گئے۔۔۔ چل بیٹا قادر علی۔۔۔ کلاس لینے والے ہیں۔" وہ جلدی سے پلٹا۔
"یار! ابا نے بلوایا ہے۔ بعد میں بات کرتا ہوں بائے۔" اس نے ریسیور اٹھا کر کہا اور دوسری طرف سے جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔
قمیص پہن کر جلدی سے بال سنوارے اور چپل پہن کر ابا کے کمرے کی طرف بھاگا۔ جب کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر آیا تو ابا آرام کرسی پر جھولتے ہوئے کوئی کھانا کھولے بیٹھے تھے۔
"ابا! آپ نے یاد کیا؟" اس نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں۔۔۔ بیٹھو۔" وہ کھاتے سے نظریں ہٹائے بغیر بولے۔ کینڈی نے اندر آتے ہوئے بغور ان کے چہرے کا مطالعہ کیا غصے میں تو نہیں لگ رہے۔ اس نے تجزیہ کیا۔
"پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟" اس بار انہوں نے کھاتا بند کرتے ہوئے سوال کیا۔ وہ کرسی پر ٹک گیا تھا مگر جی چاہ رہا تھا کہ وہاں سے بھاگ جائے۔
"جی بہت اچھی۔" اس نے جواب دیا۔
"ایسے عجیب اوٹ پٹانگ کپڑے کیوں پہنتے ہو۔"
انہوں نے اس کی شرٹ پر بنے کسی ماؤس کو ناگواری سے دیکھا۔ "نماز پڑھی تم نے ؟" انہیں یک دم یاد آیا۔
"ج۔۔۔ جی ہاں۔" وہ ہکلایا۔
"ایسے کپڑوں میں تو نماز نہیں ہوتی۔" انہوں نے جتلایا۔
"نہیں ابا۔۔۔ پہلے پڑھی تھی نماز۔۔۔ پھر چینج کیے تھے کپڑے۔" اس نے وضاحت دی۔
"خیر۔۔۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمہاری پڑھائی ختم ہونے میں شاید آٹھ یا نو ماہ باقی ہیں۔ اس کے بعد تم اپنے بھائیوں کے ساتھ کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاؤ گے۔" انہوں نے کہنا شروع کیا۔
"جی۔۔۔" وہ ان کی شکل دیکھنے لگا (آزادی ختم ہونے میں صرف چند مہینے) اس نے بڑی حسرت سے سوچا۔
"مگر ابا۔۔۔ میں کسٹم آفیسر بننا چاہتا ہوں۔" اس نے بڑی ہمت کر کے جواب دیا۔
"کسٹم آفیسر۔۔۔" خان جلال اللہ چونکے۔
"جی۔۔۔ مجھے کاروبار میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔۔۔ یوں بھی میرا ذہن کاروباری نہیں ہے۔۔۔ اگر شروع بھی کیا تو نقصان ہی ہو گا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے ان کی شکل دیکھی۔ شلوار قمیص میں نماز کی جالی والی ٹوپی پہنے اس کے باریش ابا کسی سوچ میں گم تھے۔ کینڈی نے آج ہمت کر کے ان کے سامنے بات کی تھی۔۔۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر آج اس وقت اس نے یہ ہمت نہ دکھائی تو پھر شاید کبھی نہ دکھا پاتا۔ کینڈی کا گھرانا بہت مذہبی تھا۔ اس کے علاوہ اس کے تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ منیرہ عرف منی اس سے چھوٹی تھی باقی سب بڑے تھے۔ وہ میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ قادر اور منیرہ کے علاوہ باقی تمام بہن بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ قادر اور منیرہ کی بات بھی ان کی برادری میں ہی پکی ہو چکی تھی اور اس بات سے دونوں کو آگاہی تھی۔ خان جلال اللہ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کا کاروبار وسیع تھا۔ دولت کی ریل پیل کے ساتھ ماحول

بھی تعلیم یافتہ تھا۔ مگر جلال اللہ کا گھر پر اس قدر رعب تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی سانس لینے کی ہمت بھی نہ کر سکتا۔ وہ بے حد سخت گیر طبیعت رکھتے تھے۔

کینڈی کا رجحان شروع سے ہی دوسری طرف تھا۔ نہ اسے اپنے گھر کا ماحول پسند تھا اور نہ ہی ذریعہ معاش نہ ہی باپ کی حاکمیت پسند تھی نہ جبر ——————

غیر ارادی طور پر آہستہ آہستہ وہ باپ اور اس کے بنائے اصولوں اور گھر کے ماحول سے بیزار ہوتا چلا گیا۔

وہ بظاہر تو باپ سے ٹکرانے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا مگر در پردہ ہر وہ کام کرتا جو وہ چاہتا اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ دوسری شخصیت اس کی چھوٹی معصوم بہن تھی۔ جس کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ وہ چند سال بعد اس گھر سے رخصت ہو جائے گی۔ وہ جتنا اسے ستاتا تھا، اتنی ہی محبت بھی کرتا تھا۔ باپ کے کاروبار کو چھوڑ کر سرکاری ملازمت کرنا بھی اس کی سرکشی کا ایک رخ تھا۔

"ٹھیک ہے.... جب تمہاری تعلیم مکمل ہو جائے تو مجھے بتا دینا.... کسٹم میں تمہیں لگوانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ باقی کاروبار میں تمہارا حصہ تو رہے گا ہی.... مگر میں چاہتا ہوں کہ تم اس طرف بھی کچھ توجہ کرلو....."

انہوں نے اس کی سوچ کے برخلاف جواب دیا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کا خیال تھا وہ اس کی بات سن کر وہ بھڑک اٹھیں گے۔

"اچھا ہے گھر کے کسی ایک بندے کو کسٹم میں بھی ہونا چاہیے۔ اتفاق ہی ہے کہ ہمارے خاندان میں سے کسی نے تمہارے سوا اس فیلڈ میں جانے کا سوچا ہی نہیں۔ چلو ہمیں بھی سہولت رہے گی۔ ہمارا مال کلیئر کرا دیا کرنا۔" انہوں نے آخری فقرہ مسکرا کر کہا تو اسے ان کی نرمی کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ ابا میاں ہر چیز میں اپنا فائدہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں اس نے تلخی سے سوچا اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھا۔

اسی وقت خان صاحب کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

"نماز پڑھا کرو۔ چہرے پر نور آتا ہے۔" انہوں نے اپنا فون اٹھاتے ہوئے اسے نصیحت اور جانے کا اشارہ ساتھ ساتھ کیا۔

"جی۔" وہ نیک شریف بچوں کی طرح تابعداری سے اٹھا اور چلتا بنا۔ کمرے سے نکلا تھا کہ ماں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

"سارا وقت کام میں لگی رہتی ہیں۔ آرام کب کرتی ہیں؟" اس نے ماں کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس دیکھا وہ سمجھ گیا۔ خان صاحب کے لیے دودھ لے کر جا رہی ہیں۔

"آرام بھی کرتی ہوں مگر تجھے کیا۔ دو گھڑی پاس آ کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی حال احوال نہیں پوچھتا۔" انہوں نے شکوہ کیا۔

"آپ کو "خدمت جلال" سے فرصت ملے تو کچھ بیٹھ کر بات چیت ہو۔ آپ تو سارا وقت اس گھر کے مکینوں کی خدمت میں لگی رہتی ہیں۔ اپنی ان ہڈ حرام بہوؤں سے بھی کہا کریں کہ ہاتھ ہلا لیا کریں۔ ان کے کمروں اور میکوں سے باہر بھی ایک دنیا ہے۔ کبھی ان کو یاد دلا دیا کریں۔" وہ محبت سے ماں کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"اچھا چل چھوڑ.... تیرے ابا نے بلوایا تھا کیا کہہ رہے تھے؟" انہوں نے موضوع بدلا۔

"آج بھولے بھٹکے ہماری تعلیم اور فیوچر کا خیال آ گیا۔" اس نے جواب دیا۔

"باپ ہیں —— خیال تو رہتا ہی ہوگا انہیں اچھا ہے۔ بس تیری پڑھائی ختم ہو تو پھر تیری بیوی کو بھی گھر لے آؤں گی۔ بڑا آزاد گھوم پھر لیا تو نے۔" وہ مسکرائیں۔

"اللہ کے واسطے بی بی جان! کیوں میری آزادی کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ بھاپ بھی مت نکالیے گا منہ سے۔ مجھے نہیں کرنی کوئی شادی وادی.... کچھ دن تو آزادی کے مزے لوٹ لوں۔" اس نے گھبرا کر ماں کے سامنے ہاتھ ہی جوڑ دیے۔

"لے.... کتنے ارمان دل میں لیے بیٹھی ہوں۔" وہ برا مان گئیں۔

"اچھا اچھا میری پیاری بی بی جان! فی الوقت اس قصے کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا کر رکھیے۔ دودھ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ لے جائیے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"ابھی تو جا رہی ہوں مگر یہ مت سمجھنا کہ تیری جان چھوڑ دی۔" وہ دھمکاتی نظروں سے اسے گھورتی ہوئی آگے بڑھ گئیں اور کینڈی نے جان چھوٹ جانے پر (وقتی ہی سہی) اللہ کا شکر ادا کیا۔

☆ ☆ ☆

یہ ایک بہت پرشکوہ اور بے حد قیمتی فرنیچر سے آراستہ کمرا تھا۔ پہلی نظر میں یہ کمرا کسی شاہی فرد کا کمرا لگتا تھا۔ سنہری اور سیاہ امتزاج کا فرنیچر اور ہم رنگ بھاری پردوں سمیت کمرے میں رکھی اور سجی ہر شے ہی قابل تعریف اور بے حد قیمتی تھی۔ ماسوائے اس ایک وجود کے جو کمرے کے وسط میں رکھے جہازی سائز بیڈ کے اوپر چت لیٹا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کسی ڈھانچے کو قیمتی لباس زیب تن کرا کر بیڈ پر لٹا دیا ہے۔ سفید چمڑی جو شاید کسی زمانے میں گوری رنگت رہی ہو۔ اب اس طرح ہو رہی تھی گویا دودھ میں کسی نے چمچ بھر کر ہلدی ڈال دی ہو۔ موندی ہوئی آنکھوں تلے سیاہ حلقے تھے۔ گال پچکے اندر کو دھنسے ہوئے۔ سوکھے ہوئے پیلے پیلے ہونٹ ادھ کھلے تھے۔ بال شاید کسی زمانے میں لانبے اور گھنے ہوں مگر اب صرف ان کی لمبائی نظر آتی تھی۔ نین نقش بتاتے تھے کہ یہ "زندہ لاش" کبھی کسی مصور کے برش سے تخلیق شدہ شاہکار ہوا کرتی تھی۔ قریب ہی ایک نرس یونیفارم میں ملبوس کوئی کتاب پڑھنے میں مگن تھی۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبلز مختلف قسم کی دواؤں اور انجکشنز سے بھری تھیں۔ کمرے میں دواؤں کی بو رچی ہوئی تھی۔ نرس وقتاً" فوقتاً" مریضہ پر نگاہ ڈالتی اور پھر کلائی پر بندھی گھڑی پر۔ اس کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہونے والا تھا اور وہ دوسری نرس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دن کے وقت ڈیوٹی کرتی تھی جبکہ دوسری نرس کی ڈیوٹی رات کی تھی۔

ابھی ابھی دروازہ کھلا تھا اور ڈیوٹی نرس کے بجائے ساڑھی میں ملبوس زندگی خوشبوؤں میں مہکتی اندر آ گئی۔ آبنوسی بھاری منقش دروازہ بغیر چرچراہٹ کے کھلا تھا۔ اسی لیے نرس کی توجہ اس طرف نہیں گئی۔ مگر ساڑھی میں ملبوس وجود سے اٹھتی ہوئی مہک نے نرس کو ضرور چونکایا تھا۔ وہ چونک کر دروازے کی طرف مڑی۔

"ہیلو میڈم!" وہ مؤدب کھڑی ہو گئی۔

"ہیلو سسٹر مریم! کیسی ہیں آپ؟" نازک لپ اسٹک سے سجے لبوں پر مسکان ابھری۔

مریم نے چلتی پھرتی غزل کو پرشوق نظروں سے دیکھا۔ یہ عورت ایک معمہ تھی۔۔۔ ایک راز تھی۔۔۔ ایک پہیلی تھی، جسے وہ اپنی چار سالہ سروس میں لگاتار سر کھپانے کے باوجود بوجھ نہ پائی تھی۔ بستر پر زندہ درگور وجود سے اس کا جو رشتہ تھا اس کا رویہ اس رشتے کی مناسبت سے یکسر مختلف تھا۔

"آپ ابھی تک یہیں ہیں؟ آپ کا تو آف ہو گیا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"سسٹر روبی کا ویٹ کر رہی ہوں۔ وہ آجائیں تو چلتی ہوں۔ میڈم کو تنہا تو نہیں چھوڑ سکتی۔" سسٹر مریم نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ آپ چلی جائیں سسٹر روبی کے آنے تک میں ہوں یہاں۔"

"او نو میڈم! سر کو پتا چلا تو ناراض ہوں گے۔" سسٹر مریم فوراً" بولی۔

"یہ میری ذمہ داری ہے۔" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"اوکے، تھینکس۔" سسٹر مریم اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔

اس کے جانے کے بعد وہ بستر پر بے خبر دراز زرد سوکھے چہرے پر نجانے کون سی عبارت تلاش کرتی رہیں۔ اس حسین چہرے پر ابھی جو کچھ لمحے قبل مسکراہٹ تھی، وہ اب گم ہو چکی تھی۔ اب ایک

ناقابل فہم تحریر اس چہرے کی کتاب پر رقم تھی۔ آنکھوں کا تاثر بھی یکسر بدل چکا تھا۔ وہ نجانے کب تک یونہی کھڑی رہتی اگر مسٹر رومی کی مداخلت نہ ہوتی۔ اس کی "ہیلو" پر اس چہرے کی کتاب پر رقم تحریر بھی بدل گئی۔ اب لبوں پر پھر مسکان تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ بیڈ پر بے ترتیبی سے نیم دراز کسی سوچ میں گم تھا۔ محویت اتنی تھی کہ لاؤنج میں رکھے ٹیلی فون کی بیل پر بھی نہ ٹوٹی۔ بالآخر فون بجتا ہی بند ہو گیا۔ اب کی بار بیل اس کے موبائل فون پر بجی۔ وہ یکدم چونک گیا۔ اس نے ناگواری سے فون کی طرف دیکھا مگر اسکرین پر چمکتے نمبروں کو دیکھ کر اس کی ساری کوفت اڑن چھو ہو گئی۔

"آج اس وقت کیسے یاد آ گئی میری؟" فون اٹھانے کے بعد پہلا جملہ ہی یہ تھا۔

"تم جو کچھ کر رہے ہو، سب چھوڑ چھاڑ کر آجاؤ۔" دوسری طرف سے حکم ملا۔

"خیریت ہے؟" عمر بے اختیار رسٹ واچ پر نگاہ ڈال بیٹھا۔

"ہاں تم بس گھر آجاؤ۔" حوریہ نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ عمر خاصی پریشانی کے عالم میں اٹھا۔ وارڈ روب کی جانب بڑھا۔ جلدی میں جو بھی لباس ہاتھ لگا پہنا اور چابی موبائل اٹھا کر بھاگا۔ اسے بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ خدانخواستہ کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔ تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے وہ حوریہ کے گھر پہنچ گیا۔

"سب ٹھیک ہے فضلو بابا۔" وہ پریشانی کے عالم میں پوچھتے ہوئے اندر کی طرف بڑھا۔ "اندر اتنا اندھیرا کیوں ہو رہا ہے؟ حوریہ اور بابا تو ٹھیک ہیں؟" وہ عجیب سی گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔ فضل دین بالکل خاموش تھا۔

"آپ اندر چلے جائیں بس۔" اس نے صرف یہی ایک جملہ کہا تھا۔ عمر دوڑتا ہوا اندر چلا گیا۔ پہلا قدم لاؤنج میں رکھا تھا کہ پورا لاؤنج روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔

"سرپرائز.... ہیپی برتھ ڈے۔" پورا شیطانی گروپ یک زبان ہو کر چلایا۔

"مائی گاڈ۔" عمر نے سر پکڑ لیا اپنا۔ اس کا پورا گروپ، حوریہ، بابا، شاہینہ سب وہاں موجود تھے۔ آج اس کی سالگرہ تھی۔

"تم لوگ.... حوریہ! تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ میں پتا نہیں کیا سمجھا۔" وہ اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے بولا۔

"یہ آئیڈیا بابا کا تھا۔" حوریہ نے سارا بوجھ بابا کے کندھوں پر ڈال دیا۔

بابا اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ "پسند آیا؟"

"جی بہت۔" وہ ہنس پڑا۔

"چلو تو پھر کیک کاٹ کر کھا بھی لو۔ جان واپس آجائے گی جو نکل گئی تھی۔" انہوں نے میز پر رکھے کیک کی طرف اشارہ کیا۔

عمر نے کیک کاٹا تو ایک الگ ہنگامہ مچ گیا۔

"یہ لو تمہارا گفٹ۔" کینڈی نے ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔ باقی سب نے بھی اس کو مختلف سائز کے پیکٹس دیے۔

"یہ.... یہ سب رہنے دو.... بس یہ برتھ ڈے پارٹی ہی میرا گفٹ ہے۔" عمر نے کہا۔

"رکھ لے یار.... شکر کر، کوئی اتنی محبت جتا رہا ہے۔" دانش نے حوریہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"یہ میری طرف سے۔" بابا نے سب سے آخر میں اس کی طرف ایک پیکٹ بڑھایا۔ عمر نے بہت احترام و محبت سے پیکٹ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

"شکریہ بابا۔ آپ کی محبت ہی کافی تھی۔"

"ویسے ایک سرپرائز اور تھا تمہارے لیے مگر افسوس وہ آنہ سکا۔" بابا نے برجستہ کہا۔

"وہ کیا؟" عمر نے پوچھا۔ "رحمان سے ملوانا تھا تمہیں۔ مگر عین وقت پر اس کی کوئی ضروری میٹنگ نکل آئی تو وہ آ نہیں سکا۔ بابا نے کہا۔

"رحمان انکل... آپ کے دوست...؟" عمر نے پوچھا۔

"میں بھی ان کی باتیں سن سن کر ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں... وہ تو شاید اینٹی نارکوٹکس آفیسر ہیں ناں؟" اس نے پوچھا۔

"شاید نہیں یقیناً"... ڈائریکٹر ہوتے ہیں موصوف۔" بابا نے بتایا۔

"گڈ... چلیں پھر کبھی سہی۔"

"اچھا بھئی۔ اب تم لوگ باتیں کرو۔ میں چلتا ہوں اپنے کمرے میں۔" بابا ان سے معذرت کر کے اندر چلے گئے۔

"تمہیں یہ سب کرنے کو کس نے کہا تھا؟" عمر نے حوریہ کے قریب جاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اچھا لگ رہا ہے۔" حوریہ نے پلیٹیں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تھینکس... مجھے بھی بہت اچھا لگا ہے... یقین آگیا کہ واقعی میرے وجود سے کسی کو لگاؤ ہے۔" اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے عمر کہ تم سے کسی کو لگاؤ نہیں... ہم سب تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔" حوریہ نے نرمی سے کہا۔

"تم سب کی بات کر رہی ہو یا اپنی؟" عمر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ اس کی بات پر گڑبڑا گئی۔

"ظاہر ہے سب میں 'میں بھی تو ہوں۔" اس نے رخ موڑ کر جواب دیا۔

عمر اس کی اس ادا پر مسکرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی روشنی اتر آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

گیٹ کے لاک کی چابی صندل کے پاس تھی۔ اس نے بے دلی سے بیگ کھول کر چابی نکالی اور سستی سے لاک کھولنے لگی۔ اندر سے مختلف قسم کی آوازوں کا شور اسے یہاں تک سنائی دے رہا تھا۔ نہایت کوفت سے اس نے دروازہ کھولا اور اندر آئی۔ تیز آواز میں چلتا ٹی وی' چار سالہ وکی کے رونے کی آواز... اس کے ساتھ ہی خالدہ کے چلانے کی آواز مل جل کر اس کے اعصاب پر ہتھوڑے بن کر برس رہی تھی۔

"اف خدایا گھر ہے یا پاگل خانہ۔" اس نے سر پکڑ لیا۔ اندر آتے آتے صوفی سے ڈبھیڑ ہوگئی جو کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے کتابیں ہاتھ میں لیے جھومتا جھامتا باہر آرہا تھا۔

"ہیلو ڈیر سسٹر۔" اسے دیکھتے ہی امریکن انداز میں سلام جھاڑا۔

"تم کہاں جارہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"دوست کے گھر کمبائن اسٹڈی کے لیے جا رہا ہوں۔ یہاں تو حال آپ دیکھ ہی رہی ہیں۔ یہاں انسان صرف کتاب کو دیکھ سکتا ہے' اسے پڑھ نہیں سکتا۔" صوفی نے لفظ "پڑھ" پر خاصا زور دیا۔ "ویسے میرا مشورہ مان لیں۔ آپ ہاسٹل میں رہ لیں۔ یہاں تو آپ کا ایم اے کلیئر ہونا مشکل لگتا ہے۔" وہ جاتے جاتے اسے بڑے کام کا مشورہ دے گیا تھا۔

"گڈ... پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا یہ خیال؟" اس نے شکریے کی اک نگاہ اپنے سوتیلے بھائی پر ڈالی' جو اس گھر بھر میں واحد تھا جسے کبھی کبھار اس کا خیال آجاتا تھا۔

صندل پہلے بھی باپ سے زیادہ اٹیچڈ نہ تھی۔ باپ کے اس اقدام نے اسے اور زیادہ اکیلا کر دیا تھا۔

خالدہ ایک بدزبان اور جھگڑالو عورت تھی۔ صندل کی دادی زندہ تھیں تو اسے ڈھارس رہتی تھی۔ خالدہ اور حمید کے تیور وہ بہت شروع میں ہی دیکھ چکی تھیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے تمام تر زیورات اور جمع پونجی صندل کے حوالے کر کے اسے یہ تاکید کر دی تھی کہ یہ تمام چیزیں چپکے سے علیحدہ لاکر میں رکھوا دے اور اس کی بھنک بھی اپنے باپ کو نہ پڑنے دے۔ یہ تمام نقدی و زیور کسی برے وقت میں اس کے کام آئیں گے۔ دادی کی دور اندیشی اور سمجھ داری کا صحیح ادراک اسے دادی کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ جب خالدہ نے اپنی اصل شکل دکھانی شروع کی تھی۔ حمید پوری طرح

بیوی کے دام میں تھا۔ جوان بیٹی کے آنسو پونچھنے کے بجائے وہ اپنی نئی بیوی کی نازبرداریوں میں لگا رہتا تھا۔
خالدہ طلاق شدہ تھی صوفی اس کے پہلے شوہر سے تھا جبکہ وکی کا باپ حمید تھا۔
دادی نے اسے ایک وصیت اور کی تھی اور وہ یہ کہ وہ اپنی تعلیم ضرور مکمل کرے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرے۔ حمید سے انہیں صندل کے سلسلے میں کوئی اچھی امیدیں نہ تھیں۔ صندل اپنی دادی کی نصیحتوں کی پوٹلی سنبھالے ماسٹرز کے آخری سال تک پہنچ گئی تھی۔
وہ اپنی پوری توجہ پڑھائی پر رکھنا چاہتی تھی مگر خالدہ نے گھر کا ماحول ایسا ترتیب دے دیا تھا کہ وہ سکون اور خاموشی کے لیے ترس جاتی تھی۔ حمید ایک احسان اس پر ضرور کرتا تھا اور وہ یہ کہ اس کے تعلیمی اخراجات وہ "فراخدلی" سے اٹھا رہا تھا۔ صندل نے یہ بھی غنیمت جانا۔ اب جو صوفی نے اسے نئی راہ دکھائی تو اس نے اس پر سوچنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ خالدہ کو اس کے اس فیصلے پر اگر اختلاف ہوا بھی تو صرف اس حد تک ہو گا کہ اس کے اخراجات بڑھ جائیں گے۔ ورنہ وہ تو اس سے پہلے ہی چھٹکارا پانے کے چکر میں رہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

پروجیکٹ مکمل ہو چکا تھا۔ عمر سمیت دو اور اسٹوڈنٹس تھے، جن کے پروجیکٹس سر سجاد علوی کو بہت پسند آئے تھے۔ اپنی کلاس میں ان تینوں کے ناموں کا اعلان کرتے ہوئے سجاد علوی بولے۔
"عمر، حوریہ اور صندل کی کہانیاں ہر لحاظ سے بہترین ہیں۔ موضوع، الفاظ، جملے، انداز و بیاں، شروعات اور آخیر... ہر اینگل کو بہت ہی خوب صورتی سے عیاں و بیاں کیا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ بھی ان کی تحریر پڑھیں۔"
سجاد علوی کی باتیں وہ لوگ بہت غور سے سن رہے تھے۔ سمسٹر شروع ہونے میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔

سبھی کو ہاتھ پاؤں پڑے تھے۔

"میں نے تو سوچ لیا ہے۔ بس کسٹم میں ہی جانا ہے۔ مزے ہیں یارو! وہاں پر تو۔" کینڈی کین منہ سے لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

" تیرے باپ نے اجازت دے دی ؟" عمر نے پوچھا۔

"ہاں! دے دی۔" وہ مسکرایا۔

"یہ معجزہ کیسے ہوا؟" عمر واقعی حیران تھا۔

"میرا باپ پکا کاروباری ہے۔ میری اس جاب میں بھی اپنے فائدے ڈھونڈ رہا ہے۔ فرمایا مال امپورٹ اور ایکسپورٹ کرنے میں فائدہ ہوگا۔" کینڈی نے بتایا۔

"اور تو؟ یہاں کتابیں چھپوا رہا ہے۔ تجھے تو باہر کی ہوا کھائی تھی۔ کیا پلان ہے؟" کینڈی نے پوچھا۔

" بس ایگزام دے دوں پھر پروگرام پکا۔" عمر مسکرایا۔

حوریہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "تم ابراڈ جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔ بڑا بے اختیار عمل تھا۔

"ہاں۔" عمر نے بے نیازی سے جواب دیا۔

" صرف پڑھنے ؟" اس نے دل کو تسلی دینے کی غرض سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں باہر ہی سیٹل ہو جاؤں گا۔" عمر نے اس بار گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ حوریہ چُپ سی ہو گئی۔

"مگر تمہارے فادر کا تو اچھا خاصا بزنس ہے یہاں ... اور تمہارا تو کوئی اور بھائی بھی نہیں۔" دانش نے حیرت سے پوچھا۔

" سوواٹ! مجھے بزنس فیلڈ پسند نہیں ہے۔" وہ قدرے درشتی سے گویا ہوا۔

" ہاؤ لکی یو آر۔" ذیشان نے حسرت سے آہ بھری۔

"مت ندیدہ پن دکھاؤ۔" ریشم نے اسے گھورا۔

"سنو! تم فی الحال میری آدھی گھر والی ہو' جب پوری ہو جاؤ تو رعب جھاڑنا۔" ریشم اور ذیشان ایک دوسرے کے منگیتر اور فرسٹ کزن بھی تھے۔

"پریکٹس تو ابھی کرنے دو۔" ریشم نے معصوم سی صورت بنائی۔

"ہاہ... ہ" دانش نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"تجھے کیا ہوا؟ کیوں ماحول میں ٹھنڈ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟" کینڈی نے اسے گھورا۔

"یار! یہ دن بعد میں بہت یاد آئیں گے۔ قسم سے ایگزامز کے بعد پھر پتا نہیں کون کہاں ہو؟" وہ افسردگی سے بولا۔ یہ پورا گروپ کالج کے زمانے سے ہی ساتھ تھا۔

عمر او لیولز سے ہی ہاسٹل میں تھا۔ پھر یونیورسٹی آنے کے بعد اس نے اپنا فلیٹ خرید لیا تھا۔ ایک جز وقتی ملازم رکھا ہوا تھا۔ اکثر تو وہ کھانا گھر سے باہر ہی کھاتا تھا۔

عمر کی بہت سی باتوں پر اعتراض ہونے کے باوجود حوریہ اسے بہت پسند کرتی تھی۔ آج عمر کے بیرون ملک جانے کا ذکر چلا تو اس کو اپنے دل کی کیفیت میں کچھ بہت بڑی تبدیلی اور کھلبلی کا احساس ہوا تھا۔ وہ ان سب سے معذرت کر کے اٹھنے لگی تو کینڈی نے اسے روک لیا۔

"بیٹھو آرام سے۔ ابھی تو تم تینوں سے ٹریٹ لینی ہے۔ اب بتاؤ کہ پہلا نمبر کس کا ہے؟ یعنی پہلے کون جیب ہلکی کرے گا۔" اس کا اشارہ عمر' حوریہ اور صندل کی طرف تھا۔

"ندیدے ... ہر وقت ٹریٹ کی پڑی رہتی ہے۔" صندل نے اسے گھورا۔

"چپ کرو بدتمیز۔ سر علی ادھر ہی آ رہے ہیں۔" حوریہ نے دانت پیسے۔ سر علی عزیز سفید براق کرتے شلوار میں نکھرے نکھرے سے ان کے قریب آ گئے۔

"السلام علیکم گائز..." انہوں نے قریب آ کر ان سب پر سلامتی بھیجی۔

"وعلیکم السلام سر کیسے ہیں؟" سب نے مشترکہ جواب دیا اور حال صرف حوریہ نے پوچھا

"پکچی ہے یہ تو۔" کینڈی نے عمر کے کان میں سرگوشی کی۔

"الحمد للہ۔ بالکل ٹھیک ہوں۔" انہوں نے تازگی بھری مسکان کے ساتھ جواب دیا۔

"سر! آج تو زیادہ ہی فریش لگ رہے ہیں۔ مسجد سے تو نہیں آ رہے؟" ذیشان نے مسکرا کر شوخی سے پوچھا۔

سر علی ہنس پڑے "اس میں ابھی وقت ہے۔ فکر مت کرو۔ لائن میں تم بھی ہو گے میرا مطلب ہے مبارک باد دینے والوں کی لائن میں۔" وہ بھی اس کے استاد تھے۔ عمر ہنس پڑا۔

"شیور سر! مگر شرط یہ ہے کہ آپ انوائیٹ کریں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"میرے بھائی! پہلے مجھے تو کنفرم ہونے دو۔ ابھی تک تو لڑکی بھی نہیں دیکھی۔" وہ مسکرائے۔

"ہیں... آپ شادی کر رہے ہیں؟" دانش کو ان دونوں کے مکالمے ابھی سمجھ میں آئے تھے۔

"ابھی نہیں۔ کچھ وقت کے بعد۔" وہ بولے۔

"سر! پیشگی مبارکباد لے لیں عمر سے۔ یہ باہر کی پلاننگ کر رہا ہے۔" ریشم نے اطلاع دی ــــــــ انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"سر! کل شام کو میں ایک چھوٹی سی پارٹی دے رہا ہوں۔ آپ بھی انوائٹڈ ہیں۔" عمر نے کہا تو سارا گروپ اس کو دیکھنے لگا۔

"میسنے گھنے .... سمجھتا ہوں تجھے۔" کینڈی نے اس کے کان میں منہ گھسیڑ کر دھمکایا۔ جسے ہمیشہ کی طرح عمر نظرانداز کر گیا۔

"ویل.... کس خوشی میں؟" وہ حیرت سے بولے۔

"صاحب کتاب ہونے کی خوشی میں سر.... یہ تینوں ماشاء اللہ سے 'کتاب' والے ہو گئے ہیں" کینڈی نے انہیں مختصراً احوال سنایا۔

"اوہ.... گڈ بھئی! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ضرور آئیں گے ہم۔ کہاں دے رہے ہو پارٹی؟" انہوں نے پوچھا۔

"ڈیفنس کلب میں۔"

"او.... اچھا گڈ چلو ٹھیک ہے۔ کل ملاقات ہو گی۔ ویسے مجھے تم سے پرسنلی بھی ملنا تھا۔ جب بھی وقت ہو بتانا۔" انہوں نے کہا۔ ان کے جانے کے بعد تینوں لڑکے عمر کے پیچھے پڑ گئے۔

"یہ پارٹی کا پلان کب بنا؟"

"پہلے ہی بنا چکا تھا۔ سوچا اچانک سرپرائز دوں گا۔" وہ مسکرایا۔

"کس کس کو انوائیٹ کیا ہے؟" ذیشان نے پوچھا۔

"کل دیکھ لینا خود ہی۔ اوکے اب میں چلتا ہوں۔" اس نے سب کو بائے کیا۔

"چلو تمہیں ڈراپ کر دوں۔" عمر نے حوریہ کو مخاطب کیا۔

"چلی جاؤں گی بس سے۔" وہ آگے بڑھ گئی۔

"منتیں کروانے کی عادی ہو تم۔ چلو ورنہ پھر اسٹاپ پر گاڑی لے کر آجاؤں گا۔" اس نے دھمکی دی تو حوریہ گھورتی ہوئی اس کے ساتھ ہولی۔

"اتنی چپ کیوں ہو؟" پارکنگ کی طرف جاتے جاتے اس نے پوچھا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تمہارا بیرون ملک جانے کا پلان ہے۔" اس نے پوچھا۔

"پلان تو نہیں تھا۔ بس بنا لیا۔ پاپا چاہتے ہیں میں ان کے ساتھ بزنس جوائن کروں۔ مگر میں یہ سب بکھیڑا نہیں چاہتا۔" اس نے بتایا۔

"تم اپنے فادر سے اتنا بھاگتے کیوں ہو؟" حوریہ نے پوچھا۔

"میں کسی سے نہیں بھاگتا۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے جواب دیا۔

"عمر! کبھی کبھی تم مجھے بہت عجیب سے لگتے ہو؟" حوریہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ بلیک جینز اور گرین ٹی شرٹ میں وہ نکھرا نکھرا سا مگر کچھ کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔

"تمہیں تو ہر چیز عجیب لگتی ہے۔" وہ مسکرایا۔

"تم رزلٹ کے بعد کیا کرو گی؟" عمر نے اس کی توجہ خود سے ہٹانے کی غرض سے پوچھا۔

"سر علی کا گروپ جوائن کروں گی۔" اس نے اطمینان سے بتایا۔

"واٹ! پاگل ہو گئی ہو؟" عمر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اس میں اعتراض والی کیا بات ہے؟ ان کے گروپ میں بہت پڑھے لکھے اور تقریباً" ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں اور میں تو بابا سے اجازت بھی لے چکی ہوں۔" اس نے بتایا۔

"دیکھو! آرٹیکلز کی حد تک تو ٹھیک ہے یا پھر تم کسی پریس میں یا میڈیا میں جاب کر لو۔ مگر سر علی کے گروپ کو جوائن مت کرو۔ وہ کام بے حد خطرناک ہے۔" عمر سنجیدہ تھا۔

"خطرہ کہاں نہیں ہوتا ہے عمر! اور کیا خطرے کے ڈر سے جینا اور کام کرنا چھوڑ دیں؟" وہ سنجیدگی سے جواب دے رہی تھی۔

عمر نے ٹھٹک کر اس کی شکل دیکھی۔ یک لخت حوریہ کا چہرہ، نین نقش، قد و قامت، جسامت ہر چیز بدل گئی۔ وہاں پر اب کوئی اور کھڑا تھا۔ چھ فٹ سے لانبا قد، مضبوط جسامت، سیاہ گھنگھریالے بال، جو بے فکری سے روشن کشادہ پیشانی پر بکھرے تھے۔ چمکتی ہوئی سیاہ بھنورا آنکھیں۔ متانت بھرے چہرے پر بھرے بھرے گلابی ہلکی سی مسکان لیے لب۔ سیاہ گھنیری مونچھیں۔ مردانہ وجاہت کا منہ بولتا شاہکار زندگی سے بھرپور وجود....

"مرنا تو ہے ہی ایک دن.... پھر ہر دن مرنے کے بجائے کیوں نہ ایک لمحے میں ہی جی لیا جائے۔"

سماعتوں کو بے حد خوب صورت تاثر دیتی بھاری آواز نے اس کی سماعتوں میں طوفان برپا کر دیا تھا۔

"کہاں کھو گئے؟" حوریہ نے اس کا شانہ ہلایا تو وہ چونکا۔ وہ وجود تحلیل ہو چکا تھا۔ اب منظر پر وہی نازک سی دلکش و پرکشش لڑکی کھڑی تھی۔

"کچھ نہیں۔" اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا۔

"حوریہ! تم گروپ جوائن کرنا چاہتی ہو۔ کر لو.... مگر میں تمہیں اکیلے نہیں چھوڑ سکتا۔" عمر کو پتا تھا کہ وہ کتنی ضدی اور مستقل مزاج ہے۔ وہ اپنا فیصلہ نہیں بدلے گی، اسی سوچ نے عمر کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔

"تمہیں پتا ہے، تم میری سب سے بڑی کمزوری ہو۔" دل ہی دل میں وہ اس سے مخاطب تھا۔ حوریہ سامنے دیکھ رہی تھی ورنہ اس کی آنکھوں کے بدلتے تاثرات سے بہت کچھ جان جاتی۔

"اور پھر تمہیں کیا۔ میں کچھ بھی کروں.... تم تو باہر جا رہے ہو۔ ہمیشہ کے لیے۔" اس کے لہجے میں ناراضی اُمڈ آئی تھی۔ عمر کے لبوں پر لحہ بھر کو مسکان کی چاندنی اتری اور پھر اس کی چمک معدوم ہو گئی "میں کہیں نہیں جا رہا۔" اس نے اطلاع دی۔

وہ جھٹکا کھا کر رکی۔ "پھر بولو۔" حوریہ کو لگا اس نے کچھ اور سنا ہے۔

"میں نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ پروگرام میں تبدیلی آ گئی ہے۔" اس نے نارمل سے انداز میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

"میں اس شخص کو کبھی نہیں سمجھ سکوں گی۔" حوریہ نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔

❋ ❋ ❋

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ چاند کی اولین راتیں تھیں مگر موسم ابر آلود ہونے کی وجہ سے چاند کی کرنیں سیاہ بدلیوں کے پیچھے ہی محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ فضا میں سناٹے کا راج تھا۔ ماحول کے جمود کو کبھی جھینگروں کی تو کبھی مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں جھنجھوڑ دیتی تھیں۔ کبھی گارڈ کے ساتھ ڈیوٹی بھگتاتے شکاری خطرناک کتوں کے بھونکنے کی آواز اس سناٹے کا سینہ چاک کر دیتی۔

پوری حویلی خاموشی کی چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ اس کے کمرے میں بیڈ کے دوسرے کونے پر موجود وجود خواب آور گولیوں کی بدولت خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔

"ایک میں ہی ہوں بدنصیب جو نیند کے اصل

مزے سے ناواقف ہوں۔۔۔ ہائے میری تقدیر۔"

گاؤن پہن کر مخروطی انگلیوں میں کتاب پکڑ کر وہ آہستہ روی سے چلتی بالکنی میں آ گئی۔ کتاب کسی مقدس صحیفے کی مانند اس کے سینے سے لگی اس کی دھڑکنیں محسوس کر رہی تھی۔ گویا کتاب' کتاب نہ ہو کوئی زندہ وجود ہو۔۔۔ اداس آنکھیں آہستگی سے اٹھیں اور سیاہ بادلوں کے جنگل سے آزادی کی کوشش کرتے چاند پر ٹک گئیں۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتے جام نے اس کے رخسار کے مے خانے کو ڈبو دیا تھا۔ نازک لبوں کو سسکیوں سے روکنے کی کوشش میں بے دردی سے نچلے ہونٹ کا کونا دانتوں میں دبا لیا۔

"میں کتنی بھی کوشش کر لوں۔۔۔ تم کسی نہ کسی روپ میں میرے سامنے آ ہی جاتے ہو۔"

اس کے دل سے آواز نکلی اور اس نے کتاب کو سینے سے ہٹا کر آنکھوں سے لگا لیا۔ "بھولوں۔۔۔ تو کیسے بھولوں تمہیں۔۔۔؟"

☼ ☼ ☼

"عمر نے پارٹی دی ہے۔ آپ نہیں چلیں گے؟" وہ سنجیدگی سے بولیں۔

"تمہارے لاڈلے نے مجھے کب انوائٹ کیا ہے؟"

فراز ان سے زیادہ مصروفیت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اپنے بریف کیس کو کھول کر جانے کون کون سے کاغذات چیک کر رہے تھے۔

"آپ کو میں نے پرسوں ہی بتا دیا تھا کہ عمر نے گھر پر فون کر کے ہم دونوں کو دعوت دی ہے۔" وہ یاد دہانی کرا رہی تھیں۔

"سوری! مجھے بالکل یاد نہیں مگر اب تو ممکن بھی نہیں۔ مجھے آج شام دبئی کے لیے نکلنا ہے ارجنٹ۔" انہیں یک دم یاد آ گیا تو معذرت خواہ لہجے میں بولے۔

"میری طرف سے کوئی تحفہ خرید کر دے دینا اور اسے مبارک باد بھی کہنا۔۔۔ اور معذرت بھی۔" انہوں نے بریف کیس بند کر دیا۔

"یہ کارڈ رکھ لو میرا۔" انہوں نے والٹ سے کریڈٹ کارڈ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے چپ چاپ لے لیا۔

"ایسا کرو کہ تم میرے ساتھ ہی چلو۔ عمر کے فلیٹ پر چلتے ہیں' میں وہیں سے نکل جاؤں گا۔"

فراز کو اچانک سوجھا۔ وہ خاموشی سے تیار ہونے چل دیں۔ عرصہ ہوا وہ سوال جواب کرنا چھوڑ چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

آج چھٹی تھی تو وہ ابھی تک بستر پر پڑا ہوا تھا۔ ملازم کو بھی اس نے چھٹی دے رکھی تھی۔ وہ بستر پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں انگریزی کی بہت ہی دھیمے سروں میں دھن بج رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اس کی اپنی لکھی ہوئی کتاب تھی اور وہ نہایت محویت سے کتاب کی سطور میں گم تھا۔۔۔ گویا پڑھ نہ رہا ہو' کسی نتیجے پر پہنچنا چاہ رہا ہو۔

"زندگی سب کے لیے ایک سی سوغات نہیں لاتی' مگر زندگی ہر ایک کا امتحان ضرور لیتی ہے۔۔۔ مگر ناکامی یہ نہیں کہ ہم جینا چھوڑ دیں۔۔۔ زندگی کو پوری طرح جینا ہی اصل زندگی ہے۔"

یہ الفاظ اس کے نہیں تھے۔ یہ الفاظ بابا کے تھے۔ بابا نے بتایا تھا کہ یہ کہانی کسی اور کی کہانی ہے۔۔۔ ایک امانت ہے۔۔۔ اگر کہانی کو کتاب کی شکل مل گئی تو از خود یہ اپنے مالک تک پہنچ جائے گی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ کہانی کس کی ہو سکتی ہے۔۔۔

کال بیل کی آواز پر اس نے سستی سے کتاب کو ایک طرف رکھا اور اسی طرح جینز اور بنیان پہنے دروازہ کھولنے چلا گیا مگر دروازے پر فراز اور رومیصہ کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ رومیصہ تو خیر آتی جاتی رہتی تھیں' مگر فراز سومرو شاید آج دوسری بار یہاں آئے تھے۔ اس نے سلام کرتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔

"کیسے ہو؟" رومیصہ روٹین کی طرح اس سے ملیں۔

"ٹھیک ہوں۔۔۔ یہ" فراز اندر جا چکے تھے۔ اس

نے تکلفاً" بھی ان سے مصافحہ نہ کیا تھا۔ نہ ہی فراز نے خود سے پہل کی تھی۔

"ملنے آئے ہیں تم سے۔" رومیصہ نے عام سے لہجے میں کہا۔

"تمہارے فلیٹ کی لوکیشن اچھی ہے۔ مگر کچھ پینٹ وغیرہ کراؤ یہاں.... سمندری ہوا تو روغن اور آئرن کی دشمن ہے۔ سب کھا جاتی ہے۔" انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"جی ہاں.... کچھ چیزیں ہر چیز کو کھا جاتی ہیں۔ چاہے وہ جاندار ہو یا بے جان۔" عمر معنی خیز انداز میں بولا۔

"میں نے تو پڑھی نہیں کتاب۔ وقت ہی نہیں ملا۔ پڑھ کر بتاؤں گا کہ کیسی ہے۔" فراز نے جیب سے موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ انہوں نے فون چیک کر کے پھر جیب میں رکھ دیا۔ "بھئی.... سوری تمہارا گفٹ نہیں لے سکا۔ دراصل میری فلائیٹ ہے آٹھ بجے اور یہاں کچھ ضروری میٹنگز بھی ہیں، مجھے وہ نبٹانی ہیں۔ تم ایسا کرو کہ یہ کیش رکھ لو اور اپنی مرضی سے جو لینا چاہو، لے لینا۔"

فراز نے بریف کیس میں سے کچھ گڈیاں نکال کر میز پر رکھ دیں۔ عمر بالکل خاموش کھڑا ان کی باتیں صرف سن رہا تھا۔

"اب یہ بتاؤ کہ ان فیوچر کیا پلاننگ ہے؟" وہ اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"ابھی کچھ ڈیسائیڈ نہیں کیا...."

"میرا خیال ہے کہ تم میرے ساتھ بزنس میں آجاؤ۔ پالیٹکس میں آنے کا تو تمہیں شوق ہے نہیں۔ میرے بعد یہ سب تمہیں ہی سنبھالنا ہے۔ بہتر ہے کہ تم ابھی سے سیکھ اور سمجھ لو۔" فراز مدعا پر آگئے۔

"پاپا! اس بارے میں ہماری پہلے بھی بات ہو چکی ہے۔ میرا ارادہ آپ جانتے ہیں۔" اس نے ان کی بات کاٹتے ہوئے قطعی انداز میں کہا۔ فراز لب بھینچ کر رہ گئے۔

"ویل.... میری باتوں پر غور کرنا.... ٹھنڈے دل سے...."

فراز اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ رومیصہ نے عمر کو اشارہ کیا کہ وہ فراز کو نیچے تک چھوڑ آئے مگر وہ نظرانداز کر گیا۔ اس نے دروازے تک آنے کی زحمت بھی نہ کی تھی۔

"اف.... یہ کیا بکھیڑا پھیلا رکھا ہے عمر! آج ملازم نہیں آیا ہے کیا؟" ان کے جانے کے بعد انہوں نے کچھ پُرسکون ہو کر کہا۔

"میں نے چھٹی دے دی تھی آج۔ کوئی خاص کام تو ہوتا نہیں ہے یہاں.... اور پھر آج میرا دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ بے ترتیب رکھوں۔" وہ صوفہ کم بیڈ پر سے کپڑے اٹھاتے ہوئے بولا۔

"لاؤ میں سمیٹ دیتی ہوں۔ کچھ کھایا تم نے؟" انہوں نے اس کے ہاتھ سے کپڑے لیتے ہوئے پوچھا۔

"صرف شیک پیا تھا۔ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"شام کے فنکشن میں کون کون مدعو ہے؟" رومیصہ نے اس کی قمیص ہینگر میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

صرف قریبی دوست اور میرے دو تین ٹیچرز۔" وہ بیڈ شیٹ کی شکنیں دور کرتے ہوئے بولا۔

"آدھے امریکی بن چکے ہو تم اکیلے رہتے رہتے۔" رومیصہ مسکرائیں۔ وہ جواب میں صرف مسکرایا تھا۔

"اسٹوری کیسی لگی؟" اس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد پوچھا۔ رومیصہ اس کی وارڈ روب کا دروازہ بند کر رہی تھیں۔ لحہ بھر کو ٹھٹھکیں۔ پھر پلٹ کر اس کی کتابیں سمیٹنے لگیں۔

"بہت اچھی۔ لگتا ہی نہیں کہ تم نے لکھا ہے۔ غالباً" تمہاری پہلی تحریر ہے۔" رومیصہ نے سوال کیا۔

"نہیں۔ میں پہلے بھی چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور آرٹیکلز لکھ چکا ہوں۔"

عمر نے فریج سے پانی کی بوتل اور لیموں پانی کا کین نکال کر رومیصہ کی طرف بڑھایا اور خود بوتل منہ سے لگا لی۔

"پی لیں۔ فیورٹ ہے آپ کا۔ میں کھانے کا آرڈر کر دیتا ہوں۔ بتائیں کیا کھائیں گی؟" اس نے پوچھا۔

"رہنے دو۔ میں گھر پر ہی کچھ پکا لیتی ہوں۔ روز تم بھی باہر کا کھاتے ہو گے؟" انہوں نے منع کر دیا۔ عمر ان کی مادرانہ ڈانٹ پر مسکرایا۔

"ٹھیک ہے.... بنالیں پھر۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے بلاتکلف کہا۔

"چلو کچن میں باتیں کرتے ہیں، ساتھ ساتھ میں کھانا بھی پکالوں گی۔" رومیصہ اپنا پرس وہیں بیڈ پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"جی نہیں، آپ کھانا بنایئے، میں نہا کر آتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا اور کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں آیا تو رومیصہ کے پرس میں سے مترنم سی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ اس نے پرس اٹھایا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ "آپ کا فون بج رہا تھا....." عمر نے پرس ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ موبائل کی گھنٹی بجنی بند ہو گئی تھی۔

"اچھا میں دیکھتی ہوں۔" رومیصہ نے چولہے کی آنچ ہلکی کی اور ہاتھ صاف کرتی ہوئی باہر آئیں۔ انہوں نے پرس کھول کر سیل نکالا اور نمبر چیک کرنے ہی والی تھیں کہ فون پھر بج اٹھا۔ انہوں نے بٹن دبا دیا۔

"کہاں تھیں؟ اتنی دیر سے فون کر رہا تھا۔" فراز کی آواز سنائی دی۔

"فون پرس میں تھا اور پرس عمر کے بیڈ روم میں تھا۔" عمر نے اندر جاتے جاتے بس اتنا ہی سنا۔

"تمہارا پرس عمر کے بیڈ روم میں کیا کر رہا تھا رومیصہ!" فراز کے لہجے میں کچھ الگ تھا۔ مگر رومیصہ کا دھیان قیمے پر تھا۔ انہوں نے فراز کے لہجے کی تبدیلی پر غور نہیں کیا۔

"میں اس کے ساتھ مل کر کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔ سارا کمرا بکھرا ہوا تھا۔ پرس بھی اندر ہی رہ گیا۔" رومیصہ نے عام سے انداز میں بتایا۔

"عمر کا ملازم بھی نہیں آیا آج؟" فراز نے پوچھا۔

"نہیں۔ عمر نے چھٹی دے رکھی تھی۔"

"کیوں؟ اسے تو پتا تھا کہ آج تم آؤ گی۔" فراز کے لہجے میں چبھن تھی۔

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ آپ بتایئے، آپ نے کیسے فون کیا؟" رومیصہ نے قیمے میں نمک ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"یونہی.... بس عمر کہاں ہے؟" فراز نے پوچھا۔

"نہا رہا ہے۔" رومیصہ نے چولہے کی آنچ ہلکی کر دی اور قیمے میں پانی ڈال دیا۔

"اچھا.... تم رکو گی یا جاؤ گی واپس؟" فراز چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پوچھ رہے تھے۔

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔" رومیصہ نے مصروف سے روکھے انداز میں جواب دیا۔

"اچھا.... او کے۔" فراز نے فون بند کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کلب کی روشنیوں اور مدھم سے شور کے درمیان نسبتاً" پرسکون حصے میں بوفے کا انتظام تھا۔ عمر کے ساتھ کھڑی سادہ سیاہ رنگ کی ساڑھی میں لپٹی، بالوں کا سادہ سا جوڑا بنائے بالکل ہلکے میک اور ڈائمنڈ کی بے حد نازک سی جیولری پہنے رومیصہ سب مہمانوں کا استقبال کر رہی تھیں۔

"یار....! یہ عمر کی ممی نہیں بڑی سسٹر لگتی ہیں۔" ریشم نے حوریہ کے کان میں منہ گھسیڑ کر کہا۔

"ہوں میں نے بھی جھٹکا کھایا تھا۔" حوریہ مسکرائی اور ایک نظر رومیصہ پر ڈالی جو دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر علی عزیز سے کوئی بات کر رہی تھیں۔

"بابا! آپ کچھ لیں ناں۔ پلیٹ بالکل خالی ہے۔" عمر کی نظر بابا پر پڑی۔

"ہاں.... وہ حوریہ سے کہتا ہوں، وہ بنا دے گی پلیٹ۔" وہ کسی گہری سوچ سے نکلے۔

"لایئے.... میں بنا دیتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر

پلیٹ ان کے ہاتھ سے لے لی۔ وہ ان کی پلیٹ بنا کر مڑا تو رومیصہ کو ان سے باتوں میں مصروف دیکھا۔ رومیصہ کا آدھا رخ نظر آرہا تھا جبکہ بابا بالکل سیدھے کھڑے ہونے کی وجہ سے صاف نظر آرہے تھے۔ ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ رومیصہ کی کسی بات پر گردن ہلا رہے تھے۔

"بائیس برس بعد تمہیں دیکھ رہی ہوں۔۔۔" چھوٹی ممی کی آواز اس تک پہنچی۔

"مگر میں تمہاری تصاویر مختلف میگزینز اور اخبارات میں دیکھتا رہتا ہوں۔ ٹی وی پر بھی تمہیں دیکھنے کا شرف حاصل ہوا کرتا ہے۔ بہت کامیاب عورت بن گئی ہو۔" بابا کہہ رہے تھے۔ دونوں بے حد سنجیدہ نظر آرہے تھے (کیا بابا پہلے سے جانتے ہیں انہیں؟ مگر جب میں نے ممی کو بابا سے ملوایا تھا تو انہوں نے ایسا کچھ تاثر تو نہیں دیا تھا جو ان دونوں میں کسی تعلق کو ظاہر کرے) عمر نے سوچا۔ بابا کی نظر اس پر پڑی تو وہ چونکے۔ عمر نے ان کے لب ہلتے دیکھے مگر الفاظ اس کی سماعت تک نہ پہنچے۔

"یہ لیجیے۔" اس نے پلیٹ ان کی طرف بڑھا دی۔

"شکریہ۔"

اسی وقت سر علی اور سر سجاد بھی ادھر ہی آگئے۔ موضوع بدل چکا تھا مگر عمر کے ذہن میں سوال آچکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ حوریہ کے فادر کو جانتی ہیں؟" اس نے گیئر بدلتے ہوئے سوال کیا۔ رومیصہ اس سوال کے لیے تیار نہیں تھیں۔ ابھی تک تو وہ دونوں پارٹی پر ہی تبصرہ کر رہے تھے۔

"ہاں۔۔۔ ہم کالج فرینڈز تھے۔" نہایت ہی اختصار کے ساتھ جواب آیا تھا۔

"اچھا مگر آپ دونوں کو دیکھ کر لگ تو نہیں رہا تھا۔ اتنا تکلف؟" اس نے کن اکھیوں سے ماں کی طرف دیکھا۔ رومیصہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس نے پارٹی میں پاپا کے چہرے پر دیکھے تھے۔

"ہاں۔۔۔ کافی سال بھی تو گزر گئے ہیں۔" انہوں نے گہری سانس لی۔

"شکیلہ ممی بھی بابا کو جانتی ہوں گی۔ آپ نے بتایا تھا ایک بار کہ آپ' ممی اور پاپا ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔" اس نے موڑ کاٹا اور گہری نظر رومیصہ پر ڈالی۔

"ہاں!" رومیصہ کے چہرے پر اذیت کے سائے بکھرنے لگے تھے۔

ممی! میری کتاب میں جو کہانی ہے' وہ جانتی ہیں کس کی ہے؟" عمر نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ رومیصہ ساکت ہو گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"بابا! کیا بات ہے؟ جب سے آئے ہیں پارٹی سے' کھوئے کھوئے سے لگ رہے ہیں؟" وہ دودھ کا گلاس اور ٹیبلٹ میز پر رکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں بس یونہی۔۔۔ تھک گیا ہوں۔ عادت نہیں رہی ناں پارٹیز اٹینڈ کرنے کی۔" وہ گویا زبردستی مسکرائے۔

"بابا! عمر کی مدر کتنی ینگ ہیں۔۔۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس کی سیکنڈ مدر ہیں۔ اس کی اپنی ممی تو کافی سالوں سے بیمار ہیں۔ عمر کو کرون اپ بھی اس کی اسٹیپ مدر نے ہی کیا ہے۔ ہاؤ سوئیٹ۔ میں نے تو سوتیلی ماؤں کے بڑے بھیانک قصے سنے ہیں۔ مگر اتنی سوئیٹ سی سوتیلی ممی آج پہلی بار دیکھی ہے۔" وہ تبصرہ کر رہی تھی' اپنے باپ کے احساسات سے بے خبر۔

"ہوں۔ چلو بیٹا! اب سو جاؤ۔ تم بھی تھک گئی ہو گی۔" بابا نے کافی دیر بعد کہا مگر ہولے سے تاکہ ان کی لاڈلی کا دل نہ ٹوٹے۔

"جی۔" وہ شب بخیر کہتی ہوئی چلی گئی اور انیق مسعود ماضی میں کھو گئے۔

☼ ☼ ☼

بہت کوشش کے باوجود آج نیند ان سے روٹھی

ہوئی تھی۔ ادھر سے ادھر ٹہل ٹہل کر وہ تھک چکے تھے۔ انہوں نے فون اٹھا کر نمبر گھمانے شروع کر دیے۔ ساڑھے دس بجے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ رحمان جاگ رہے ہوں گے۔ ان کی توقع کے عین مطابق دوسری گھنٹی کے بعد ہی رحمان نے فون اٹینڈ کر لیا تھا۔

"خیریت ہے... اتنی رات کو فون کیا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"رحمانی! آج وہ ملی تھی۔" بغیر تمہید کے انہوں نے کہا۔

"وہ... کون وہ... کیا کسی بد روح سے ملاقات ہو گئی؟" رحمان ہنسے۔

"رومیصہ..." انیق مسعود کے لہجے میں بہت کچھ تھا۔

"رو... م... رومیصہ... تمہیں کہاں ملی؟ کیسے؟" رحمان کی ساری ہنسی اڑن چھو ہو گئی۔

"وہ عمر کی سوتیلی ماں ہے۔" انہوں نے بڑے دکھ سے بتایا۔

"اوہ... یہ تو گڑبڑ ہو گئی۔" رحمان کے لہجے میں تشویش تھی۔

"عمر نے بھی کبھی ذکر ہی نہیں کیا اپنے باپ کا ورنہ میں جان جاتا کہ وہ فراز سومرو کا بیٹا ہے... اس غاصب کا... مجھے بھی کبھی دھیان تک نہیں آیا... وہ صرف اپنی ذات کے بارے میں مجھ سے باتیں کرتا تھا۔ اور میں نے تو اسے انجانے میں اپنی کہانی بھی سنا دی۔ جو اب کتاب کی شکل میں شائع بھی ہو چکی ہے... تم نے پڑھی؟" انہوں نے پریشانی کے عالم میں کہا اور پھر دھیان آنے پر پوچھا۔ عمر نے ایک کاپی ان کے لیے بھی دی تھی۔

"میں نے ابھی پوری نہیں پڑھی... وقت ہی نہیں مل رہا ہے... تم تو جانتے ہو میرا کام؟" رحمان نے کہا۔ "رومیصہ کیسی ہے؟" رحمان نے پوچھا۔

"بظاہر تو تم نے اسے دیکھا ہی ہے" مگر رحمانی! وہ ٹھیک نہیں ہے... میری اور حوریہ کی جدائی نے اسے اندر ہی اندر گھلا رکھا ہے... وہ ہارٹ پیشنٹ ہے۔" انیق مسعود نے نہایت دکھ سے بتایا۔

"اوہ..." رحمان کو بے حد دکھ ہوا۔

"اور... شکیلہ؟"

"وہ زندہ لاش بن چکی ہے... جوان بیٹے کی موت نے اسے توڑ دیا ہے۔ رومیصہ بتا رہی تھی کہ وہ آٹھ سال سے کوما میں ہے۔ نہ جی رہی ہے نہ ہی مرتی ہے۔"

"بہت افسوس ہوا سن کر... رومیصہ کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے؟" رحمان نے پوچھا۔

"نہیں... اللہ نے اسے حوریہ کے بعد کوئی اولاد نہیں دی۔ مگر عمر کو وہ اپنے سگے بیٹے کی طرح چاہتی ہے۔" انیق مسعود نے بتایا۔

"اور عمر کا بڑا بھائی... جس کا تم ذکر کر رہے تھے...؟"

"یہ لمبی کہانی ہے۔ بس یوں سمجھو کہ فراز کے گناہوں کی سزا اسے مل گئی۔" انہوں نے افسردگی سے کہا۔

"انیق! تمہاری اور رومیصہ کی زندگی کی سچائی عجیب سے انداز میں سامنے آئی ہے... میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کہوں؟ اگر عمر کو یہ پتا چل گیا تو..."

"پتا نہیں رحمانی! دل پر بڑا بوجھ تھا میرے یار...! آج زخموں کے ٹانکے پھر سے کھل گئے۔ کاش اس وقت تم میرے ساتھ ہوتے... مگر تم بھی کیا کرو' اتنی ٹف جاب ہے تمہاری۔ کچھ دیر اور باتیں کرو میرے دوست... میرا دل بے قابو ہو چکا ہے... راکھ میں دبی چنگاریاں پھر سے آگ کے شعلے بننے جا رہی ہیں۔" انیق مسعود بے حد بے چین تھے۔

☼ ☼ ☼

"میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد اپنی سگی ماں کو تو دیکھا ہی نہیں بھائی کی ڈیتھ کے بعد تو میں اور زیادہ تنہا ہو گیا تھا۔ آپ نے کبھی ممی کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ کبھی یہ لگا ہی نہیں کہ آپ سوتیلی ہیں سیلیا تو سکے

باپ ہونے کے باوجود کبھی اپنے لگے ہی نہیں۔۔۔ مگر آپ کے وجود سے اٹھتی ممتا کی کرنوں نے مجھے ہمیشہ سنبھالے رکھا۔ مگر نجانے کیوں۔۔۔ لگ رہا ہے کہ آپ ۔۔۔ یہ کہانی آپ کی ہی ہے۔" عمر ہلکی رفتار سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہہ رہا تھا۔

رومیصہ نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"ممی ۔۔۔ پلیز۔" عمر گھبرا گیا۔ اس نے کار ایک طرف روکی "آئم سو سوری آپ کو میری وجہ سے تکلیف پہنچی۔۔۔ سوری۔" اس نے جیب سے رومال نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔

"بائیس سال۔۔۔ عمر! بائیس سالوں سے یہ بوجھ اپنے سینے میں چھپائے 'اٹھائے۔۔۔ تھک گئی ہوں۔۔۔ میرا دل تھک چکا ہے۔۔۔ یہ دکھ ایک ایسا زہر بن کر قطرہ قطرہ میری رگوں میں اتر رہا ہے' جس نے میری جان کو گھلا دیا ہے۔ آج میں یہ بوجھ اپنے بیٹے کے سامنے ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔۔۔" رومیصہ نے ہچکیوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ عمر پلکیں جھپکے بنا انہیں دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

فراز کو عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی۔ برسوں گزر جانے کے باوجود اور اسے حاصل کر لینے کے باوجود اسے کھو دینے کا خطرہ اور ڈر انہیں ہمیشہ لگا رہتا تھا۔۔۔ ٹکٹ ہاتھ میں لیے وہ عجیب سی بے چینی۔۔۔ عجیب سے کشش و پنج میں مبتلا تھے۔ آخر جیسے فیصلہ ہو ہی گیا۔ انہوں نے ڈرائیور کو واپسی کا حکم دیا تھا۔

گھر بارہ بج چکے تھے اور عمر اور رومیصہ ابھی تک گھر نہیں پہنچے تھے۔ شک کا سانپ بار بار انہیں ڈس رہا تھا ۔۔۔ رومیصہ اور عمر کو ان کا ذہن اپنی ہی سوچ کی حدوں میں رہتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ "جس کی جتنی حد' اس کی اتنی سوچ۔" رومیصہ نے کبھی ان سے یہ بات کہی تھی۔۔۔ رومیصہ اور عمر کے نمبر بھی بند آ رہے تھے۔

انہوں نے ٹی وی بند کر دیا اور اٹھ کر مختلف چیزیں دیکھنے لگے۔ انہوں نے عمر کے فلیٹ کی چابی گارڈ سے حاصل کر لی تھی۔ کیونکہ گارڈ جان گیا تھا کہ یہ پُر شکوہ سا رعب داب والا مرد عمر کا باپ ہے۔۔۔ ایسے بارسوخ آدمی کو منع کرنے کی ہمت اس بیچارے گارڈ میں کہاں سے آتی۔

وہ عمر اور رومیصہ کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتے تھے۔ آج تک وہ یہی سوچتے آئے تھے کہ عمر اور رومیصہ ایک دوسرے سے اتنے قریب کیوں ہیں؟ سوتیلے ہونے کے باوجود۔۔۔ جبکہ عباس (عمر کا بڑا بھائی) رومیصہ سے اتنا قریب نہیں تھا۔ فراز یہی سب سوچتے عمر کے کمرے میں آ گئے تھے۔ کیبنٹس میں لگی مختلف کتابوں کو دیکھتے ہوئے ان کے ہاتھ ایک کتاب پر جا کر رکے "سچائیاں" عمر کی تحریر تھی۔ انہوں نے کتاب نکالی اور صوفہ کم بیڈ پر نیم دراز ہو گئے۔

یہ کتاب انہوں نے رومیصہ کے ہاتھوں میں اکثر رات کے وقت دیکھی تھی' اور کئی بار دیکھی تھی۔ وہ خواب آور گولیاں کھا کر سو تو جاتے تھے' مگر رات کے کسی پہر چند لمحوں کے لیے آنکھ ضرور کھلتی تھی اور ایسے میں وہ رومیصہ کو بستر کے بجائے اکثر بالکنی میں اسی کتاب کے ہمراہ دیکھتے تھے۔ انہوں نے آج اس کتاب کو پڑھا تھا اور اس کے بعد وہ کافی دیر تک کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے تھے۔۔۔ ایک راز' ایک گناہ' ایک جرم صفحات قرطاس پر رقم تھا۔ ہر ہر لفظ آئینہ بن چکا تھا۔۔۔ موبائل فون نہ بجتا تو ان کی محویت یا پھر سکتہ نہ ٹوٹتا۔

"یس۔" انہوں نے غائب دماغی سے فون ریسیو کیا۔

"سر! میں مریم بات کر رہی ہوں۔" دوسری طرف سے سسٹر مریم کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"تم۔۔۔ ابھی تک موجود ہو۔۔۔ ڈیوٹی ختم نہیں ہوئی تمہاری؟" وہ جیسے پاتال سے بول رہے تھے۔

"سر! وہ۔۔۔ آپ کو ایک بری خبر سنانی ہے۔" سسٹر مریم نے شاید ان کی بات سنی ہی نہیں تھی "میڈم

اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔" بہت دکھ سے اس نے اطلاع دی تھی۔

"شکیلہ..." فراز کے منہ سے نکلا۔

☆ ☆ ☆

"انیق مسعود' میں' تمہاری ممی شکیلہ اور فراز ہم سب ایک ہی بیچ میں تھے۔ انیق مسعود کے بہت گہرے دوست رحمان بھی ہمارے گروپ میں تھے مگران کا بیچ الگ تھا۔

شکیلہ اور فراز فرسٹ کزن بھی تھے اور دونوں کا نکاح ہو چکا تھا۔ انیق اور میں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے مگر سوائے رحمان کے یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہمارے گھر والے بھی ہمارے ساتھ تھے اور فائنل کے بعد شادی کا خیال تھا۔ انیق بہت ہردل عزیز تھا جبکہ فراز... بہت کینہ پرور اور حاسد تھے ... ان کے حسد نے میری اور انیق سمیت کئی زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا۔

شکیلہ سے میری اچھی دوستی تھی اور رفتہ رفتہ وہ بھی یہ جان گئی کہ میں اور انیق ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ کب فراز کی نظر اور نیت بدلی اور کب ان کی سوچ کی سیاہی نے میری قسمت کو کالا کرنا شروع کر دیا۔

یونیورسٹی میں الیکشنز شروع ہو گئے تھے۔ مقابلے میں انیق اور فراز بھی کھڑے تھے۔ فراز کو اپنی دولت' شخصیت اور اسٹیٹس پر گھمنڈ تھا مگر لوگ انیق سے محبت کرتے تھے۔ اس کی شخصیت' اخلاق اور قابلیت کی وجہ سے۔ مقابلہ ہوا اور انیق جیت گیا۔ فراز نے اپنی اس ہار کو ذاتی انا کا مسئلہ بنا لیا۔ اس نے انیق کو نیچا دکھانے کے لیے مختلف ہتھ کنڈے استعمال کرنے شروع کر دیے مگر ہر بار اسے منہ کی کھانی پڑتی۔ پھر اس نے مجھ پر بھی اپنا جادو جگانا شروع کر دیا۔ مگر میں تو پہلے ہی سے انیق کی اسیر تھی۔"

رومیصہ نے گہری سانس لیتے ہوئے گیلی آنکھوں کو صاف کیا۔

"میں نے شکیلہ سے فراز کی شکایت کی۔ اس نے فراز کو سمجھایا تو دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ بات خاندان تک جا پہنچی اور طے یہ پایا کہ شکیلہ اور فراز کی شادی فائنل ایگزامز سے قبل کر دی جائے۔ ادھر میرے گھر والے بھی فکر مند ہو گئے اور فراز کے رسوخ سے ڈر کر میری شادی رزلٹ آنے سے قبل ہی انیق سے کرا دی گئی۔

شکیلہ بیاہ کر حیدر آباد چلی گئی اور میں اپنے گھر سے انیق مسعود کے گھر آ گئی۔ شادی کے بعد ہمارا ایک دوسرے سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ یہ مصلحت کا تقاضا تھا اور یہی بہتر تھا۔ ہم تو فراز اور اس سارے قصے کو بھول گئے تھے مگر فراز کے حسد اور انا نے اس سے وہ کروا لیا جو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ حوریہ میری گود میں شادی کے دوسرے سال آئی تھی۔"

رومیصہ نے ٹشو سے ناک رگڑی اور عمر کو دیکھا۔

"حوریہ آپ کی اور پاپا کی..." وہ ششدر تھا۔

"ہاں... وہ ہماری بیٹی ہے۔ انیق نے اپنی زندگی میں صرف ایک شادی کی' صرف مجھ سے... حوریہ سے مصلحتاً" جھوٹ بولا گیا کہ اس کی ماں مر چکی ہے... تمہیں پورے گھر میں حوریہ کی ماں کی تصویر کہیں نہیں ملے گی..." رومیصہ عجیب انداز سے مسکرائیں۔

"پھر آپ کی شادی پاپا سے کیسے ہوئی؟ کیا اسی طرح جیسے اسٹوری میں پاپا نے بتایا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں... انیق نے اس کہانی میں میری لاج رکھی ہے... اس نے کہانی میں مجھے موت دی ہے... یعنی عزت... مگر حقیقت میں عمر! تمہارے سگے باپ نے مجھے شادی کے پانچ سال بعد اغوا کروا لیا تھا اور اپنی جاگیر میں چھپا دیا تھا۔ فراز نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں انیق سے خلع لے لوں' ورنہ وہ میری معصوم بچی اور انیق کو مار ڈالے گا... عمر! تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں نے کس دل سے یہ فیصلہ کیا تھا... میں نے انیق سے خلع لے لی تھی... میں انیق کو بہت چاہتی تھی' اس کی زندگی سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا میرے لیے' اس کے

بعد تمہارے باپ نے مجھ سے نکاح کرلیا۔ میں نے اس روز کے بعد کبھی بھی انیق مسعود کا چہرہ دیکھا تھا' نہ ہی اپنی ننھی معصوم حوریہ کا... میں پھر کبھی اپنے ماں باپ' بھائی' بہن سے نہیں ملی... میرے غم نے میری ماں کو کھالیا۔ میرا باپ وقت سے پہلے بوڑھا ہوگیا۔ میرے بھائی اور بہن نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا... شکیلہ میرے غم میں شریک تھی مگر وہ بھی بے بس تھی۔ فراز سے مقابلہ کرنا اس کے بس میں بھی نہ تھا۔" عمر دم سادھے اپنی سوتیلی ماں کو سن رہا تھا۔

"عباس ان دنوں سمجھ دار تھا... مگر تم بہت چھوٹے تھے۔ عباس مرتے دم تک مجھے اپنی ماں کی خوشیوں کا قاتل سمجھتا رہا۔ تمہارے باپ کی ضد اور ہوس نے کتنے دلوں کو برباد کردیا تھا... عباس نے پولیس فورس جوائن کرلی۔ ضد میں آکر اور پھر آگے جو ہوا وہ تم جانتے ہو... قدرت کا قانون بے انصافی نہیں کرتا ہے عمر... وہ شخص ہر نعمت ہونے کے باوجود تہی دامن ہے۔" رومیصہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں۔ عمر لب بستہ بس انہیں سن رہا تھا۔

"بس... اب تو زندگی تمام ہوئی ہی سمجھو..." کافی دیر بعد وہ گویا ہوئیں۔ عمر نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"دیکھو عمر... ایک زندہ درگور ماں تمہاری بستر سے لگی ہے اور دوسری زندہ درگور ماں کسی بھی پل چلتے پھرتے میں دم توڑ دے گی۔ عمر! میں دل کی مریضہ ہوں۔ کسی بھی پل وقت تمام ہوجائے گا۔" وہ مسکرائیں۔

"بس پھر تو آزادی ہی آزادی... ہر غم' ہر دکھ سے۔"

انہوں نے سر سیٹ کی پشت سے لگالیا اور آنکھیں موندلیں۔ عمر نے نہایت تکلیف ــــــ سے اس بے تحاشا حسین عورت کا چہرہ دیکھا... اور پھر گاڑی آگے بڑھادی۔

✲ ✲ ✲

تین روز گزر چکے تھے شکیلہ کو موت کی گود میں سوئے... ان تین دنوں میں وہ چند گھنٹوں سے زیادہ سو نہیں پایا تھا۔ اس نے اپنا سامان پیک کرکے ملازم سے کہہ کر گاڑی میں رکھوایا۔ پھر فراز سومرو کے کمرے کی طرف بڑھ گیا... وہ سگار ہاتھ میں لیے کسی فائل کے مطالعے میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" اس نے بنا کسی تمہید کے کہا۔ فراز سومرو چونکے۔ سفید شلوار قمیص میں وہ بکھرا بکھرا سرخ آنکھیں لیے کھڑا تھا۔

"کہو...؟" فراز نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور پھر فائل میں کھو گئے۔ عمر نے اس روبوٹ کو دیکھا۔ دکھ سے اس کی آنکھیں مزید سرخ ہوگئیں۔

"ممی کو گزرے ابھی صرف تین روز ہی ہوئے ہیں۔ اتنے سال اگر جانور کو بھی قریب رکھا جائے تو اس سے انسیت ہوجاتی ہے۔ وہ تو پھر آپ کی بیوی تھیں۔" اس کے لب کھلے۔

"مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا عمر! زندگی گزارنے کے لیے کل کو چھوڑنا اور بھولنا ہی پڑتا ہے۔ تم ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو۔" انہوں نے سگار کو ایش ٹرے میں رکھ کر زور سے مسلا۔

"ہاں' آپ جیسے آدمی کے لیے یہ سب آسان ہے۔ عباس بھائی کے جانے پر بھی آپ نے یہی کچھ کہا تھا۔ آج میری ماں چلی گئی تو بھی آپ یہی کہہ رہے ہیں۔ کل اگر میں مرگیا' چھوٹی ممی مرگئیں' تب بھی آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"تم فضول میں جذباتی ہورہے ہو۔ مجھے بھی شکیلہ اور عباس کے جانے کا دکھ ہے۔ مگر کیا اب ساری زندگی بیٹھ کر مردوں کو روتا رہوں؟ اگر سوگ منانے بیٹھ گیا تو یہ کاروبار' یہ سارا کام کیسے چلے گا؟" وہ جھلا گئے۔

"میں آپ سے بحث کرنے نہیں آیا۔ صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ ظلم' ناانصافی اور جبر کی اس کہانی کو اب ختم کردیں۔ چھوٹی ممی کے ساتھ ظلم کی انتہا کردی ہے آپ نے... اب اس کا ازالہ بھی آپ ہی کریں... اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ میں اس گھر میں

آج آخری بار آیا ہوں۔ اب مرتے دم تک اس چار دیواری میں نہیں آؤں گا۔ بس چھوٹی ممی کا خیال رکھیے گا۔ آپ نے انہیں بہت اکیلا کر دیا ہے۔"

وہ تحمل سے بولا۔ "کیوں؟ تم جو ہو ان کی تنہائیوں کے ساتھی۔" فراز سومرو نے حد پار کرلی تھی۔

"بس کریں..." عمر دھاڑا۔ اس کے پورے وجود پر لرزا طاری ہو چکا تھا۔ شدید ترین غصے اور غم نے اس کے بولنے کی طاقت کو سلب کر لیا تھا۔ اس کے تاثرات اتنے شدید تھے کہ فراز سومرو بھی اندر ہی اندر گھبرا گئے۔

"آج آپ نے ساری حدیں پار کرلیں۔ میری ماں مر چکی ہے اور آج سے میرا باپ بھی میرے لیے مر چکا ہے۔"

وہ فوراً" پلٹا مگر رومیصہ کو دیکھ چکرا گیا۔ وہ بُت بنی کھڑی تھیں۔ عمر کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔

"آپ واقعی میری ماں ہیں۔" اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آنکھوں سے لگالیا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا جبکہ رومیصہ سکتے کے عالم میں وہیں کھڑے کھڑے یکدم ڈھے گئیں۔

☼ ☼ ☼

کئی روگ دے گئی ہے نئے موسموں کی بارش
مجھے یاد آ رہے ہیں، مجھے بھول جانے والے

سو... تو آج پورے چھ سال گزر گئے۔ تمہارے بغیر... تمہیں دیکھے بغیر، تمہیں چھوئے بغیر... ہاں... تمہاری آواز تک نہیں سنی... ایسے پتھر ہو گئے ہو کہ مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔"

وہ کھڑکی کھول کر کھڑی تھی۔ اس کے لانبے سیاہ ریشمی بال تیز ہوا سے اڑ رہے تھے۔ باہر گھپ اندھیرا تھا، کمرے میں بھی اندھیرا تھا اور اس کے اندر... اس کے اندر الاؤ روشن تھے۔

"زندگی کے آٹھ سال تم نے مجھے کس جرم کی پاداش میں تنہا رکھا؟" وہ اب رو رہی تھی۔ اسی وقت لائٹ آگئی۔ کمرے میں اجالا ہو گیا تھا۔ لان کی لائٹ بھی آن ہو گئی تھی، مگر بارش کی رفتار میں کمی نہ آئی تھی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے دروازے کی سمت دیکھا۔ اسے گمان ہوا تھا کہ کسی نے دستک دی ہے مگر پھر خاموشی...

اس نے کھڑکی کے پٹ سے سر ٹکا دیا۔ اس بار اس نے دستک نہیں سنی تھی، بلکہ دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ وہ پلٹی اور پھر ایسے ٹھٹک گئی گویا بُت بن گئی ہو۔

"عمر... عمر۔" وہ بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ سفید شرٹ بلیو جینز اور بھیگے بکھرے بال... وہ عمر ہی تھا۔

"عمر..." وہ بے اختیار ہو کر اس کے شانے سے جا لگی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ عمر نے گردن گھما کر شاہینہ کی طرف دیکھا۔ وہ دوپٹے سے بھیگی آنکھیں پونچھتی ہوئی مڑ گئیں۔ عمر نے اس کے سر پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ وہ کتنی دیر روتی رہی... آٹھ سالوں کا غبار تھا جو اس کے آنسوؤں کی صورت نکل رہا تھا۔

"کتنا روؤ گی؟ پہلے ہی بارش نے جل تھل کر رکھا ہے۔" عمر نے بالآخر نرمی سے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"کہاں چلے گئے تھے؟ تم گئے... بابا بھی چلے گئے... مجھے تنہا کر دیا تم دونوں نے..." وہ بے ربط ہو رہی تھی۔ عمر نے اسے صوفے پر بٹھایا۔

"عمر! بابا چلے گئے..." وہ پھر رو دی۔

"مجھے معلوم ہے۔ حوصلہ کرو... اتنے بڑے ادارے کی ڈائریکٹر ہو کر بچوں کی طرح رو رہی ہو۔" عمر نے جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھے۔

"ڈائریکٹر انسان نہیں ہوتے کیا؟" وہ دھاڑی۔

"بدلی نہیں ہو تم..." وہ مبہم مسکرایا۔

"تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ سی ایس ایس کر کے تم نے اینٹی نارکوٹکس جوائن کر لیا اور اس دن کے بعد تم نے آج شکل دکھائی ہے۔ بابا تمہیں یاد کرتے کرتے چل بسے۔ تمہاری چھوٹی ممی بھی۔" وہ رک گئی۔ آنسوؤں کا گولہ اس کے گلے میں پھنس گیا تھا۔

عمر اٹھا اور روم فریج سے پانی کا جگ نکال کر گلاس میں پانی انڈیلا اور اس کو تھمادیا۔

"سیدھا ایئرپورٹ سے آرہا ہوں۔ چلو اچھا سا کھانا کھلواؤ۔ ترس گیا ہوں گھر کے کھانے کو۔" عمر نے تھکے تھکے انداز میں مسکرا کر کہا۔ بہت تھکی ہوئی مسکراہٹ تھی اس کی۔

"بہت بدل گئے ہو عمر۔" حوریہ نے تفصیلی نگاہ اس پر ڈالی۔ قد تو اس کا پہلے ہی لمبا تھا۔ صحت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ سرخی مائل گندمی رنگت چمک رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی ہلکی شیو بڑھی تھی۔ مگر چمک دار آنکھیں اداس تھیں۔

"تم یونیورسٹی میں مجھ سے بریانی کھانے کے لیے کتنا ضد کرتے تھے۔" اسے یاد آیا۔

"اور تم مہا کنجوس، کتنی مشکلوں سے راضی ہوتی تھیں۔" عمر ہنسا۔ اسی وقت شاہینہ آگئیں۔

"بوا! کھانا لگائیں عمر کے لیے۔۔۔ بلکہ ایسا کریں قیمہ نکالیں میں جلدی سے لزانیہ بنا لیتی ہوں، تمہیں پسند ہے ناں۔" وہ مڑی۔

عمر کو رومیصہ یاد آگئیں اور ان کے ساتھ ساتھ نجانے کیا کیا کچھ۔۔۔ وہ گالی بھی جو فراز سومرو نے اسے اور رومیصہ کو دی تھی۔۔۔

"چلو۔۔۔ تم ایسا کرو بابا کے روم میں چلو۔ فریش ہو جاؤ۔ تب تک میں کھانا تیار کرتی ہوں۔ صرف آدھا گھنٹہ لگے گا۔"

حوریہ نے اسے بابا کے کمرے تک چھوڑا اور خود کچن میں چلی گئی۔ عمر کتنے سالوں بعد یہاں آیا تھا۔۔۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ مگر اس کمرے کی ہر چیز اسی ترتیب اور سیٹنگ کے ساتھ مخصوص جگہوں پر موجود تھی جیسے کہ انیق مسعود کی زندگی میں۔ بیڈ کے ساتھ رکھی تپائی پر انیق مسعود اور حوریہ کی مسکراتی ہوئی تصویر بھی جوں کی توں تھی۔ ہر شے اسی طرح چمک رہی تھی جیسے کہ ان کی زندگی میں چمکتی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر فریم اٹھایا اور انیق مسعود کی زندگی سے بھرپور چمک دار آنکھوں کو دیکھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا ہو گا کہ ان دو چمک دار ستاروں کے پیچھے درد والم کے جہاں آباد ہیں۔

اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ اس نے فریم کو واپس رکھا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ جب تک نہا کر آیا۔ حوریہ کھانا بنا چکی تھی۔

وہ بے حد خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔ حوریہ نے کئی بار اس سے بات کرنی چاہی مگر اس کے چہرے پر اتنے ناقابل فہم تاثرات تھے کہ اس کی ہمت ہی نہ ہو سکی۔

"ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ ہم دونوں اکٹھے ہوں اور خاموش رہے۔" حوریہ نے سوچا۔

اک پرانا موسم لوٹا یاد بھری پروائی بھی
ایسا تو کم ہی ہوتا تھا وہ بھی ہو تنہائی بھی

یہ شعر حسب حال لگتا ہے۔ ہے ناں؟" کچھ دیر کے بعد خاموشی کی گمبھیر فضا میں حوریہ کے لفظوں نے ارتعاش پیدا کی۔

"آں۔۔۔ ہاں۔" وہ چونکا۔ "پرانے دوستوں سے ملاقات ہوتی ہے؟" اس نے بات چھیڑی۔

"بہت زیادہ نہیں۔ کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی ہے۔ تمہاری طرح کوئی پوری طرح سے غائب نہیں ہوا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی حوریہ کے لہجے میں شکایت آگئی۔

جواباً" وہ صرف مبہم مسکرایا۔

"ریشم اور ذیشان کی شادی ہو چکی ہے۔ دونوں مل کر میگزین سنبھال رہے ہیں۔ صندل نے دانش کے فادر کا آفس جوائن کر لیا تھا پھر دانش نے اسے پرپوز کر دیا۔ تھوڑی بہت ڈرامائی صورت حال کے بعد بالآخر ان کی شادی ہو گئی ہے اور وہ بہت خوش ہیں۔" وہ ہیڈ لائنز سنا رہی تھی۔

"کینڈی بھی بیوی کو پیارا ہو چکا ہے۔ جانتے ہو اس نے شادی کس سے کی؟"

"کس سے؟" عمر نے پوچھا۔

"ندا حمید سے اور وہ ہمسٹم جوائن کر چکا ہے۔" حوریہ نے اطلاع پہنچائی۔

"جانتا ہوں۔ انکل رحمان سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی، تین سال پہلے۔۔۔ جب میں یہاں پوسٹڈ

تھا۔" عمر نے نظریں چراتے ہوئے بتایا۔

"تم سب جانتے تھے۔ پھر بھی مجھ سے ملے نہیں۔" وہ شاکڈ تھی۔

"تم جانتے ہو.... تم کتنے بڑے خودغرض ہو...." وہ پھٹ پڑی۔

"بابا تمہیں آخری وقت تک یاد کرتے رہے تھے۔ وہ تم سے کچھ کہنا چاہتے تھے عمر! انکل رحمان سے سارا احوال جان لینے کے بعد بھی تم اُف کتنے کٹھور ہو۔"

وہ پھر رو پڑی۔ عمر چپ رہا۔ وہ کتنی دیر بولتی رہی۔ اسے بُرا بھلا کہتی رہی اور وہ چپ چاپ ہمیشہ کی طرح سنتا رہا۔ کافی دیر بولتے رہنے کے بعد وہ چپ ہوگئی تو عمر نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تم بہت بے حس ہو۔" وہ غصے سے اسے دیکھنے لگی۔

"ایک زمانہ گزر گیا ہے حوریہ! اس دل پر بوجھ ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے.... مجھے سننے والا تو کوئی بھی نہیں۔" عمر نے کانٹے سے لزانیہ کے ٹکڑے کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ حوریہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں حوریہ! زندگی نے بھگا بھگا کر تھکا دیا ہے۔ بابا کے پاس ستانے کو آتا تھا مگر بہت کچھ ان سے شیئر کرنے کے بعد بھی بہت کچھ انہیں بتا نہیں سکتا تھا۔"

اس نے تھکے تھکے انداز میں کرسی کی پشت سے کمر لگا دی۔ حوریہ اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جہاں کئی کہانیاں رقم ہو چکی تھیں۔ آج یہ بند کتاب کھلنے والی تھی اور اس بند کتاب کے اندر کی تحریر وہ برسوں پہلے پڑھنا چاہتی تھی۔

"حوریہ! میری رگوں میں ایک ایسے شخص کا خون ہے، جس کی خودغرضی اور سفاکی مثالی ہے۔ جانتی ہو .... میں آج اس مثالی خودغرض شخص کو تختہ دار تک پہنچا کر آیا ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"مطلب؟" حوریہ ناسمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بات کا آغاز ڈھونڈ رہا ہے۔

"میرا باپ اس کہانی کا مین کردار ہے۔ ہر سرا اسی سے ملتا ہے۔ میرے پاپا، بڑی ممی، تمہارے بابا اور چھوٹی ممی.... یہ چاروں اس کہانی کے چار سرے ہیں۔ میری چھوٹی ممی اور تمہارے بابا پہلے میاں بیوی تھے۔"

اس نے کہتے کہتے چور نظروں سے حوریہ کی طرف دیکھا۔

اس اچانک انکشاف نے اس سے ردِعمل کی قوت چھین لی تھی۔

"تم مجھے بزدل سمجھتی ہو ناں.... مگر میں بزدل نہیں تھا حوریہ! کچھ مصلحتیں تھیں، جن کی وجہ سے میں کسی کے معاملے میں نہیں بولتا تھا۔" اسے یونیورسٹی کا وریاد آگیا تھا۔

"عباس بھائی چھوٹی ممی کو ہماری ممی کے دکھوں کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ ممی بھی عباس بھائی سے بہت محبت کرتی تھیں کیونکہ ایک وہی تھے جو ان کے لیے بولتے تھے، لڑتے تھے۔ اور پھر ایک دن ممی کی پاپا سے زبردست جھڑپ ہوگئی اور پاپا نے ممی کو اتنا مارا کہ ان کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے ٹوٹ گئے۔ میری ماں ہزار علاج کے باوجود بستر سے جو لگی تو موت بھی وہیں آئی

اسے۔ پاپا نے سب کو ممی کی اس حالت کی وجہ یہ بتائی کہ وہ سیڑھیوں سے پھسل گئی تھیں۔ مگر اصلیت میں جانتا تھا اور میں نے عباس بھائی کو یہ اصلیت نہیں بتائی کہ کہیں وہ پاپا کو جان سے ہی نہ مار ڈالیں۔ انہوں نے پولیس فورس جوائن کرلی تھی۔ وہ ایک نہایت ایمان دار پولیس آفیسر تھے۔ اور جب انہیں پتا چلا کہ پاپا کا اصل بزنس ڈرگز کی اسمگلنگ ہے تو انہوں نے پاپا کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے شروع کر دیے۔ پاپا کو اریسٹ کرنے سے پہلے انہوں نے پاپا کو روکا' سمجھایا' دھمکایا۔ مگر پاپا نہیں مانے اور پتا پاپا نے کیا کیا؟ پاپا نے عباس بھائی کو اپنے سگے بیٹے کو مروا دیا اور ان کے اس پلان میں ان کا کاروباری شراکت دار دوست بھی شامل تھا اور وہ دوست قادر کا باپ تھا۔" اس نے انکشاف کیا۔

"کیا؟" وہ چونکی۔

"ہاں قادر' اپنا کینڈی... اسے کسٹم سروس کے دوران اس گھناؤنے سچ کا پتا چلا تھا۔ اس نے مجھے بھی بتا دیا اور مجھے اس حقیقت کا پتا تب چلا تھا جب میں ممی کی ڈیتھ کے بعد بھائی کے کمرے میں آخری بار گیا تھا۔ ان کے کچھ کاغذات جو شاید پاپا سے پوشیدہ رہ گئے یا انہوں نے انہیں اہم نہ جانا۔ میں نے اسی وقت ارادہ کرلیا کہ اپنے بھائی کا مشن میں پورا کروں گا۔

میرا بھائی میری زندگی تھا حوریہ... فراز سومرو نے میری زندگی مجھ سے چھین لی تھی۔ حقیقت جاننے کے بعد میں نے کسی اور فیلڈ میں جانے کے بجائے اینٹی نارکوٹکس جوائن کیا اور انکل رحمان کی معاونت سے ایک ظالم کو اس کے انجام تک پہنچایا۔

ان کی طرف ویسے بھی بہت ادھار نکلتے تھے میرے ... میں چھوٹی ممی کو حوریہ! اپنی سگی ماں کی طرح ہی سمجھتا تھا مگر انہوں نے...!" اس نے کراہیت سے سر جھٹکا۔

"وہ پہلے ہی دل کی مریضہ تھیں۔ برداشت نہ کر پائیں۔ ان کی ڈیتھ کے بعد میں نے وہ گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔"

اس نے سر جھکا لیا۔ حوریہ نے میز پر بازو رکھے اور چہرہ ان میں چھپا لیا۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ عمر نے نہایت دکھ سے اسے دیکھا۔

"حوریہ! زندگی نے مجھے اتنا کچھ دیا... خوشیاں' غم' یادیں' مہربان... نامہربان' دوست' دشمن سب ہی کچھ ... مگر اس پل میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں تمہارے ان آنسوؤں کو کہاں رکھوں؟ مت رو پلیز۔" وہ جیسے بے بسی سے کہہ رہا تھا۔

"کاش تم مجھے یہ سچ نہ بتاتے۔" اس نے اپنا بھیگا ہوا چہرہ اٹھایا "مجھے میرے اسی گمان میں زندہ رہنے دیتے۔"

"مجھے انکل رحمان نے بابا کا خط دیا تھا۔ اس خط میں انہوں نے یہی لکھا ہے کہ تمہیں بابا کی ڈیتھ کے بعد سچائی بتا دوں۔ شاید وہ یہ چاہتے ہوں کہ ان کے جانے کے بعد کم از کم تمہیں تمہاری ماں تو مل جائے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ چھوٹی ممی تو ان سے بھی پہلے ان کے انتظار میں جاچکی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"سر سجاد علوی صحیح کہتے تھے کہ کہانیاں' حقیقت سے ہی جنم لیتی ہیں۔ یہ کہانی تو ختم ہوگئی حوریہ... اب میں اور تم مل کر ایک نئی کہانی رقم کریں گے... کیونکہ اس کہانی کا سفر میرے یا تمہارے بغیر مکمل نہیں ہو گا۔"

عمر نے نرمی سے کہا۔ وہ ناسمجھی کے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ماضی کا باب بند کر کے ایک نیا باب شروع کرتے ہیں حوریہ... میں نے ان آٹھ سالوں میں جان لیا ہے کہ تمہارے بغیر میری یہ کہانی مکمل نہیں ہو سکتی۔ بولو... ساتھ دو گی؟" عمر نے بہت نرم مگر بہت گمبھیر لہجے میں سوال کیا تھا۔

"برسوں سے تمہارے منہ سے یہی سوال سننا چاہتی تھی۔" حوریہ کی بھیگی بھیگی سی مسکان سے عمر کو اپنے مستقبل کے حسن کا اندازہ ہوگیا تھا۔

میمونہ صدف

آریہ محلہ... محلے کی بڑی مسجد... مسجد سے ملحقہ شان دار محل نما گھر... اور محلے کے کرتا دھرتا حاجی عبدالغنی... نیک نامی اور پاک بازی میں شہرت کے حامل۔ آتے جاتوں کو نوازتے۔ دیتے اور دیتے ہی جاتے... ایسے سخی، ایسے دیالو۔ دل۔ خوش ہو جاتا۔

"ہاں بھئی بولو، کتنی رقم کی ضرورت ہے۔ کہو کہو شرماؤ نہیں۔" اگلا کچھ شرمندگی، کچھ جھجک کا شکار... کیسے بتائے؟ کیا بتائے اور کیا چھپائے؟

"بولو بھائی! شرمانا کیسا؟ ہر بار ہی دیتا ہوں، اب بھی دوں گا۔ جتنا چاہیے اتنا دوں گا۔" اور اگلا شرم سے گڑ گڑ جاتا۔

"ہاں بھئی، کہو جو سائیکل میں نے لے کر دی تھی، ٹھیک سے چل رہی ہے نا؟" اگلا احسان تلے دب دب جاتا۔

"ہاں بھئی۔ بچے کی صحت کیسی ہے؟ میں نے بڑا خرچا کیا تھا... بڑے اور مہنگے اسپتال میں علاج کروایا تھا۔" ان کی بات سے اگلے کا سر جھک جھک جاتا۔

ان کی ہر بات "ہاں بھئی" سے ہی تان پکڑتی... اور

احسانوں کی طویل فہرست گنوائی جاتی۔
فلاں کے بیٹے کو چھوٹا موٹا کاروبار شروع کروا کر دیا۔۔۔ فلاں کی بیٹی کی شادی کروائی' جہیز میں سوئی سے لے کر ٹی وی' فریج تک سب دے ڈالا۔۔۔ کتنوں کے مکان کا کرایہ چکایا۔۔۔ کتنوں کے بچوں کے پڑھائی کے خرچ اٹھائے۔ ایسے قصے تو زبان زد عام تھے اور کیوں نہ ہوتے۔ عبدالغنی صاحب بڑی عاجزی و انکساری سے بتاتے کہ کون ان کے احسانوں کا کتنا مقروض ہے۔
محلے کی اتنی بڑی مسجد بنوائی تو نام اپنے نام پر رکھوایا۔۔۔ مسجد عبدالغنی۔۔۔ اور کیوں نہ رکھتے۔۔۔ لوگوں کو بھی خبر ہونا چاہیے کہ اللہ کے نام پر بنوائی گئی مسجد بنوائی تو بنوائی کس نے؟
"اتنا کر کے چھپاتے کیوں نہیں۔۔۔؟ بتاتے کیوں ہیں۔۔۔؟ جتاتے کیوں ہیں؟" چھوٹا بیٹا ناصر اکثر چڑ جاتا۔ وہ گھورتے اور پھر دھاڑتے۔۔۔ ایسی مجال کہ بیٹا باپ کے منہ کو آئے۔
"یاد دلاتا ہوں اور دلاتا رہوں گا تاکہ دوسرے احسان بھول نہ جائیں۔ یاد رکھیں۔"
اور ناصر سر جھٹک کر رہ جاتا۔۔۔ تھا ہی منہ پھٹ اور باغی۔ سمجھتا نہیں تھا کہ اتنا تو بتانا پڑتا ہے۔۔۔ بتانا ہی ہوتا ہے اور اتنا پیسہ کہاں سے آتا تھا؟ کہاں سے بنتا؟
قریب کے گاؤں میں بڑے بڑے اناج کے گودام تھے۔۔۔ آخر کو جدی پشتی زمین دار تھے۔ نجانے کتنے سو ایکڑ پر پھیلی پیداوار دیتی زمینیں تھیں۔۔۔ ذخیرہ اندوزی کی گئی پیداوار سے کتنے گودام بھرے پڑے تھے۔
اور شہر میں فرنیچر کا بڑا شوروم۔۔۔ جہاں منہگا فرنیچر بنتا اور بکتا۔ کمائی کھلی تھی۔۔۔ نہ کوئی فکر نہ پریشانی۔
اولاد کے نام پر دو بیٹے باقر اور ناصر تھے جو باپ کے کاروبار اور زمینوں کی دیکھ بھال سنبھالنے کی بجائے مرضی کی نوکری کرتے۔۔۔ اونہہ!۔۔۔ ناخلف اولاد۔ کبھی باپ کے کام نہ آئی۔
سب ٹھیک چل رہا تھا۔۔۔ گاؤں کی زمینیں اور پیداوار بھی۔ فرنیچر کا شوروم بھی۔۔۔ اور فلاحی کام بھی۔

پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا؟ اور کیسے ہوا؟
گاؤں کے گوداموں میں آگ لگ گئی۔ ساری گندم نے آن کی آن میں چنگاری پکڑی اور دھڑا دھڑ جلنے لگی۔۔۔ راکھ بنی اور سب ختم۔ ہفتوں گزر گئے' مگر معلوم نہ پڑ سکا کہ ذرا سی چنگاری بھڑکی کیسے۔۔۔؟ خود سے بھڑکی یا کسی نے بھڑکائی۔۔۔؟ کون جانے۔
اور پھر دو ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ شارٹ سرکٹ کی بدولت شو روم جل گیا اور ایسا جلا کہ فرنیچر تو فرنیچر در و دیوار تک کوئلہ ہو گئے۔
ہو نہ ہو کوئی سایہ تھا وہاں ورنہ کیسے۔۔۔؟
کسی نے تعویذ گنڈے کروائے ہوں گے تب ہی اتنا نقصان ہوا۔ کسی نے جادو ٹونا کروایا ہو گا۔۔۔ عمل کیا ہو گا ورنہ۔۔۔ اور کتنے ورنہ' ورنہ ہی رہ گئے۔
جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔
ساری کمائی بھسم ہو گئی اور حاجی عبدالغنی کف افسوس ملتے رہ گئے۔
کیسے؟ کب؟ کیا؟ کیوں؟ سب بے کار تھا اب۔۔۔
پھر بھی حاجی صاحب سوچتے جاتے' سوچ سوچ کر تھکنے لگتے اور پھر سے سوچنے لگتے۔
ساری پونجی آنکھوں کے سامنے راکھ بن گئی۔۔۔؟ کتنا سوچا۔۔۔ مگر کچھ پلے نہ پڑا' کوئی سرا نہ ملا۔
اور ایک لمحے کو بھی نہ سوچا گیا کہ جو ساری نیکیاں کر کر کے جتائی گئیں۔۔۔ وہ بھی تو خاک ہوئیں۔
اور ایک شخص محنت سے باغ لگاتا ہے اور پھر اپنے ہاتھوں سے اسے جلا ڈالتا ہے۔۔۔ کیا کرایا سب تباہ۔ تو حاجی عبدالغنی وہی شخص تو تھے۔
ہاں کون سوچتا ہے کہ سب نیکیاں جتانے سے ایسے ہی جلتی ہیں۔۔۔ کوئلہ ہوتی ہیں تب نہیں سوچا جاتا۔ کب؟ کیسے؟ کیوں۔۔۔؟
اور جب ناصر کہتا کہ "نیکی کر کے جتاتے کیوں ہیں۔۔۔؟ سب کو بتاتے کیوں ہیں۔۔۔؟"
تو حاجی صاحب گھورتے اور دھاڑتے۔
"بتانا تو پڑتا ہے نا۔۔۔ اتنا تو بتانا ہی پڑتا ہے۔"

☆

دسمبر 2014ء
کے شمارے کی ایک جھلک

- "پیرِ کامل" کا دوسرا حصہ "آبِ حیات" عُمیرہ احمد کا ناول ،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول "جمل" ۔
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول "عہدِ الست"
- عفت سحر طاہر کا ناول "بن مانگی دُعا"،
- وجیہہ احمد کا مکمل ناول،
- میمونہ صدف اور آسیہ مقصود کے ناولٹ،
- راشدہ رفعت، سائرہ رضا، ملیحہ صدیقی اور سیما بنت عاصم کے افسانے،
- "حسب حال" کی "ناجیہ بیگ" سے ملاقات،
- ڈراما سیریل "میرا سسرال" کی علیزے "زرنش خان" سے باتیں،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا دسمبر 2014 کا شمارہ آج ہی خریدلیں۔

ایمل رضا

چور عورت

"چور عورتیں" ناگ کی طرح پھنکارتے طنز بھرے الفاظ ادا ہوئے جن میں کہیں کہیں قہقہوں کی آمیزش بھی تھی۔

"تمہیں پتا ہے کہ تم بھی ایک چور عورت ہو؟" ذات کی جھوٹی حقیقت کا ادراک کسی کے بڑے گھڑیال کی طرح بجا۔ ٹن ٹن ٹن۔ سحر کے اعصاب طبلہ چڑھی کھال کی طرح تن گئے۔ اس کی سوئی سوئی آنکھیں ایسے کھل گئی جیسے مدتوں نیند سے ناآشنا رہی ہوں۔

"چور عورت؟" سوالیہ نظروں سے اس نے اپنے صرف ایک مہینہ پرانے شوہر کو دیکھا اور کمرے کے درودیوار نے بھی جو ٹن ٹن کی گرج سے گھبرا گئے تھے۔ پہلی رات کی سجاوٹ کی جو باقیات بچی تھیں، وہ بھی کن اکھیوں سے حماد کو دیکھنے لگیں، جس نے اپنی نئی نئی بیوی کو محبوبہ کا خطاب دینے کے بجائے "چور عورت" کہا تھا۔

"کیا اب بھی تمہیں مزید کسی وضاحت کی ضرورت ہے؟" پیروں میں سیاہ جرابیں چڑھاتے ہوئے اس نے استفہامیہ نظروں سے سحر کو ٹٹولا۔

"شاید اب ہی تو وضاحتیں لینے اور دینے کا آغاز ہوا ہے۔" اپنی جگہ ساکت وجامد ہوتی سحر نے خود سے کہا۔

"تمہاری ایک ایک جنبش مجھے تمہارا مجھ میں کسی اور کو ڈھونڈنے کا پیغام دیتی ہے۔" بزنس مین حماد نے اپنی نئی بہت مشکل اور سوچ سوچ کر لفظ اکٹھا کی ہوئی بات کی تھی۔ وہ اب شوز پہننے لگا تھا۔

"کسی اور۔ کسی اور۔ کسی اور۔" سحر نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لینے چاہے۔

جب اس شخص نے مجھے برگد کی جڑوں کی طرح ہوا میں معلق کر ہی دیا ہے تو پھر ابہام قائم رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ سیدھی طرح "عاصم" کا نام کیوں نہیں لے لیتا۔ اس نے چلانا چاہا مگر خاموش رہی۔ جوتے پہن کر حماد بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی طرف منہ کرکے۔ لیکچر جاری رکھنے کے انداز میں۔ اس مفصل لیکچرز کے نوٹس سحر کو دو ہفتے پہلے سے ملنے لگے تھے، پھر بھی تیاری میں اس نے خود کو کورا ہی رہنے دیا تھا، وہ شروع سے ہی ایسی لاپروا رہی تھی۔ مصیبت سر پر آن کھڑی ہوتی اسے تب ہوش آتا تھا۔

"اگر تمہیں میں پسند نہیں تھا تو تم مجھ سے شادی سے انکار کرسکتی تھیں۔"

"کیسی باتیں کررہے ہیں حماد آپ؟" نیم مردہ لہجے سے اس نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی۔

"یہ حقیقت ہے اگر تمہیں برا لگ رہا ہے تو میں کچھ نہیں کرسکتا۔"

"نہیں ہے یہ حقیقت۔" الفاظ تو دھاڑنے والے تھے، لیکن بڑی نرمی سے ادا ہوئے۔

"میرا مشاہدہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا سحر!" وہ پریقین اور ٹھوس لہجے میں بولا۔ طوطے کی طرح اس نے بھی دوسروں کے جھوٹے سچے تجربات کتر کتر کر اپنی چونچ تیز کی تھی، پھر اب وقت آنے پر اسی چونچ سے سحر کو کاٹا تھا۔

"باتھ روم میں جاتی ہو تو گھنٹہ گھنٹہ باہر نہیں آتیں۔ کیا روتی رہتی ہو اندر؟ کل میں نے خود دیکھا

ہے۔ تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔" وہ بے یقینی سے حماد کو دیکھنے لگی۔

"میک اپ ریموو کررہی تھی حماد۔ کلینزنگ آنکھوں میں چلی گئی تو آنکھیں سرخ ہو گئیں بس۔"

"بس۔؟" آفس جانے کی جلدی میں ہونے کے باوجود وہ بڑے تحمل سے بات کررہا تھا۔ "بستر سے آدھی آدھی رات کو اٹھ کر غائب ہو جاتی ہو۔ کبھی گھنٹہ گھنٹہ کھڑکی میں کھڑی ہو۔ کبھی آئینے میں خود کو دیکھ رہی ہو۔ ترس بھرے انداز سے۔ تمہارا کیا خیال ہے میں غافل ہو کر سوتا ہوں۔ جب تم جیسی بیوی آجائے تو مرد کیسے غافل ہو سکتا ہے۔ اسے تو ہر دم چوکنا رہنا پڑتا ہے۔"

"بس کردیں حماد!" وہ بے چارگی سے بولی۔

"بتاؤ' کس بات کا دکھ ہے تمہیں۔ کس اقدام کا پچھتاوا ہے۔ مجھ سے شادی کا ہی ناں۔ یا آدھی رات کو اٹھ اٹھ کر کسی کی جدائی کا غم مناتی ہو؟"

سب کچھ حوصلے اور صبر سے برداشت کرنے کے باوجود بھی آخری بات پر اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر آگیا۔ لیکن اس نے خود کو بے بس پایا۔ عورت شاید ازل سے ہی بے بس ہوتی ہے۔ اس کے اختیارات کا دائرہ کسی گھر، کوٹھی، بنگلے یا قلعے تک تو وسیع ہو سکتا ہے لیکن اپنی خود کی ذات کے دریچے کا پھاٹک اس پر کبھی وا نہیں ہوتا۔

"یہ سب ایسی باتیں نہیں۔ جن کی بنا پر آپ مجھ پر شک کریں۔ کسی قسم کا بھی؟" حماد نے اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے کسی انجان چیز کو دیکھ رہا ہو۔ کسی مکمل نفی وجود کو یا جیسے سحر کے ماتھے پر جھوٹ اور غلط بیانی کی تختی لگی ہو۔

"یہ بات تم مجھے کہہ رہی ہو سحر تم؟" بھنویں اندر کو سکیڑ کر اس نے ایک اندرونی ہچکی سی لی اس طنز کی بھرپور حرکت سے سحر سلگ کر رہ گئی۔ "جس کی ایک ایک حرکت میرے شک کی تصدیق کرتی ہے۔ جس کی آنکھیں ہر وقت کچھ لٹ جانے کا ماتم مناتی رہتی ہیں۔"

"پھر تو آپ پر وارد ہوئی تصدیق کی فہرست میں بھی دیکھنا چاہوں گی۔"

"تم انجان تو نہیں۔ یا کیا ہو۔؟"

یہ شخص کتنا ملٹی ٹیلنٹڈ ہے نا۔ تاجر، مالک، حاکم، سرپرست اور جادوگر، جو بنا تیلی جلائے آگ لگا دینے کا فن جانتا ہے۔

"آپ کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں حماد"

"اور تم میری سوچ سے بھی زیادہ ہوشیار، چالاک، چور۔"

"چور۔ چور۔ چور" کمرے کی فضا میں پھر اس لفظ کی گردان ہونے لگی۔

"آپ نے اپنی ذات میں اتنے ہی اصول پال رکھے تھے تو مجھ سے شادی نہ کی ہوتی۔"

"مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اپنے سابقہ منگیتر کو کبھی بھول ہی نہیں پاؤ گی۔"

"سب آپ کی سوچ ہے، وہم ہے، حقیقتاً ایسا کچھ بھی نہیں۔"

"تو پھر کیوں رہتی ہو اتنی دکھی دکھی۔ جیسے بچھڑ گئی ہو کسی سے، ورنہ شادی کے بعد اور صرف ایک ماہ بعد تو لڑکیاں ایسی نہیں ہو جاتیں۔"

"وہی تو میں کہہ رہی ہوں حماد! کہ شادی کے صرف ایک ماہ بعد شوہر ایسے تو نہیں ہو جاتے۔"

"جو ہو جاتے ہیں ان کے پاس وجہ بھی تو ہوتی ہو گی نا۔" اس کے پاس ہر چیز کا جواب تھا ہینگر سے اپنا کوٹ نکال کر وہ پہننے لگا۔

"جب کوئی من گھڑت وجہ ڈھونڈنے لگے تو دوسرا کیا کرے؟" سحر کی اس بات پر وہ جاتے جاتے پھر رک گیا۔

"فرحانہ کی طرف دعوت پر کیوں لے گئی تھیں تم مجھے۔ میں تو تھکا ہوا تھا۔ انوی ٹیشن کے طور پر بھی صرف ایک فون ہی تو آیا تھا۔ لیکن تم نے جانے کی ضد پکڑلی اور وہاں جا کر ہی دم لیا۔ وہ تو مجھے وہاں جا کر پتا چلا کہ عاصم بھی وہاں پر ہی ہے۔ اسی لیے تو تم اتنی بے چین تھیں۔"

"بس کریں حماد۔ مجھے پتا چلا تھا کہ عاصم کراچی گیا ہوا ہے اس لیے چلی گئی لیکن وہاں وہ نجانے کیسے موجود تھا۔"

"تمہیں پتا چلا۔" بنا آواز کے بنا ہاتھ ہلائے تالی مارنے والا انداز۔ انگلی ٹھوڑی تلے رکھے، وہ مصنوعی انداز سے جیسے کچھ سوچنے لگا۔ "خبر بھی رکھتی ہو اس کے بارے میں پوری پوری۔ یا دل کو دل سے راہ والا معاملہ ہے۔"

"مجھے پتا تھا کہ آپ برہم ہوں گے۔" سحر بھی بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی "آپ کی شخصیت جو واضح ہو گئی تھی شادی کے پہلے ہی ہفتے مجھ پر۔ اس لیے میں نے پہلے ہی فرحانہ کو فون کر کے پوچھ لیا تھا۔"

"میری شخصیت واضح ہو گئی تھی؟" وہ ابھی تک وہی اڑا ہوا تھا۔ "چلو اچھی بات ہے۔ میں کوئی گیت نہیں ہوں۔ لیکن تم۔ تم کیوں پہیلی ہو ابھی تک میرے لیے۔"

وہ گہرے دکھ سے حماد کو دیکھنے لگی۔

"عاصم اور تمہیں۔ تم دونوں کو مل کر منانا چاہیے تھا تمہارے ابو کو۔ جنہوں نے تمہاری مرضی کے بغیر یہ منگنی توڑ دی۔"

"وہ منگنی میرے والدین کی مرضی سے ہوئی تھی۔ اور ان کی مرضی سے ختم بھی ہوگئی۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں یقیناً انہوں نے میرا بھلا ہی سوچا ہوگا' منگنی کے دوران میں ایک دفعہ بھی عاصم سے نہیں ملی تھی حماد۔"

شادی کے بعد وہ یہ ساری وضاحت دوسری مرتبہ دے رہی تھی۔ کیونکہ شادی کے فوراً" بعد ہی حماد کی شخصیت اور فطرت کے پول کپاس کی سنڈیوں کی طرح ایک دم سے حملہ آور ہوئے تھے۔ ابھی تو مشکل سے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا۔ دھنک کے رنگ مدھم بھی نہ ہوئے تھے کہ حماد اپنے رنگ دکھانے لگا۔

پینتیس سالہ حماد ناٹے قد کا' بھرے بھرے جسم' درمیانے سائز کی مونچھ' گول گول آنکھیں اور پھولے پھولے گالوں کا مالک آدمی تھا۔ اس کے علاوہ وہ جاہلانہ ذہنیت بھی رکھتا تھا۔ کوئی دلیل اسے منظور نہ تھی اور اس کی خود کی باتوں میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ ماں باپ کی وفات اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی ان تھک محنت نے اس کو بہت سے جذبوں سے ناواقف رکھا تھا اور بہت سوں سے روشناس کروایا تھا۔ اس جان کاری اور لاعلمی نے اس کی ذات کے اندر عجیب تلخی سی بھر دی تھی' جو اس کے سارے وجود سے عیاں ہوتی تھی۔ دیر سے شادی کی وجہ اس کا دس سالہ سعودیہ عرب میں قیام تھا۔ جس کے بدلے میں اس کی تین بڑی بہنیں اپنے اپنے گھروں کو خوش و خرم رخصت ہوئیں۔

سحر کے ابو کو پتا نہیں حماد کی ذہنی حالت کا اندازہ تھا کہ نہیں' لیکن بس انہیں سحر کی شادی کرنے کی بہت جلدی تھی۔ اس سے پہلے سحر کی ایک سال عاصم سے منگنی رہ چکی تھی۔ عاصم سحر کے ننھیال سے دور کا رشتے دار تھا۔ سحر نے منگنی سے پہلے بس عاصم کو دو ایک بار دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس تعلق میں اور کچھ نہیں تھا۔ پھر جب سحر کے لیے عاصم کا رشتہ آیا تو امی کی مرضی زیادہ تھی اور ابو کی نہ ہونے کے برابر۔ ابو کو ہمیشہ سے ہی روایتی مردوں کی طرح بیوی کے میکے سے کوئی نہ کوئی شکایت رہتی تھی۔ لیکن پھر ایک سال گزر جانے کے باوجود بھی ابو عاصم لوگوں کے حق میں اپنا فیصلہ نہ دے سکے۔ بلکہ بتدریج خلاف ہی ہوتے گئے۔

ابو کسی طور حق بجانب بھی تھے ایک تو سحر کی ہونے والی سسرال نے عاصم کی نوکری کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ عاصم سرے سے کوئی جاب کرتا ہی نہیں تھا۔ ہر دفعہ ان کے گھر اچانک جانے پر بھی عاصم گھر پر ہی ملتا۔ دوسرا انہوں نے شادی سے پہلے گھر تعمیر کروانے کا بھی وعدہ کر رکھا تھا۔ ان کا گھر کافی پرانی طرز کا بنا ہوا تھا۔ لاتعداد اور غیر ضروری کھڑکیاں دروازے تو تھے ہی' باہری دیواروں میں بھی جگہ جگہ چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ مٹی کی چنائی کی دیواریں تھیں۔ جن کے اوپر بھی پلستر نہیں ہو سکتا تھا۔ گھر تعمیر کروانے کا وعدہ بھی کھائی میں جاتا محسوس ہونے لگا۔

اس سب کے باوجود وہ آئے دن شادی کی تاریخ لینے کا عندیہ بھجواتے رہتے۔ ایک سال کے اندر اندر ابو نے ان کی باتوں اور خیالات سے ان کی سوچ کی سطح کا اندازہ لگالیا۔ شکر ہے کہ نکاح نہیں ہوا تھا' ورنہ ابو اسے تڑوانے میں بھی دریغ نہ کرتے۔

"جن لوگوں کی صبح بونگ پائے اور رات نان کباب پر ہو' وہ لوگ گھر تو کیا ایک اینٹ بھی نہیں لگا سکتے۔"

امی بھی ابو کی باتیں سن سن کر پریشان رہنے لگی تھیں۔ ابو نے عاصم کے لیے دو ایک دفعہ خود بھی کوشش کی تھی۔ یہاں پر اس کی بی اے کی جعلی ڈگری کا بھی انکشاف ہوا۔ ایف اے والی اصلی بھی ایف (فیل) گریڈ سے ذرا ہی اوپر تھی۔

"اچھا ہوا۔ سب پہلے ہی پتا چل گیا۔" منگنی توڑ دینے کی طویل گفتگو کرنے کے بعد ابو نے امی سے کہا تھا۔ اندر ہی اندر اب وہ خود رشتے تلاش کرنے لگے تھے۔

ان کے دوست نے انہیں دونوں کے مشترکہ مرحوم دوست کے بیٹے حماد کے بارے میں بتایا۔ ابو نے گھربار آفس دیکھا تو فوراً" راضی ہو گئے۔ امی کو بھی ہر حال میں اپنی بیٹی کا مستقبل منظور تھا۔ دونوں کی عمروں میں موجود دس سال کے فرق کو سرے سے خاطر میں ہی نہ لایا گیا۔ یہ فرق موجودہ معاشرے کے رواجوں کے مطابق اب کچھ ایسا انوکھا بھی نہیں رہا تھا۔

سحر کی منگنی عاصم سے بے تحاشا لڑائی جھگڑوں کے باوجود بھی ختم ہو گئی سحر کو افسوس ہوا لیکن صرف وقتی۔ وہ جانتی تھی کہ اللہ کے ہر کام میں کوئی بہتری ہی ہوتی ہے۔ دوسری وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس دوران وہ کبھی عاصم سے نہیں ملی تھی اور نہ ہی فون پر کبھی بات کی تھی۔ معاشرے کی تنگ نظری کا اسے فائدہ ہوا تھا۔ دونوں طرف کے حالات اور رویے اس کے حق میں گئے تھے۔ ورنہ یقیناً" وہ عاصم کے ساتھ منگنی ختم ہونے پر احتجاج کرتی یا اڑ ہی جاتی۔

پھر بہت جلد ہی اس کی شادی حماد سے کر دی گئی۔ حماد کو شادی سے پہلے ہی سحر کی ایک سال تک قائم رہنے والی منگنی کا علم ہو چکا تھا۔ چونکہ سعودیہ عرب رہ کر آیا تھا۔ اس لیے اپنے طور پر پوری تفتیش کروائی۔ اور اسے وہ باتیں بھی معلوم ہو گئیں جو شاید خود سحر کو بھی نہیں پتا تھیں۔

✲ ✲ ✲

اس نے کہیں سن رکھا تھا کہ شادی شدہ زندگی پہاڑوں پر دی جانے والی صدا کی طرح ہوتی ہے۔ انسان جو آواز پیدا کرتا ہے۔ پلٹ کر بھی ویسی ہی آتی ہے۔ سحر نے تو ہر ساعت محبت محبت پکارا تھا۔ جذبوں سے سرشار ہو کر پھر نجانے کیوں بدلے میں اسے طعنوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ اس ساری صورت حال میں اسے اپنا آپ مٹتا نظر آیا' جب کہ وہ تو محبت کے راستے میں پوجا کو سنگ میل کا درجہ دیا کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ رفت گزشت زندگی سے دوبارہ خود سے سانس لینے کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ اسے سب سنتا تھا اور چپ رہنا تھا۔ دوبارہ زندگی جینے کے لیے رسید بڑے ہائی پرائس مانگتی تھی۔ اس پیہم دکھ کی نئی کثافتوں سے وہ پہلی بار روشناس ہو رہی تھی۔

حماد کا مزاج چور بخار کی طرح تھا۔ جو خود ہی تپتا اور اسے بھی تپاتا۔ یقین احتجاج اور دلاسوں کے پسینے آنے پر بہہ نکلتا سحر سمجھتی سب ٹھیک ہو گیا' لیکن بخار اگلے دن چور راستے سے اس کے دماغ پر پھر آ جمتا۔ اس بخار کی حالت میں حماد نے سحر سے اس کا ذاتی موبائل بھی لے لیا تھا۔ اور اس سے پوچھے بنا اور اس کے بغیر گھر سے باہر نکلنے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ سحر نے کسی بھی بات پر کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔

"تیار ہو گئیں تم؟" حماد نے اندر آتے ہی اس سے پوچھا تھا۔

"جی بالکل۔" جوتی کے اسٹریپس بند کرتے ہوئے وہ بولی' حماد ایک ٹک اس کو دیکھنے لگا۔ اسٹریپس بند کر کے وہ کھڑی ہوئی۔ اپنا بیگ پکڑا اور چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ لیکن حماد وہیں اپنے پہلے کے انداز میں کھڑا رہا۔

"نیلا سوٹ۔" لہجے میں کچھ تھا۔ کسی ناکردہ گناہ کی سزا کے خیال سے ہی سحر کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"آپ کو اچھا نہیں لگا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا اندر ہی اندر جان گئی تھی کہ بات اچھا یا برا لگنے کی نہیں ہے' بلکہ نیلے رنگ میں پوشیدہ کسی راز میں ہے جو یقیناً" حماد نے پالیا تھا۔

"تمہیں نیلا رنگ پسند ہے؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔" اپنی دانست میں اس نے الٹ جواب دے کر ٹھیک کیا تھا لیکن حماد کا سارا غصہ اس کی آنکھوں سے ظاہر ہونے لگا۔

"پسند نہیں ہے تو پھر پہنا کیوں ہے؟"

"ویسے ہی۔" کٹہرے میں کھڑے مجرم جس پر الزام ثابت ہونے ہی والا ہو کی طرح وہ گویا ہوئی تھی۔

"تم نے اپنی منگنی پر بھی نیلا سوٹ ہی پہنا تھا ناں؟" مکمل اعتماد سے کہا گیا تو سحر کو اندازہ ہوا کہ پوچھا نہیں جا رہا بلکہ بتایا جا رہا ہے۔ بنا منہ دھوئے ہی

سحر کا سارا میک اپ ڈھل گیا۔ "تب جب تم عاصم کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ خوش خوش۔ ہے ناں۔ وہ نیلا سوٹ یقیناً" وہاں سے ہی آیا ہو گا۔ یادوں کے سہارے تمہیں جینے کا بہت شوق ہے نا سحر"

"ہمیں دیر ہو رہی ہے حماد۔" سب نظر انداز کر کے اس نے باہر نکل جانا چاہا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جب جا من پر چڑھا جاتا ہے تو بھوری چونٹیوں سے واسطہ پڑنا لازمی امر ہے۔ حماد نے غصے سے اس کا بازو تھام لیا۔

"مجھے بنا جواب دے تم اس طرح سے باہر نہیں جا سکتیں۔ سنا تم نے۔ یہ رویہ یہاں نہیں چلے گا۔" حماد کے ہاتھوں کی گرفت لحہ بہ لحہ اس کے بازو کے اندر گھسنے لگی۔

"حماد چھوڑیے مجھے" اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا تھا۔ جہاں پر حماد کی مضبوط گرفت کے باعث انگلیوں کے سرخ نشان ثبت ہو چکے تھے۔

"آپ کہتے ہیں تو میں ڈریس تبدیل کر لیتی ہوں" اندرونی گھٹن کے باعث اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔ اور اندرونی غصے نے چہرے کے خدوخال جگسا پزل کی طرح دائیں بائیں کر دیے۔ حماد کو ہر وقت شاید اس کی ایسی صورت ہی درکار تھی' جب وہ لڑائی کو اس نہج پر لے آتا تو اندر ہی اندر بڑا خوش ہوتا۔

"میرے کہنے یا نہ کہنے سے اب فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ تمہارے دل کو میں صرف کہہ کر تو اپنی طرف نہیں موڑ سکتا ناں۔"

"آپ مجھے بتائیے آپ کو کیا پسند ہے حماد۔ میں آپ کو خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔"

"پسند ناپسند بتائی نہیں جاتی سحر۔ یہ تو خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔"

"ہاں۔" بھرے طنز سے وہ بھی بولی۔ "ستائش کے ذریعے۔ افسوس کہ جو مجھے نہ مل سکی۔"

"تمہارے دل کے دروازے تو شروع ہی سے مجھ پر بند رہے ہیں۔"

"عورت کا دل جیتنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں حماد۔ میں تو پہلے دن ہی آپ کی ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں آپ میرے نہ ہو سکے۔"

"اب تو میں تمہیں برا ہی نظر آؤں گا۔ خامیاں نظر آئیں گی مجھ میں۔ کیوں کہ تم خود بٹی ہوئی ہو۔ صرف جسمانی طور پر یہاں موجود ہو جبکہ ذہنی طور پر کہیں اور بھی۔" بے اختیار سحر کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

یہ شخص نجانے کس زعم میں مبتلا ہو کر مجھ سے اتنی گھٹیا گھٹیا باتیں کرتا ہے۔ اگر یہ مجھ کو آنسو بہاتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ آج میں اس کو جی بھر کر خوش کر دیتی ہوں۔ بیڈ پر بیٹھ کر وہ نجانے کتنی دیر تک روتی رہی تھی۔ حماد نے اس کو چپ نہیں کروایا تھا' لیکن یہ بھی اس کا احسان تھا کہ بحث کو ختم کر کے وہ باہر چلا گیا تھا۔ روتے ہوئے ہی سحر نے اپنی امی کو فون کر کے کہا تھا کہ وہ آج نہیں آ سکتی۔ کسی اور دن آ جائے گی۔ امی نے پریشان ہو کر بار بار وجہ پوچھی تھی' وہ اصل صورت حال بتا نہ سکی اور طبیعت خرابی کا بہانہ کرتی رہی۔

ہفتے بھر پہلے بھی حماد نے ایسی ہی گھٹیا بات کہی تھی۔ بڑے تفصیل انداز میں اور سحر کے سارے جسم کو جیسے کسی نے بان کی طرح مروڑ دے دی تھی۔

حماد صوفے پر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ کچن میں کافی بناتی وہ اس کی گردن اور سر کی پشت کو دیکھ رہی تھی اور کتنی ہی دیر دیکھتی رہی تھی۔ ٹی وی پر دکھائے جانے والے فٹ بال میچ کی آواز تیز ہونے کے باوجود بھی اس کی سوچوں پر کوئی پہرہ نہیں بیٹھا۔ کچھ اتوار کی چھٹی کی رونق تھی۔ کچھ باہر کا سہانا موسم اور کچھ ابال آتی چائے کی اٹھتی بھاپ۔ سحر نے ٹھنڈے چہرے پر پڑتی گرم بھاپ کے باعث اپنے اندر بڑی نئی اور کثیر توانائی سی محسوس کی۔ اس توانائی نے ہی سحر سے بڑے بڑے مشکل فیصلے کروا ڈالے۔ زندگی جینے کے گر تو وہی دادیوں نانیوں والے تھے۔ لیکن ان تجربوں میں سحر نے اپنے حوصلے اور محبت کی نئی چاشنی انڈیلنے کی ٹھان لی حماد سے ہزاروں شکوے ہونے کے باوجود بھی آج

اسے اس پر بہت پیار آیا۔

بچپن میں اس کی ماں فوت ہو گئی اور پھر تھوڑے ہی عرصے کے بعد باپ بھی' ساری زندگی یہ شخص اپنے زور بازو پر اونچا مقام حاصل کرنے کی جدوجہد کرتا رہا ہے۔ اس صورت حال میں کسی بھی انسان کا چڑچڑا ہو جانا فطری بات ہے۔ لیکن میں سب ٹھیک کرلوں گی۔ اسے اتنی محبت دوں گی کہ یہ زندگی کی ساری تلخیاں بھول جائے گا۔ ارادے بچگانہ ضرور تھے۔ لیکن غیر حقیقی نہیں۔

"لے بھی آؤ چائے بھئی!" حماد نے وہیں بیٹھے بیٹھے صدا لگائی تو وہ خیالات اور عزائم کے گرداب سے باہر نکلی گرم چائے کا ایک کپ اس نے حماد کو پکڑایا تھا اور ایک خود پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس نے حماد کے کندھے پر اپنا سر رکھ لیا۔ حماد بھی ایک طرف کو ذرا جھک گیا' مگ میں آدھی بھری چائے ترچھی ہو کر گرنے لگی تو وہ ایک دم سے سیدھی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا؟" حماد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"وہ چائے گرنے..."

"جھوٹ مت بولو..." حماد نے بات کاٹی۔ "یوں کیوں نہیں کہتی کہ کسی اور کو تصور کر کے بیٹھی تھیں اور اب جب مجھے دیکھا تو..."

حماد نے جیسے تیزاب اس کے منہ پر اچھالا' بے یقینی اور ہارنے والے انداز سے وہ حماد کو دیکھنے لگی۔ اس سے آگے کے الفاظ وہ سن نہ پائی۔ بس اسے حماد کے ہونٹ ہلتے نظر آئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے کیے سارے عزائم اور پختہ ارادے خاک ہو گئے۔

"بولو... جواب دو..." کتنا کچھ کہہ چکنے کے بعد وہ اب اس سے جواب مانگ رہا تھا۔ اس بات کا جو سحر سرے سے جانتی ہی نہیں تھی۔

"اب کیا بولو گی تم..." اس کے پاس اس کی خاموشی کا بھی جواب تھا۔ "دراصل تمہیں گمان بھی نہیں تھا کہ میں تمہاری چوری اس طرح سے پکڑ لوں گا۔ تم ہو ہی چور عورت..."

"چور عورت!" کمرے میں پھر مکمل واقف لفظوں کی تھرتھراہٹ ہونے لگی۔

"اتنی سی بات کا اتنا بڑا بتنگڑ بنا رہے ہیں آپ!" گھٹی گھٹی سی آواز میں اس نے کہا تھا جیسے آواز کو حلق میں ہی کسی نے قابو کر رکھا ہو۔

"اتنی سی بات؟" وہ ہنسا تھا۔ مکمل اوپرے انداز سے' لیکن اندر سے اسے چڑانے کے لیے۔

"تمہارے لیے یہ اتنی سی بات ہو گی... کیونکہ تمہیں ایسی چوریاں کرنے کی عادت ہو گی' مگر میرے لیے یہ بہت بڑی بات ہے کہ میری بیوی میرے وجود سے کسی اور کا عکس دیکھ کر فیض یاب ہوتی رہے۔"

"کتنی گھٹیا سوچ ہے حماد آپ کی..." وہ چیخ ہی پڑی۔

"چلاؤ... چلاؤ... اور چلاؤ... گالیاں دو مجھے... اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے تم اور کر ہی کیا سکتی ہو۔"

"کون سا گناہ... کس گناہ کی بات کر رہے ہیں آپ... جو صرف اور صرف آپ کے ذہن کا فتور ہے۔" سحر نے چڑ کر کہا اور چلا کر بھی۔ حماد ہمیشہ کی طرح آگے سے مکمل تفصیل دینے لگا جو اس کے خیال میں ہمیشہ درست رہی تھی۔

"اپنے شوہر کی موجودگی میں کسی غیر محرم کو سوچنا یہ گناہ نہیں تو اور کیا ہے...؟" اس خفیہ کارروائی کے انکشاف سے سحر کا سارا وجود افسوس کی علامت بن گیا یاس میں مبتلا وہ "نال" کے انداز میں گردن ہلانے لگی۔ جیسے حماد کے وجود کی نفی کر رہی ہو۔ جیسے ہر چیز اس کے لیے ناکافی اور "کچھ بھی نہیں" ہو گئی ہو۔

"میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی حماد!"

"سمجھتا تو میں بھی تم کو ایسا نہیں تھا۔"

"میرے باپ کو پتا ہوتا کہ شک آپ کی فطرت میں اس قدر سرایت کر چکا ہے تو وہ میری شادی کبھی بھی آپ سے نہ کرتے۔"

"تمہارے باپ کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ ان کی بیٹی اپنے سابقہ منگیتر کو کبھی بھی بھول نہیں سکے گی تو وہ

کبھی بھی تمہاری منگنی نہ توڑتے۔"

"مجھے بتایئے۔" اس نے دوبدو جنگ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ طبل تو نجانے کب سے بج رہا تھا وہ ہی بچ رہی تھی۔ "مجھے بتایئے حماد میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میرا عاصم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"کس تعلق کی بات کررہی ہو... ذہنی... یا جسمانی؟" الفاظ کی کٹاری سی اس کے اندر اتر گئی۔ آنسوؤں کو اس نے آنکھوں سے چھلکنے نہ دیا۔ اب وہ اپنا آپ اتنا بھی کمزور ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔ پورا وجود ضبط کی علامت بن گیا۔

"کوئی بھی تعلق... کسی بھی قسم کا نہیں تھا... نہ میں کبھی اس سے ملی نہ فون پر بات کی..." ایک بار پھر پرانی وضاحتیں دی گئیں۔

"اور شاید اسی بات کا تو تمہیں ابھی تک دکھ ہے۔" بات سے بات بنانا وہ خوب جانتا تھا۔ اب مزید کوئی دلیل دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ناکام ہوگئی تھی۔ اس نے ایک نظر ٹھنڈی چائے کو دیکھا اور سیڑھیاں پھلانگ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ سیڑھیاں چڑھتے سے اسے حماد کی ہنسی کی آواز سنائی دی تھی۔ ایسی ہنسی جو کسی بڑی فتح کے بعد ہونٹوں سے نہیں بلکہ دل سے نکلتی ہے۔ کمرے میں آکر اس نے دروازہ بند کرلیا۔

"یہ شخص جو نہ سمجھنے کی قسم کھائے بیٹھا ہے اس کو سمجھانا اب بے کار ہے۔" کھڑکی میں کھڑے ہوتے وقت اس نے سوچا تھا۔

شادی کو چھ ماہ گزر چکے تھے' یہ رشتہ پہلے دن کی طرح پُرخار تھا' جس کے بارے میں امی نے کہا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ وہ امی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی' لیکن دل ہلکا کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی دوست بھی تو نہ تھی۔

"محبت میں جلن لازم ہے سحر!" وہ بڑی دیر تک امی کی باتیں سنتی رہی تھی۔ شوہر' مرد کی فطرت' شروعاتی زندگی اور عملی زندگی کے پہلے پہلے قدم پر بڑی مفصل گفتگو کی تھی انہوں نے۔ سحر کچھ نہیں بولی تھی۔

بونگ اور نہاری سے ناشتا کرنے والے خاندان کی "امی" کی ہمیشہ عجیب ہی منطق رہی تھی۔ نہ ان کی ہڈیوں میں کوئی دم خم رہا تھا اور نہ فلسفوں میں۔ تجربہ ہی تو بے تجربہ تھا۔ ورنہ اس کی عاصم سے منگنی ہوتی ہی کیوں۔ یہ بات جسے حماد نے کلنک کا ٹیکہ بنا دیا تھا اور جس کو اب وہ اپنے ہی جسم کا حصہ محسوس کرنے لگی تھی امی میں ذرا بھی شعور ہوتا تو یہ سب ہوتا ہی کیوں۔

"پرانی باتوں اور واقعات کی نام نہاد جلن تو کبھی ختم نہیں ہوگی امی!" اس نے امی کو اصل صورت حال سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ امی کے پاس ایسے موقعے کے لیے ہرماں کی طرح ایک آخری تیر ہی بچا تھا۔

"صبر سے کام لو... شروع شروع میں مرد اپنا روپ دکھاتے ہیں۔ اپنی انا کو ہر چیز پر فوقیت دیتے ہیں۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہوجاتا ہے۔"

بڑی مایوس کن حالت میں وہ گھر واپس آئی تھی اور اب وہ کھڑکی میں کھڑی سب ٹھیک ہوجانے کا انتظار کررہی تھی۔ باہر وقت بڑی سست روی سے گزر رہا تھا۔ چور شام سارے سایوں کو آہستہ آہستہ ہتھیانے لگی تھی' پرندوں کے ساتھ ساتھ درخت بھی خاموشی سے نیند کی آغوش میں جانے کی تیاری کرنے لگے تھے۔ بڑی دیر تک وہ وہیں کھڑی شام کو گہری رات میں بدلتے دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

پھر وقت گزرتا گیا بڑی بے اعتنائی سے اور اس نے سمجھوتا کرلیا حماد کے ساتھ اور اس کی فطرت کے ساتھ بھی۔ خود کو مضبوط کرتے کرتے اس نے حماد کو کھلی چھٹی دے دی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا رویہ اور ردِعمل معاملے کو مزید ہوا دیتے ہیں اب جب وہ چپ ہوجائے گی تو لاوا خود بخود ٹھنڈا ہونے لگے گا' لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ یہ معاملہ تو سیلابی ریلے کی مانند تھا' جو کبھی سمندر میں نہیں گرتا اور سب کچھ تہس

نہس کرتا چلا جاتا ہے۔ اب حماد کے منہ میں جو آتا بنا لحاظ کے باہر نکال دیتا۔ تین چار ایسی ہی چبھتی ہوئی باتیں روز کی تو سحر کا معمول بن گئیں۔ جن کو سن کر بھی وہ بے فکر ہی رہتی تھی۔ جیسے اس سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ کچھ اپنے جسم کے اندر ایک نئی روح کے انکشاف نے اس کو مطمئن اور مکمل کر دیا تھا۔ عورت کے وجود کے اندر جب ایک اور وجود کلبلاتا ہے تو وہ بہت پر اعتماد اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ اس لیے اب حماد کی باتوں پر جواب دینا اس نے چھوڑ دیا تھا۔ ہاں البتہ حماد جس چیز کو پوائنٹ آؤٹ کر کے لڑائی کی بنیاد بناتا تھا سحر حتی الامکان آگے اس چیز سے بچنے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ کبھی حماد کا موڈ خوشگوار ہوتا تو وہ اپنی محبت کا یقین دلانے سے بھی باز نہیں رہتی تھی۔

جوں جوں ڈلیوری کے دن قریب آتے جا رہے تھے گھر میں چیزوں کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا۔ حماد کی تینوں بہنوں نے پہلے سے ہی کتنی بہت سی چیزیں خرید کر بھجوا دی تھیں' خود حماد نے نجانے کیا کیا کچھ خرید لیا تھا۔ بے بی کا کمرہ وقت آنے سے پہلے ہی سیٹ ہو چکا تھا۔ وقتی طور پر ہی سہی سحر خوش تھی۔ حماد کے رویے کی ذرا سی بھی لچک اسے بہت امیدیں بندھوا دیتی تھی۔ شاید بچے کی پیدائش کے بعد حماد اپنے اندر کے شک سے باہر نکل آئے۔

سحر اب زیادہ وقت خیالوں اور خوابوں میں گزارنے لگی تھی۔ مستقبل کے حوالے سے اس کی بہت سی باتیں "شاید" اور "اگر" کے الفاظ سے شروع ہوتی تھی۔ امی نے اسے کہا تھا کہ ایسی حالت میں وہ ذرا سی بھی ٹینشن اپنے اعصاب پر سوار نہ کرے۔ وہ ہر وقت ریلیکس رہنے کی کوشش میں ہی اپنے اعصاب بھاری کر لیتی۔

"حماد اگر بیٹی ہوئی تو ہم اس کا نام صالحہ رکھیں گے۔۔۔ مجھے یہ نام بہت پسند ہے اور اگر بیٹا ہوا تو۔۔۔" وہ سوچنے لگی۔

"عاصم رکھ لینا۔۔۔" ٹی وی دیکھتے اسکرین پر سے نظریں ہٹائے بغیر حماد نے کہا تھا اور پھر اسے ایک دم خاموش پا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ مسکرا کر بھنویں اچکائی تھیں۔

"کچھ غلط کہا میں نے۔۔۔ کر دی ناں تمہارے دل کی بات؟" بیٹھے بیٹھے ہی سحر جیسے اسقاط کے مرحلے سے گزر گئی۔

"شاید عورت ذرہ ذرہ بکھری ہی رہتی ہے' یہ مجسم وجود تو محض نظر کا دھوکا ہے۔" لاچاری سے اٹھتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ حماد کی عادتوں کا عادی ہو جانے کے باوجود کبھی کبھی اسے لگتا کہ آنسوؤں کے سمندر میں وہ خود ہی ڈوب کر ہلاک ہو جائے گی۔ "پتا نہیں حماد آپ اتنے کینہ پرور کیوں ہیں یا شاید آپ زیادہ دیر مجھے خوش نہیں دیکھ سکتے۔" کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھتے اور آنسو بہاتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک ننھی سحر نے جنم لیا تھا جو بالکل سحر کی ہی کاربن کاپی تھی۔ سحر کے سارے ڈر' سارے خوف' سارے غم جیسے پلک جھپکتے میں کہیں غائب ہو گئے۔ ایک نئی دنیا کو جانے والا رستہ اسے مل ہی گیا تھا۔ خوشی سے نہال ہوتے ہوتے وہ سراپا محبت بن گئی۔

"میں اس کا نام مریم رکھوں گا۔" حماد نے اسپتال میں ہی کہا تھا۔ کسی نے آگے سے کچھ نہیں کہا تھا۔ نہ سحر کی امی نے نہ حماد کی تینوں بہنوں نے۔ سب نے جیسے معاملہ دونوں میاں بیوی کی ذاتی پسند پر چھوڑ دیا تھا۔

"لیکن مجھے صالحہ نام پسند ہے حماد! میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔" بیڈ پر لیٹے لیٹے وہ ہلکے احتجاج سے بولی۔

"نہیں بھئی۔۔۔ مجھے تو مریم نام ہی پسند ہے اور میں اس کا نام مریم ہی رکھوں گا۔"

"میری کزن کی بیٹی کا نام بھی مریم ہے اور پھر آپ کے خاندان میں بھی تو ایک دو مریم ہیں۔"

"ان سب کے اپنے خاندان ہیں اور ہمارا اپنا

خاندان بننے جارہا ہے۔"

"کافی اولڈ نام بھی ہے اگر کوئی نیا سوچ لیں تو...."

"وہاں سعودیہ میں تو جس کے گھر بھی بیٹی ہوتی ہے وہ فاطمہ' عائشہ' مریم نام رکھنا ہی پسند کرتا ہے۔ تینوں بہت دل پسند نام ہیں وہاں.... تم اولڈ کیسے کہہ رہی ہو اسے۔ خالص اسلامی نام ہیں۔ کبھی پرانے نہیں ہوں گے۔ ہر دور میں لوگ انہیں رکھنا پسند کریں گے۔"

"ہاں سحر بیٹی.... حماد ٹھیک کہتا ہے۔" سحر کی امی نے کہا تھا۔ "ویسے بھی ناموں میں کیا رکھا ہے' ماں پر تو بچوں کی تربیت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے' جواب تمہیں بہت خوب صورت اور احسن طریقے سے نبھانی ہے۔"

امی نے بالکل ٹھیک بات کی تھی وہ جلد ہی سمجھ گئی۔ کچھ حماد کی حد سے زیادہ خوشی نے بھی اسے اپنی منوانے پر نہ اکسایا تھا۔ بیٹی کو اپنی گود میں اٹھا کر وہ خوش تھا۔ بہت زیادہ۔ سحر شاید کسی حد تک کامیاب ہو چکی تھی جسے آنے والے وقت نے بھی ثابت کر دیا۔

حماد کا رویہ مکمل نہ سہی تو پہلے سے بہت زیادہ بدل گیا تھا یہ تبدیلی برقی رو کی طرح بڑے متواتر انداز سے چل رہی تھی۔ جب ایک دن گرڈ اسٹیشن اڑنے کا سا دھماکا ہوا۔

☼ ☼ ☼

شادی ہال میں زیادہ رش نہیں تھا۔ تقریب شروع ہونے میں کافی وقت تھا۔ ابھی لوگ آنا شروع ہی ہوئے تھے۔ حماد ہال میں مردوں کے لیے مختص حصے میں چلا گیا اور وہ عورتوں والی سائیڈ پر آگئی۔

اپنی شادی کے بعد وہ پہلی بار حماد کے خاندان کی کسی شادی میں شرکت کر رہی تھی۔ کچھ تو ایس ڈیڑھ سال کے عرصے میں شادیاں ہی زیادہ نہ ہوئی تھیں اور جو ایک آدھ ہوئی بھی تو ان میں صرف حماد کی بہنیں ہی شرکت کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ حماد کے خاندان کے لوگوں سے زیادہ مانوس بھی نہیں تھی۔

پتا نہیں یہ شادی کتنی ضروری تھی جس میں حماد خود تو آیا ہی ساتھ اسے بھی چلنے پر اصرار کیا۔ سحر کے لیے اچھے کپڑے لایا۔ مریم کے لیے بھی اور پھر بڑے اصرار سے سحر کو پارلر سے تیار ہونے کے لیے بھی کہا' حماد کے اکثر ایسے بدلے بدلے رویے دیکھ کر سحر کو خوشی کے ساتھ ساتھ تشویش بھی ہوتی تھی۔

سحر نے اتنی تیاری اور ایکسائٹمنٹ کی وجہ پوچھی تو بس یہ کہتا رہا کہ۔

"شادی کے بعد پہلی بار جا رہی ہو میرے خاندان میں.... لوگ میری بیوی کا پوچھیں گے اس لیے تمہیں آج بہت خوب صورت لگنا چاہیے۔"

ویسے تو شادی کے بعد کی روٹین اور مریم کی پیدائش نے اس کے حسن میں کوئی خاص فرق نہ ڈالا تھا' پھر بھی آج جب وہ پارلر میں تیار ہوئی تو خود کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بڑے عرصے بعد وہ دوبارہ خود پسندی کا شکار ہوئی تھی۔

اس نے ارد گرد دیکھا۔ آدھی سے زیادہ خالی کرسیوں پر اسے کہیں اپنی تینوں نندیں نظر نہ آئیں جس کا مطلب صاف تھا کہ ابھی تک وہ یہاں پہنچی ہی نہیں۔ سحر مریم کو سنبھالتی ایک خاموش پر سکون کونے میں جا بیٹھی۔ جو زیادہ دیر پر سکون نہ رہ سکا۔ لوگ رفتہ رفتہ زیادہ ہونے لگے تھے۔ سحر کی سامنے والی رو میں بھی چار شوخ و چنچل لڑکیاں بیٹھ گئیں جنہیں دیکھ کر اسے اپنی بے فکری سے اٹینڈ کی ہوئی بہت سی شادیاں یاد آگئیں۔ چاروں کی آوازوں میں دولت کا سکون اور خود اعتمادی تھی۔

"سنو.... وہ بھی آیا ہوا ہے۔" راز فاش کرنے کے سے انداز میں چاروں لڑکیوں میں سے کسی ایک نے کہا۔ "میں نے دیکھا ہے ابھی اسے۔"

"کون....؟" ایک لمبے اور خوب صورت بالوں والی لڑکی نے اپنے بال سمیٹ کر دوبارہ بکھیرتے ہوئے پوچھا۔

"حماد.... اور کون.... وہاں بیٹھا ہے.... مردوں والے حصے میں۔"

"حماد....؟"

"حماد...؟" لمبے بالوں والی اور سحر دونوں نے کہا۔
لمبے بالوں والی نے بلند آواز سے اور سحر نے صرف دل میں۔۔۔

"امی بتا رہی تھیں کہ بڑی پیاری بیوی ہے اس کی۔"

"ہوگی۔" اک ادائے بے نیازی سے کہا گیا۔

"ویسے بڑے عرصے بعد آیا ہے کسی تقریب میں' مجھے تو لگا شاید میرے ساتھ ساتھ پورے خاندان سے ناتا توڑ لیا ہے۔"

"شاید تیرا سامنا کرنے سے ہچکچاتا ہو۔"

"وہ کیوں بھلا؟" لہجے سے غرور سا ٹپکا۔

"مرد ٹھکرایا جائے تو اس کی انا کو بڑی ٹھیس لگتی ہے۔"

"میں نے ٹھکرایا نہیں... صرف اپنے اختیارات کا استعمال کیا۔ مجھے وہ ناپسند تھا' میں نے شادی سے انکار کر دیا۔ لیکن وہ سمجھا ہی نہیں۔ ہر دو مہینے بعد اپنی بہنوں میں سے کسی ایک کو بھیج دیتا تھا۔ آخر کار مجھے سخت رویہ اپنانا پڑا۔"

"کیا اتنا ناپسند تھا تجھے وہ...؟"

"میں نے لوگوں کے ظاہری حلیے کو تو کبھی اہمیت نہیں دی' لیکن بعض اوقات ان ساری باتوں کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو اس کا قد مجھ سے بھی چھوٹا تھا۔ اس کے ساتھ چلنے کے لیے مجھے ہیل تو کیا چھوڑنی پڑتی۔ پاؤں بھی کٹوانے پڑتے۔"

ساری لڑکیاں دل کھول کر ہنسنے لگیں۔

"اوپر سے اللہ معاف کرے رنگ بھی سانولے سے زیادہ گہرا ہے مانا کہ مجھے چاکلیٹ کلر کی لپ اسٹک پسند ہیں' لیکن اتنی بھی نہیں کہ ایک لپ اسٹک کو ساتھ ساتھ لیے پھروں۔" آخر میں لڑکی خود بھی ہنسی تو سب کے قہقہے مزید تیز ہو گئے۔ جنہیں تھمنے میں پھر کافی وقت لگا۔

"سنا ہے بیٹی کا نام بھی اس نے تیرے نام پر ہی رکھ لیا ہے... مریم۔"

"ہاں۔" لمبے بالوں والی مریم نامی لڑکی نے کہا۔

"مریم؟" ہال کی چھت سحر کے سر پر آگری اور پاؤں تلے خلا آگیا۔ وہ کرسی پر بیٹھی نہ ہوتی تو یقیناً" بری طرح چکرا کر گرتی۔ سحر کو سب سمجھنے میں پھر ایک منٹ بھی نہیں لگا۔

"لیکن مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔" مریم بولی۔ "میری تو خود چھ ماہ بعد شادی ہے اور اپنے بیٹے کا تو کیا۔ کوئی نوکر بھی حماد نام کا ہوا تو گھر میں گھسنے نہ دوں گی۔" وہی غرور بھرا لہجہ... سب ہنسنے لگیں۔ سحر کا مزید وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔

انجان قہقہوں اور اشاروں کو اس نے خود پر اٹھتا محسوس کیا۔

"چور عورت... چور عورت... چور عورت۔" تیز تیز قدم اٹھاتی وہ وہاں سے نکلی۔

"کہاں جا رہی ہو سحر...؟" حماد کہیں سے اچانک اس کے سامنے آگیا تھا۔ اس کا چہرہ تو اس کی طرف تھا' لیکن نظریں کہیں اور ہی بھٹک رہی تھیں۔ ایک درد بھری کیفیت میں ہونے کے باوجود بھی وہ حماد کی نظروں کا تعاقب جان گئی۔

"وہ وہاں ہے..." سحر نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔

"کون...؟" حماد کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

"مریم!" سحر نے کہا تو حماد کے چہرے پر کئی رنگ آکر ٹھہر گئے۔ سحر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں تک آگئی۔

"اگر میں کچھ نہ کرنے کے باوجود بھی ایک چور عورت ہوں تو آپ... آپ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد پھر کیا ہیں حماد...؟"

سوچتے ہوئے وہ حماد کو وہیں کھڑا چھوڑ کر باہر آگئی تھی۔

کسی مضافاتی علاقے میں نہر کے قریب کسی بستی سے دور وہ لکڑی کی چھت والا ایک اکیلا گھر تھا اور خاصی اوپری سطح پر تھا کہ پکی سڑک پر سے گزرنے والے کی نگاہ سیدھی اس پہاڑ کی چھوٹی سی چوٹی پر پڑتی تھی۔ جب بھی سیلاب آتا'اس گھر کی بنیادوں کو چھو کر بھی نہیں گزرتا تھا۔ نہر میں ارتعاش ضرور آتا اور پانی چوٹی سے ٹکراتا بھی تھا مگر تنگ نہ پاتا۔

بے ترتیب پتھروں کے درمیان پچھلی طرف کے بڑے سے پتھر کو کاٹ کر سیڑھی بنائی گئی تھی' جو اوپر والے کو نیچے اور نیچے والے کو اوپر تک جانے میں مدد دیتی تھی۔ اس سیڑھی کے اطراف میں بہت سے چھوٹے پتھر' کنکریاں بچھی ہوئی تھیں' سیڑھی کے نیچے زمین کچھ ہموار تھی۔

جہاں سے راہ گیر لڑکھڑاتے ہوئے پتھروں کو پھلانگ کر پکی سڑک تک جاتا تھا۔ اور پکی سڑک پر جب چھوٹی سی جیپ گزرتی تھی تو ابوذر کھڑکی سے سر نکال کر اس چھوٹی سی چوٹی پر بنائی گئی اپنی جنت کو دیکھتا تھا' جہاں پر اک کم عمر' خوب صورت حور اس کا

ریلنگ پر جھک کر انتظار کرتی تھی یا بے قراری سے ٹہلتی تھی۔

اس نے اب بھی ایسا ہی کیا تھا۔ مگر جنت کی حور اپنی مخصوص جگہ پر نہیں تھی۔ گاڑی پکی سڑک سے نیچے اُترنے کو تیار نہ تھی۔ ڈرائیور نے ابوذر کو یہیں اُتر جانے کا کہہ دیا۔ یہ جیپ اس کے ساتھی دوست کی تھی۔ وہ جب بھی گھر آتا' اس کی گاڑی لے آتا تھا۔ کبھی کبھار تو گاڑی کچھ دنوں کے لیے رکھ لیتا اور تب اس کی رانی اسے طعنے دیتی "ابوذر ایک چھوٹی سی جیپ بھی نہیں لے سکتے تم۔"

چونکہ پتھریلے اور ریتلے راستوں کے لیے جیپ کی سواری ہی بہترین تھی۔ علاوہ ازیں سواریاں زیادہ آگے جانے پر بری طرح متاثر ہو جاتی تھیں۔

وہ اپنی رانی کی بات بے تاثر چہرے سے سنتا یا پھر ایک قہقہہ لگاتا۔ وہ اسے گھورتی یا پھر مسکراہٹ دبا کر اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ وہ اس کے تصور میں جیپ سے

اُترا۔ تھیلا کندھے پر لٹکایا اور پکی سڑک سے پتھریلی سڑک پر آگیا۔ جہاں سے پتھروں سے بچ کر نکلنا دشوار تھا۔

اس کی مضبوط لیدر کی چپلوں میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں ہمیشہ کی طرح چبھ گئیں۔ جن کی چبھن پاؤں تک محسوس ہو رہی تھی۔

وہ بڑے پتھروں سے بچتا بچاتا سیڑھی چڑھتے اوپر آیا جہاں چھوٹے سے مکان کے اوپر رکھی لکڑی کی چھت کچھ آگے تک نکلی ہوئی دھوپ سے بچا رہی تھی اور اسی کے نیچے مٹی کے گملے سجے ہوئے تھے' جن میں سارے پھول ابوذر کی پسند کے لگائے ہوئے تھے۔

بعض اوقات عائشہ اس کی رانی ان پھولوں کا گلدستہ بنا کر اسے پیش کرتے ہوئے خوش آمدید کہتی' ابھی اسے سامنے نہ پا کر وہ جھک کر سارے گملوں سے پھول توڑنے لگا اور پورا گلدستہ بنایا اور ہاتھ میں لیے ان کی خوشبو دل میں اُتارتا آگے بڑھا۔ وہ ریلنگ کے سہارے چل کر لاؤنج میں آیا وہ خالی تھا۔

آگے دو کمرے تھے اور کونے پر ایک جگہ میز رکھ کر دو کیبنٹ بنا کر کچن کا نام دیا گیا تھا۔

ابوذر نے اسے لکڑی کا ایک اسٹینڈ بھی بنا دیا تھا۔ جس پر گنتی کے چار' چھ برتن رکھے ہوئے تھے۔ چولہے پر ہنڈیا چڑھی تھی۔ تازہ سالن اتار اگیا تھا۔

اس کی پسند کا ساگ اور مچھلی کی خوشبو سارے میں پھیل رہی تھی۔ پرات ہٹا کر دیکھا تو چاول کے آٹے کے پیڑے بنائے گئے تھے۔ تازہ روٹی ڈالنے کے لیے۔

وہ اس کی آمد سے لاتعلق نہ تھی۔ ابوذر نے جو ایک ہفتہ پہلے اسے فون پر کہا تھا کہ وہ اگلے ہفتے آئے گا۔ اتوار یا پیر کو اور آج منگل تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اتوار سے یہ اہتمام کرتی آئی ہوگی۔

اور شاید یہ دیر سے آنے پر ناراضی کا اظہار ہے کہ آج نہ وہ ریلنگ پر جھکی ہاتھ ہلاتی ہوئی نظر آئی' نہ پھولوں کے گملے کے پاس' نہ ہی لاؤنج میں کچن میں سالن بھونتی ہوئی ملی' وہ کمرے میں ہی تھی۔

ابوذر بغیر اسے آواز دیے ــــ آہستگی سے قدم اٹھاتا اندر آیا' جس طرف عائشہ کی پشت تھی۔ اس نے بیگ اتار کر رکھا اور پیچھے سے عائشہ کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھے۔

"بتاؤ تو کون آیا ہے۔" یہ شرارتی انداز عموماً" عائشہ کا ہوتا تھا اور وہ اسے منانے کے لیے اسی کے حربے استعمال کر رہا تھا۔

عائشہ نے بے دردی سے ہاتھ ہٹائے اور اس نے پھولوں کا گلدستہ آگے کر دیا اس کے' جو لے کر اس نے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کا موڈ بہت خراب تھا۔

"یہ ناراضی کا اظہار ہے۔" وہ اس کے آگے آ کھڑا ہوا۔

"آج کون سا دن ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

"میں تاریخ نہیں دیکھتا۔ میرے کیمپ میں کیلنڈر ہی نہیں ہوتا۔" اس نے کندھے اُچکائے بڑے مزے

سے' یہ تو سچ تھا کہ کیمپ میں کیلنڈر نہیں لگایا گیا تھا۔ وہ پرائیویٹ گیس کمپنی میں کام کرتا تھا۔ جہاں اسے پہاڑی علاقے میں یا پھر کئی جگہوں پر عارضی کیمپ میں رہنا پڑتا تھا۔ کیمپ کے اندر ہر سہولت تھی۔ یہاں تک کہ ٹی وی بھی رکھا گیا تھا۔ جو صرف اینٹینا کے ذریعے سرکاری چینل ہی دکھاتا تھا۔

اتنی سہولیات کے باوجود کیلنڈر لگانے کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ ٹی وی چینلز' موبائل فون ۔ ہر جگہ کیلنڈر کا اندراج نصب تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ تاریخ بھی بتا دیتا تھا۔

عائشہ کے ذہن میں نہ آیا کہ جیب میں پڑا اسیل فون اٹھا کر اسے تاریخ دکھا دے۔ وہ صرف اسے خفگی سے گھورتی رہی۔

"میرا کیا قصور ہے کہ پچھلے تین دن سے میں مچھلی اور ساگ پر گزارا کر رہی ہوں۔" اس کی شکایت بجا تھی۔

"تم اپنے لیے کچھ اور بنا لیا کرو۔" وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ حالانکہ اسے اچھی طرح پتا تھا وہ ایک وقت میں کئی چیزیں نہیں بنائے گی۔ اسے یہ سب وقت' پیسے اور چیز کا ضیاع لگتا ہے۔

وقت تو ہاتھ سے کھسک جاتا ہے' مگر وہ چیزوں کو اور پیسے کو بچا کر رکھتی تھی۔ اس کی یہ عادت بہت اچھی تھی۔ جس نے ابوذر کو فائدے میں ڈالا ہوا تھا۔

"اچھا کھانا لاؤ' بہت بھوک لگی ہے۔" وہ ہاتھ دھونے کے لیے اٹھا اور کمرے سے ملحق باتھ روم کا رخ کیا۔

وہ کھانا لینے کچن میں پہنچی اور گرم گرم روٹی ڈالنے لگی۔ ابوذر کو تازہ روٹی پسند تھی۔ ساتھ ہی اسے اس بچی کا خیال آیا جو پچھلے کئی دنوں سے بخار میں تپ رہی تھی اور کھانے کے نام پر اب تک صرف چند نوالے لیے تھے۔

وہ کھانے کی ٹرے لیے اپنے کمرے میں آئی' جہاں ابوذر فریش ہو کر بیٹھا تھا۔ کھانے کے انتظار میں پانی پر گزارا کر رہا تھا۔ پہلے پانی پی لیتا پھر آدھی روٹی کھا کر آدھی بچا کر ضائع کرتا۔ اسے ابوذر کی یہ عادت سخت ناپسند تھی کہ وہ کھانے سے پہلے پانی بہت پیتا تھا۔

اس نے بغیر کچھ کہے کھانے کی ٹرے قریب کی اور نوالہ لیتے ہوئے اسے خیال آیا۔

"وہ کہاں ہے؟" اس کا اشارہ بچی کی طرف تھا۔

"اس نے کھانا کھایا۔" یہ دوسرا سوال تھا جس پر عائشہ کا موڈ مزید خراب ہوا تھا۔

"یہ پوچھا کہ میں نے کھانا کھایا یا نہیں' تم پہلے اس کا پوچھ رہے ہو۔" ناراضی بجا تھی۔

"اس لیے کہ وہ چھوٹی سی بچی ہے۔" نوالہ ابھی ہاتھ میں ہی تھا۔

"دے دوں گی اسے' تم کھالو پہلے۔" لہجہ روکھا سا تھا۔

"پہلے اسے دے دو۔۔۔ میں بعد میں کھالوں گا۔" نوالہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"نہیں کھاتی تمہاری لاڈلی یہ مچھلی اور ساگ۔ کہتی ہے بو آتی ہے۔ سخت ناپسند ہے۔ اب میں کہاں سے لاؤں اس کے لیے الگ سے کھانا۔"

"وہ بچی ہے' اس کے لیے کچھ بنا دیا کرو عاشی!"

نوالہ حلق میں اُترنے کے لیے ترس رہا تھا اور وہ اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

"جب میں اپنے لیے نہیں بناتی تو اس کے لیے کیوں بناؤں۔"

"بہت بری بات ہے عاشی! کہاں ہے وہ ابھی۔" وہ اٹھا اور بیگ میں سے ایک ڈبا نکالا۔ جس میں چاکلیٹ اور بسکٹ کے ساتھ کچھ اور چیزیں تھیں۔ ڈبا لیے ساتھ والے چھوٹے سے کمرے کی طرف آیا جہاں پر غیر ضروری اور ضروری سامان بھرا تھا۔ کونے میں ایک بستر بچھا تھا جس پر وہ سر نیہوڑائے بیٹھی تھی۔

"کہاں رکھا ہوا ہے تم نے اسے۔ اپنے ساتھ سلانے میں کیا حرج تھا۔" پیچھے سے آتی عائشہ کو اس نے خفگی سے کہا تھا۔

"بیٹا! کیا حال ہے۔" وہ گھٹنے ٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سر اٹھایا تو رنگت سرخ تھی اور آنکھیں جیسے دہکتا ہوا انگارہ۔ ابوذر نے ہاتھ بڑھا کر پیشانی چھوئی تو چیخ اٹھا۔

"اتنا تیز بخار...... بتایا بھی نہیں تم نے مجھے۔" اس کا غصہ عائشہ پر تھا جو ابھی تک غصہ دبا رہی تھی اپنا۔

"اٹھو بیٹا...... جلدی اٹھو۔" اس نے بچی کو ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ جو فوراً بدک کر پیچھے ہوئی کرنٹ کھا کر۔ "مجھے نہیں جانا کہیں، مجھے اپنے گھر جانا ہے۔"

"میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔ اگر تم میری بات مانو گی۔"

"نہیں مانوں گی۔" سہمے ہوئے لہجے میں کیا نہیں تھا۔ ابوذر کو ٹوٹ کر پیار آگیا۔ اس نے بچی کا سر چوم لیا۔

"پہلے ہم کھانا کھائیں گے، پھر ہم ڈاکٹر کے پاس جائیں گے، پھر میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔"

"پہلے مجھے گھر چھوڑ دیں۔" ملتجی انداز معصوم چہرہ وہ مسکرایا۔

"پہلے کھانا۔"

"کھانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔" برا سا منہ بنایا۔

"تو پھر بسکٹ کھالو یا چاکلیٹ۔ دیکھو اس میں کتنی چیزیں ہیں۔"

پیکٹ کھول کر دکھایا، رنگ برنگے ریپرز میں چھپی جیلی، چاکلیٹ، ٹافیاں، بسکٹ اس کے سامنے تھے۔ عائشہ خاموش تماشائی سی کھڑی تھی۔ اس سے پہلے وہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لایا کرتا تھا۔ اس بار بھول گیا یا ضروری نہ سمجھا۔ "نہیں، مجھے گھر جانا ہے۔" چہرہ اترا ہوا افسردہ سا تھا۔

"چلو، ہم پہلے ڈاکٹر کے پاس چلیں پھر گھر جائیں گے۔" اس کی شکل روتی سی بن گئی۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا اور ملایا۔

"ہاں اختر کہاں ہو۔ ابھی اسی ایریا میں ہو نا۔ یار! یہیں رکنا، بلکہ کچھ آگے تک آؤ، بہت ضروری کام ہے۔ بچی بہت بیمار ہے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔ ہاں میری بچی۔"

عائشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

ابوذر نے چیزیں سمیٹ کر کچھ اپنی جیبوں میں بھری اور اسے اٹھا لیا۔

"میں خود چل سکتی ہوں۔" اس نے اعتراض کیا۔

"نیچے جاکر اتر جانا۔ یہاں سے رستہ مشکل ہے۔" وہ فون جیب میں ڈالے اسے کندھے پر اٹھائے تیزی سے باہر آیا۔

"مجھے واپسی میں دیر ہو سکتی ہے، کھانا کھا لینا۔ دیر ہو جائے تو سو جانا، میں آجاؤں گا۔" وہ عائشہ سے کہتے ہوئے نیچے کی طرف آیا۔ پاؤں سیڑھی پر رکھ دیے۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ آپ مجھے گرا دیں گے۔" وہ چیخی۔

"نہیں گرو گی۔ چپ رہو۔" اس نے تیزی سے اترتے ہوئے ڈانٹا۔ اس نے اپنی چیخ دباتے ہوئے زور سے آنکھیں بند کرلیں۔

وہ نیچے اتر کر پکی سڑک کی طرف جا رہا تھا، جہاں سے دور سے آتی ہوئی جیپ دکھائی دے رہی تھی۔ عائشہ ریلنگ کے پاس کھڑی عجیب سے انداز میں ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ کھانا دیر تک ایسے ہی پڑا رہا اور وہ نوالہ

بھی۔

☼ ☼ ☼

شام پھیل رہی تھی۔ موسم میں سردی کی شدت بھی کچھ بڑھی تھی۔ سردی کی شدت سے اس کا چہرہ پورا سرخ تھا اور ناک تو جیسے لال ہو گئی تھی۔ فلو کا اثر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

اسے پتا تھا' اب طبیعت بگڑنے لگی ہے۔ اب بگڑے گی تو سنبھلنے کا نام نہ لے گی۔ اس کا السر پک کر لاوا بن گیا تھا۔ اندر گرمی کی شدید لہر تھی اور باہر مجسم تھر تھراتا تھا' مگر وہ ہر کیفیت سے لاپروا' بے زار اور بے چین گھر کی طرف لوٹ رہی تھی۔ اسے فکر تھی' بچے اکیلے اور ——— پریشان ہوں گے۔ دوسری طرف اسے زینی کی فکر کھا رہی تھی۔ چہرے پر سوچ کے آثار تھے۔ وہ تھکے قدموں سے تھیلا ہاتھ میں لیے گھر آئی۔

یہ قدرے ویران علاقہ تھا۔ چھوٹی سی بستی تھی اور چند گھروں کے بیچ فاصلہ بہت زیادہ۔ بیچ میں کئی پلاٹ خالی تھے اور کچھ زیر تعمیر' ایک دم اجنبی ماحول۔ نہ کوئی جاننے والا' نہ پوچھنے والا۔ ایسے میں بچوں کو اکیلا چھوڑنا بہت مشکل تھا۔

مگر زینی کی جدائی نے اسے ——— ختم کر دیا تھا۔ جیسے ایک بے چین تلاش تھی۔ وہ ہر روز اس جگہ جاتی۔ ٹھہرتی' بیٹھتی' انتظار کرتی' پھر آجاتی۔

پاگلوں کی سی کیفیت ہو گئی تھی' بچوں کی الگ شکایت ہوتی کہ چھوڑ کر چلی جاتی ہیں' فاطمہ روتی اور شانی خاموش آنسو بہاتا رہتا۔

وہ ماں تھی۔ کلیجہ پھٹنے لگتا۔ کھانا پینا تو ویسے ہی حرام ہو گیا تھا۔ بچوں کا سوچ کر قدم اور تیز ہو گئے تھے۔ گاڑی گھر سے کافی دور رکوائی تھی۔

وہ ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دے کر آگے بڑھی۔ فاطمہ اور شانی کب سے کھڑکی سے لگے کھڑے تھے' انہیں انتظار کرتے ہوئے بھی ڈھائی' تین گھنٹے ہو گئے تھے۔

آگے روشنی کم تھی۔ پتھر بچھے ہوئے تھے۔ رستے میں وہ بچتی بچاتی دروازے تک آئی۔ لکڑی کا دروازہ خود بخود کھل جاتا تھا۔ ایک دھکے سے ہی۔ اسے صحن میں دیکھ کر شانی دروازے سے باہر نکلا' پیچھے فاطمہ بھی تھی۔

"کہاں تھیں آپ؟ اتنی دیر ہو گئی۔ کیوں ہمیں چھوڑ جاتی ہیں۔" فاطمہ لپٹ کر رونے لگی اور شانی کے چہرے پر شکایت لکھی تھی۔

"اندر چلو۔" وہ آنسو پیتی ان کو ساتھ لپٹائے اندر آئی۔

"میرے بچے تو بہت بہادر ہیں نا۔" اس نے شانی کی پشت تھپکی' گال پر پیار کیا ——— فاطمہ تو اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اندر آکر اس نے بچوں کو الگ کیا۔ تھیلا کھولا' راشن بکھر گیا۔

چھوٹے چھوٹے ساشے' پیکٹ' صابن' شیمپو' پتی' چینی' آٹا' چاول وغیرہ زینی کو میکرونی اچھے لگتے تھے۔ فاطمہ ہاتھ میں پیکٹ لے کر بیٹھ گئی۔

"اب کیوں لائی ہیں امی! جب زینی نے ضد کی تھی' تب تو نہیں لائی تھیں۔" فاطمہ کا موڈ بہت خراب تھا۔

"زینی جب آئے گی' تب ہم یہ بنائیں گے یہ رکھ لو فاطمہ۔" شانی نے پیکٹ لے لیا۔ اس کا لہجہ عجیب سا تھا دکھ بھرا۔ یقین اور بے یقینی کے درمیان ٹھہرا۔

"تم یہ کھا لو۔ زینی آئے گی تو ہم بہت سارے میکرونی لائیں گے۔ ہم آئس کریم بھی روز کھایا کریں گے۔ ہم روز آؤٹنگ کے لیے جائیں گے۔ میں بالکل بچت نہیں کروں گی۔ (بچت بہہ جاتی ہے)" اس کی مسکراہٹ جھوٹی تھی' مصنوعی تھی' مگر لہجے میں امید تھی۔

"چاہے جتنی سردیاں ہوں ... ہم آئس کریم کھائیں گے؟" فاطمہ بھی دل کو بہلانے کا کام کرتی تھی۔

"چاہے سردی ہو۔" وہ مسکرائی' پھر وہی مسکراہٹ۔

"زینی مل جائے گی نا امی؟" شانی بھی جب سوچ سوچ

کر تھک جاتا تو بولنے لگتا۔
"کل — تم لوگ پھر سے اسکول جاؤ گے۔ بہت ہو گئیں چھٹیاں۔"
"زینی کے بغیر کون اسکول جائے گا امی!" فاطمہ کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔
"ہم اسکول جائیں گے فاطمہ....!" شانی کا بڑا پن عود کر آیا تھا۔ "زینی بہت جلد مل جائے گی۔ وہ بہت ذہین ہے' اسے بہت ساری چیزوں کا پتا ہے۔ وہ پہنچ جائے گی کسی طرح۔" نہ جانے وہ کسے بہلا رہی تھی۔
"کیسے پہنچے گی۔ وہ بہت چھوٹی ہے امی۔ اسے رستوں کا نہیں پتا' پھر نئے گھر کا اسے کیسے پتا لگے گا۔ ہمارے پاس فون نہیں' نہ پرانا نمبر' وہ کیسے رابطہ کرے گی ہم سے۔" فاطمہ کی آواز رندھ گئی۔ وہ پھر سے رونے لگی تھی شاید۔
اس نے گیلی آنکھوں سے فاطمہ کا چہرہ دھندلایا ہوا دیکھا تھا۔ دل جو ڈوبا ہوا تھا۔ رُک سا گیا۔
"ہم سب کے بغیر رہ سکتے ہیں۔ مگر اس کے بغیر نہیں۔ ہم بابا کے بغیر بھی رہ سکتے ہیں۔" شانی بولتے بولتے رک گیا۔
"بابا کو زینی کا بتائیں۔ وہ ہماری مدد کریں گے۔ وہ زینی سے تو محبت کرتے ہیں نا امی۔" فاطمہ کو جیسے کوئی جلتی بجھتی امید کی بتی ہاتھ لگی تھی۔
وہ چپ ہو گئی' فاطمہ کے چہرے پر امید کا سایہ دیکھ کر کچھ نہ بول سکی۔
"وہ ہمارا فون نہیں اٹھاتے۔ ان کو نمبر بدلنے کی عادت ہے۔"
"ہو سکتا ہے نمبر بدل لیا ہو۔ اگر نہ بھی بدلا ہو تو ان کی بیوی فون اٹھاتی ہو اور وہ رانگ نمبر کہہ کر فون رکھ دیتی ہو......"
شانی کی شکایتیں بھی ٹھیک' خدشے بھی درست۔ فاطمہ کی امید کی بتی بجھنے لگی جیسے۔
"سارا آنٹی اور انکل سفیر آنے والے ہوں گے آج یا کل میں پہنچ جائیں گے۔ وہ لوگ ہماری مدد کریں گے۔"

"اور ہمیں زینی ضرور مل جائے گی۔ ان شاء اللہ کہو فاطمہ۔" شانی نے امید کی بتی کی لو بڑھا دی۔ ان شاء اللہ کہہ اور کہلوا کر۔
وہ دونوں سامان کے تھیلے اٹھا اٹھا کر کچن کی طرف لے جا رہے تھے اور کیبنٹ میں سیٹ کر رہے تھے۔ وہ ان کی ماں تھی جو انہیں دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ وہی جگہ تھی اس کا گھر' اس کا اجڑا ہوا گھر جو ڈھے گیا تھا۔ اسے اب بھی وہ خوف ناک شب یاد آ آ کر ڈراتی تھی جب اس کی انگلی اس سے بچھڑی تھی۔ جب اسے غلطی سے کسی اور کشتی میں ڈال دیا گیا تھا اور وہ کہیں کی کہیں پہنچ گئی تھی۔
ایک ماہ سیلاب زدگان کے کیمپ میں رہ کر اس کا برا حال ہو گیا تھا۔
تب ہی اسے ابوذر جیسا فرشتہ ملا تھا جو اٹھا کر اس بچی کو اپنے پہاڑی ایریا والے گھر لے آیا تھا۔ اسے ابوذر کے گھر میں لگ بھگ دو ماہ ہو گئے تھے۔
ابوذر پندرہ دن گھر سے باہر ڈیوٹی پر ہوتا' پھر کچھ دن آتا اور چلا جاتا۔ پچھلا پورا مہینہ وہ نہیں آسکا تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے وہ دوسری بار گھر آیا تھا۔
اور اس بار ایک ہفتے کی چھٹی پر آیا تھا۔ اس کے کہنے پر وہ اسے لے تو آیا تھا' مگر پچھتا رہا تھا۔ ڈوبا ہوا مکان ڈھے چکا تھا بری طرح سے۔ اب پانی کافی اتر گیا تھا۔ علاقہ خشک ہو گیا تھا کافی' مگر مکان رہنے کے قابل نہ بچے تھے۔
یہ بستی نچلی سطح پر تھی۔ سارے مکان ڈوب گئے تھے اور ان کے مکان کی تو دیواریں بھی ڈھے گئی تھیں۔ زینی اپنے مکان سے کچھ فاصلے پر اس کے ساتھ بیٹھی بھاں بھاں کر کے روتی رہی۔ اسے چپ کرانا مشکل ہو رہا تھا۔
"بس بہت ہو گیا اٹھو اب۔ اتنی ٹھنڈ بڑھ گئی ہے۔ ابھی تو انجیکشن لگے ہیں بخار کے' ڈاکٹر نے منع کیا ہے سردی میں باہر نکلنے سے۔"

"میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ مجھے نہیں جانا۔" اس کے رونے میں کمی واقع ہوئی تھی۔ درحقیقت وہ روتے روتے تھک گئی تھی۔ اب رویا بھی نہیں جارہا تھا۔

"ہم یہاں پھر آجائیں گے۔ ابھی یہاں کوئی نہیں ہے۔ ہم تمہاری امی کو ڈھونڈلیں گے۔ تم ابھی چلو۔" اس نے اسے کندھے پر اٹھالیا۔

"یہاں پریاں آتی ہیں۔" وہ اس کی پشت پر چمٹی تھی اور چھوٹی سی باہنیں اس کی گردن میں لپٹی تھیں۔

"ایسی کھنڈر جگہ پر پریاں نہیں آتیں۔" وہ ہنسا تھا۔

"آپ کو پریوں کی کہانی آتی ہے؟"

"مجھے بہت ساری کہانیاں آتی ہیں۔" وہ اسے پشت پر اٹھائے بڑے مزے سے آگے بڑھ رہا تھا۔ جیپ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ اس نے فون کرکے دوست سے کچھ دنوں کے لیے گاڑی رکھنے کی بات کرلی تھی۔ ڈرائیور جاچکا تھا۔

اس نے دروازہ کھول کر اسے بٹھایا اور دوسری طرف آکر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ وہ اس کی جیکٹ میں پوری پیک بیٹھی تھی۔ صرف گردن اور سر باہر تھا۔ چھوٹے چھوٹے بالوں کو اس نے ٹوپی سے ڈھانپ لیا تھا اور اب ریپر اتار کر چاکلیٹ کھا رہی تھی۔

"کہانی سنائیں نا۔"

"کہانی یہ ہے کہ ایک جگہ ایک پری رہتی تھی۔" وہ یاد کرنے لگا کہ آگے کیا کہنا ہے۔

"یہ کہانی مزے کی نہیں ہے، دوسری سنائیں۔"

"تمہیں پتا ہے میری بھی ایک بیٹی ہے۔ بالکل تمہاری طرح، تمہارے جیسی.... پیاری سی.... چھوٹی سی۔" اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ محبت تھی اور اندر چھپا ہوا دکھ، جو وہی سمجھ پاتا تھا۔ اس چھوٹی سی بچی کو تو صرف اپنی جیسی پری کی کہانی سے مطلب تھا۔

وہ بڑی توجہ سے ریپرز جیکٹ کی جیب میں اڑس کر اس کی طرف دیکھ کر سن رہی تھی۔ کہانی خود بخود بنتی جارہی تھی۔ کہانی سناتے ہوئے ابوذر جیسا چٹان سا آدمی نرم ہوگیا تھا۔

لہجہ سمندر کی گہرائی لیے تھا۔ جس میں اس کا من ڈبکیاں لگا رہا تھا۔

وہ زینی کے سوالوں پر مسکرا رہا تھا اور آنکھوں کی نمی بھی صاف کررہا تھا۔

اسکرین جانے کیوں دھندلی لگنے لگی تھی۔ حالانکہ اس نے مضبوطی سے اسٹیرنگ تھام رکھا تھا۔ پہاڑی علاقے کی طرف جانے والی سڑک آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ابوذر ننھی پری کو یوں ہی اٹھائے اٹھائے آیا تھا۔ یہاں تک پہنچنے میں رات بہت ہوگئی تھی۔ یہاں سے شہر تک وہ ڈھائی گھنٹے کی ڈرائیو ہوتی تھی۔

اور پھر زینی کے گھر تک اور لمبا سفر... وہ ایک الگ ہی شہر تھا اور یہ پہاڑی علاقہ خاصا دور تھا۔ اسے پہنچتے پہنچتے رات کے ڈھائی بج گئے تھے۔

زینی سوئی ہوئی تھی۔ وہ اسے لاؤنج والے صوفے پر لٹا کر اس کے اوپر بڑا سا کمبل ڈال کر اپنے کمرے میں آیا، تو اسے جاگتا ہوا پایا۔

"کیسی ہو یقیناً" ویسی ہی، جیسی صبح تھیں۔"

اس کو خاموش پاکر وہ مسکرا کر بولا تھا اور پھر کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گیا۔ واپس آیا تو جوں کی توں بیٹھی تھی۔

"کھانا کھالیا؟" وہ اس سے کچھ فاصلے پر لیٹ گیا۔ وہ خاموش تھی۔

"کچھ پوچھا ہے میں نے۔"

"کھالیتا... اگر نہیں کھایا ہوتا؟"

"تو اپنے ساتھ زیادتی کرتیں۔ اتنی دیر بھوکی بیٹھ کر۔"

وہ آنکھوں پر بازو رکھ کر سوتا بنا اور وہ خونخوار نظروں سے دیکھتی رخ بدل کر لیٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

صبح وہ اٹھا تو زینی اٹھ گئی تھی۔ وہ چائے کا کپ لیے

اس کے پاس آیا۔
"بسکٹ کھانے ہیں۔" اس نے نفی میں سرہلایا۔
"پھر کیا کھانا ہے؟"
"کچھ نہیں..." اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔
"کیا ہوا ہے؟ کیا آنٹی نے ڈانٹا ہے؟" اس نے عائشہ کی طرف اشارہ کیا' زینی نے بڑی معصومیت سے اثبات میں سرہلایا۔
وہ اٹھا اور کچن کی طرف آیا۔
"تم نے اسے ڈانٹا ہے' ایک بچی کو۔"
"اس بچی نے میری زندگی حرام کردی ہے پچھلے دو ماہ سے۔"
"اس بچی نے تمہاری زندگی حرام کردی ہے پچھلے دو ماہ سے؟" اس نے تعجب سے اس کی بات دہرائی۔
"ہاں... تم آخر مان کیوں نہیں جاتے کہ یہ تمہاری بیٹی ہے اور تم اسے یہاں لے آئے ہو۔" وہ زور سے چیخی۔
"یہ میری بیٹی نہیں ہے مگر بیٹی جیسی ضرور ہے عائشہ۔" وہ بے بسی سے بولا۔
"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مسلسل جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے۔ تم نے کہا تھا کہ تم سب کچھ بھول جاؤ گے۔ اپنی پوری فیملی کو بھول جاؤ گے۔ تم پوری زندگی ان کا ذکر نہیں کرو گے۔ مگر تم اپنی بیٹی کو لے آئے اور اب خدمتیں کروا رہے ہو مجھ سے۔" وہ روہانسی ہوگئی بولتے ہوئے۔
"دیکھو... مجھے کچھ یاد نہیں ہے' نہ میں یاد رکھنا چاہتا ہوں۔ یقین کرو' وہ سب سچ ہے جو میں نے بتایا تھا۔ سیلاب میں یہ بچی..."
"بس کرو ابوذر! بہت جھوٹ ہوگیا۔" اس نے تیزی سے بات کاٹ دی اس کی۔
"تم مجھے جھوٹا کہہ رہی ہو۔" وہ اس کی طرح چیخ نہیں پایا۔ دکھ لہجے میں در آیا تھا۔
"ہاں... تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو۔ یہ تمہاری بیٹی ہے۔ تم اپنی بیوی سے بھی ملتے رہے ہوگے۔ تمہیں میرا کوئی خیال نہیں ہے۔ پچھلے دو ماہ سے تم اس بچی کو اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہو۔"
"تم ایک معصوم بچی سے حسد کررہی ہو۔ تم ہوش میں ہو؟" اب بات کاٹنے کی باری ابوذر کی تھی۔
"مجھے ہر اس چیز سے حسد ہے' جو تمہاری زندگی میں میری جگہ لے سکتی ہے۔ جو تمہیں مجھ سے دور کرسکتی ہے۔"
"تم غلط فہمی کا شکار ہو' ایک معصوم بچی سے تم خود کو کمپیئر کررہی ہو۔"
"ہاں... ہاں... کررہی ہوں کمپیئر' کیونکہ یہ معصوم بچی میرا وقت' میری جگہ لے رہی ہے۔"
"تمہیں شرم آنی چاہیے ایسی بات کرتے ہوئے۔" اس کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رکا تھا۔
"اب تم اس کی وجہ سے مجھے مارو گے۔" وہ اور زور سے چیخی۔ آواز پہاڑ سے ٹکرا کر پلٹی تھی۔
زینی حواس باختہ ہو کر اٹھی تھی۔ ایسے لڑتے تو اس نے اپنے ماں' باپ کو بھی نہیں دیکھا تھا۔
ان دونوں کی آوازیں تیز ہوگئی تھیں۔ زینی خوف زدہ ہو کر سیڑھیوں کی طرف بھاگی اور یہیں سے اس کا پیر پھسلا تھا۔
"زینی... رکو۔" وہ اس کے پیچھے لپکا تھا۔ اسے گرتے دیکھ کر جیسے جان نکل گئی تھی۔
"اسے کچھ ہوا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔" وہ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے چیخ کر اس سے بولا جو خونخوار تاثرات لیے کھڑی تھی۔ رانی نے ڈائن کا روپ بدل لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ صبح کا پہلا پہر تھا۔ اس کی آنکھ لگی ہی نہیں تو بیداری کیسی۔ بلکہ آنکھ اب لگنے کو تھی۔ مگر بوجھل دماغ نے جتنا سونے کی رٹ لگائی ہوئی تھی دل اتنا ہی پریشان تھا۔ بچے سوئے ہوئے تھے۔
وہ بڑی آہستگی سے اٹھی تھی کہ معمولی سی کھٹکے سے بھی وہ اٹھ جاتے۔ وہ زینی تھی جس کے سامنے بین بجانی پڑتی تھی۔ شور کرنا ہوتا تھا۔ کھینچا تانی ہوتی تھی۔

وہ آہستگی سے دروازہ بند کر کے باہر آئی اور صحن میں اترتی سیڑھیوں کے چار زینوں کے اوپر بیٹھ گئی۔ دھوپ کا نام ونشان تک نہ تھا۔

اسے یاد آیا زینی کو سردیوں کی دھوپ کتنی اچھی لگتی تھی اور گرمیوں کی دھوپ سے اتنی ہی چڑ ہوتی تھی اسے۔ پھر اسکول جانے سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ ماضی قریب کے منظر کھٹا کھٹ سامنے آنے لگے۔

☆ ☆ ☆

یہ صبح بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ نہ ہو تو ہمارے سارے کام دھرے کے دھرے رہ جائیں۔ ایک کروٹ دائیں لی اور دوسری بائیں۔ پھر کھڑکی کی درزوں کو چیرتی روشنی کی لکیر کو دیکھا اور زوردار جمائی کے ساتھ بستر چھوڑ کر سامنے گھڑی پر نظر ڈالی۔

فجر کے بعد بمشکل چند منٹ ہی آنکھ لگتی تھی اور پھر اس کمرے میں آنے والی روشنی کی پہلی لکیر ہی جگا دیتی۔ وہ لحاف ہٹا کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

کھڑکی کا پٹ کھولتے ہی سورج کی کرنیں اندر داخل ہوئی تھیں۔

"شانی' فاطمہ' زینی! اٹھو شاباش جلدی اٹھو بچے۔"

شانی تو اس کی پہلی آواز پر ہی جاگ جاتا تھا۔

حسب معمول وہ اٹھا اور آنکھیں ملتے ہوئے واش روم کی راہ لی۔ فاطمہ بھی اٹھ چکی تھی۔

مگر زینی کا آسانی سے اٹھنا محال تھا۔ اس پر چیخنے چلانے کا اثر کم ہی ہوتا تھا اور اس نے روز والی ترکیب آزماتے ہوئے اس کے اوپر پڑا کمبل تیزی سے کھینچا تھا۔

"ممی۔ کیا ہے۔ کتنی بار کہا ہے' کسی کے اوپر سے اس طرح کمبل نہیں کھینچتے۔" وہ روز کی طرح چیخی تھی۔ سبق پڑھنا تو ناپسند' مگر پڑھانا وہ خوب جانتی تھی۔

"ٹھیک ہے تو پھر سوتی رہو۔ لیٹ ہونے پر ٹیچر ہی تمہیں پوچھے گی۔"

"اور آج بازار بھی میرے ساتھ فاطمہ ہی جائے گی۔" دھمکی اثر کر گئی وہ چھلانگ مار کر نیچے اتری۔

"چھٹی پر مارکیٹ لے جائیں گی؟" واش روم کی طرف جاتے ہوئے ایک بار پھر یقین دہانی چاہی' تاکہ پروگرام ملتوی کرے۔

"کیوں.... کیا رات وعدہ نہیں کیا تھا۔" وہ کمبل تہ کر کے رکھتے ہوئے بولی۔

"وہ تو ہر روز کرتی ہیں۔"

"وعدے اور بات میں فرق ہوتا ہے نا اور جب وعدہ کیا ہے تو لے ہی جاؤں گی۔"

"آپ نے کہا تھا کہ مسلمان کی زبان بھی وعدہ ہوتی ہے۔ "جو کہو' وہ کر دکھاؤ۔"

"اچھا بابا! اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" وہ جاتے جاتے با آواز بلند بولی اور کچن میں آ گئی۔ رات والا آٹا فریج میں گوندھ کر رکھا تھا۔ وہ نکالا۔ جب تک شانی آچکا تھا وہ آملیٹ کا آمیزہ تیار کرنے لگا۔ فاطمہ برتن نکالنے لگی۔ جب تک اس نے روٹیاں ڈالیں' فاطمہ اور شانی نے آملیٹ تیار کر لیے تھے۔ ایک ہاف فرائی انڈہ سادہ چپاتی نانی کے آگے رکھ آئے۔

"روز یہ چپاتی جس پہ ایک قطرہ تیل نہیں ڈالتے تم لوگ۔ روز یہ بنا نمک مرچ کے انڈہ' وہ بھی کچا۔ تنگ آ گئی ہوں کھاتے کھاتے۔" روز کی طرح چیخنا بھی ان کی ڈیوٹی تھا۔

"کیا ہے اماں۔ کھا لیا کریں کبھی شکر کر کے بھی۔ ڈاکٹر نے سخت پرہیز کو کہا ہے' یہ بھی میں دیتی ہوں کہ اس سے زیادہ کیا پرہیز ہوگا۔ آپ کو خوش کرنا تو بڑا مشکل ہے۔" پسینہ صاف کرتی روٹیاں لے کر کچن سے باہر آئی اور زینی کو پھر آواز دی۔

"کہاں رہ گئی ہو زینی۔ سو تو نہیں گئیں۔ آجاؤ بیٹا شاباش.... دیر ہو جائے۔" کمرے میں جا کر اب وہ اپنے کپڑے نکالنے لگی جو رات میں استری کر کے رکھے تھے۔ "ابھی جاؤ بی بی۔" دروازہ بار بار بجانا پڑتا تھا۔

"کتنی بار کہا ہے دروازہ نہ بجایا کریں۔" وہ بڑبڑاتی واش روم سے باہر آئی۔

"بہت ہو گیا' استادی مت جھاڑو زیادہ اپنی۔" کھینچ

کر اسے قریب کیا بال بنائے لوشن لگایا بیگ چیک کیا اور اسے باہر لے آئی۔

"جلدی جلدی ناشتا کر لو اس سے پہلے اسکول کی وین آجائے۔"

"بچوں کو سانس تو لینے دیا کرو ہاجرہ! ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی ہے۔" نانی بڑے بڑے منہ بنا کر نوالے لیتے بڑبڑائیں۔

"سانس تو لے لیا کرو۔ کبھی اس طرح بھی کہہ دیا کریں اماں۔ بچوں کی فکر بہت رہتی ہے آپ کو اپنی بچی کی فکر ذرا نہیں۔" وہ مسکرا کر کہتے ہوئے چائے بنانے لگی۔

"ساری زندگی تو تیری فکر کرتے گزر گئی میری۔"

"رہنے دیں اماں۔" اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"قہوہ نہ دینا مجھے خدا کے لیے۔ سیدھی سیدھی اچھی بھلی چائے بنا کر دے دے۔"

اسکول کی وین آگئی تھی۔ شانی اور فاطمہ کھڑے ہو گئے۔ "زینی جلدی کرو' بچے گاڑی نہیں رکے گی زیادہ دیر۔" وہ وہیں سے چیخی۔ "ارے آج نہ بھیج بچوں کو اسکول ہاجرہ! دیکھ موسم بدل رہا ہے۔ بارش ہو گئی تو۔"

"نہیں نانی! میں دعا کروں گی اللہ سے کہ بارش نہ ہو۔" زینی وہیں سے چیخی۔

"اوں ہوں.... زینی بیٹا دعا کر کے اللہ کی رحمت کو نہیں روکتے۔"

"مگر مجھے آج مارکیٹ جانا ہے۔" کہتے ہوئے پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

وہ بچوں کو دروازے تک چھوڑ آئی۔

"زینی کا خیال رکھنا۔" وین جب تک نظر سے اوجھل نہ ہوتی تب تک وہ وہیں کھڑی رہتی تھی۔ ان کو روانہ کر کے خود تیاری پکڑی۔ جلدی جلدی دو چار نوالے لیے اور پرس اٹھا کر پیسے گنتے ہوئے بٹوہ چیک کیا۔ لسٹ بنائی۔ فائل اٹھائی اور اللہ حافظ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ نانی پیچھے بڑبڑاتی رہ گئیں۔ اس کے جاتے ہی اٹھیں' بچوں کے بچائے ہوئے پراٹھوں کے ٹکڑے اور آملیٹ کے چند نوالے کھا کر ہی دل خوش ہوتا تھا۔

اس کی موجودگی میں سخت پرہیز اور غیر موجودگی میں فل آزادی مناتیں اور وہ سوچتی رہ جاتی کہ اتنے پرہیز اور دوا کے باوجود وہ ٹھیک کیوں نہیں رہتیں۔ اب اسے کیا پتا۔

☆ ☆ ☆

"ہو گئی وقت کی پابندی' آج پھر ایک گھنٹہ لیٹ ہو۔" وہ اسے کلاس کے باہر ہی مل گیا تھا۔

"جتنا وقت کو پکڑنے کی کوشش کرو' ہاتھ سے کھسک جاتا ہے۔ یہ بتاؤ بیوی کیسی ہے تمہاری۔" وہ عجلت میں کلاس کی طرف جاتے ہوئے رکی کہ وہ تیزی سے اس کی طرف آرہا تھا۔

"آج صبح تو اسے ٹھیک ٹھاک چھوڑ آیا ہوں۔ ویسے..."

"فلاسفی کلاس میں جھاڑنا ابھی تو خیر مناؤ' خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔" اس کا اشارہ پرنسپل کی طرف تھا جو کوریڈور سے گزرتے ہوئے شاید اسی طرف آرہے تھے۔ اس سے پہلے وہ کلاس میں چلی گئی۔

اس نے خفت سے بچوں کے سلام کا جواب دیا اور کتاب کھول کر کھڑی ہو گئی' پہلے ہی گھنٹہ ضائع ہو گیا تھا۔

پرنسپل کلاس کے سامنے کھڑے تھے۔ اس نے توجہ نہیں دی۔

"مسٹر سفیر! آپ کلاس سے باہر کیا کر رہے ہیں۔" وہ اب اس سے مخاطب تھے۔

"میں کلاس لے چکا ہوں' میری دوسری کلاس شروع ہونے میں کچھ منٹ باقی ہیں سر۔" اس نے گھڑی دکھاتے ہوئے کہا۔

"سزا کے طور پر بچوں کو باہر کھڑا رکھنے والے ٹیچرز کی دیر سے آنے پر کیا سزا ہونی چاہیے مسٹر سفیر۔ انہیں بھی کلاس سے باہر نہ کھڑا کیا جائے یا پھر اسکول سے ہی۔" وہ در حقیقت اسے ہی سنا رہے تھے۔

"اچھے استادوں کو باہر کرنے کی صورت میں ان

ناداں بچوں کے ساتھ ساتھ اسکول کا بھی نقصان ہو سکتا ہے سر۔" سفیر کو ان کی بات بری لگی تھی۔ مگر اس نے نارمل لہجے میں جواب دے دیا تھا۔

"اچھے ٹیچرز۔۔۔ رول توڑنے والے۔" وہ طنزیہ مسکرائے اور رخ کمرے کی طرف کیا۔

"تو پھر مس ہاجرہ! چھٹی کے بعد میرے آفس میں ملتے ہیں۔" ان کا انداز دھمکانے والا تھا۔

ہاجرہ سر جھٹک کر کام میں لگ گئی۔ ذہن اسی طرف تھا۔ وہ بریک میں آکر کینٹین میں بیٹھ گئی چائے لے کر۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا سوچ سوچ کر۔۔۔

"پھر سر میں درد ہے؟" سفیر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بہت درد ہے۔" اس نے پریشانی سے پیشانی مسلی۔

"پرنسپل سے بات ہوئی؟ وہ اب بھی تمہارا ہی پوچھ رہے تھے۔"

"جس دن اسکول چھوڑنے کا ارادہ ہوا' اس دن تفصیل سے بات کرلوں گی۔ فی الحال اتنی ہمت نہیں۔ مجھے پتا ہے وہ مجھے بلیک میل کرے گا۔ اسے بھی پتا ہے کہ یہ نوکری میری مجبوری ہے۔"

"تم اخبار کی نوکری چھوڑ کر یہیں پوری توجہ دو ہاجرہ! بہت زیادہ لوڈ ہے کام کا تم پر' کچھ رحم کرو خود پر۔"

"خود تو اخبار میں دس دفعہ ٹرائی کر آئے ہو۔ مجھے چھوڑنے کا مشورہ دے رہے ہو' کمال ہے۔"

"ارے میری تو بیوی وہاں ہے' مجبوری ہے میری۔ اس پہ چیک رکھنا ہے۔ سمجھا کرو۔" اس نے آنکھ مار کر کہا تو وہ ہنس دی۔

"اسے پتا چلے تو۔"

"گلا نہیں دبا سکتی وہ۔۔۔ شوہر ہوں اس کا۔"

"فائدہ اٹھا رہے ہو شوہر ہونے کا۔"

"ہر کوئی اٹھاتا ہے۔ تمہارے شوہر سے پھر بھی کم ہی اٹھاتا ہوں۔"

"اس کی تو بات ہی نہ کرو۔" اس کا موڈ آف ہوگیا۔

"ایک سوال پوچھوں تم سے؟" وہ افسوس سے اسے دیکھنے لگا۔

"ہوگا کوئی فضول سوال ہی۔" وہ اس سے نظریں چرا رہی تھی۔

"تمہاری نظر میں ہوگا۔" وہ اپنے برگر میں کیچپ اور مایونیز ڈالنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ مجھے اس اسکول سے نکال کیوں نہیں دیتیں امی!" وہ اس کے بازو پر سر رکھے آنکھیں موندے ہوئے لیٹا تھا۔

"اسکول میں اب کیا برائی ہے بیٹے! اتنا اچھا اسکول تو ہے۔"

"برائی اسکول میں نہیں ہے۔ ہم میں ہے۔ اس لیے کہ ہم فیس وقت پر نہیں دیتے' جو بہت بری بات ہے۔ آج بھی ٹیچر نے کہا' اگر افورڈ نہیں کرسکتے تو اسکول بدل لو۔"

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ آنکھیں کھول کر سیدھا ہو بیٹھا۔

"شانی۔۔۔ سوری بیٹے۔۔۔ ہم کچھ دنوں میں فیس دے دیں گے۔ بس سیلری مل جائے دفتر سے۔ میں مانتی ہوں کہ لیٹ ہوگیا ہے۔ آپ ٹیچر سے کہیں' مجھ سے بات کیا کریں ڈائریکٹ۔"

"امی! ہمیں نکال لیں اس مہنگے اسکول سے۔ ہمارے مسئلے بڑھ رہے ہیں۔"

"نہیں بیٹا! میں کس لیے دو' دو نوکریاں کرتی ہوں۔ تم لوگوں کے لیے نا۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ بس دو دن میں جمع کروادوں گی۔" اس نے کہتے ہوئے اسے ساتھ لگالیا۔

☆ ☆ ☆

لطیف آباد نمبر آٹھ۔۔۔

بازار کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا پورا حیدر آباد اسی بازار میں گھوم رہا ہے۔

زینی کو اسکول سے لے کر اس نے ہسپتال کا رخ کیا۔ بمشکل ڈاکٹر نے چند منٹ کی مہربانی کی اور نسخہ لکھ

دیا۔ پھر چار گولیاں ملیں تو دو رہ گئیں۔ درزی کی دکان پر رش نے پورا گھنٹہ اسے وہیں کھڑا رکھا۔ خدا' خدا' کر کے درزی کو بچوں کے کپڑوں کا ناپ دیا۔ ڈیزائن سمجھایا اور زینی کو گھسیٹتی ہوئی جتنا جلدی باہر نکلنے کی کوشش کرتی اتنا رش کے اندر پھنس جاتی تھی۔

"ممی وہ فراک۔۔۔" وہ پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے چلائی تھی۔

یہاں آکر اس کے اندر کتنی خواہشیں بیدار ہوتی تھیں۔ بازار سے ہمیشہ وہ رو دھو کر نکلتی تھی' جرمانے کی صورت آئس کریم لے کر چپ ہو گئی۔ سودا کافی سستا تھا۔

"ممی! بابا۔۔۔ وہ دیکھیں بابا۔" دفعتاً" وہ چلائی۔ وہ پیچھے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ زینی پوری گھوم گئی اسے کھینچ کر اور وہ ششدر۔۔۔ یہ اس کا شوہر ہی تو تھا۔

کیا خوشی تھی قیصر وحید کے چہرے پر۔ اکیس سالہ نوجوان لگ رہا تھا شکل اور حلیے سے۔ آئس کریم کپ ہاتھ میں تھامے اس حسینہ کے ساتھ ساتھ چلتا مسکراتا اور اس کی دلجوئی کرتا جو مصنوعی خفگی سے بار بار سر جھٹک رہی تھی اور وہ اسے منانے کے جتن کر رہا تھا۔ التجائیہ سے انداز میں۔ اس کا دل کیا خاک جلنا تھا جو پہلے جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اس نے زینی کا ہاتھ کھینچا اور آگے بڑھنے لگی۔ ابھی ان لوگوں کی نظر ان کی طرف نہیں پڑی تھی۔ وہ یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔

"چلو زینی! وہ کوئی اور ہیں' بابا نہیں۔" وہ اسے سمجھا رہی تھی۔ وہ واقعی بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ جب گھر سے گیا تھا تو بال بڑھے ہوئے تھے۔ شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ حلیہ رف ہی رہتا تھا اس کا گھر میں۔ غنڈہ لگتا تھا' دہشت گرد' جواری سا' وہ منہ پھیر لیتی تھی۔

"وہ بابا ہی ہیں۔" زینی آگے بڑھی' مگر وہ لوگ دکان کے اندر گھس گئے تھے۔

"آپ مجھے بابا کے پاس لے چلیں' مجھے ملنا ہے بابا سے۔"

"بتایا نا کہ بابا نہیں تھے۔ وہ کوئی اور تھے۔ تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔" وہ ڈپٹتی آگے بڑھی اور ہاتھ کے اشارے سے رکشہ والے کو بلایا۔

"وہ بابا ہی تھے۔ آپ نے مجھے ملنے نہیں دیا بابا سے۔ مجھے پتا ہے' وہ آپ کو اچھے نہیں لگتے۔ فون پہ بھی بات نہیں کرنے دیتیں آپ۔ ملنے بھی نہیں دیا۔" وہ پھر شروع ہو چکی تھی۔ اس نے زور کا تھپڑ جڑ دیا اور زبردستی لے کر رکشہ میں بیٹھ گئی۔

"نانی سے شکایت لگاؤں گی آپ کی؟"

وہ چلائی تو اس نے دوسرے گال پر بھی تھپڑ لگا دیا۔ جانے کیوں غصہ بڑھ گیا اور زینی کی بھیں بھیں گونجنے لگی وہ روتی رہی اس نے کچھ منٹ دیکھا' پھر خود سے بھینچ لیا۔ تھپکنے لگی' پیار کیا۔

"اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔ وہ کوئی اور تھے بیٹا!" ساتھ لگا کر تھپکی دی۔

"وہ بابا تھے۔ بابا ہی تھے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "میں نے پہچان لیا تھا۔"

"اچھا ٹھیک ہے' اب چپ رہو' گھر جا کر کوئی ذکر نہیں کرنا۔ ورنہ بہت پٹائی لگاؤں گی۔"

اس نے "ہونہہ۔۔۔" کے انداز میں غصے سے سر جھٹکا۔ اس نے بسورتی ہوئی زینی کو ساتھ لگایا اور بھاگتے مناظر دیکھنے لگی۔ منظر ایک دھندلائے تھے۔ شاید آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ جو اس نے بے حسی سے رگڑ ڈالیں۔ رونا دھونا بچوں کا کام ہے۔ اس نے خود کو ڈپٹا' مگر زینی اس کی آنکھوں میں دیکھ چکی اور سمجھ چکی تھی۔

"ممی! وہ بابا نہیں تھے۔ کوئی اور تھے۔" اب وہ اسے بہلا رہی تھی۔ پھر دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ جیسے ایک دوسرے کی کمزوری سمجھ گئی ہوں۔ ایک ماں تھی اور ایک ماں کی زینی تھی۔

٭ ٭ ٭

"آگئی ہاجرہ! ہمیشہ دیر کر دیتی ہے تو۔" وہ پسینہ پسینہ گھر پہنچی تو اماں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ اس نے بڑا سا دوپٹا اتار کر تخت پر رکھا اور سانس لینے کے لیے چوکڑی

مار کر بیٹھ گئی۔

"کیوں جاتی ہے لطیف آباد کے بازار۔" اس کی حالت دیکھ کر وہ پھر بولیں۔

"اماں۔۔۔ میں ایک غریب باپ کی بیٹی' ایک نالائق شوہر کی بیوی' میرے لیے لطیف آباد کا بازار ہی بھلا۔ بڑے بازار بڑے لوگوں کے لیے ہیں۔" اس نے ہنس کر اپنا مذاق اڑایا۔

"تمہیں ہی چڑھا تھا فرماں برداری کا بخار' کتنا منع کیا تھا مت کرو یہ شادی' مگر میری مانتی کہاں ہو۔ رچالی اپنے باپ کے نکھٹے کنگلے بھتیجے سے بیاہ۔" وہ کلس کر بولیں۔

"اب اُتر گیا ہے بخار اماں۔۔۔ ہاں کمزوری البتہ باقی ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔ اور کچن میں چلی آئی روٹی ڈالنے۔ فاطمہ نے آٹا گوندھ رکھا تھا۔ اس نے چولہے پر توا رکھا اور پیڑے بنائے۔

"ممی! زینی نے بابا کو دیکھا ہے۔" فاطمہ دوڑتی ہوئی کمرے سے آئی تھی۔ اس نے زینی کو گھورا۔

"میری ٹیچر کہتی ہیں' دنیا میں ایک شکل کے سات لوگ ہوتے ہیں۔ وہ بابا جیسے تھے۔" وہ ایک دم ہاجرہ کے غصے سے ڈر گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"وہ بابا تھے ممی۔ ان کے ساتھ کوئی عورت تھی۔" شانی کافی سنجیدہ تھا۔ سونے سے پہلے اس نے ہاجرہ سے کہا۔ وہ چپ ہو گئی۔

"آپ کو کیسے پتا شانی!" اس کے پاس کہنے کو اور کچھ نہ تھا۔

"زینی کی بابا سے بات ہوئی تھی کچھ دیر پہلے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ بال کٹوا لیے ہیں' اور یہ بھی کہ وہ آج کل یہیں ہیں اسی شہر میں۔"

"تو یہ نہیں بتایا کہ ان کے ساتھ کون تھی؟" اب سوال پوچھنے کی باری اس کی تھی۔

"تب تک فون کی لائن کٹ گئی تھی۔" اس کے سنجیدہ سے لہجے میں بہت کچھ تھا' افسوس' دکھ' شکوہ۔

"کٹ گئی یا کاٹ دی گئی۔" وہ بڑبڑائی اور اسے سیدھے کے لیے تکیہ دبا۔

"سو جاؤ شانی!" وہ بتی بند کر کے لیٹ گئی۔

"انہوں نے کہا کہ وہ کل یا پرسوں کسی بھی وقت رات گئے گھر آئیں گے ملنے۔ زینی نے الارم لگایا ہے دو بجے کا۔ اب وہ روز الارم لگا کر دو بجے اٹھے گی۔"

وہ اس سے کچھ فاصلے پر لیٹا ہوا بتا رہا تھا۔

"رات گئے چوروں کی طرح اپنے ہی گھر میں۔" وہ بڑبڑائی۔ اس نے رخ بدلا۔

"ممی! الارم ہٹا دوں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم ملنا نہیں چاہتے۔"

"وہ مجھ سے ملنے کے لیے نہیں آرہے۔ انہیں صرف زینی کی پروا ہے۔" اسے یہی شکایت تھی۔

"انہیں کسی کی پروا نہیں۔" وہ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ مگر سچ یہی تھا۔

"وہ صرف زینی سے محبت کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے اور فاطمہ سے محبت نہیں کرتے۔"

"وہ کسی سے محبت نہیں کرتے۔" وہ کہہ نہیں پائی۔

"میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے کیوں محبت نہیں کرتے' کیوں کہ میں آپ جیسا ہوں۔ زینی ان پر گئی ہے۔ ان کی طرح خوب صورت ہے۔ ان کو صرف گورے اور خوب صورت لوگ پسند ہیں۔" شانی کے لہجے میں تلخی آگئی تھی۔

"آپ بھی بہت خوب صورت ہیں بیٹا! ایسے نہیں سوچتے۔" وہ اندھیرے میں اپنے بیٹے کی چمکتی آنکھوں میں تیرتے ہوئے پانی کو دیکھ رہی تھی۔

"میں اس لیے خوب صورت ہوں کہ میں آپ جیسا ہوں اگر میں آپ جیسا نہیں تو میں خوب صورت بھی نہیں۔۔۔ ممی! مجھے بابا جیسا نہیں بننا۔۔۔ میں آپ جیسا ہی رہنا چاہتا ہوں۔" وہ اس کے بازو پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"اس لیے کہ میں اچھا بننا چاہتا ہوں اور سفیر انکل کہتے ہیں' اچھے انسان ہی درحقیقت خوب صورت

ہوتے ہیں اور تمہاری ممی خوب صورت ہیں۔"

"سفیر انکل خود بھی بہت اچھے ہیں اور اچھے لوگوں کو سب لوگ اچھے لگتے ہیں۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

"بابا صرف خوب صورت ہیں مگر اچھے نہیں ہیں۔"

"ایسے نہیں کہتے بیٹے وہ آپ کے بابا ہیں۔"

"جب ہی وہ مجھ سے پیار نہیں کرتے۔" اس کا لہجہ پھر ویسا ہی ہوگیا۔

"اب وہ آئیں تو اپنی ساری شکایتیں ان سے کر دینا۔ ویسے تو جنگ بری چیز ہے مگر کبھی کبھار اپنے لیے اپنے حقوق کے لیے جنگ لڑنا پڑ جاتی ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی اور وہ بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔

* * *

وہ اسکول سے دفتر آئی تو نئی خبر اس کی منتظر تھی۔ سفیر اسے گیٹ پر ہی مل گیا تھا۔

"یہ بتاؤ، یہ خبر کیسی لگی۔" اس نے اخبار اس کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔ وہ اخبار پکڑ کر ہیڈ لائن دیکھنے لگی۔

"مشہور سندھی شاعر قیصر وحید حیات اپنی پرانی محبوبہ شاعرہ کے ساتھ۔۔۔"

اس سے آگے پڑھنے کی ضرورت اسے محسوس نہ ہوئی۔ اس نے اخبار کا گولہ بنا کر اسے تھما دیا۔

"کل تمہاری غیر موجودگی میں خبر لگ گئی تم ہوتیں تو شاید نہ لگتی۔ تمہیں افسوس ہوا ہوگا۔"

"قطعی نہیں۔" وہ قطعیت سے کہتے ہوئے اپنے کیبن میں آگئی۔

"پتا نہیں کیا سوچ کر تم نے اس گھٹیا آدمی سے شادی کرلی۔" وہ ہونٹ کاٹتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا۔

"میں نے اس گھٹیا آدمی سے شادی کرتے وقت کچھ بھی نہیں سوچا، جو بھی سوچا بعد میں سوچا۔"

"ویسے ایک سوال میرے ذہن میں آرہا ہے۔"

"کوئی فضول سوال نہیں چلے گا۔" اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی اور کام دیکھنے لگی۔

"اسے تم سے قطعی محبت نہیں بلکہ تمہاری پروا تک نہیں۔"

"پلیز سفیر! مجھے کام کرنا ہے۔" اس نے کاغذات اٹھا لیے۔

"اپنے کیبن میں جاؤ۔ یہاں کیا کر رہے ہو۔" وہ ڈھیٹ بن کر بیٹھا رہا۔ اس نے کل کا اخبار ساتھ نہ لے جانے کا خود سے وعدہ کرلیا۔ بظاہر وہ سفیر سے بات کر رہی تھی، سارا سامنے سے آتی دکھائی دی۔ اس سے پہلے وہ آکر کچھ کہتی اس نے سفیر کی کلاس لینا شروع کر دی۔

"تو تم نے کتنے دن کی چھٹی لی، ذرا۔"

"ہمیشہ کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔"

"یعنی کہ نوکری چھوڑ کر؟" وہ حقیقت میں حیران ہوئی۔ وہ مسکرایا۔

"دیکھو سارا! اپنے شوہر کا بچپنا ملاحظہ کرو ذرا۔ نوکری چھوڑ کر آگیا ہے حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔"

"میں نے اس سے کبھی کسی میچورٹی کی توقع نہیں رکھی۔" سارا چیونگم چباتی ہوئی کیبن کے پاس کھڑی تھی۔

"اب میرے کون سے تین بچے ہیں جن کو پالنے کے لیے میں ہاجرہ کی طرح کولہو کا بیل بنا رہوں۔"

"تم بار بار بچوں کی بات کر کے مجھے کیا جتانا چاہتے ہو۔" سارا غیر ارادی طور پر غصہ ہوگئی۔

"میں نے کوئی گناہ نہیں کیا یہ کہہ کر میرے دل میں بھی خواہش ہے کہ میرے دو تین بچے ہوں جن کے لیے میں کولہو کے بیل کی طرح کام کروں۔" وہ کندھے جھٹک کر اٹھا۔

"خوب جانتی ہوں تم کیا جتانا چاہتے ہو۔۔۔ اگر بچے نہیں ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔" سارا سنجیدہ تھی۔

"میں نے تمہیں کیا کہا ہے۔۔۔ میں تو ہاجرہ سے

بات کر رہا تھا۔" وہ دبے دبے لہجے میں کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"خوب سمجھتی ہوں تمہیں' اس دن کیا کہا تھا کہ دوسری شادی کروں گا۔"

"کہنے میں کیا ہے... کہنے کو تو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔"

"دیکھا... دیکھا تم نے... یہ مجھے جتاتا ہے۔ طعنے مارتا ہے' تنگ کرتا ہے۔ کہتا ہے' دوسری شادی کروں گا۔ لڑکی پسند کر لی ہے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"کیا چل رہا ہے یہ تم دونوں کے درمیان۔" وہ باہر نکل آئی تھی پارکنگ ایریا میں' جہاں وہ دونوں کھڑے تھے منہ سجائے۔

"میں نے مذاق کیا تھا یار! یہ سنجیدہ ہو رہی ہے۔" سفیر بے زار نظر آرہا تھا۔

"کیوں کیا یہ نہیں کہا تھا کہ یہ شادی ایک غلطی ہے۔"

"ہاں' کہا تھا۔" وہ ڈھٹائی سے کہنے لگا۔

"تو اب کہہ دو کہ یہ بھی مذاق کیا تھا۔"

"نہیں' یہ مذاق ہرگز نہیں تھا۔"

"اور یہ بھی بتاؤ نا کہ تم نے کہا تھا کہ میری آئیڈیل ہاجرہ جیسی لڑکیاں ہیں' اس نے اگر شادی نہ کی ہوتی تو میں تمہیں چھوڑ کر اسی سے شادی کرتا۔" وہ بھری ہوئی تھی۔

"کہا ہو گا۔" وہ گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا لاپروائی سے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا... اب مجھے لے کر تم دونوں کے درمیان لڑائی ہو گی۔ سفیر! تم نے یہ کہا۔" اسے صدمہ سا ہونے لگا یہ سب سن کر۔

"کہنے میں کیا حرج ہے۔ میں تمہیں آئیڈیلائز کرتا ہوں اس میں کیا برائی ہے۔"

"سفیر..." وہ غصہ سے اسے دیکھنے لگی۔ "بہت دکھ ہوا ہے مجھے یہ سب سن کر۔" وہ تیزی سے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ یہ بھول کر کہ دفتر میں کام شروع ہونے والا ہے۔

"رکو ہاجرہ! بات سنو۔" وہ پیچھے لپکا۔

"سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔" سارا کو گھور کر آگے بڑھا۔

"ہاجرہ رکو۔ سنو۔ ایسی بات نہیں ہے۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔" وہ پیچھے آیا مگر وہ رکشہ پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ تیزی سے گاڑی کی طرف آیا۔ "اب بیٹھو۔" سارا کو گھرکا اور اس کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کی۔

"تمہیں یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ پہلے ہی اپنے شوہر کی وجہ سے ڈسٹرب ہے بہت...." وہ رکشے کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا' یہاں تک کہ اس نے رستہ روکا۔ رکشے والے کو رکنے کا اشارہ کیا اور گاڑی سے اترا۔ ساتھ سارا بھی اتری۔

"اترو یہاں۔"

"بھائی صاحب! آپ رکشہ اسٹارٹ کریں۔" اس نے نظر انداز کر دیا دونوں کو۔

سفیر رکشے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"یہ کیا بچکانہ حرکت ہے تم لوگوں کی۔" وہ ناچار اتری اور سفیر کے ہٹتے ہی رکشے والا آگے بڑھ گیا۔

"بیٹھو گاڑی میں۔" سارا نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ ہاتھ ہٹا کر غصے سے گھورتی ہوئی ناچار بیٹھ گئی۔

"مجھے پتا ہے' اپنے شوہر کو اس لڑکی کے ساتھ دیکھ کر تمہیں صدمہ ہوا ہے۔" سارا اس کے ساتھ آبیٹھی۔

"مجھے صدمہ تم لوگوں کی بکواس سن کر ہوا ہے۔ مجھے سفیر سے ایسی توقع نہ تھی کہ وہ میرے بارے میں ایسے خیال رکھتا ہے۔ دوست سمجھتی ہوں تم لوگوں کو میں۔ سات سال سے ہم لوگ اکٹھے ہیں کبھی ایسی بات نہ ہوئی' آج مجھے لے کر تم دونوں کے درمیان لڑائیاں ہونے لگی ہیں۔ ڈوب کر مرجانا چاہیے مجھے تو۔"

"چلو تینوں مل کر خودکشی کریں گے۔" سفیر ہنسا۔ اور سارا بھی۔ وہ دونوں کو تعجب سے دیکھنے لگی۔

"یار! کوئی بڑی بات نہیں ہوئی ہاجرہ! بلیو می۔ میں ویسے ہی تمہیں آئیڈیلائز کرتا ہوں' ویسے ہی اس

سے کہتا ہوں کہ ہاجرہ کی طرح بنو۔ رہی بات شادی کی تو وہ میں مذاق میں کہہ گیا۔"

"تمہیں پتا ہے' یہ مذاق کسی کو مہنگا پڑ سکتا ہے۔ میری ریپو خراب ہو سکتی ہے' سارا میرے بارے میں یہ سوچ سکتی ہے کہ میں اس کے شوہر کو قابو کرنے لگی ہوں' ہماری دوستی خراب ہو سکتی ہے سوالیہ نشان اٹھ سکتے ہیں مجھ پر۔"

"خیر' اب یہ تو مجھے پتا ہے کہ تم اپنا شوہر تو قابو نہ کر سکیں۔ میرا کیا خاک کرو گی۔" سارا ایسے بات کر رہی تھی جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"طنز کر رہی ہو۔" اس کا لہجہ دکھی تھا۔

"نہیں' بتا رہی ہوں کہ لگام ڈال کر رکھنی چاہیے تھی' ایسے بدمعاش شوہر کو۔"

"جیسے سب کچھ تم لوگوں سے چھپا ہوا ہے۔" وہ سر جھٹک کر باہر دیکھنے لگی۔

"گھر چھوڑ دو مجھے' اس سے پہلے کہ بارش ہو جائے۔" اس نے سر باہر نکال کر ایک لمحے کو آسمان کو دیکھا جو بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ کالے بادل گھر گھر کر آرہے تھے اور دھند چھا رہی تھی۔ سفیر نے گاڑی موڑی' اس سڑک پر جو اس کے گھر کی طرف جاتی تھی۔

"یار ہاجرہ! یہ بستی کچھ زیادہ ہی نیچے نہیں ہے۔ بارش زیادہ ہوئی یا سیلاب کا خطرہ ہوا تو بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔" سارا تشویش سے دیکھنے لگی۔

"اب ایک نئی ٹینشن نہ دو' مجھے یہ احساس دلا کر۔"

"تم تو ٹینشن لینے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہو۔" وہ ہنسی

تینوں گاڑی سے اتر گئے گاڑی لاک کی اور بارش سے بچتے بچاتے پھر بھی خاصے بھیگ گئے گھر تک پہنچتے۔

"کون آیا ہے بھئی۔" اماں وہیں سے پوچھنے لگیں آوازیں سن کر۔

"ہم آئے ہیں خصوصاً" آپ سے ملنے کے لیے۔" سفیر اندر آکر ان کے تخت کے پاس جھکا تو انہوں نے سر تھپتھپایا۔

"جیتے رہو بیٹے! کتنے دن بعد شکل دکھائی ہے۔"

"اور میں تو بچوں سے ملنے آئی ہوں۔" سارا کمرے سے دوڑ کر آتے بچوں سے لپٹ گئی۔

"کتنے بڑے جھوٹے ہو تم لوگ۔ ایک اماں سے ملنے آیا ہے' دوسری بچوں کے لیے۔ سب کو بہلانا آتا ہے۔" وہ ہنس کر بیگ رکھ کر کمرے میں گھس گئی۔ اور سفیر بچوں کے ساتھ کچن میں گھس گیا۔

ہاجرہ کپڑے تبدیل کر کے باہر آئی تو سفیر پکوڑے تل رہا تھا۔ بچے اس کے ارد گرد کھڑے تھے' سارا تخت پر چڑھ کر بیٹھی اماں جی سے باتیں کر رہی تھی۔ سفیر بچوں کے ساتھ ایک بڑی سی پلیٹ میں پکوڑے لے کر آیا تھا۔ "لو جی سب کھاؤ موج اڑاؤ۔"

"مجھے کہہ دیتے سفیر! میں تل دیتی۔" وہ شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس کی شرٹ پر بیسن کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پکوڑے کھاتا بچوں کے ساتھ صحن میں چلا گیا' بارش میں نہانے۔ سارا بھی ان کے پیچھے پیچھے گئی۔ ان دونوں نے ہاجرہ کو آواز دی' مگر وہ وہیں تخت پر بیٹھ گئی۔

"مجھے بیمار نہیں ہونا۔" وہ وہیں سے ان لوگوں کو مستیاں کرتے دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔ کتنے خوش تھے اس کے بچے' یہ دونوں جب بھی گھر آتے میلہ سا لگ جاتا تھا۔

"اللہ ان کو بھی اولاد سے نوازے۔" اس نے اماں کی بات پر آمین کہا تھا۔

رات گئے تک یہ موج مستی رہی' وہ لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے' اتنی بارش میں سفیر ان سب کو ڈنر کے لیے لے گیا تھا اور پھر تب تک بچوں کے ساتھ بیٹھا رہا جب تک بچے گہری نیند نہ سو گئے۔ وہ بچوں کو کہانی سناتا رہا تھا۔

وہ حسرت سے سوچنے لگی کہ کاش ان بچوں کا باپ بچوں سے ایسے لاڈ کرتا۔ ان کو اتنا وقت دیتا۔ کاش ان کے باپ کو یہ احساس ہوتا۔

سارا اور سفیر کے جانے کے بعد بھی وہ صبح چار بجے

تک جاگتی رہی' بارش رک گئی تھی اور برآمدے کی چھت ٹپک رہی تھی۔ چھت پر پانی کا دباؤ پڑا تھا' بوندیں نیچے فرش پر گرتیں تو آواز پیدا ہوتی۔ بوندیں جیسے دل پر گرتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"اب اس کی طبیعت کچھ بہتر ہے' چوٹ بازو میں آئی ہے اور ٹانگ میں بھی' مگر چل سکتی ہے۔ ہاں احتیاط لازمی ہے' جیسے جیسے ٹھنڈ بڑھے گی درد بڑھے گا' درد کے لیے یہ اسپرے لگانا لازمی ہے' تم سن رہی ہونا میری بات۔"

وہ عائشہ سے مخاطب تھا جو خاموشی سے لاؤنج میں کپڑے استری کررہی تھی۔

"میں مانتا ہوں کہ میں نے تم سے سخت لہجے میں بات کی تھی' مگر تم دیکھو اگر اسے کچھ ہوجاتا تو..... میں کیا منہ دکھاتا اس کے ماں باپ کو۔"

"تمہیں پرائی بچی کی ٹینشن کیوں ہے آخر؟"

"اس لیے کہ میری بھی ایک بیٹی ہے' اگر اسے کچھ ہوجائے تو میرے دل پر کیا گزرے گی' یہ میں ہی جانتا ہوں۔ تمہاری جب اپنی اولاد ہوگی تو تم سے پوچھوں گا کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے۔"

"تم مجھے طعنہ دے رہے ہو۔" اس نے کپڑوں پر استری رکھ دی' جلنے کی بو آنے لگی۔

"مجھے پتا تھا' تم ایسا ہی کہوگی۔" ابوذر نے ساکٹ سے پلگ نکالا اور شرٹ کھسکا دی۔ یہ اس کی پسندیدہ شرٹ تھی۔

"تمہیں میں بری لگنے لگی ہوں نا۔"

"مجھے تمہاری باتیں بری لگنے لگی ہیں۔" اس نے شرٹ اٹھا کر نیچے پھینک دی۔

"اب یہ بے کار ہوچکی ہے۔"

"تم مجھے بھی ایسے ہی نکال پھینکو گے کہ تم اب بے کار ہوچکی ہو۔" اس کی بات پر وہ دکھ سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور پھر اپنے کمرے کے ساتھ بنے چھوٹے سے کمرے کی طرف آیا جہاں زینی سونے کی کوشش کررہی تھی' وہ آکر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"درد تو نہیں ہورہا؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ اس کو لائیں نا۔"

"کس کو لاؤں؟"

"اپنی بیٹی کو لائیں' میں نے اس کے ساتھ دوستی کرنی ہے۔"

"وہ نہیں آئے گی۔"

"اس لیے کہ آپ اسے لینے نہیں جاتے۔ ملنے نہیں جاتے ہوں گے۔ اس کا خیال نہیں رکھتے ہوں گے۔ اس کے لیے کھلونے لے کر نہیں جاتے ہوں گے۔"

"میں اس کا خیال نہیں رکھتا' نہ کھلونے لے کر جاتا ہوں نہ ہی ملنے... پر میں اسے لینے کے لیے کئی مرتبہ گیا تھا۔ وہ نہیں آئی۔"

"آپ کھلونے لے کر نہیں گئے ہوں گے نا..."

"ہاں... تم پہلے ملی ہوتیں اور مشورہ دیتیں تو میں اس کے لیے کھلونے لے کر ضرور جاتا۔ تمہیں کھلونے اچھے لگتے ہیں۔ تمہارے ڈیڈی لاتے ہوں گے؟"

"وہ کھلونے نہیں لاتے' مگر وہ میرے لیے چاکلیٹ لاتے تھے۔ شانی کہتا ہے' وہ بہت برے ہیں' کیوں کہ وہ شانی اور فاطمہ سے محبت نہیں کرتے' نہ ان سے فون پر بات کرتے ہیں' نہ پیار کرتے ہیں۔ شانی تو ان کے پاس بھی نہیں جاتا اور فاطمہ بھی ان کو پسند نہیں کرتی' مگر بابا مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتا کہ وہ تم سے پیار کرتے ہیں حالانکہ وہ کھلونے بھی نہیں لاتے نہ تمہیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔"

"وہ بہت دور رہتے ہیں ہم سے' کہتے ہیں آنا مشکل ہے۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ زینی بابا کو بہت پیاری ہے سب سے پیاری۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر بتایا۔

"اتنی زیادہ پیاری۔" وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

"آپ بھی کہتے ہیں' اپنی بیٹی سے کہ وہ پیاری ہے؟"

"نہیں۔ میں نہیں کہتا۔"

"اب کہیے گا۔"

"اب کہوں گا۔ پر وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ اس کی ماں اسے مجھ سے ملنے نہیں دیتی۔"

"امی کہتی ہیں اپنے بابا سے نفرت نہیں کرتے... وہ ہمیں ملنے دیتی ہیں' وہ کہتی ہیں' تمہارے بابا میرے ساتھ زیادتی کر سکتے ہیں' مگر تم لوگوں کے وہ باپ ہیں۔ تم لوگوں سے پیار کرتے ہیں' وہ بہت برے ہیں' مگر وہ ہمارے بابا تو ہیں نا۔"

"تمہاری ممی کتنی اچھی ہیں نا۔"

"ان کا نام ہاجرہ ہے۔" وہ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"اچھا۔ اچھا نام ہے... کیا کرتی ہیں وہ؟"

"وہ ڈبل ڈیوٹی کرتی ہیں' سارا آنٹی کہتی ہیں کولہو کی بیل۔" وہ اسے اپنی فیملی کی چھوٹی سے چھوٹی بات جتانے لگی۔

وہ ہفتے کے باقی دن بہت خوش رہا اس کے ساتھ۔ اس نے سوچا تھا اب وہ اپنی بیٹی سے ایک بار پھر ملنے جائے گا۔

ایک آخری بار کوشش کرے گا' اپنی بیوی کو سمجھانے کی' وہ بے خیالی میں زینی کو اپنی بیٹی کے نام سے پکارنے لگا تھا اور عائشہ کے اندر کا شک یقین میں تبدیل ہونے لگا تھا' وہ عجیب وہموں میں گھری تلخ ہونے لگی تھی اور اسی تلخی نے ان کے بیچ ایک دیوار سی کھڑی کر دی تھی' اس نے خود ہی خود کو اس سے دور کر لیا تھا اور بہت دن بعد اس نے اپنی بہن سے بات کی' جو اسے ہمیشہ کی طرح ملامت کر رہی تھی' ان سب کے تئیں ایک ضد کی بنیاد پر عائشہ کی یہ شادی ایک غلطی ہے۔

☼ ☼ ☼

عائشہ ایک سترہ سالہ ناپختہ ذہن کی مالک معصوم سی لڑکی تھی' اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہتی تھی' جو شادی شدہ تھی۔

مال لے آنے جانے کے کام سے اسے گھر آنا پڑتا۔ عائشہ نے ابوذر کو پہلی بار وہیں دیکھا تھا۔

وہ لاپروا سا اپنی دھن میں مگن کام کی بات کر کے چلا جاتا تھا۔ عائشہ کو ایک دن پتا چلا کہ ابوذر شادی شدہ ہے' تو اسے گہری مایوسی ہوئی۔ وہ لاشعوری طور پر اسے سوچنے لگی تھی۔ جس دن اسے پتا ہوتا گھر سے مال جانے والا ہے' وہ بہن کے گھر سے باپ کے گھر آجاتی۔ سارا دن وہاں رہتی۔ وہ بہانے بہانے سے ابوذر سے بات کرتی۔ ابوذر نے اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو بچپنے کا نام دے کر ہمیشہ نظرانداز کیا تھا۔ اسے پتا نہ تھا یہ معصوم سی ضدی لڑکی خود سے کیا ضد لگائے بیٹھی ہے اور اس کے لیے کیا سوچتی رہتی ہے۔ ان دنوں وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب رہتا تھا' کام سے بھی کبھی کبھار دھیان ہٹ جاتا تھا۔ اس کی زندگی پھر اسے کوئی نیا زخم دینے جا رہی تھی وہ خود کو بدنصیب انسان سمجھتا تھا۔ پیدا ہوا تو ماں مر گئی' باپ چھوڑ کر چلا گیا۔ پھپھی نے پالا۔ بس بے دلی سے پالا ہی تھا' پھپھا کی ڈانٹ ڈپٹ مار کا بھی وہی نشانہ بنتا تھا' لڑتے جھگڑتے اور دوسروں کی ڈانٹ کھاتے کھاتے بڑا ہو گیا' پڑھائی میں اس کی دلچسپی کم تھی اور اس کی تعلیم پر کون خرچا کرتا' بچپن سے مزدوری کرتا تھا۔ چھوٹی عمر سے ہی اپنے خرچے خود اٹھا لیے' پھپھو کے بچے بھی اس سے بے زار رہتے تھے۔ ایک بار لڑ جھگڑ کر نکال دیا پھر اسے ماموں اپنے پاس لے آئے ماموں کی بیٹی شروع سے اسے اچھی لگتی تھی' آہستہ آہستہ اس کی پسند محبت کا روپ دھارنے لگی اور سونے پہ سہاگہ کہ ماموں نے کسی کے مشورے پر اسے اپنا گھر داماد بنا لیا۔ پہلے صرف نکاح ہوا۔ ماموں کی شرط تھی وہ کچھ کر لے تو رخصتی کی جائے' سمیرا ابھی پڑھ رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ سمیرا اسے کچھ خاص پسند نہیں کرتی تھی' وہ اسے منہ نہیں لگاتی تھی' نہ ہی اس کے دیگر بہن بھائی ایسا کرتے' وہ کسی غیر ضروری چیز کی طرح اس گھر کے ایک کونے میں بیٹھا تھا اور کتابیں پڑھتا رہتا۔ اس نے ماموں کا کام اچھا خاصا سنبھال لیا تھا۔ ماموں

نے اپنی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بیاہ دیا تھا۔ اب سمیرا ہی رہتی تھی' بڑے اچھے طریقے سے اس کی بھی شادی ہو گئی' نہ کوئی خرچا' نہ جھنجٹ' نہ مسئلہ' نہ مسائل اسے اپنی من پسند ساتھی مل گئی۔ اس نے سمجھا کہ زندگی آسان ہو گئی ہے' وہ اب خوش رہے گا سارے دکھ' مسئلے' پریشانیاں ختم ہو جائیں گی' مگر بہت جلد اسے اپنے خیالات بدلنے پڑے۔

☼ ☼ ☼

وہ کم عمری میں ہی قیصر کی محبت میں مبتلا تو نہ ہوئی مگر متاثر ضرور تھی۔ قیصر اس سے چار سال بڑا تھا' وہ اسے بات بے بات سمجھاتا۔ رعب جھاڑتا اپنے بڑے پن کا رعب اسی پر جماتا۔ وہ اس کی صلاحیتوں کو مان گئی تھی' اسے پتا تھا وہ اسے دلیل سے یا جواز سے قائل نہیں کرپائی۔ جب وہ بولتا تھا تو حیران کر دیتا' مسحور کر دیتا گرفت میں لے لیتا' سحر زدہ ہو کر جاتا' کتابیں بہت پڑھتا تھا۔ اس کا کمرہ کتابوں سے بھرا رہتا اور طرح طرح کے ــــــــ لکھے پھاڑے ضائع کیے ہوئے گولہ بنے ہوئے کاغذوں سے۔ خود اس نے ساری زندگی باپ کو بھی کتابوں میں غرق دیکھا تھا۔ یہ شوق اس کی توجہ بن گیا مگر اس کے اکلوتے بھتیجے قیصر وحید کے اندر سرایت کر گیا' اتر گیا' ٹھہر گیا اور قیصر جیسے سنور گیا' بلکہ سنور ہی جاتا اگر کتابوں تک ہی محدود رہتا۔ وہ تو طرح طرح کی محفلوں مشاعروں میں اٹھنے بیٹھنے' جانے لگا۔ اس کا رنگ ڈھنگ بدلتا گیا' بڑے بڑے الفاظ بولتا اور لمبی آہیں بھرتا تو جوانی کی مستی تھی اور عشق کا بخار تھا محبت بھی سونے پر سہاگہ تھی۔

ان کے گھر پر عجیب غریب ملنے والے' شاعر ادیب آنے جانے لگے۔ جن میں کچھ تو واقعی فنکار تھے' اس نے ایک ادیب کی گہری آنکھوں میں عجیب حیرتوں کا سمندر دیکھا تھا۔ پتا چلا اس کے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں' نوکری نہیں ملتی' نہ کوئی کام دھندا' بس لکھتا رہتا ہے' ادبی پرچوں نے اعزازیہ کیا دینا تھا' پرچہ تک بھیجنا محال تھا' جس کے دروازے پر چار رسالے مفت میں آجاتے' وہ خود کو اس دنیا کا خوش قسمت اور سب سے بڑے پائے کا لکھاری سمجھتا' کوئی ایسا ہوتا کہ جیب میں پچیس ہزار لیے کتاب چھپوانے کو بے تاب پھرتا۔ پبلسٹی کے لیے بے چین' بس رائٹر' شاعر کہلوانے کے شوق نے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔

وہ کونے میں دبکی بیٹھی ان سب کی عجیب و غریب لن ترانیاں' بابا کے قہقہے اور قیصر کی معنی خیز مسکراہٹ دیکھتی سنتی اور سمجھنے کی کوشش کرتی اور ناکام ہی رہتی۔

بس احساسات اُترتے رہتے دل میں۔

اسے ادیب دنیا کی سب سے بیچاری قوم لگتی' اسے ٹوٹ ٹوٹ کر ترس آتا ان نکموں پر جنہوں نے گھر والوں کا جینا محال کر رکھا تھا' نہ کما کر کھلاتے نہ خود کا ہی بوجھ اٹھا پاتے' محفل یاراں میں شام تمام کر کے سڑکوں کے حوالے رات کر آتے' ابا جی بگڑتے بھی تھے ان عادتوں پر' اس نے کبھی اپنے باپ کو بے وجہ مارا پھرتے نہیں دیکھا حالانکہ حلقہ احباب ان کا بھی اچھا خاصا تھا مگر چن چن کر معصوم اور مسکین لوگ جمع کیے تھے جو کہ اچھے خاصے شرفا بھی معلوم ہوتے تھے۔

قیصر جن لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا تھا ان میں سے کچھ آزادی اور کمیونزم کے نام پر اڑتے پھرتے' نہ کوئی دین مذہب نہ عبادت نہ کوئی کام دھندہ بس اڑتے بھاگتے ٹہلتے پھرو۔ سب کچھ خود بخود ہی ہو جائے گا اور ہوتا ہے' خود اپنی ذات سے بیگانہ تھے' اس نے دیکھا وہ دیر سے گھر آنے لگا۔

بابا دیر تک انتظار کرتے۔ فکرمند ہو کر سوتے' عزیز بھائی کی اکلوتی اولاد' بھائی بھابھی جن کو ٹرک نے کچل دیا اور قیصر کو ہاجرہ کے ابا نے گلے سے کیا سینے سے لگالیا۔ آنکھوں کا سرمہ بنادیا۔ آنکھ کا نور تھا' جینے کی آس تھا۔ اکلوتی بیٹی کی کئی خواہشوں کو پس پشت کیا' بیوی چھوڑ کر چلی گئی۔ جھگڑے بہت ہوتے تھے دونوں کے' پھر خلع کا نوٹس آیا' تو طلاق ہو گئی جس پر اثر پڑا' وہ ہاجرہ تھی۔ لوگ ماں پر نفرین بھیج رہے تھے کہ جوان ہوتی بچی کی ماں گھر چھوڑ کر گئی اس عمر میں ہاجرہ بس چار

چھ دن روئی' ابا کی محبت نے سنبھال لیا' وہ باپ کو خود بھی ٹوٹ کر چاہتی تھی' بس بیچ میں قیصر جیسا لاپروا دیوار نہ بنتا تو ساری محرومیاں مٹ بھی جاتیں وہ قیصر کے کمرے کی صفائی کرتی اور بعد میں کئی بار ڈانٹ بھی کھاتی۔

"میرے رسالے کہاں رکھ دیے۔" بکھرے کاغذ سمیٹ کر ایک جگہ رکھنے کی صورت میں بھی شامت آتی۔

"اب اس نظم کا دوسرا سرا کہاں ملے گا۔ اتنے سارے کاغذات۔ کہا بھی تھا کہ مت چھیڑا کرو ان کو۔"

وہ کاغذ تلاش کرتے ہوئے ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیتا اور کمرہ پھر کباڑ خانہ بن جاتا۔ کہیں واسکٹ کہیں جوتا' صوفے کی گدیاں ادھر ادھر پڑی ہوئی۔ کرسی کے نیچے سے تولیہ برآمد ہو رہا ہے تو شرٹ کونے میں دبکی ہے۔ وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر چیزیں اکٹھی کرتی۔ سلیقے سے رکھتی۔

ان ہی دنوں اس نے شیو بڑھالی۔ سیاہ لباس زیب تن کرنے لگا۔ رات گئے تک کھڑکی کے پاس بیٹھ کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ پتا چلا کسی نوجوان شاعرہ کے عشق نے آلیا اور زیر کر دیا ہے۔

پھر جلد ہی شاعرہ کی شادی کا کارڈ آن پہنچا۔

وہ ڈھے سا گیا' مٹ سا گیا' کھانا پینا چھوڑ دیا' چائے کی پیالی پر پیالی پیے جاتا' بوڑھوں کی طرح کھانسنے لگا' ابا جی کو اس کی حالت نے مزید کمزور کر دیا تھا۔

کسی نے مشورہ دیا' شادی کروا دو۔ وہ کئی روز تک اس کی منتیں کرتے رہے۔ وہ نہ مانا' جس دن دل کا پہلا اٹیک ہوا بس بال بال بچے۔

اس دن انکار کی ہمت قیصر کو نہ تھی۔ ہاجرہ اور قیصر کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ ایک بے جوڑ رشتہ طے پایا۔ باپ کے دل کا بوجھ اتر گیا۔ بیٹی کو بہت سمجھایا بہلایا۔ وہ شروع سے قیصر کی خدمتیں کرتی تھی اب کچھ مزید ذمہ داری آگئی کوئی فرق نہ پڑا۔ قیصر کا رویہ پہلی رات بہت برا' پھر صرف برا آہستہ آہستہ بس نارمل ہوتا گیا' کبھی بات کرتا کبھی بات کا جواب تک نہ دیتا۔ کبھی ہوں ہاں کر تا رہتا تو کبھی بے طرح جھڑکتا۔

اس کے ابا اپنے نواسے کی آس لیے دنیا سے چلے گئے۔ وجہ وقت پر علاج نہ ہونا' بے احتیاطی بھی تھی' وہ روتی ٹوٹ کر روتی' بکھر گئی ڈھے گئی' مگر قیصر جیسے انسان کو زیادہ فرق نہ پڑا' اس کے آنسو اس کی محبوبہ کے عشق میں بہنے کے لیے تھے۔ اور فکر معاش فکر حال نہ تھی' فکر فراق تھی اور جوانی پر بیت بازی پسندیدہ مشغلہ تھا۔

وقت بے رحمی سے گزرتا گیا۔ پڑھتے پڑھتے ایک دن حالت تشویش ناک ہوئی پڑوسن اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی پتا چلا کہ خیر سے امید سے ہے۔ عجیب کیفیت تھی' قیصر کو تب بھی کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ فاطمہ کی پیدائش پر اسپتال سے وہ اکیلی آئی قیصر نے ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال دی اور بس۔ چھو کر پیشانی پیار تک نہ کیا' دیکھا تک نہیں کہ کس پر گئی ہے' یہی طریقہ رہا آگے بھی۔ فاطمہ کو پالنے کے ساتھ ساتھ ابا کی دکان سے آتے پیسوں سے وہ ضرورتیں بھی پوری کرتی رہی۔ فاطمہ کے بعد شانی کی آمد نے بھی زندگی میں کوئی ہل چل نہ مچائی۔

بس اتنا فرق تھا کہ کبھی جھک کر پیار کر لیتا' یا دیکھ لیتا' مگر زیادہ نہیں' وہ شکل وصورت میں ماں پر گیا تھا۔ نقش اچھے تھے' سانولی رنگت تھی۔ فاطمہ بھی بس خوش شکل تھی پھر زندگی ہوئی' ایک کمرے میں تین چھوٹے چھوٹے بچے۔

وہ ان کے رونے پر چلاتا چیختا برا بھلا کہتا۔

ان ہی دنوں یونیورسٹی میں ہاجرہ کو سفیر اور سارا مل گئے' دونوں شرارتی نٹ کھٹ زندگی سے بھرپور ہنستے مسکراتے اچھے خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کوئی فکر نہ تھی بس پڑھنا تھا اور شادی کرلینی تھی۔ اسے گھر لوٹنے کی فکر ہوتی تھی' مسائل تھے گھر آکر اس نے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ بچوں کے اخراجات کا دباؤ تھا۔ سارا اس سے لڑتی کہ قیصر کو کہو' اسے احساس دلاؤ اس سے پیسے لو اس کی ذمہ داری ہے' سفیر اسے برا بھلا کہتا' وہ پہلے پہل لڑتی'

جھڑکی روتی ہوئی مگر آہستہ آہستہ [illegible] چھوڑ دیا۔ اس کا شوہر اسی لائق تھا۔

ہاجرہ پہلے پہل قیصر سے لڑتی' احتجاج کرتی' پھر جب دیکھا کہ آگے اثر نہیں ہوتا' پہلے جو وہ چپ چاپ سن لیتا یا کبھی کبھار جھڑکنے لگتا تھا' اب مارنے مرنے پر تلا ہوا تھا۔

وہ اپنی عزت بچا کر امان مانگتی تھی۔

بچوں کا باپ کئی دنوں میں آتا' کبھی بچوں سے بات چیت کر لیتا زینی خود ہی چمٹتی تھی' ٹانگوں کو پکڑ لیتی' ہاتھ تھام لیتی' ارد گرد گھومتی' چڑیوں کی سی بولیاں بولتی تھی۔ ارد گرد منڈلاتی رہتی' تھی بھی بہت پیاری' خوب گوری چٹی' سفید رنگت اور نقش میں باپ پر گئی تھی' اسے بس اس سے ہی انسیت تھی' وہ اٹھا لیتا یا چوم لیتا' جس دن جانا ہوتا وہ زینی سے چھپ کر جاتا۔ دیکھا سوئی ہوئی ہے تو ہی جاتا ورنہ وہ بری صورت میں اسے پتا تھا اس نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لینا ہے۔

البتہ یہ پروانہ تھی کہ اس کے جانے کے بعد وہ کیسے روتی چلاتی ہے' چیزیں پھینکتی ہے' بابا کی مالا جپتی ہے۔ ننھے ننھے گالوں پر موٹے موٹے آنسو بہتے ہیں اور ہاجرہ دل تھام کر بیٹھ جاتی ہے۔ کبھی کبھار خود بھی رونے لگتی ہے تو کبھی اسے ایک تھپڑ مار کر پھر کلیجے سے لگا لیتی ہے تڑپتی اس لیے ہے کہ وہ ماں ہے۔

مگر یہ باپ کیسا باپ ہے' اس شخص کا شوہروں کے بہت برے قبیلے سے تو تعلق تھا ہی مگر وہ باپ بھی بہت برا ہے' وہ اپنے بچوں کے لیے ہمیشہ دکھ کا باعث بنتا ہے۔ وہ باپ کہلانے کے قابل نہیں ہے' کوئی اسے جا کر بتائے تو۔

☼ ☼ ☼

سمیرا پہلے پہل صرف بیزاری کا شکار تھی' پھر باقاعدہ چڑنے لگی۔ اس کی چیزیں کمرے سے اٹھا کر باہر پھینک دیتی۔

شادی کو ابھی ایک ماہ ہی ہوا تھا' اور یہ ایک سال کی طرح گزرا تھا۔

[illegible] کرے گا۔ وہ آیا تو کمرے کے باہر کئی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ شیو کا سامان' پرانے جوتے جن کے تلوے اکھڑنے کو تھے۔ پھٹی ہوئی جیکٹ کی جیب جس کو اندر اڑس اڑس کر وہ چھپا لیا کرتا تھا بوسیدہ کوٹ' سستے کپڑے کی چند قمیصیں لنڈے کی خریدی ہوئی جینز اور ٹی شرٹ۔

ٹوٹی ہوئی زپ والا بیگ' سب کچھ باہر تھا' اس نے سب چیزیں سمیٹیں' یکجا کیں' جمع کیں۔ تھیلے میں ڈالیں اور تھیلی لے کر اندر آ گیا۔

"تم اس کاٹھ کباڑ کو پھر سے اٹھا لائے ہو۔" وہ اسے آتا دیکھ کر چیخی۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب چیزیں پھیلا کر نہیں جاؤں گا۔ استعمال کے بعد اسی بیگ میں رکھ کر جاؤں گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں' انہیں نکالو یہاں سے' مجھے اپنے کمرے میں اتنا زیادہ کباڑ بھرنے کی کوئی خواہش نہیں۔"

وہ کہنا چاہتا تھا' یہ میری چیزیں ہیں' کیا میں تمہارے لیے بے کار ہوں تو پھر مجھے بھی کمرے سے نکال پھینکو اور اسے پتا تھا وہ کہہ دے گی کہ تم بھی نکل جاؤ' اتنے عرصے میں وہ اس کے دل میں پلنے والی نفرت کو تو جان ہی گیا تھا۔

اسے اس لڑکی پر رحم بھی آیا' لڑکی جتنی پڑھی لکھی ہو۔ ماں باپ جس قدر آزاد خیال ہوں' مگر لڑکی کو پسند کی شادی کا اختیار ہرگز نہیں دیتے۔ اس کا غصہ' چڑچڑاپن' نفرت گریز جھجک بے معنی نہ تھی اور اسے حق تھا اس کی بہنوں کی اچھی جگہ شادیاں ہوئی تھیں' ان کے شوہروں کا شمار اچھے کاروباری لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ اچھی شکلوں والے اچھے پیسے والے' اچھی گاڑیوں میں بن ٹھن کر آتے تو کسی ریاست کے شہزادے لگتے تھے۔ اور ایک اچھی شکل والا صرف پیسہ گاڑی' بنگلہ نہ ہونے کی صورت میں کونے میں دبکا بیٹھا سگریٹ پیتا رہتا تھا۔

اس نے سوچا وہ بھی کمائے گا پیسہ بنائے گا تو سمیرا اس کے ساتھ سیٹ ہو ہی جائے گی۔

سمیرا کا رویہ کبھی نارمل ہو جاتا' کبھی اسے چڑچڑے پن کے دورے پڑتے اور وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی جاتی۔

وہ چپ چاپ تماشائی بنا کو سنے سنتا اس کے یا پھر کمرے سے نکل جاتا۔ اس رات باہر سو جاتا' گھر نہ آتا پھر غصہ دیتا تو آجاتا' سمیرا کے ماں باپ بھی یہ سب محسوس کر رہے تھے اس کی ماں کا رویہ بھی ابوذر سے اتنا ہی تلخ تھا۔

احسان صاحب کے چہرے پر ہر وقت تفکر چھایا رہتا۔ بیٹی کے ساتھ زبردستی کرنے کا احساس اندر ہی اندر بے چین کیے رکھتا' بس کسی کو اس نوجوان مسکین صورت والے ابوذر پر رحم نہ آتا تھا' فکر نہ ہوتی تھی' اس کا اپنا کون تھا جو پریشان ہوتا' اس دنیا میں باقی سارے رشتے ایک طرف ماں اور باپ ایک طرف' اس کے ماں باپ نہیں تھے' وہ کس کے آسرے پر احتجاج کرتا' اختلاف کرتا' اعتراض کرتا' سارا کچھ ایک طرف' اس کی بے بسی ایک طرف۔

☆ ☆ ☆

ہاجرہ کی ماں نے دوسری شادی کرلی تھی۔ ایک بیٹا ہوا جو ہاجرہ سے تو کئی سال چھوٹا تھا' ہاجرہ کی ماں جب اس سے فون پر بات کرتے ہوئے حمید کے قصے شرارتیں باتیں بتاتی تو اس کا دل چاہتا دوڑ کر وہاں پہنچ جائے' اس کا کوئی بھائی نہ تھا۔ حمید کو بھائی تصور کر کے اس کا دل نرم ہو جایا کرتا تھا' تب ہی اس کی ماں اس کے پاس لوٹ کر آئی جب وہ خود ایک ماں تھی' اس کے تین بچے تھے جن کے لیے وہ دن رات محنت کرتی تھی' ایک کے بعد ایک کام' پھر اسکول میں جاب مل گئی۔ سیلری بس زیادہ اچھی نہ تھی اتنی کہ گھر کا راشن آجاتا اور دو وقت کی روٹی میسر ہو جاتی۔

ماں کے آنے کے بعد خرچہ دوہرا ہو گیا۔ اس کا علاج اس کی دوائیں' اس نے ایک دو بار حمید کے گھر فون کیا جس کی بیوی نے اسے دس باتیں اور خوب سنائیں۔ ان سب کا خیال تھا کہ وہ ماں کے بہانے خود پیسے ہڑپ کر جائے گی' یا پھر اس بڈھی کو کہو' اپنا انتظام خود کرلے بہو کے کہے گئے لفظ ماں نے بھی سنے۔

حمید بھی ساتھ تھا پر کچھ نہ کہا نہ بیوی کو ٹوکا' بلکہ کہہ دیا "اماں کو بول دیں روز روز پیسے کہاں سے لاؤں گا' میرا اپنا گھر ہے سو خرچے ہیں۔ اب بچہ بھی ہے کہاں سے پیسے بچاؤں میں جوان کو بھیجوں بیٹی پر ناز تھا تو بیٹھی رہیں بیٹی کے گھر۔ بیٹی کیا دوائیں بھی نہیں دلا سکتی ماں کو۔" یہ اس ماں کا بیٹا تھا۔

ہاجرہ فون پکڑ کر ساکت رہ گئی' ماں کو پہلی بار احساس ہوا کہ بیٹے مانگتے ہوئے بیٹیوں کو نظر انداز کرتے وقت بیٹی کے دل کی نرمی' محبت سچائی اور وفاداری کا اور اک پہلے کیوں نہ تھا۔

بیٹے کے لیے روتی ماں کو ہاجرہ نے گلے سے لگایا اور بچوں کی طرح پیار کیا۔ تسلی دی' سمجھا دیا' اس کے بعد ہاجرہ نے ماں کی ذمہ داری ایسے اٹھالی' جیسے تین بچوں کی ذمہ داری اس کے سر پر تھی' سارا کی اخبار میں جاب ہو گئی۔ اس نے وہیں اس کے لیے کوششیں شروع کردیں اور ایک دن اسے دفتر بلوالیا' پہلا مہینہ ٹیسٹ پر رکھا گیا۔ وہ ذہین تھی' محنتی تھی۔ خوب اچھا کام کیا۔ وہ اسکول اور اخبار کے دفتر سے ملی تنخواہ سے گھر چلا رہی تھی۔ بچوں کی تعلیم پر خرچا ہو رہا تھا۔ ماں کا علاج ہو رہا تھا۔ کبھی ایک دو ہزار بچ جاتے اور کبھی سارے بچے ہوئے بھی خرچ ہو جاتے۔

مشکل وقت کو اچھے وقت کی امید پر ٹالتی رہی۔ بچوں کو بہلاتی پھسلاتی رہی۔ ساری باتیں ایک طرف۔ اس لاپروا آوارہ شخص کے دیے گئے زخم ایک طرف' جو اس کے بچوں کے دلوں پر اثر ڈالتے تھے۔

کئی دنوں سے زینی الارم لگا کر سو رہی تھی۔ اسے پتا تھا وہ رات گئے اٹھتی ہے۔ پھر سو جاتی ہے۔ وہ فون ملاتی ہے وہاں سے ریسیو نہیں ہوتا یا نمبر بند ملتا ہے۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے لمبے ہوتے جاتے

ہیں۔ پھیل جاتے ہیں۔

وہ اپنی زینی کو کلیجے سے لگا کر ڈھیر سارا پیار کرتی اور دعا کرتی کاش اس کے پیار اس کی محبت سے وہ کمی پوری ہو جائے' جس کی بچوں کو باپ سے توقع ہے۔

***

مگر ایک دن معاملہ صاف ہو ہی گیا۔ قیصر آیا تھا' بہت خوش گوار تاثر چہرے پر سجا تھا۔ نیا نیا دولہا۔ بچوں کو پکڑ کر بیٹھ گیا "میں تمہیں تمہاری نئی ممی کی تصویر دکھاؤں۔"

سیل فون کھول کر بیٹھ گیا۔

ہاجرہ کے ہاتھ سے برتن گرتے گرتے بچا' شانی کا چہرہ بجھ گیا۔ فاطمہ پاس سے اٹھ گئی۔

زینی حواس باختہ تصویریں دیکھتی رہی۔ منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ باپ کے پاس سے اٹھنا اس کے لیے مشکل تھا۔ وہ زینی کو ساتھ لگائے بیٹھا بتا رہا تھا۔

"یہ وہی آنٹی ہیں جو آپ کے ساتھ آئس کریم کھا رہی تھیں؟"

زینی کی انگلی اس تصویر پر رک گئی' معصوم آنکھوں میں اور بھی سوال تھے' فاطمہ کونے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ شانی کی آنکھیں بھر آئیں۔

ہاجرہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' کمرے میں گئی' اس کی ساری چیزیں اکٹھی کیں ایک بیگ میں بھریں اور باہر آکر منہ پر دے ماریں۔

"آج کے بعد میرے بچوں کی زندگی میں زہر گھولنے مت آنا۔ نکل جاؤ اور رہو اپنی نئی بیوی کے ساتھ۔ میرے بچوں پر تمہارا اور تمہاری گندی فطرت کا سایہ بھی نہ پڑے۔" وہ پہلی بار چیخی تھی۔ آنکھوں میں پانی بھرا تھا اس کا چہرہ دھندلا تھا وہ خباثت سے ہنسا تھا۔

"اس گھر میں میرا بھی حصہ ہے۔ لے کر رہوں گا۔ تم مجھے ایسے نہیں نکال سکتیں' میرے بچوں کو مجھ سے۔"

"بکواس بند کرو۔ تمہارے بچے۔ کوئی تعلق نہیں ہے تمہارا۔"

اس کا تھیلا باہر پھینکا' زینی کو اس سے الگ کیا۔

"نکلو یہاں سے ابھی اور اسی وقت۔ تمہاری اس گھر میں اب کوئی جگہ نہیں۔" دھکا دے کر باہر کیا۔

"جا رہا ہوں' جا رہا ہوں' مجھے کوئی شوق نہیں ہے آنے کا۔ دس دس دفعہ فون کرتے ہیں۔ تب ان سے ملنے آتا ہوں۔ تمہاری شکل دیکھنے کا شوق نہیں ہے مجھے۔"

بکتا جھکتا دروازے سے بیگ اٹھا کر چلا گیا۔

بچے رونے لگے' بچوں کی ماں نے تینوں بچوں کو ساتھ لگا لیا۔ وہ خود بھی رو رہی تھی۔

بچوں کی نانی نے آج اپنی ___ بیٹی میں ایک ماں دیکھی۔

ایسی ماں جو کبھی ہاجرہ کی ماں میں نہ جاگ سکی۔

***

پرنسپل نے کمرے میں بلا کر خوب برا بھلا کہا تھا اور نوکری سے فارغ کر دیا تھا۔ ایک اور امتحان آ گیا' وہ چپ چاپ چلی آئی۔ وہ نوکری ڈھونڈنے لگی' صبح سویرے نکل جاتی پھر شام کو اخبار چلی جاتی وہاں بھی اس کی سیلری نہیں بڑھائی جا رہی تھی۔ بمشکل اس بار سترہ ہزار ہوئے' بل جمع کروانے کے بعد کئی چیزیں راشن سے نکالنے کے بعد بھی راشن __ پورا نہ ہو سکا' اماں کی آدھی دوائیں لیں' آدھی رہ گئیں۔ ابھی بچوں کے اسکول کی فیس باقی تھی۔

"کیا ہوا ہاجرہ! کچھ بنا؟" اماں پریشان تھیں۔

"کچھ نہیں ہوا اماں۔" چہرے سے تھکن ظاہر تھی' اور لہجے سے بیزاری۔ وہ کمرے میں چلی گئی۔

شانی ایک کپ چائے بنا لایا۔

"کیا ضرورت تھی پتی چینی ضائع کرنے کی۔" لہجہ عجیب سا تھا۔ اس نے سر جھٹک دیا۔ اور پھر دل ہی دل میں خود کو کوستے ہوئے چائے کا کپ تھام لیا' شام کو پھر بارش ہوئی چھت ٹپکنے لگی' ایک کمرے کی دیوار بھی گیلی سی ہو گئی' اس نے سب کو ایک ہی کمرے میں

منتقل کردیا، بچے رات تک سوگئے۔ بجلی چلی گئی تھی، وہ لیٹی ہوئی تھی، پتا تھا اماں بھی اس کی طرح پرانے ٹیرز گارڈز والی بوسیدہ چھت کو آسمان سمجھ کر گھور رہی ہیں۔

"اماں۔" آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آرہی تھی۔

اماں سیدھی ہوگئیں۔ "بول"۔

"اماں۔ آپ حمید کے پاس چلی جائیں۔"

وہ اسے حیرانی سے دیکھنے لگیں، جو ابھی تک چھت کو دیکھ رہی تھی۔ "تو چاہتی ہے میں وہاں مروں جہاں کوئی میرے پاس دو منٹ بیٹھ کر بات تک نہیں کرتا۔ جانوروں کی طرح کوٹھی میں ڈال کر روٹی دے جاتے ہیں۔ ایسے پھینک کر جیسے جانوروں کے آگے چارہ ڈالا جاتا ہے۔"

"اماں۔" اس نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔

"یہاں آپ کو کیا ملتا ہے اماں! بمشکل دوائیاں۔ پھل تک نہیں لاسکتی میں آپ کے لیے۔ اور اب دوائی بھی۔ آج آپ کی گولیاں نہیں لائی میں۔ جو بہت ضروری تھیں۔ جن کے بغیر آپ کو نیند بھی نہیں آتی۔"

"ہاجرہ۔ میں تیرے پاس مرنا چاہتی ہوں۔" آواز کس قدر نحیف تھی۔

"اماں! اس طرح کی باتیں کرکے آپ مجھے پریشان کررہی ہیں۔" شکوہ در آیا۔

"ہاجرہ۔ میں چاہتی ہوں، مجھے یہاں موت آئے۔

"ہاجرہ! میں سب سے پہلے یہاں بیاہ کر آئی تھی۔ یہیں تو پیدا ہوئی۔ بڑی ہوئی۔ تیری شادی ہوئی۔ بچے ہوئے۔ اس گھر نے پھر سے مجھے پناہ دی۔ یہ گھر بہت بڑی جگہ رکھتا ہے۔ کہنے کو چھوٹا ہے۔ مجھے دوبارہ نہ کہنا کہ حمید کے پاس چلی جا۔ میں یہاں خوش ہوں ہاجرہ! ہر حال میں خوش ہوں۔ میں کوشش کرتی ہوں سونے کی۔ نیند آجائے گی۔ گولی کی فکر نہ کر۔"

"کس چیز کی فکر کروں اور کس چیز کی نہ کروں۔"

آج اسے بھی گولی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ نیند کی گولی کی۔

☆ ☆ ☆

سمیرا کو ڈاکٹر نے خوش خبری دی تھی۔ وہ پھولے نہیں سمارہا تھا۔ ماموں بھی بہت خوش تھے لگا جیسے سب کچھ ٹھیک ہونے جارہا ہے وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ بہت کوشش کی ختم کروانے کی مگر کوئی بن اس کے اس کام میں شامل نہ ہوئی۔ جیسے تیسے تکلیف میں یہ مہینے تمام ہوئے۔ ننھی پری کی پیدائش پر کون خوش نہیں تھا۔ ایک اس کی ماں تھی جو نڈھال سی بیٹھی تھی پھیکی مسکراہٹ تک ہونٹوں پر نہ تھی۔ مگر کیا کرے۔ آخر ماں تھی بچی کے رونے پر تڑپ جاتی تھی۔ ابوذر سے اس کا رویہ آخری حد تک خراب ہوگیا۔ فیصلہ کرلیا تھا کہ اب اسے یہاں ٹکنے نہیں دینا۔ ایک دن اس نے ابوذر کو دھمکی دی کہ "وہ خودکشی کرلے گی۔ اگر اس نے نہ چھوڑا تو" اس نے بہت سمجھایا کہ اب ہم دونوں ایک بچی کے ماں باپ بن گئے ہیں۔ کم از کم اس کے لیے کچھ سوچو۔ مگر وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے لیے تیار نہ تھی۔

دونوں کے درمیان لڑائی ہوئی۔ وہ تھک ہار کر اسے طلاق کا نوٹس دے کر نکل آیا۔ چند ماہ کی بچی کی طرف دل کھنچتا تھا مگر کیسے دیکھتا۔ کیسے رہتا وہاں۔ اب کوئی جواز نہ تھا۔

تب ہی اسے عائشہ کے والد ملے، جنہوں نے اسے اپنے کام میں شامل کرلیا اور آہستہ آہستہ اتنا اعتماد آگیا کہ اسے گھر کے کاموں میں بھی شامل کرلیا تھا۔

وہ ایک دوبار بچی سے ملنے گیا مگر نامراد لوٹا۔

اسے عائشہ کی محرومیوں میں اپنی محرومیاں نظر آتی تھیں۔ عائشہ کی منگنی ہورہی تھی اور ہو بھی گئی۔ لڑکا اچھا تھا۔ اس کا ہم عمر۔ اس جیسا سانٹ کھٹ، خوب صورت، پڑھا لکھا۔ مگر عائشہ خوش نہ تھی۔ وہ کئی دنوں سے کھانا نہیں کھا رہی تھی ڈھنگ سے۔ اسے عائشہ میں سمیرا نظر آنے لگی تھی۔

وہ اس کے ماں باپ کو سمجھانا چاہ رہا تھا کہ زبردستی نہ کریں۔ مگر اس سے پہلے عائشہ نے حد کردی۔

شور مچادیا کہ شادی کرنی ہے تو ابوذر کے ساتھ۔

گھر میں بہت ہنگامہ ہوا۔ ابوذر کام چھوڑ کر چلا گیا۔ دوسری جگہ کام ڈھونڈنے لگا۔

خوش قسمتی سے اختر مل گیا۔ اسکول میں ساتھ پڑھا ہوا تھا۔ اس نے سفارش کی۔ بات کی۔ کمپنی میں جگہ بھی خالی تھی۔ کمپنی کو ایک محنت کش نوجوان ملا اور نوجوان کو اپنا روزگار۔

کئی سالوں بعد وہ چین کی نیند سویا تھا۔ اسے اب پتا چلا کہ چین کی نیند کیا ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

ایک سال بعد عائشہ کے باپ نے ابوذر کو ڈھونڈا تھا۔ اور عائشہ سے نکاح پڑھوا دیا۔ ابوذر نے خاصی حیرانی سے اپنے نکاح میں شرکت کی۔ نکاح نامے پر سائن کرتے ہوئے لڑکیوں کی طرح ہاتھ بھی کانپے تھے۔

اب اسے عائشہ کے باپ نے ایک ٹاسک دیا کہ وہ کہیں بھی، کسی بھی جگہ اپنا گھر بنالے اور اسے رخصت کرا کے لے جائے، کیمپ سے نکل کر گھر بنانے کا مرحلہ سخت تھا۔

وہ پہاڑ کی چھوٹی سی چوٹی جہاں پر ان کا کیمپ کئی مہینوں تک لگا رہا تھا۔ اسے وہ چوٹی اور اس کے نیچے بہتی ہوئی نہر کتنی اچھی لگتی تھی۔ چوٹی پر قبضہ کرنے کی صورت میں کوئی اس سے پوچھ کچھ کرنے والا نہ تھا۔ اللہ کی زمین اس کے بندوں کے لیے بچھی جاتی تھی۔

اس نے بسم اللہ کی، دوست کی مدد سے قرضہ لیا، دو کمروں کا مکان بنانے میں کامیاب ہوا جس میں آدھا کام لکڑی کا تھا۔

شہر کے شور سے دور پہاڑوں کی گود میں ابوذر کا چھوٹا سا محل تیار تھا۔

وہ عائشہ کو چند لوگوں کی موجودگی میں رخصت کرا کے لے آیا۔

وہ خوش تھی حالانکہ اسے اس علاقے سے ڈر لگتا تھا مگر اس نے اکیلے رہ کر اس کا انتظار کرنا سیکھ لیا۔ وہ چھوٹے سے محل کی رانی بن گئی اور اسے چھوٹے سے محل کا راجہ بنا دیا۔

دور پہاڑوں میں لکڑی کے محل میں راجہ، رانی نے زندگی کی بنیاد رکھی تھی۔ زندگی پہاڑوں میں رقص کرتی تھی۔

ابوذر کو اب زندگی زندگی لگتی تھی، وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین مرد سمجھنے لگا تھا، جسے ایک کم عمر، خوب صورت لڑکی چاہتی تھی۔ اتنا کہ اس کی پسند کا کھانا بنتا، اس کی پسند کی چیزیں رکھی جاتیں اس گھر میں، اس کی رانی نے اس کے لیے زندگی آسان بلکہ خوش گوار کردی تھی، یہ تھی نئی شروعات اس کی زندگی کی مگر۔

☼ ☼ ☼

بارش بہت زیادہ برس رہی تھی وہ بمشکل دفتر سے گھر پہنچی، بچے پریشان تھے۔ رات بھر اس سے لپٹے رہے۔

"کیا واقعی اس بار سیلاب آئے گا۔" فاطمہ ڈری سہمی اس سے چمٹ کر لیٹی ہوئی تھی۔

"نہیں آئے گا۔" وہ اسے ساتھ لگائے ہوئے اس بوسیدہ چھت کو دیکھ رہی تھی۔

اماں سو چکی تھیں۔ زینی ان کے ساتھ سوئی تھی۔ وہ، فاطمہ اور شانی جاگ رہے تھے۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اسکول نہیں جاؤں گا۔" شانی نے سر اٹھا کر کہا تھا۔

وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ "کیا کہا پھر سے کہنا۔"

"اب اسکول نہیں جاؤں گا۔" وہ ضدی بچے کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے کھینچ کر ایک تھپڑ لگایا۔ وہ ساکت کھڑا رہا۔ زندگی میں پہلی بار ہاتھ اٹھایا تھا۔

"بولو۔ کیا بولتے ہو۔" وہ چیخی، عجیب وحشت سے۔ فاطمہ کا دل دہل گیا، اماں نیند سے بیدار ہو گئیں۔ "کیا ہوا ہاجرہ! خیریت ہے نا۔"

"کہتا ہے اسکول نہیں جاؤں گا۔"

"تو تم نے اسے مارا ہے کیا۔" وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ روتے ہوئے شانی کی ہچکی بندھ گئی۔ ساتھ لگالیا نانی نے۔

"آئندہ اگر یہ کہا کہ اسکول نہیں جاؤں گا تو بتاؤں گی اچھی طرح آوارہ پھرنا اپنے باپ کی طرح... اسکول نہیں جاؤں گا۔"

"اس وقت بچوں پر برس رہی ہو۔ پاگل ہو گئی ہو۔ ارے استغفار پڑھو کیسی بجلی چمک رہی ہے۔" وہ دیر تک بڑبڑاتی رہیں پھر شانی کو ساتھ لگائے ہوئے سو گئیں۔

صبح قریب تھی کہ اس نے شانی کو جاگتے ہوئے پایا' دل بھر آیا۔ اسے اپنے پاس بازو پر لٹایا۔

"تمہیں پتا ہے بیٹا! میرے پاس کچھ نہیں سوائے تم لوگوں کے۔ بہت خواب دیکھ رکھے ہیں تمہارے حوالے سے... تم نہیں پڑھو گے تو میرے خواب کون پورا کرے گا۔ نوکری مل جائے گی۔ برا وقت گزر جائے گا۔ وقت رکتا نہیں اور برے وقت کے بعد اچھا وقت بھی آئے گا۔"

"ہم پیسے کہاں سے لائیں گے ممی۔ اگر نوکری لیٹ ملی۔ پیسے ختم ہو گئے۔ نانی کی دوا نہیں ہے۔ چھت ٹوٹ رہی ہے۔"

"میں زیور بیچ دوں گی۔ میرا زیور تم ہو۔"

"میں آپ کو زیور بیچنے نہیں دوں گا ممی!" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تو پھر صبر کرو... اچھے وقت کا انتظار... دیکھو' تم میرے بیٹے ہو۔ میرے دوست' میرے ساتھی... تمہیں میرے ساتھ مل کر حالات بہتر بنانے ہیں۔ اس کے لیے مجھے کام کرنا ہے اور تمہیں پڑھنا ہے۔"

"میں پڑھنے کے ساتھ کام بھی تو کر سکتا ہوں نا امی۔"

"کیا کام؟"

"میں ریڑھی لگالوں گا..."

اس کا دل ٹوٹ گیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔

"آیندہ ایسے نہ کہنا میری جان! تمہاری ماں زندہ ہے ابھی۔ کما سکتی ہے۔ تم کیوں ایسا سوچنے لگے ہو۔" اور وہ ماں کے سینے سے لگ کر یہ سوچتا رہا کہ جو بچے ریڑھی لگاتے ہیں' پھول بیچتے ہیں' بھیک مانگتے ہیں' ان کی مائیں یہ کیوں نہیں سوچتیں۔ ہر ماں اس کی ماں جیسی کیوں نہیں ہے اور ماں بیٹے کو ساتھ لگائے یہ سوچ رہی تھی کہ سب بچے ایسے ہونے چاہئیں جیسے کہ میرا شانی ہے۔

✵ ✵ ✵

بارش سے جگہ جگہ پانی جمع ہو رہا تھا' ایک طرف رستہ اوپری سطح پر تھا جہاں سے بچے اسکول اور بڑے اپنی اپنی مصروفیات کو نکل رہے تھے۔

ہاجرہ نے برآمدے سے پانی نکالتے ہوئے کھڑکی سے جھانکا۔ سامنے شانی کھڑا تھا اور رستے سے کچھ لڑکے جو پانی ہٹا رہے تھے' وہ ان کے ساتھ مل کر سڑک صاف کر رہا تھا تاکہ لوگ باآسانی گزر سکیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ اور وہ صفائی کر کے جیسے ہلکی پھلکی ہو گئی۔

آج سارا بھی آئی تھی اور اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس کے زیور اور اچھے کپڑے اپنے ساتھ رکھنے کے لیے لے گئی۔ اسے پختہ یقین تھا کہ دریائے سندھ میں آنے والا پانی کا سیلابی ریلا یہاں بھی اپنے چھینٹے اڑائے گا۔ اس نے ہاجرہ کی بہت منتیں کیں کہ وہ بچوں کو لے کر اس کے گھر شفٹ ہو جائے مگر اس نے ایک نہ مانی۔ وہ چیزیں لے کر چلی گئی۔

ایک دو دن گزر گئے' بارش میں تیزی آرہی تھی اور سیلابی ریلا نزدیک تھا۔

خوف اور وحشت نے ہر جگہ ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ لوگ نقل مکانی کر رہے تھے۔ جو نہیں جا سکتے تھے' وہ حفاظتی بچاؤ کرنے لگے۔

اماں کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اتنی کہ کہیں لے جانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

وہ بچوں کو ماں کے پاس چھوڑ کر دوا لینے کے لیے نکل گئی۔ راستے خراب تھے۔ آدھے گھنٹے کا سفر ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا' سیلابی ریلا اس علاقے کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

ہاجرہ کے ساتھ ساتھ کچھ اور لوگوں کا بھی اندازہ تھا کہ ہو سکتا ہے پانی رخ موڑ لے ادھر نہ آئے۔ نیچے بہہ جائے کیونکہ ایک بار وہ بچ بھی چکے تھے۔

اس نے دوا لی' سواری ملنا مشکل ہو رہی تھی۔ وہ کافی پیدل چلی پھر رکشہ ملا۔ آدھے رستے پر چھوڑ کر گیا' آگے پانی ہی پانی تھا۔

اس کا دل دہل گیا' دھڑکن جیسے رک گئی' کچھ دیر کال کر لیتی مگر فون بھی گھر چھوڑ آئی تھی۔ سیلابی ریلا اس کے علاقے میں گھس گیا تھا۔ یہ علاقہ دریا سے قریب تھا۔

اس کی آنکھیں ایسے بہہ رہی تھیں جیسے زمین کی سطح پر پانی پھیل کر بہہ رہا تھا۔

آگے رستہ بند تھا۔ اس کے ہاتھ میں دوائیں اور کھانے پینے کی اشیا کا تھیلا تھا جو اس نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

اسے صرف گھر کی پروا تھی اور گھر والوں کی...

اماں' شانی' فاطمہ' زینی...

دل رک گیا جیسے۔ وہ اندھا دھند آگے بھاگی۔ آگے کوئی گڑھا تھا جس میں گر گئی... اٹھنا اور بچنا محال تھا جیسے...

☼ ☼ ☼

گھر کی چھت گر گئی تھی' پانی گھس آیا تھا' کون گرا' کون بچا۔ اوسان خطا تھے۔ چیخیں تھیں۔

شانی کے ہاتھ میں نانی کا بازو تھا' وہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھیں۔ شانی کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ انہیں گھسیٹنے میں کامیاب ہو گیا' مگر تب تک وہ دم توڑ چکی تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر بھاگتے' نکلتے لوگوں کو متوجہ کرنے لگا تھا۔

کوئی اس طرف آیا تھا۔ ان دونوں کو گھسیٹ کر آگے کیا۔ جہاں سے پانی کم تھا اور نکلنا شاید کچھ آسان۔ دو افراد نے مل کر اسے اور نانی کو اٹھایا۔ گاڑی میں ڈالا' ان کے سر پر اینٹ گری تھی بہت خون بہہ رہا تھا۔

وہ جیسے بے ہوشی کے قریب تھا۔ زینی اور فاطمہ کو آواز دینا چاہتا تھا مگر حلق میں کچھ پھنسا ہوا تھا جیسے۔

اس کا سر کسی کے کندھے پر ڈھلک گیا تھا۔ آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد اسے ہوش نہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھ کھلی تو اماں اس کے قریب تھی۔ بازوؤں پر چوٹ کے نشان تھے۔ وہ بمشکل آگے آسکی تھی' جہاں سے اسے ماں کی نعش ملی تھی بمشکل اٹھا کر ان کو قریبی علاقے میں اس کے پڑوسیوں نے دفن کیا تھا۔ ان کے کسی گروپ میں فاطمہ بھی زندہ سلامت مل گئی تھی۔ چوٹیں تو اسے بھی بہت آئی تھیں مگر چوٹیں تو بھر جاتی ہیں۔ زینی کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ رو رو کر بچوں کا برا حال ہو گیا تھا' نانی کی موت اور زینی کی جدائی...

بس ایک ہی سوال تھا۔ کیا زینی بچ گئی ہوگی۔

کیا وہ ہمیں ملے گی۔

سارا اور سفیر پہنچ گئے تھے۔ گھر لے گئے اسے۔ کچھ دن تک وہ وہیں رہی پھر ایک جگہ کم کرائے پر مکان مل گیا۔

سارا اور سفیر مل کر اپنا کوئی کاروبار شروع کر رہے تھے۔ سارا سڑکوں پر دوڑ دوڑ کر تھک گئی تھی جیسے' اس سیلاب کی نشریات' حادثوں نے جیسے اس کے اندر کی توانائی چھین لی تھی۔

سفیر تو ویسے بھی اس کی وجہ سے ہی پڑا تھا۔ وہ ہاجرہ کو اپنے ساتھ نئے کاروبار میں ملا رہے تھے۔ زندگی معمول پر لوٹنے لگی تھی' مگر اس کی زینی... جس کے ملنے کی آس کبھی دم توڑتی تو کبھی امید کی کرن روشن کرتی۔

آج صبح سارا اور سفیر آئے تھے۔ انہیں مل کر پھر سے کچھ کرنا تھا۔ زینی کو تلاش کرنے کے لیے۔

سفیر کے چہرے پر تھکن تھی' مگر وہ ہشاش بشاش لہجہ لیے اس کے پاس کھڑا تھا سارا نے بچوں کو ساتھ لپٹا کر خوب پیار کیا' اب وہ ان کو کہانی سنانے لگی تھی۔

ہاجرہ ناشتے کی ٹرے لے کر ان کے پاس آئی۔ انہوں نے سوچا پھر سے تھانے چلتے ہیں' اخبار میں اشتہار دیتے ہیں۔ شاید کوئی امید پوری اترے۔ وہ تینوں بچوں کو اسکول چھوڑ کر خود نکل گئے اللہ کا نام لے کر۔ وہ نام جو کام بناتا ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ رات کا پہلا پہر تھا جب سفیر اور سارا گھر کے لیے نکلے تھے اور وہ کھانے کے برتن سمیٹنے لگی تھی' جب دوبارہ دروازہ بجایا گیا۔

"میں دیکھ لوں ممی!" شانی کمرے سے باہر نکلا تھا۔

"دیکھ لو۔۔۔ مگر دھیان سے۔ پہلے پوچھ لینا کہ کون ہے۔" وہ برتن دھونے لگی تھی۔ شانی کے پیچھے پیچھے قیصر آ رہا تھا' شانی عدم دلچسپی دکھاتا ہوا کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔

"کیسی ہو؟" وہ اس کی طرف آیا۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔

"میں تم سے بات کر رہا ہوں۔"

"اپنے مطلب کی بات کرو۔" وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

"بچوں سے ملنے آیا ہوں میں۔۔۔ کہاں ہیں میری بیٹیاں۔ بیٹے کو تو تم نے میرے خلاف کر دیا ہے۔"

"بہت جلدی نہیں یاد آ گئی تمہیں اپنی بیٹیوں کی؟" لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"مجھے تمہاری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ فاطمہ' زینی کہاں ہو بچے۔۔۔" اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔ شانی کو کتابوں میں محو پایا۔ فاطمہ بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر اٹھی تھی مگر اس تک آئی نہیں۔

"کیسی ہو بیٹا؟" وہ خود آگے بڑھا۔ اسے پیار کیا۔

"کیا یہ سچ ہے۔ زینی واقعی گم ہو گئی ہے؟" کمرے کے اطراف میں دیکھتے ہوئے جیسے یقین کرنا چاہا۔

فاطمہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا' اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"تم ٹھیک ہونا۔" اس نے پہلی بار فاطمہ کی اداس آنکھوں میں دیکھا تھا بغور۔۔۔ اس کی آنکھیں گہری براؤن تھیں جن میں دکھ اور ڈر ہلکورے لے رہا تھا۔

اس نے فاطمہ کو ساتھ لگا لیا۔ "ہم اسے ڈھونڈ لیں گے۔ وہ مل جائے گی۔۔۔ زینی ہمیں مل جائے گی۔" وہ زندگی میں پہلی بار فکر مند ہو رہا تھا۔

"شانی۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔ میرے پاس۔" اس نے بازو بڑھا کر اسے قریب کرنا چاہا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اس کا لہجہ سرد تھا' مگر آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ وہ حیرت سے اسے دیکھے گیا۔

"میں تمہارا باپ ہوں شانی! تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم میرے پاس آؤ۔" پہلی بار لہجہ شکستہ تھا۔

"اس کی عادت نہیں ڈالی آپ نے۔" وہ کتاب بند کر کے کمرے سے باہر چلا گیا۔

"تم اپنی ماں کی زبان بول رہے ہو۔" اس نے بلند آواز میں کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسے فوری طور پر بلوایا گیا تھا' جاتے ہوئے وہ بار بار اسے زینی کے بارے میں تنبیہہ کرتا رہا تھا' پہلے وہ جانے سے پہلے اسے اپنا خیال رکھنے کے لیے کہتا تھا۔ اور نہ جانے کے بہانے ڈھونڈتا تھا اب تو اسے پکا یقین ہو گیا کہ یہ بچی اس کی بیٹی ہے۔ وہ حیران نہ تھی خائف تھی خفا اور نہ ناراض۔۔۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

"مجھے پتا تھا' میں تمہیں خوش نہیں رکھ سکوں گا۔۔۔ مجھے پتا تھا' تمہیں ایک دن مجھ سے ڈھیر ساری شکایتیں ہوں گی۔" رات اس نے اس کی بات کے جواب میں کہا تھا جب اس نے کہا کہ

"مجھے پتا ہے' تم اپنی پہلی زندگی سے نہیں نکل

پاؤ گے۔ مجھے پتا تھا۔ تم مجھے دل سے نہیں چاہو گے۔۔۔ تمہیں میرا' میری محبت کا' میری سچائی کا کوئی احساس نہیں ہو گا پر میں بے وقوف تھی' احمق تھی۔"

"مجھے پتا تھا' تم بے وقوفیاں کرو گی۔۔۔ تم اب بھی احمق ہو۔ ناسمجھ ہو۔ اکیس بائیس سال اتنی بھی کم عمر نہیں ہوتی مگر تم سولہ سال کی بچیوں کی طرح بی ہیو کرتی ہو۔ بہتر تھا۔۔۔ تم اسی لڑکے سے شادی کر لیتیں۔" وہ آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم نے کیا کہا ابوذر؟"

"میں نے کہا کہ تمہیں اسی لڑکے سے شادی کر لینی چاہیے تھی۔۔۔ وہ شاید تمہیں خوش رکھ پاتا۔ بہت پیسہ' بہت پیار۔"

"ایک دفعہ پھر یہ سب کہنا۔۔۔"

"بار بار کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ اتنا کہتا ہوں۔ اب بھی سوچ لو۔ تمہاری زندگی ہے۔۔۔ تم چاہو تو لوٹ سکتی ہو۔ وہاں سب کو انتظار ہے کہ تم لوٹ جاؤ گی۔ تمہارا باپ مجھے تمہیں یہاں رکھنے اور بہت سی ضروریات نہ پوری کرنے کی وجہ سے برا بھلا کہنے لگا ہے۔

تمہاری سوتیلی ماں کو تو کوئی خاص دلچسپی نہیں' مگر وہ بھی میرا مذاق اڑاتی ہے۔"

وہ گھڑی پہن کر اس کی طرف مڑا اور کچھ ضروری چیزیں ڈھونڈنے لگا۔

"زندگی بہت لمبی ہے۔ میرے ساتھ نہ رہ پاؤ تو۔۔۔ ابھی فیصلہ کر لو۔"

"یہ سب تم اپنی بیٹی کی وجہ سے کہہ رہے ہو' ہے نا۔"

عورت اپنی محبت میں کتنی کمزور اور بے وقوف بن جاتی ہے یہ وہ بھی نہیں سمجھ پاتی بعض دفعہ۔

"مجھے تم نے۔۔۔ اس بچی نے اور وقت نے احساس دلا دیا ہے کہ مجھے اپنی بچی کو ساتھ رکھنا چاہیے۔ میں چاہوں تو اسے ان محرومیوں سے بچا سکتا ہوں جو میری زندگی میں آئیں' جو میں نے تمہارے اندر دیکھیں۔ میں نہیں چاہتا' میری بیٹی ادھوری زندگی گزارے۔ تم اگر دل سے قبول کر سکو میری بیٹی کو تو اچھی بات ہے مگر مجھے تم سے کچھ اچھی امید نہیں' بہرحال۔۔۔ تم سوچ لو' میں تمہیں سوچنے کے لیے وقت دیتا ہوں۔ ابھی ہماری کوئی اولاد نہیں۔۔۔ ابھی تمہارے لیے پلٹنا شاید آسان ہو۔"

وہ کتنی آسانی سے یہ سب کہہ رہا تھا جو سوچنے کا تصور بھی اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے اندر کا اشتعال بڑھ رہا تھا غصہ بڑھ رہا تھا۔

"تم چاہو تو۔۔۔"

چٹاخ۔۔۔ "اتنی بڑی جرأت" بائیس سالہ لڑکی نے ایک زوردار تھپڑ دے مارا ایک پینتیس سالہ آدمی کو۔

بیوی نے شوہر کا آخری حربہ خود آزمایا جب زبان کسی چیز کو نہیں بیان کر پاتی' سمجھا پاتی' غصہ اور اشتعال بڑھ جاتا ہے تو ہاتھ اٹھتا ہے۔ وہ بلاشبہ غصے کی اتنی ہی تیز تھی مگر۔

وہ حیرانی سے اپنا ہاتھ دیکھنے لگی۔ یہی اٹھا تھا اور اس کے محبوب کا گال دہکا گیا۔ اتنی طاقت۔ ابوذر کے لفظوں نے اسے جتنا دکھ دیا۔ وہ سارا سمیٹ کر اس نے ایک تھپڑ میں اتار دیا۔

وہ چاہتا تو اسے پیٹنا شروع کر دیتا' مگر وہ کم ظرف مرد نہ تھا' درندہ نہ تھا۔ ایک معصوم سی لڑکی کی جرأت پر حیران ضرور تھا' مگر اس نے بدلہ نہیں لیا۔ بیگ کندھے پر ڈالا اور بے تاثر چہرے کے ساتھ باہر نکلا۔ سیڑھیاں اتر تا جا رہا تھا۔

عائشہ نے اپنا سر پٹخنا شروع کر دیا۔ زینی ایک کونے میں کھڑی سہمی ہوئی تھی۔ اس نے ایک عجیب تماشا دیکھا جو اس نے اپنے گھر میں کبھی اور صورت دیکھا تھا۔ اس کے دل میں بڑوں کا کردار کچھ مشکوک ہو گیا۔

وہ جو کئی دنوں سے نہیں روئی۔ رونا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ امی کو پکارتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر' چیخ چیخ کر رونے لگی اور عائشہ نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا تھا اور پھر تھپڑ مار دیا۔ زینی کے رونے میں کمی کے بجائے تیزی آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سمیرا نے پہلی بار اسے فون کیا تھا۔ اس کی شادی ہو رہی تھی یہ بتانے کے لیے نہیں بلکہ یہ کہنے کے لیے کہ اپنی بیٹی کو کچھ دنوں میں آکر لے جانا۔

سمیرا کا لہجہ نرم تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ اپنی بیٹی سے باپ نہیں چھیننا چاہتی۔ ابوذر نے بڑی خاموشی سے اس کی بات سنی اور جب اس کی بات ختم ہوئی تو بغیر الوداعیہ کلمات کہے اس نے فون بند کر دیا۔

اس کے چہرے پر ایک تکلیف دہ مسکراہٹ پھیل گئی' اسے پتا تھا سمیرا کے شوہر نے بچی کو ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا ہے حالانکہ سمیرا اتنی آسانی سے کہاں بچی اس کے حوالے کرنے والی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی دوبارہ اپنے طریقے سے شروع کرنے جا رہی تھی۔

اس نے سوچا' وہ فیلڈ سے فارغ ہو کر ایک دو دن میں اپنی بیٹی سے ملنے جائے گا۔ اس کے لیے ڈھیر سارے کھلونے لے جائے گا۔ اس کے لیے طرح طرح کی چیزیں لے جائے گا کھانے کی۔ اس کے لیے اچھے والے کپڑے خریدے گا۔ یہ سوچ کر ہی اس کی مسکراہٹ سے تکلیف غائب ہونے لگی تھی۔

اس نے سوچتے ہوئے اخبار اٹھایا سرسری نظر گزرتے ہوئے پلٹی اور پلٹ کر ٹھہر گئی۔

یہ تصویر زینی کی تھی۔ اطلاع گمشدگی کے ساتھ نیچے کانٹیکٹ نمبر بھی دیے گئے تھے۔ وہ فوراً" متوجہ ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کتنا زہر بھر دیا ہے تم نے میرے بچوں کے دل میں میرے خلاف۔" وہ صبح چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے زہر بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"افسوس کہ مجھے ایسا کچھ کرنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی نہ ہی ضرورت پڑی تم نے خود ہی اپنے عمل' اپنے رویے' اپنی ظالمانہ فطرت سے ان کے اندر یہ زہر کا بیج بو دیا۔ جسے کئی سال ہو چکے ہیں۔ اور اب تمہیں احساس ہو رہا ہے کہ تمہارے بچے تم سے نفرت کرتے ہیں۔ انہیں تم سے نفرت ہی کرنی چاہیے۔ کسی دیر میں اپنی اہلیت اور اصلیت کھلی ہے تم پر مگر کھل بہر حال گئی۔"

اس نے ایک عرصہ اس شخص سے دبتے جھجکتے' اس کا لحاظ کرتے ہوئے گزارا تھا۔ اب اس کے اندر رتی برابر اس کے لیے ــــــ نہ نرمی تھی نہ گنجائش۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسے دھکے دے کر نکال دیتی' مگر وہ بچوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی' نہ ہی اپنی پریشانیوں کو بڑھانا چاہتی تھی۔

"تم نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔ بہت برا کیا ہے۔ بدلہ لے رہی ہو مجھ سے۔" وہ زور سے چیخا تھا۔

شانی کمرے سے باہر آیا۔ "آپ میری ماں سے لڑ رہے ہیں۔" وہ ان دونوں کے بیچ کے فاصلے میں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

"میں تمہارا باپ ہوں شانی!" اس کا لہجہ کچھ دھیما پڑا۔

"مجھے پتا ہے۔" شانی کا لہجہ دھیما مگر کاٹ دار تھا۔

"تم طنز کر رہے ہو۔ اپنے باپ پر۔ کس قدر بگاڑ دیا ہے تم لوگوں کو تمہاری ماں نے۔"

"ممی۔ اندر چلیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہوا۔

"مجھ سے بات کرو شانی! بتاؤ کیا کہتی رہتی ہے یہ عورت تم لوگوں کو۔ بتاؤ کتنا ورغلاتی ہے اپنے باپ کے خلاف۔ بولو۔ بولو نا۔" اس نے شانی کا بازو پکڑ کر پاگلوں کی طرح کہا تھا۔

"چھوڑو میرے بیٹے کو۔ کوئی حق نہیں ہے تمہیں اسے ہراساں کرنے کا۔" اس نے بازو چھڑایا۔

شانی اس کے پیچھے جا چھپا تھا۔

"ممی! یہ مجھے ماریں گے۔" شانی کو اس کی وحشت سے ڈر لگ رہا تھا۔

"میرے سامنے' میرے ہوتے ہوئے کوئی یہ جرات نہیں کر سکتا۔"

"اچھا ہوا' میں نے تم پر بھروسا نہیں کیا۔ اچھا ہوا' میں نے تمہیں اس قابل نہیں سمجھا۔ تم تھیں ہی اس قابل۔ نفرت کرتا ہوں میں تم سے۔"

"تم اگر ہماری زندگیوں کو پھر سے تباہ کرنے آئے ہو تو چلے جاؤ۔ بجائے غم بانٹنے کے، تمہیں ایسی باتیں سوجھ رہی ہیں۔"

وہ خاموشی سے کمرے کی طرف گیا۔

"بہت کوشش کی تھی کہ ان کے دل پر تمہارے خلاف کوئی اثر نہ پڑے، بہت کوشش کی کہ یہ تمہارے لیے اچھا سوچیں، مگر تم نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ یہ تم پر ڈیپینڈ نہیں ہیں، اس لیے ان کو ہراساں کرنے کا سوچنا بھی نا۔" وہ کچن سے باہر نکل گئی دروازے پر بیل ہو رہی تھی۔ وہ ہونٹ چبانے لگا۔ لفظوں کے کھلاڑی کے پاس جوابی لفظ کمزور پڑ گئے تھے۔ دروازہ کھلنے پر سارا اور سفیر اندر آئے تھے۔ سفیر نے اس کو سلام کر کے حال احوال پوچھا تھا وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو نا سفیر!" اس کے چہرے پر یقین اور بے یقینی کی سی کیفیت تھی۔ وہ سفیر سے بات کر رہی تھی۔

"ہاں، میں سچ کہہ رہا ہوں یقین کرو تم، مجھے کچھ دیر پہلے ہی فون آیا ہے وہ آدمی اپنا نام ابوذر بتا تا ہے اور اس نے اخبار دیکھا ہے۔ وہ بتا رہا تھا۔ اسی علاقے کا جہاں سے یہ کیمپ لگائے گئے تھے۔ اسے وہیں سے زینی ملی تھی۔"

"اف خدایا!" ہاجرہ کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"سفیر! میں نفل پڑھ لوں شکرانے کے۔" اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔

"پڑھ لینا میڈم! مگر ابھی چلیں خاصا دور ہے وہ علاقہ۔"

"ہاں چلو۔ جلدی چلو۔ میں تسبیح تو لے لوں سفیر۔"

وہ کمرے کی طرف بڑھی۔

سارا کمرے میں گھسے بچوں کو باہر لائی تھی۔ بچے اس سے خوشی سے چمٹے ہوئے تھے۔

اس سب میں وہ کتنا اجنبی لگ رہا تھا، اس نے پہلی بار یہ سب محسوس کیا تھا۔

"ہم بھی چلیں گے۔" فاطمہ اور شانی کے چہرے کھل اٹھے تھے۔

"ضرور چلیں گے۔ جلدی چلو۔ راستے میں ناشتا لے لیں گے۔ مجھے پتا ہے، تم نے ناشتا نہیں کیا ہوگا۔"

وہ شانی کو ساتھ لگائے اس کے بال بگاڑتے ہوئے پیار سے کہہ رہا تھا۔ شانی اس سے چمٹا ہوا اس کا بازو تھامے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ پوچھ رہا تھا۔ کبھی اس نے بیٹے کو یوں لپٹا کر نہ پیار کیا تھا نہ ہی وہ اس طرح لاڈ کرتا تھا۔ وہ لوگ عجلت میں باہر نکلے۔ سارا نے اسے بھی کہہ دیا تھا ساتھ چلنے کو، مگر وہ ان سب کو ایک ساتھ خوش دیکھ کر مزید جلنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے گھر بیٹھ کر انتظار کرنے کا کہا۔

شانی، سفیر کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور سارا ہاجرہ اور فاطمہ پیچھے بیٹھے تھے۔ وہ گھر کے بیرونی دروازے کے ساتھ کھڑا دل جلا رہا تھا۔ گاڑی آگے بڑھنے کے بعد اس نے بڑے غصے سے دروازہ بند کیا اور دروازے کی پشت پر مکا جڑ دیا، جس سے دروازے کو تو کوئی فرق نہیں پڑا مگر اس کا ہاتھ لوہے کے دروازے سے ٹکرا کر جیسے سن ہو گیا تھا، جس پر اس کے چہرے کا تاثر دیکھنے لائق تھا۔

☆ ☆ ☆

ابوذر خلاف توقع تیزی سے آ رہا تھا۔ کل ہی تو وہ گیا تھا۔ وہ جی بھر کر حیران ہو رہی تھی اور کچھ ڈری ہوئی۔

"زینی۔ زینی کہاں ہو بچے!" وہ ایک سے دوسرے کمرے میں جھانک کر آوازیں دینے لگا پھر لاؤنج، کچن ہر جگہ۔ واش روم میں بھی دیکھ آیا۔ کمرے کے دروازے، کونے درزیں جیسے کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔ ساتھ ہی وہ آوازیں بھی دیے جا رہا تھا۔

"کہاں ہے زینی۔" وہ پاگلوں کی طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا تو اس کے پیچھے آیا۔

"مجھے کیا پتا۔" مری سی آواز نکلی۔

"کیا مطلب۔ تمہیں کیا پتا۔ اس کے گھر والے اسے لینے آ رہے ہیں۔ پہنچنے والے ہوں گے۔" وہ بوکھلا گیا اس کے انداز پر۔

"وہ۔ واقعی تمہاری بیٹی نہیں تھی؟"
"عائشہ!" اس کا جی چاہا اسے پیٹنا شروع کر دے۔
"کہاں ہے وہ۔ بتاؤ۔ کہاں ہے۔ کیا کیا ہے اس کے ساتھ۔" وہ اس کے آگے بڑھتے ہی دیوار سے جا لگی تھی۔
"مم۔ میں کیوں ماروں گی اسے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ قسم کھاتی ہوں میں نے کچھ نہیں کیا۔ بس تھپڑ مارا تھا۔"
"کیا۔ تم نے اسے مارا۔" یہ بھول گیا کہ تھپڑ تو وہ اس کو بھی مار بیٹھی تھی۔ چھوٹی سی بچی کو مارنا کیا دشوار تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رک گیا۔ عائشہ نے آنکھیں بھینچ لیں پھر اس کا رکتا ہاتھ دیکھ کر کھولیں۔
"سچ سچ بتاؤ۔ اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ سچ بتاؤ۔ تھپڑ نہیں ماروں گا۔ گلا دبا دوں گا۔ بتاؤ۔" وہ اس کے گرد دیوار پر ہاتھ جمائے کھڑا دھاڑ رہا تھا۔
"مم۔ مجھے واقعی نہیں پتا۔ وہ پتا نہیں کہاں چلی گئی۔" اس کی گھگھی بندھ گئی۔
"دیکھو اگر اسے کچھ ہوا۔ وہ نہیں ملی۔ کچھ بھی۔ کوئی نقصان بھی تو میں تمہیں اس کے ماں باپ کے حوالے کروں گا۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات۔ پھر جیل بھجوا دوں گا۔"
اس کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔ عائشہ نے پھر سے آنکھیں بھینچ لیں۔
"وہ۔ وہ نیچے گئی تھی۔ اسے ڈھونڈ لیتے۔ ہیں۔"
وہ فوراً نیچے کی طرف آیا' جب تک سفید کرولا روڈ پر کھڑی تھی اور اس میں سے کچھ لوگ اتر کر ادھر ہی آ رہے تھے۔ وہ وہیں سیڑھیوں کے بیچ رکا رہ گیا۔ پھر اوپر آیا۔
"وہ آ گئے ہیں وہ لوگ۔ آ رہے ہیں ادھر۔ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ بات کرنا خود ہی۔ کتنا ظلم کیا ہے تم نے ایک معصوم بچی پر اور کہاں چھوڑ آئی ہو۔ ایف آئی آر کٹے گی تم پر۔" وہ مزید کہتا مگر قدموں کی آواز سیڑھیوں سے اوپر آ رہی تھی۔
"السلام علیکم۔ مسٹر ۔۔۔ !" سفیر اسے سامنے دیکھ کر آگے بڑھا اور ہاتھ بڑھایا۔
"وعلیکم السلام۔ میں ابوذر۔" اس نے ہاتھ فوراً تھام کر چھوڑ دیا۔
"آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے ہمیں اطلاع دی۔ ہم آپ کا احسان کیسے اتاریں' بتائیں۔" سفیر متاثر کن انداز میں کہنے لگا۔
"زینی کہاں ہے۔" ہاجرہ آگے بڑھی اور اردگرد دیکھنے لگی۔
"وہ۔ وہ یہیں تھی۔ یہ اس کی چیزیں۔ کپڑے۔" اس نے اس کے اسکارف کی طرف اشارہ کیا جو لاؤنج میں سامنے ہی کھونٹی پر لٹکا تھا۔
"پر وہ ہے کہاں۔ اسے پتا ہے ہم آ گئے ہیں۔" سارا آگے بڑھی تھی۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ جو خالی نظر آ رہا تھا۔ دوسرے میں عائشہ بت بنی کھڑی تھی۔
"ادھر آؤ۔" ابوذر نے اسے آواز دی کڑک دار لہجے میں۔
وہ کانپتی ہوئی باہر آئی۔
"وہ تھی یہاں۔ رات بھی۔ مگر وہ۔ اصل میں۔ وہ شور کرتی تھی' روتی تھی' ضد بھی کرتی تھی۔"
"وہ ہے کہاں؟" ہاجرہ جیسے رو دینے کو تھی۔
"وہ غصے میں پتا نہیں کہاں۔ کہیں نیچے' شاید یہیں کہیں۔ پتا نہیں کہاں چلی گئی۔" کہتے ہوئے آواز کانپی تھی۔
"کیا مذاق ہے یہ۔" سارا کا لہجہ تلخ تھا۔
"دیکھیے' میں اسے ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گیا تھا کل۔ یقین کریں۔" ابوذر بھی بوکھلایا ہوا تھا۔ اور ہاجرہ نے شانی کو تھام لیا تھا۔ شانی اور فاطمہ کو بھی چپ لگ گئی تھی۔
"دیکھیے ابو ذر صاحب! ہمیں صرف اپنی بچی چاہیے۔" سفیر کا لہجہ تلخ ہو گیا۔
"دیکھیں میں' ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں ناواقف ہوں۔ ورنہ میں آپ کو اطلاع کیوں دیتا۔ دیکھیں' وہ یہیں کہیں ہو گی۔ ہم ڈھونڈتے ہیں۔ مل جائے

گی۔ ایک رات میں وہ کہاں جاسکتی ہے بھلا۔"

"ہاجرہ! بچوں کو لے کر رکو یہیں ہم آتے ہیں۔" سفیر نے ابوذر کو ساتھ چلنے کا کہتے ہوئے پھر اس سے کہا۔

"میں ساتھ چلوں گی۔ میری زینی۔" اس کی آواز بھرآگئی۔

"نہیں، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ تم رکو۔ ہم آتے ہیں۔"

سارا بچوں کو لے کر اندر آگئی۔ اور بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر انہیں پانی پلایا۔

"سب ٹھیک ہوجائے گا۔ وہ مل جائے گی۔ اوکے۔" وہ بچوں کو سمجھا رہی تھی۔

بچوں نے بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

☆ ☆ ☆

نہر کے کنارے ایک سوئٹر ملا تھا۔ ابوذر چونکا تھا۔

"یہ تو اس نے پہن رکھا تھا۔"

"ابوذر صاحب! ہم پولیس کو کال کرتے ہیں۔" سفیر نے موبائل اٹھایا اور نمبر ملانے لگا۔ تب ہی ہاجرہ چیخی۔

"وہ۔ وہ کیا ہے۔" وہ پاگلوں کی طرح آگے بڑھی، جہاں سے پتھر پر کوئی چھوٹا سا اسکارف لہرا رہا تھا۔ وہ تینوں اس سمت بڑھے۔ بڑے پتھر کے نیچے وہ گری تھی۔ کانپ رہی تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھی۔

سفیر نے اسے فوراً اٹھالیا۔ ہاجرہ چمٹ گئی۔ زینی بخار میں تپ رہی تھی۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر ماں کو بے یقینی سے دیکھا اور ہاجرہ نے اس کا سر چوم لیا۔ گلے سے لگالیا۔

"بچی کو لے چلیں۔ بہت ٹھنڈی ہوا ہے۔" ابوذر کا جیسے اکھڑا ہوا سانس بحال ہوا تھا۔

سفیر نے اسے گاڑی میں لٹایا اور سارا اور بچوں کو بلانے گیا۔

"دیکھیے، آپ کھانا وغیرہ کھا کر جایئے سفیر صاحب!" ابوذر اس کے ساتھ اوپر آیا۔

"نہیں بہت شکریہ ابوذر! ہمیں بچی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔ وہ بخار میں تپ رہی ہے۔ آپ کا شکریہ۔

چلو سارا!"

"زینی مل گئی؟" وہ اٹھی اسے دیکھ کر۔

"ہاں مل گئی ہے گاڑی میں ہے، چلو بیٹے دھیان سے۔" وہ تینوں آگے بڑھے۔

"سفیر! وہ ٹھیک ہے نا۔" سارا کو بے چینی تھی۔

"تم نیچے جاؤ، ہاجرہ اکیلی ہے۔ بخار ہے اسے۔" وہ بچوں کو لیے نیچے اترنے لگی۔

"میں آپ سے بات کروں گا ابوذر صاحب! آپ کو کچھ پیسے وغیرہ یا پھر۔"

"کچھ نہیں سفیر صاحب! کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ میں خود ایک بیٹی کا باپ ہوں۔" ابوذر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

"اوکے بہت شکریہ۔ ملیں گے پھر۔ بات ہوگی۔" وہ ہاتھ ملا کر اللہ حافظ کہہ کر نیچے چلا گیا۔ اس کے پہنچتے ہی گاڑی اسٹارٹ ہوئی تھی۔ ابوذر ریلنگ پر جھکا تھا۔

"بچ گئیں تم۔ شکر کرو۔ ورنہ۔ یقین آگیا تمہیں کہ وہ میری بیٹی نہیں تھی۔ میری بیٹی سمجھ کر پتا نہیں تم نے اس پر کتنے ظلم ڈھائے ہوں گے۔ شرم آنی چاہیے۔ ایک بچی پر۔ کیسے احساس ہوگا۔ اپنی اولاد۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اور کمرے کی طرف چلا گیا۔

عائشہ اسے دیکھتی رہی، دل چاہ رہا تھا۔ یہیں سے کود کر جان دے دے۔ شرمندگی کا کیسا عالم تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ لوگ رات گئے گھر لوٹے تھے۔ وہ گھر سے باہر ہی نہیں گیا، البتہ وہ چھ گھنٹے سوتا رہا اور کچھ دیر پہلے ہی اٹھا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ اب باہر جائے، مگر تب تک وہ لوگ آچکے تھے، یہ کوئی رات نو بجے تک کا وقت تھا۔

"زینی کیسی ہو۔" وہ آگے بڑھا اسے بانہوں میں

اٹھانا چاہا۔

"آپ ہمیں چھوڑ کر نئی آنٹی کے ساتھ چلے گئے تھے۔" زینی کے اس سے کئی شکوے تھے۔ پہلی بار وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

"آپ پھر ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے؟" وہ اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔

سفیر اور سارا ہاجرہ کے ساتھ کھڑے تھے۔ سب نے مل کر کھانا کھایا۔ زینی وقفے وقفے سے سفیر سے چاکلیٹ یا کسی چیز کی فرمائش کر رہی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ ان کے لیے چیزیں لایا کرتا تھا۔

"بخار اُتر جائے تو لاؤں گا۔ جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ پہلے۔"

"زینی میں تمہارے لیے چاکلیٹ لاؤں؟" قیصر نے بڑی حسرت سے کہا تھا۔

"آپ تو نہیں لاتے۔ انکل لاتے ہیں۔" اس کی بات پر قیصر کا چہرہ اُتر سا گیا۔

"اب لاؤں گا۔" وہ اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ رات ساڑھے گیارہ بارہ تک وہ لوگ چلے گئے۔ بچے سو گئے تھے دن بھر کے تھکے ہوئے تھے۔

قیصر کا فون بجنے لگا۔ وہ باہر آیا بات کرنے کے لیے۔ اس کی بیوی کا فون تھا۔

ہاجرہ کچھ فاصلے پر کھڑی تھی' اسے دیکھ کر وہ زیادہ بات نہ کر سکا۔ ہوں ہاں میں جواب دے کر فون بند کر دیا۔

ہاجرہ خاموشی سے بچوں کے کمرے میں چلی گئی۔ قیصر کا بستر دوسرے کمرے میں لگایا گیا تھا۔ وہ بچوں کے کمرے میں آیا' جہاں ہاجرہ اپنا بستر بچھا رہی تھی بچوں کے بستر کے ساتھ۔

"میں اپنے بچوں کے ساتھ سونا چاہتا ہوں۔" وہ اس سے بغیر کچھ کہے باہر نکل گئی۔ وہ اس کے پیچھے باہر آیا۔ "تم بھی سو سکتی ہو یہاں پر۔"

"میرا گھر ہے' مجھے پتا ہے مجھے کہاں سونا ہے۔" وہ دوسرے کمرے کی طرف گئی۔

"تم بیوی ہو میری۔" اس کا لہجہ جتانے والا تھا۔

"جانتی ہوں۔" اس کے ہونٹوں پر عجیب مسکراہٹ تھی۔ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا اس کے جاتے ہی وہ بند دروازے کے سامنے کھڑا بند دروازے کا مفہوم سوچ رہا تھا۔

اسے کون بتاتا کہ دوسروں کی راہیں بند کرنے اور ان پر زندگی تنگ کرنے والوں کو دروازے ہمیشہ بند ملتے ہیں' پھر یہ ان پر ہے کہ وہ لوٹ جائیں یا بند دروازے پیٹتے رہیں۔

☼ ☼ ☼

یسرا کی شادی ہو گئی تھی' اس کا شوہر اسے اپنے ساتھ مسقط لے گیا تھا جہاں ان کی رہائش اور کاروبار تھا۔

ابوذر بہت سارے کھلونے اور ڈھیر ساری چیزیں لے کر اپنی بیٹی کو لینے گیا تھا اور اسے اپنے چھوٹے سے لکڑی کے محل میں لے آیا تھا۔

اسے یقین تھا کہ آہستہ آہستہ عائشہ اسے قبول کر لے گی۔ اس کی بیٹی بہت پیاری تھی۔ وہ شرارتیں نہیں کرتی تھی نہ شور کرتی نہ تنگ کرتی۔ وہ بات بھی بہت کم کرتی تھی شاید اس کی تربیت میں شامل احساس کمتری اسے پوری طرح اٹھنے نہیں دے رہی تھی۔

ابوذر اس کے ساتھ بہت وقت گزارتا تھا' وہ عائشہ کا بھی خیال رکھنے لگا تھا۔ عائشہ اس سے محبت کرتی تھی۔ اسی لیے اس نے اب بے وقوفیاں کرنی کم کر دی تھیں۔

اس نے یہ حقیقت تسلیم کر لی تھی کہ ابوذر کی بیٹی کو اب اس کے ساتھ ہی رہنا ہے۔ وہ چاہے بھی تو کچھ نہیں کر سکتی۔ عائشہ کا رویہ بچی سے بہت اچھا نہ تھا تو برا بھی نہ تھا۔ ابوذر اتنے پہ ہی مطمئن تھا۔ کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس دنیا میں جو بھی آیا ہے' وہ دکھوں سے' مشکلوں سے' پریشانیوں سے گزرنا ہے۔ اس نے بہت ساری باتوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

اسے گزرتے وقت نے بتایا کہ کوئی پریشان حال ایسا

نہیں ہے۔ جس کا کوئی پرسان حال نہ ہو۔ ہر بے چارے کا یہاں کوئی نہ کوئی چارہ ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری بیوی میں اگر کوئی عیب ہے تو تمہیں یہ سوچ کر اسے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ سوچو کہ تم میں بھی کچھ عیب ہوں گے۔ یا پھر تم خود کو بے عیب سمجھتے ہو۔ کیونکہ تم نے کبھی آئینے میں اپنا اصل چہرہ نہیں دیکھا۔ یا پھر آئینے نے تم سے خاص رعایت رکھی۔"

ہاجرہ بہت دنوں بعد اس کے ساتھ بیٹھ کر بات کر رہی تھی۔

چار دن یہاں ٹک کر اس نے ہاجرہ کو دیکھا تو اسے زندگی کے کٹھن ہونے کا احساس ہوا تھا وہ احساس بعض اوقات جھنجھوڑ دیتا ہے۔ ہلا دیتا ہے۔

وہ اسے کولہو کے بیل کی طرح کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اپنے حساس بچوں کو دیکھتا تو نہال ہو جاتا، مگر یہ سب محنت اس کی بیوی کی تھی اس میں اس کا کوئی ہاتھ نہ تھا' اس لیے وہ خوش ہو سکتا تھا مگر فخر نہیں کر سکتا تھا۔

وہ خود سے شرمندہ رہنے لگا تھا۔ اس نے وہاں جانا چھوڑ دیا' جہاں اس کی محبوبہ رہتی تھی۔ ایک دن ہاجرہ نے اس کا فون ریسیو کیا اور بات سنی۔ وہ رو رہی تھی۔

"تم ایک سیلفش مرد کے لیے رو رہی ہو۔ ایک ایسے مرد کے لیے جو تمہاری خاطر اپنے بچوں کو چھوڑ سکتا ہے تو تمہیں چھوڑنا اس کے لیے کیا مشکل ہو گا۔ تمہیں رونا نہیں چاہیے۔"

پھر اس نے ہاجرہ کو بتایا کہ اس میں ایک کمی ہے' وہ بچہ پیدا نہیں کر سکتی۔ پہلے شوہر نے بھی اسی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ اس نے سوچا اب قیصر کے ساتھ وہ نئی زندگی کا آغاز کرے گی۔ ہاجرہ نے اسے علاج کرانے کا مشورہ دیا۔ اسے جاب کرنے کا کہا اور اس کی ہمت بندھائی۔ اس کے بعد وہ پہلی بار قیصر سے خود مخاطب ہوئی اتنے روز میں۔

"میں اب اپنے بچوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔"

"میں اکیلے رہنے کی عادی ہو گئی ہوں قیصر! بچوں کی وجہ سے میں تمہارے ساتھ ایک گھر میں رہنے کے لیے تیار ہوں مگر بحیثیت اپنے بچوں کی ماں' اس سے زیادہ مجھ سے امید مت رکھنا۔"

"ہم نئے سرے سے زندگی نہیں شروع کر سکتے ہاجرہ!" اس بار وہ ہنس۔ سکی نہ مسکرا سکی۔

"میرے دل میں تمہارے لیے کچھ نہیں ہے اب جیسے مرے ہوئے لوگ زندہ نہیں ہو سکتے' ویسے مرے ہوئے ساتھ کا بھی زندہ ہونا مشکل ہے۔ میں تم سے نفرت نہیں کرتی۔ تمہارے لیے اتنا کافی ہونا چاہیے۔" وہ مسکرا کر اٹھ گئی۔

بچے خوش تھے کہ ان کے ماں باپ ان کے ساتھ ہیں' ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ زندگی شاید اب اتنی مشکل نہیں۔

قیصر نے اپنی زمین بیچ کر ایک پلاٹ خریدا تھا۔ وہ اب اس پر آہستہ آہستہ تعمیر کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ اب کمانا چاہتا تھا۔ اسے محنت کرنا تھی۔ ساری زندگی زمینوں سے آتا منافع کھاتا رہا اپنی ضروریات پوری کرتا رہا مگر اب محنت سے کمانا چاہتا تھا۔

قیصر اچھا شوہر نہ بن سکا مگر وہ اب کوشش کر رہا تھا کہ ایک اچھا باپ بن جائے۔ وہ محنت کر رہا تھا جو کہ مشکل ہوتی ہے' وہ اس بند دروازے کے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا' مگر اس ___ کی چابی وہ کھو چکا تھا۔

جیسے استغفار کرنے سے گناہ جھڑتے ہیں اسی طرح مسلسل آواز دینے سے کبھی کوئی لوٹ بھی آتا ہے اور دروازہ کھل بھی جاتا ہے۔

دروازے پہ ہونے والی ہلکی سی دستک کو نظر انداز کر کے وہ اپنے کام میں مگن تھی۔ دوسری بار دروازہ نسبتاً" زور سے بجایا گیا' چوڑی پیشانی پہ ناگواری کی شکن ابھری اور اس کے متحرک ہاتھ رک گئے۔ لیپ ٹاپ بیڈ پہ رکھے' بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے وہ اپنے کام میں محو تھی۔ اس کے نوٹس پاس ہی بکھرے تھے۔ سفید رنگ کی پوری آستین کی فراک نما قمیص پہنے' جس پہ نفیس کڑھائی اور کروشیا کا کام تھا اور ہم رنگ پاجامہ۔ جس کی چوڑی بس تین' چار انچ ہی نظر آ رہی تھی۔ کیونکہ قمیص کی لمبائی ٹخنوں سے ذرا اونچی تھی۔ بالوں کو بے ترتیبی سے اکٹھا کر کے کیچر میں عجلت میں جکڑا گیا تھا۔ ایک پل کو اس نے وال کلاک کی طرف نظر گھمائی۔

"دس بج کر اٹھارہ منٹ۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"آجائیں۔" لہجے میں بلا کی بے زاری تھی' ادھیڑ عمر ملازمہ کمرے کا دروازہ کھول کر داخل ہوئی۔

"ایمان بی بی! آپ کو صاحب نے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔" ہاجرہ اماں نے پیغام پہنچایا۔

"اس وقت۔" نظر اس بار لیپ ٹاپ اسکرین کی دائیں جانب مڑی۔ "اچھا آپ چلیں' میں آ رہی

ہوں۔" اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس نے کہا۔
اپنے نوٹس بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔
توفیق کمال کے کمرے کے دروازے پر رک کر اس نے ہلکی سی دستک دی۔
"آجاؤ ایمان!" توفیق کمال کی آواز آئی۔ وہ اندر داخل ہوئی۔ کنگ سائز بیڈ پر پاؤں پسارے توفیق کمال بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیوز چینل دیکھ رہے تھے۔
"آپ نے بلایا ڈیڈی" ایمان نے صوفے پر شگفتہ کے ساتھ بیٹھتے پوچھا۔
"سو تو نہیں رہی تھیں۔" شگفتہ نے ایمان کے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلاتے محبت سے پوچھا۔
"نہیں ممی! ایک اسائنمنٹ بنا رہی ہوں۔ صبح فرسٹ ٹائم میں جمع کروانی ہے، کچھ ٹائپنگ اور پرنٹنگ کا کام رہتا ہے۔" ایمان نے وضاحت کی۔
"پھر تو ہم نے آپ کو ڈسٹرب کیا؟" توفیق کمال کے لہجے میں وہ شیرینی تھی، جو ایمان کے لیے ہمیشہ ان کے لفظوں میں ہوتی تھی۔
ایمان نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ حالانکہ اس وقت وہ کافی الجھی ہوئی تھی۔ وہ تینوں بھائی، بہن اپنے باپ کے بہت قریب تھے اور توفیق کمال اپنے بچوں سے فارمل تو بالکل نہیں تھے۔
"ایمان! پرسوں لنچ ٹائم سے پہلے گھر آجانا۔" شگفتہ نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
"ممی! آپ کو پتا ہے نامیری اور گنائزیشنل بی ہیویر کی کلاس ہفتے کو دو بجے شروع ہوتی ہے اور ہفتے کو میں ساڑھے تین سے پہلے گھر آ ہی نہیں سکتی۔" اس نے ماں کو یاد دلایا۔
"دراصل آج جہانزیب لندن سے واپس آگیا ہے۔ میں نے اور تمہاری ماما نے سوچا خود ملنے جانے کے بجائے سکندر بھائی کی فیملی کو لنچ پہ انوائیٹ کر لیتے ہیں۔" توفیق کمال نے کہا۔
"میں پرسوں بارہ بجے تک گھر آجاؤں گی۔" ایمان جانتی تھی آگے کچھ کہنا بے معنی ہے۔
"میں اب جاؤں ڈیڈی! میری اسائنمنٹ ابھی باقی ہے۔" رکنا فضول تھا اس لیے اجازت طلب کی توفیق کمال بھی شاید بات پوری کر چکے تھے۔ اس لئے مسکرا کر بیٹی کو اجازت دی۔ وہ مسکرا کر شب بخیر کہتی اپنے کمرے میں آگئی۔ اسائنمنٹ مکمل کر کے فارغ ہوئی تو یوں ہی لان میں کھلتی کھڑکی پر آکھڑی ہوئی۔ بارہ کب کے بج چکے تھے۔
"تو جہانزیب سکندر پاکستان آگیا ہے۔" اس نے زیر لب کہا۔ اس نام نے دل میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں کیا تھا۔ کھڑکی کے پردے ڈوری سے برابر کر کے وہ بیڈ پر آبیٹھی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی، وہ سونا چاہتی تھی، لیکن ذہن ماؤف تھا۔ عجیب اضطرابی کیفیت تھی۔ وہ خود نہیں جانتی تھی وہ کس بات پہ مضطرب ہے۔ سب کچھ تو طے تھا۔ پھر یہ بے چینی کیوں؟ یا پھر اسے معلوم تھا۔

☼ ☼ ☼

ناشتے کی ٹیبل پہ سب لوگ جمع تھے۔
"ایمان! ناشتا ٹھیک سے کرو جانی۔" شگفتہ کی آواز پہ چائے کا گھونٹ بھرتی ایمان نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔
"ممی! اس وقت کچھ کھانے کا موڈ نہیں، مجھے اتنی نیند آرہی ہے کہ اگر اسائنمنٹ جمع نہ کروانی ہوتی تو میں آج کالج ضرور مس کر لیتی۔" شگفتہ کے استفسار پہ اس نے التجائیہ کہا۔ توفیق کمال نے بھی ناشتے سے سر اٹھا کر بیٹی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور دوبارہ ناشتے میں مشغول ہو گئے۔
"اسائنمنٹ لاسٹ منٹ تک سنبھالنا تو آپ کا محبوب مشغلہ ہے مائی ڈیر سس!" ضعیم کمال ایسے معاملات میں بولنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ وہ ایمان سے دو سال بڑا تھا اور بی بی اے کے چوتھے سال میں تھا۔ اس

کے بعد اپنے بڑے بھائی کی طرح اسے بھی بیرون ملک اعلا تعلیم کے لئے جانا تھا۔

"بھائی! میں لاسٹ منٹ تک اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوتی اور اس کو بہتر بنانے کے لئے اس میں ردوبدل کرتی رہتی ہوں۔" ایمان نے متاثر کرنے کے لیے کہا۔

"وقت پہ کام نہ کرپاؤ تو اچھا بہانہ ہے یہ۔" ضعیم نے شرارت سے کہا۔

"بھائی آپ...." اپنا جملہ ادھورے چھوڑ کر ایمان نے جانے میں عافیت سمجھی' وہ جانتی تھی وہ ضعیم سے جیت نہیں سکتی۔

"بائے ممی! بائے ڈیڈی!" ایمان نے تیزی سے صدر دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"آپ ہی کہہ دیتے' میری بات کی تو اہمیت ہی نہیں۔" شگفتہ نے گلہ کیا۔

"اب موڈ نہیں تو زبردستی کیا کرنی۔" توفیق کمال نے انہیں سمجھایا۔

"یہ سب آپ کے لاڈ پیار ہیں۔" شگفتہ نے شکایتی نظروں سے میاں کو دیکھا۔ حالانکہ ایمان میں ان کی جان تھی۔ لیکن جہاں وہ ان کی بات کو نظرانداز کرتی' وہ اچھی بیویوں کی طرح سارا الزام خاوند پہ ڈال دیتیں۔

"عمر کہاں ہے؟" توفیق کمال نے ان کی بات کو نظر انداز کر کے سوال کیا۔

"صبح جلدی نکل گیا تھا۔ کہہ رہا تھا بہت ضروری میٹنگ ہے۔" انہوں نے سلائس پہ مکھن لگاتے ہوئے کہا۔

"آں ہاں.... چلو میں بھی چلوں۔" کچھ سوچتے ہوئے توفیق کمال بولے۔ پھر شگفتہ اور ضعیم کو اللہ حافظ کہتے وہ بھی دفتر نکل گئے۔

ضعیم گھر سے نکلنے والا آخری فرد تھا۔ اس کی پہلی کلاس آج گیارہ بجے تھی۔

✲ ✲ ✲

کوٹ بیڈ پہ پھینک کر وہ نزدیکی صوفے پہ بیٹھ گیا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے اس نے ریموٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ موبائل کی اسکرین پہ چمکتے نام کو دیکھ کر اس کی بھوری آنکھوں میں چمک ابھری۔

"السلام علیکم پاپا!" اس کے لہجے میں بشاشت تھی۔

"وعلیکم السلام...." لہجہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ اور خوب صورت تھا۔

"کیسے ہیں آپ۔" وہ پُرجوش بولا۔

"میں ٹھیک ہوں.... تم سے ایک اہم بات کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ تم گھر آگئے ہو نا جہانزیب۔" سکندر ملک نے استفسار کیا۔

"جی بس ابھی پہنچا ہوں۔" جہانزیب نے کہا۔

"میں نے تمہاری دو دن بعد کی سیٹ کنفرم کروادی ہے۔ میرا اور طیبہ کا خیال ہے' اب تمہیں مزید لندن میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے تو ایمان کا یہ چوتھا سمسٹر ہے۔ لیکن اپنی باقی کی تعلیم وہ شادی کے بعد بھی مکمل کر سکتی ہے۔" سکندر ملک نے بغیر رکے

اپنی بات کہی۔

بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس نے خود کو کمپوز کیا۔ اس کی چوڑی پیشانی پہ بل واضح ہو گئے۔

"پاپا! ایسے اچانک مجھے انفارم کیے بغیر آپ نے میری سیٹ کنفرم کروا دی۔ مجھے اپنے کام تو وائنڈ اپ کرنے دیتے۔" جہانزیب نے شکوہ کیا۔

"میرا خیال ہے کام ہوتے رہیں گے۔ ابھی تمہارا پاکستان آنا زیادہ ضروری ہے۔" سکندر ملک نے اسے مختصر الفاظ میں ساری بات سمجھا کے فون بند کر دیا۔ جہانزیب محض لب کاٹ کر رہ گیا۔ لیکن اب اسے واپسی کی تیاری کرنی تھی۔ وہ بدھ کو پاکستان واپس جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

توفیق کمال کوئی جدی پشتی رئیسوں میں سے نہیں تھے۔ فیصل آباد کے متوسط کاروباری گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے' کپڑے کی ایک مل اور آبائی مکان ان کا کل اثاثہ تھا۔ شگفتہ جیسی نفیس طبیعت کی مالک شریک حیات اور تین پیارے بچے۔ عمر' ضعیم اور ایمان۔ توفیق کمال کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جنہوں نے محنت' ایمان داری اور لگن سے کامیابی کو خود پہ حلال کر لیا تھا۔ ایمان دو سال کی تھی' جب ایک شام اپنے کسی کاروباری دوست کے بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے وہ لاہور آئے جہاں ان کی ملاقات سکندر ملک سے ہوئی۔ سکندر ملک کا شمار کسی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ وہ ایک ایسے خاندانی رئیس تھے جن کے پیچھے دولت اور عزت کی دیویاں ہاتھ باندھے کھڑی ہوتی ہیں۔ سکندر ملک اور توفیق کمال کی یہ چھوٹی سی ملاقات دیرپا دوستی میں کیسے بدلی' اس میں زیادہ حصہ سکندر ملک کی سحر انگیز شخصیت اور انکساری کا تھا۔ توفیق کمال' سکندر ملک کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ اتنی قد آور شخصیت اور اتنی عاجزی؟ سکندر ملک کو اگر فارماسوٹیکل کنگ کہا جاتا تو ہرگز مبالغہ نہ تھا۔ مینوفیکچرنگ میں جے اینڈ ایس فارماسوٹیکل کا نام کسی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ مشہور ملٹی نیشنل کمپنیوں کو خام ادویات کی فراہمی جے اینڈ ایس فارماسوٹیکل سے کی جاتی تھی۔ توفیق کمال اور سکندر ملک کی دوستی کی باقاعدہ شروعات اس دن ہوئی' جب ان کی ایک مشین پہ کسٹم اور ایکسپورٹ معاملات کے سلسلے میں توفیق کمال لاہور کچہری گئے ہوئے تھے اور سکندر ملک اس وقت اپنے وکیل کے ساتھ اس احاطے میں موجود تھے۔ گفتگو کے دوران پتا چلا کہ سکندر ملک کچھ ادویات کی کسٹم کلیرنس کے سلسلے میں وہاں آئے تھے' جن کی درآمدی لائسنسنگ پہ حکومت کو کچھ تحفظات تھے۔ اس وقت تو دونوں ہی اپنی مصروفیت کے باعث زیادہ بات چیت نہ کر سکے' مگر اس ملاقات کے اختتام پہ سکندر ملک نے توفیق کمال کو اپنے گھر مدعو کیا تھا اور توفیق کمال نے اس دعوت کو بخوشی قبول کیا تھا اور پھر اگلے ہی دن وہ اپنی فیملی کے ساتھ سکندر ملک کے گھر پر تھے۔ طیبہ بھابھی اپنے شوہر سے بھی زیادہ پرخلوص خاتون تھیں۔ ان کی فیملی جلد بے تکلف ہو گئی تھی۔ جہانزیب' سکندر ملک کا اکلوتا بیٹا تھا جو شادی کے کئی سال بعد ہوا تھا۔

"میں آپ کے ساتھ مشترکہ کاروبار میں دلچسپی رکھتا ہوں توفیق صاحب!" سکندر ملک کی بات توفیق کمال کے لیے حیران کن تھی۔

"لیکن میرا فارماسوٹیکل کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔" توفیق کمال نے خوش اخلاقی سے کہا۔

"تجربہ تو میرا بھی نہیں ٹیکسٹائل کا توفیق صاحب! آپ تو اس فیلڈ میں پچھلے دس سال سے ہیں۔" سکندر ملک نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"میں سمجھا نہیں۔" توفیق کمال نے کہا۔

"میں دراصل کافی عرصے سے ٹیکسٹائل انڈسٹری کی طرف آنے کا پلان کر رہا تھا۔ لیکن کوئی تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے میں ایسے قابل اعتبار ساتھی کی تلاش میں تھا جو میری اس فیلڈ میں معاونت کرے۔" سکندر ملک نے وضاحت کی۔

"لیکن سکندر صاحب! میرا تجربہ ایک چھوٹے کاروبار کا ہے۔" توفیق کمال نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"توفیق کمال! مجھے آپ میں وہ اعتماد اور سنجیدگی نظر آتی ہے جو کسی بھی شراکتی کاروبار میں لازمی عنصر ہوتی ہے۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ اگر سکندر ملک جیسا بزنس ٹائیکون مجھے قابل بھروسا جانے۔" توفیق کمال کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پہ مسکراہٹ تھی اور پھر سکندر ملک کے کثیر سرمائے اور توفیق کمال کے تجربے سے سکندر کمال ٹیکسٹائل انڈسٹریز کی بنیاد رکھی گئی۔ کاٹن مل سے شروع کیا جانے والا یہ پروجیکٹ' آج پوری دنیا میں بہترین کاٹن پروڈکٹس کی ایکسپورٹ میں اول — اور معیار کی امانت تھا۔ ہوزری' بیڈنگ' کاٹن اور پھر دنیا بھر میں بڑھتی لان کی مانگ کے بعد ملک کے نامی گرامی ڈیزائنرز کے ساتھ مل کر ڈیزائنر لان کی کئی برانڈز مارکیٹ میں آچکی تھیں۔ ان کا کاروبار اور دوستی ساتھ ساتھ بڑھتے جارہے تھے۔ توفیق کمال کی محنت ایمان داری اور قدرت کی مہربانی سکندر ملک کی نظروں میں ان کا مقام قابل عزت کرویا تھا۔ ایمان کی بارہویں سالگرہ بڑے دھوم دھام سے کمال ہاؤس میں منائی گئی اور اسی دن سکندر ملک سے ان کی دوستی' کاروباری شراکت سے بڑھ کر رشتے داری میں تبدیل ہوگئی۔ ان دنوں جہاں زیب سکندر لندن اسکول آف اکنامکس سے گریجویشن کی تیاریوں میں لگا تھا۔ اس کا ایڈمیشن اور رہائش کے معاملات مکمل ہوچکے تھے۔ وہ نہ صرف غیر معمولی ذہین تھا' بلکہ انتہائی مہذب اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ سکندر ملک کے فیصلے پہ اس نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ ایمان' جہاں توفیق کمال کی آنکھ کا تارا تھی' وہیں جہاں زیب سکندر ملک کا غرور۔ یہ رشتہ دونوں خاندانوں کو قریب لے آیا تھا اور ان کے وقار میں اضافے کا باعث بنا تھا۔ سکندر' کمال ٹیکسٹائل کی ساکھ پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ جہاں زیب کے لندن جانے سے پہلے اس کا نکاح ایمان سے کردیا گیا تھا۔ ایمان ان دنوں محض آٹھویں کلاس میں تھی۔ لیکن سکندر ملک کو نہ کہنا توفیق کمال کے لئے ممکن نہ تھا۔ وجہ کاروبار نہیں تھی بلکہ توفیق کمال ان کی اپنے بڑے بھائی جیسی عزت کرتے تھے۔ طیبہ' جہاں زیب کے ساتھ ہی لندن منتقل ہوگئی تھیں۔ کیونکہ جے اینڈ ایس فارما کا دفتر بھی لندن میں تھا اور سکندر ملک اکثر وہاں آتے جاتے رہتے تھے اور ویسے بھی اکلوتے بیٹے سے دور رہنا انہیں منظور نہ تھا۔ ایج ویر روڈ پر' جہاں زیادہ تر عربوں کے عالی شان مکانات تھے۔ سکندر ملک نے ایک ولا خرید لیا تھا۔ چونکہ لندن میں بھی دنیا کے تمام بڑے شہروں کی طرح ٹریفک کے مسائل عروج پر تھے اور سکندر اور طیبہ نہیں چاہتے تھے۔ ٹریفک سے تنگ آکر جہاں زیب ہاسٹل کو ترجیح دے۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں اے سی کی ٹھنڈک تھی' لیکن وہ پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔ اس کے جسم میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ شاید وہ اب تک اس خواب کے زیر اثر تھی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے جلدی سے سائیڈ لیمپ کا بٹن دبایا۔ کمرے میں لیمپ کی دودھیا روشنی بکھر گئی۔ اچانک روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ چند لمحے لگے اور پھر ہر منظر صاف ہوگیا۔ وہ اپنے کمرے میں تھی اور صبح کے چار بج رہے تھے۔ اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔

ایک بار پھر اسے اس خواب نے بے تحاشا ڈرا دیا تھا۔

بیڈ کراؤن سے سر ٹکا کے وہ آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ اسے پہلے بھی وقفے وقفے سے یہ خواب پریشان کرتا تھا اور آج بھی اس نے سب کچھ اس تسلسل کے ساتھ دیکھا تھا۔

اس کے گہرے سیاہ اور سلکی بال ماتھے پہ بکھرے تھے۔ اس کی پیشانی چوڑی تھی۔ رنگت صاف تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے کا سب سے دلکش حصہ تھیں۔ یہ اس لیے بھی کیونکہ وہ آج تک اس کا چہرہ نہ دیکھ پائی تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ گہرا سیاہ تھا اور وہ بے تحاشا خوب صورت تھیں۔ ان میں کسی

وادی سی گہرائی تھی۔ جامد سکوت تھا۔ وہ کسی جزیرے سی پراسرار تھیں۔ ان میں وہ بھید تھا جسے سمجھنے میں اک عمر گزر جائے۔ وہ اتنی دلکش تھیں، انہیں دیکھ کر دنیا بھول جائے۔ اس کی بھنویں جڑی ہوئی اور بہت بھری بھری تھیں۔ بہت صاف واضح جیسے تراشی گئی ہوں۔ اس سے آگے وہ اس بار بھی کچھ نہ دیکھ پائی تھی اور اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی اسے یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت لگ رہا تھا۔ جیسے وہ یہ سب کچھ کہیں دیکھ چکی ہے یا پھر دیکھنے والی ہے۔ شاید اس کی چھٹی حس اسے کچھ آگاہ کر رہی تھی۔ اس کے تخیل نے اسے کئی بار یہ شبیہہ اس کے خوابوں میں دکھائی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ اب اگلے کئی دن وہ بے چین رہے گی۔ اسے وہ آنکھیں اپنا حصار کیے محسوس ہوں گی۔ وہ الجھے گی، مگر وہ اپنی اس کیفیت پہ کنٹرول نہ کر پائے گی۔ اسے یہ خواب اپنی پوری جزئیات کے ساتھ یاد رہتا تھا۔ وہ اگر کبھی اس شخص کو دیکھتی تو ایک لمحہ میں ان آنکھوں سے پہچان جاتی تھی۔ وہ اس کے حواس پہ طاری تھیں اور ایمان کمال ان آنکھوں کے عشق میں مبتلا تھی۔ اسے یہ خواب دیکھنا اچھا لگتا ہے۔

آئیڈیل پرستی کی آخری حد شاید اسے ہی کہتے ہیں۔

آج صبح جہانزیب سکندر آرہا تھا۔ سکندر انکل کا ہونہار بیٹا۔ جس کی تعریفیں کرتے اور کامیابیوں کے قصے سناتے اس کے ڈیڈی کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ جہانزیب کے لیے ان کے دل میں خاص جگہ تھی، کیونکہ وہ ان کی لاڈلی بیٹی کا شوہر تھا۔

کہیں وہ جہانزیب تو نہیں؟

کیسی بچکانہ بات ذہن میں آئی تھی۔ حالانکہ سکندر کو وہ کئی بار دیکھ چکی تھی۔ اگرچہ اس نے پچھلے کئی سال سے جہانزیب کو دیکھا نہیں تھا۔

ایمان روایتی لڑکیوں کی طرح بھلے جہانزیب کا نام سن کر سرخ نہ ہوتی، مگر شروع کے چند سال اسے اپنا کسی سے منسوب ہونا اچھا لگتا تھا۔ مگر جیسے جیسے اس نے شعور کی منزلیں طے کیں۔ جہانزیب کے بارے میں سوچنا اس نے چھوڑ دیا۔ وہ اتنے سالوں میں بھی پاکستان نہیں آیا تھا۔ اس نے کبھی کوئی پیغام، کوئی تحفہ نہیں بھیجا تھا۔ اس کی خواہش تھی جہانزیب اس کی سالگرہ پہ مبارک باد کا پیغام دے۔ وہ سوچتی شاید اس بار عید پہ وہ اچانک اسے کال کر کے حیران کر دے۔ لیکن اس نے ایمان کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش نہ کی۔

ایمان کے پاس محبتوں کی کمی نہ تھی، مگر اس کے لئے اپنے شوہر کی محبت انمول تھی۔ وہ جو اس کی زندگی کا محور تھا۔ وہ جس کا نام اس کے نام کے ساتھ سالوں پہلے جڑا تھا۔ اس کے دل میں ایمان کے لئے اگر کوئی جذبات نہ ہوئے تو۔۔۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی نو سال بعد آمد پر بھی وہ بے حس تھی۔ اور یہ محض ایک اتفاق تھا۔ پوسٹ گریجویشن کے بعد جہانزیب اپنے ڈی بی اے میں مصروف ہو گیا اور سکندر ملک اور طیبہ تو اس کے ساتھ ہی تھے۔ ایسے میں جہانزیب کو پاکستان آنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ سکندر ملک البتہ اکثر پاکستان میں ہوتے اور طیبہ آنٹی بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔ اب دو ماہ پہلے اس نے اپنا ڈاکٹریٹ مکمل کیا تھا۔ اس دوران وہ سکندر ملک کے لندن آفس کو بھی سنبھال رہا تھا۔ توفیق کمال اور شگفتہ تو اس سے پچھلے نو سالوں میں دو، تین بار مل چکے تھے اور ہر بار ان کے پاس اس کی تعریفوں کے انبار ہوتے تھے اور عمر کمال تو پوسٹ گریجویشن کے لیے انگلینڈ ہی میں رہا۔ سو اس کی جہانزیب سے پابندی سے ملاقات رہی تھی۔

اپنی بچکانہ سوچ پہ خود کو ملامت کرتی وہ سونے کے لئے لیٹی، مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ صبح یونیورسٹی کے لئے اٹھی تو خواب والی بات دماغ پہ حاوی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ ڈسٹرب ہے۔ ایسے میں وہ پرکشش سیاہ آنکھیں اب بھی اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ اس کیفیت سے نکل کر نارمل ہونا چاہتی تھی جو شاید اس کے بس میں نہ تھا۔

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، میرے نزدیک تمہارا

یہ رویہ انتہائی احمقانہ ہے۔" ڈائننگ ہال میں قدم رکھتے اسے توفیق کمال کی بھاری آواز سنائی دی تھی۔ لگتا ہے آج پھر عمر بھائی کے ساتھ ڈیڈی کی بحث ہو رہی ہے۔ تاسف سے سوچتی وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

ڈائننگ ٹیبل پہ شگفتہ اور ضیغم سر جھکائے ناشتا کر رہے تھے اور توفیق کمال، عمر کو گھور رہے تھے۔

"ڈیڈی! آپ کیوں نہیں سمجھتے۔ اس سے بہتر لوکیشن فیکٹری کے لئے ملنا مشکل ہے اور پھر میں تمام معاملات طے کر چکا ہوں۔" باپ کی ناراضی کو دیکھتے عمر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"عمر۔۔۔! میں نے ساری زندگی فیر پلے کیا ہے۔ جو میرے مقدر میں نہ ہو۔ میں نے اس کو کبھی فاؤل کر کے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ پارٹی۔۔۔" ایمان کو کمرے میں دیکھ کر توفیق کمال نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"السلام علیکم۔" ایمان نے سب کو سلام کیا اور مسکراتے ہوئے اپنی مخصوص کرسی کی طرف بڑھ گئی۔ ڈائننگ روم کا ماحول اب بدل چکا تھا۔ ایمان کی موجودگی میں اس کے ہر دلعزیز عمر بھائی کو توفیق کمال اب کیا کہتے۔

"مانو۔۔۔ فائنل کب ہیں۔" عمر کی بات پہ ایمان اسے اپنے امتحانات کا بتانے لگی۔

بچپن میں عمر ایک بلی کا بچہ لایا تھا جسے مانو کہا جاتا تھا۔ وہ ایمان کا لاڈلا تھا' اور پھر کچھ عرصے بعد پارک میں کھیلتے وہ گم ہو گیا تھا۔ لیکن ایمان کا رونا شروع ہو گیا تھا۔ ایسے میں عمر نے اسے سنبھالا تھا اور کہا تھا' ایک مانو چلی گئی تو کیا ہوا' میری مانو تو تم ہو اور ایسے ایمان عمر کی مانو تھی۔ ویسے تو ایمان گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ لیکن عمر سے وہ سب سے زیادہ قریب تھی۔ عمر کمال وہ جن تھا' جس کی جان ایمان میں تھی۔ کسی طوطے میں نہیں۔ ایمان کو اپنے عمر بھائی سب سے اچھے لگتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے آج تک ایمان کی کوئی بات نہیں ٹالی تھی۔ بس ان میں ایک ہی خامی تھی اور اس پہ اکثر ان کا ڈیڈی کے ساتھ تنازعہ رہتا تھا۔ وہ تقدیر سے زیادہ تدبیر پہ یقین رکھتے تھے اور اس میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔

ناشتے کے دوران ہلکی پھلکی باتوں کے بعد سب اپنے اپنے کاموں پہ نکل گئے تھے۔

لنچ پہ سب ہی گھر میں موجود تھے۔ مسٹرڈ اور براؤن کنٹراسٹ میں ٹخنوں تک آتا فراک جس کے گلے اور گھیر پہ کڑھائی تھی۔ ساتھ میں مسٹرڈ دوپٹا اور ہم رنگ ٹراؤزر میں وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔ اپنے سلکی بال کھولے۔ آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پہ لپ گلوس۔ ہمیشہ کی طرح پرکشش نظر آ رہی تھی۔ اس کی انگلیوں میں ایک' دو نازک سی انگوٹھیاں اور کلائی پہ گھڑی بندھی تھی۔

"السلام علیکم!" پراعتماد انداز میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔" سکندر ملک اور طیبہ اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح نہال ہو گئے۔

"کیسی ہے میری بیٹی؟" طیبہ نے اٹھ کر اسے گلے سے لگایا اور اپنے ساتھ بٹھالیا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں آنٹی! آپ کیسی ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ اکیلے بور ہوتی رہتی ہوں۔ اس لیے سوچ رہی ہوں جلد ہی اپنی کمپنی کا بندوبست کرلوں۔" ذو معنی الفاظ میں کہی ان کی بات کا مطلب سمجھ کر اس نے سر جھکا دیا۔

بلیو ڈینم اور بلیک پولو شرٹ میں وہ کافی رف سے حلیے میں تھا۔ بڑی بڑی براؤن آنکھیں' چوڑی پیشانی' سلیقے سے جیل سے پیچھے کیے براؤن بال' گوری رنگت اور چہرے پہ سنجیدگی لیے وہ پہلی نظر میں ایمان کو بڑا مغرور لگا تھا۔ اس نے صرف ایک بار ایمان کو دیکھا اور پھر عمر سے آہستہ آواز میں باتیں کرنے لگا۔ سکندر ملک اور توفیق کمال کی اپنی گفتگو جاری تھی اور طیبہ اب شگفتہ سے کسی پارٹی کے متعلق بات کر رہی تھیں۔ اس نے نظر اٹھا کے حسرت سے

جہانزیب کی طرف دیکھا جو اس وقت ڈرائنگ روم میں اس کی موجودگی سے بے نیاز تھا اور پھر اس کی نظریں بے اختیار جہانزیب کی آنکھوں پہ ٹھہر گئیں۔ جہانزیب نے شاید خود پہ اس کی نگاہ کو محسوس کیا تھا۔ تب ہی اس نے منہ اٹھا کے ایمان کی طرف دیکھا تھا۔ یکایک اس نے اپنی نظریں جھکالیں۔

جہانزیب زیر لب مسکرایا اور پھر عمر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اداسی سے ٹہلنے لگی۔ یکایک اس کی آنکھیں بھرنے لگیں۔ جب دل ٹوٹتا ہے تو آواز بھی نہیں آتی۔ مگر نہ جانے آنکھوں کو کیسے خبر ہو جاتی ہے کہ ضرب کڑی ہے۔ کتنی حسرت سے اس نے جہانزیب کی آنکھوں کو دیکھا تھا۔ وہ قابل ستائش تھیں بلاشبہ جہانزیب ایک ہینڈسم مرد تھا۔ مگر یہ آنکھیں وہ نہیں تھیں، جنہیں دیکھنے کی ایمان کو حسرت تھی۔

☆ ☆ ☆

جہانزیب بہت میچور اور لیے دیے رہنے والا بندہ تھا۔ اس کی طبیعت میں بہت ٹھہراؤ تھا۔ وہ کافی باتونی تھا۔ لیکن اپنے حلقہ احباب کی حد تک۔ اسے ایمان میں بس یہی دلچسپی تھی کہ وہ اس کے ماں، باپ کی پسند تھی اور کیونکہ اس نے کسی سے تو شادی کرنی ہی تھی تو پھر ایمان وہ لڑکی ہے تو ٹھیک ہے۔ اس سے زیادہ اس نے ایمان کے لیے کبھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن آج جب اس نے ایمان کو اتنے سالوں بعد اپنے سامنے دیکھا تو نظریں ہٹانا بھول گیا تھا۔ وہ کسی ساحرہ کی طرح اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔ مگر یہ وقت جذبات دکھانے کا نہیں تھا۔ اس کی اور ایمان کی ساری فیملی کے سامنے وہ ہرگز کوئی اوچھی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ٹین ایجر کی طرح بی ہیو نہیں کرنا تھا۔ بھلے سامنے اس کی منکوحہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے فوراً ہی عمر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جو اسے اپنی نئی فیکٹری کے متعلق بتا رہا تھا اور جس کی زمین کا سودا آج کل میں ہونے والا تھا۔ اس نے محسوس کیا کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ

ایمان تھی جو گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی اور پھر اس نے گھبرا کے اپنی گھنی پلکیں جھکالیں۔ بے شک وہ لڑکی دل میں اترنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے پلپا سے ایمان کا موبائل نمبر لیا تھا۔ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ ایک بار دوبارہ اسے فرصت سے دیکھنا چاہتا تھا۔

فون کی تیسری بیل پہ اس نے کال ریسیو کی۔ نمبر غیر شناسا تھا اور عام حالات میں ایسے نمبر کو اٹینڈ کرنے کا ایمان دس بار سوچتی، مگر جلدی نے اس کی مت ماری ہوئی تھی۔ پہلے ہی اسے کالج سے دیر ہو رہی تھی اور اب یہ موبائل بے وقت چنگھاڑنے لگا تھا۔

"ہیلو۔" تیز آواز میں کافی روڈ بولی تھی وہ۔ ساتھ ساتھ اپنے بالوں میں برش کر رہی تھی۔

"السلام علیکم مسز ایمان جہانزیب!" جانی پہچانی مردانہ آواز میں مسکراتا لہجہ اس نے شاید یہ آواز حال ہی میں سنی تھی۔ ایمان کا برش کرتا ہاتھ رک گیا تھا۔

"آپ نے... اور آپ کے پاس میرا نمبر۔" وہ خود نہیں جانتی تھی۔ اسے اس وقت کیا کہنا چاہیے اور وہ کیا کہہ رہی تھی۔ جہانزیب کا فون اتنا غیر متوقع تھا۔ وہ بہت نروس ہو گئی تھی۔

"آپ کو میرے سورسز کا اندازہ نہیں مادام!" جہانزیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں میرا مطلب ہے۔ آپ نے اچانک کال کی تو...." اب جو زبان سے نکال بیٹھی تھی اس وقت واپس تو لے نہیں سکتی تھی۔

"جی اندازہ تو مجھے ہے اور ان کا استعمال بھی آپ نے محض نو سال کے کم عرصے میں کر لیا ہے۔" یہ بات وہ جہانزیب سے کہہ نہیں پائی تھی۔ بس دل میں سوچ کے رہ گئی تھی۔

"کیسی ہیں آپ اور کیا کر رہی ہیں؟" جہانزیب کا انداز دوستانہ تھا۔

"کالج کے لیے نکل رہی تھی۔" وہ اچانک بول پڑی اور یک دم اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اب جو اس نے کال کر دی تھی تو ڈھنگ سے بات کرنے کے

بجائے اسے کالج کا بتانے کی کیا ضرورت تھی۔

"اوہ... غالباً" میں نے غلط ٹائم پہ فون کردیا ہے۔" اس نے برا مانے بغیر کہا۔ "ہو اے ناٹس ڈے ابھی آپ کالج جائیں، میں پھر کسی مناسب وقت کال کروں گا۔" اس نے فوراً "فون بند کردیا تھا۔

کالج جانے کی افراتفری بھلا کے اب وہ جہانزیب کے اچانک کال کرنے کا سوچ رہی تھی اور اپنی بے وقوفی پہ افسوس کررہی تھی کہ ایسا بھی کیا تھا جو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ جہانزیب سے ڈھنگ سے بھی تو بات کرسکتی تھی۔ اپنے نروس ہونے پہ کڑھتی ایمان کالج کے لیے نکل گئی۔

دوسری طرف آج آفس میں اس کا پہلا دن تھا۔ بطور چیف ایگزیکٹو جے اینڈ ایس فارماسیوٹیکل میں اپنا چارج سنبھالتے اس نے سکندر ملک کے چہرے پہ خوشی کے جو رنگ دیکھے تھے وہ اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئے تھے۔ ایمان سے ہونے والی صبح ٹیلی فون پہ بات نے اسے کافی محجل کیا تھا۔ لیکن اب بابا کا اس کو اپنے آفس میں اتنے جذباتی انداز میں ویلکم کرنا اسے سب بھلا گیا۔ آج کا دن بلاشبہ ایک یادگار دن تھا۔

لنچ ٹائم میں وہ ایمان کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اسے کبھی کنفیوز اور نروس لڑکیوں میں کشش محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بلاشبہ وہ لڑکی بہت خوب صورت تھی۔ مگر اتنی بھی کیا معصومیت کہ اپنے شوہر کی کال سن کے گھبرا جائے اور اگر میں سامنے چلا جاتا تو شاید وہ کسی کونے میں ہی چھپ جاتی۔ اس نے جھنجلاتے ہوئے سوچا۔ کل جب اس نے ایمان کو دیکھا تو وہ اسے اچھی لگی تھی۔ اس کا حسین پرکشش چہرہ، اس کی خوب صورت آنکھیں اور اس کے کھلے بال۔ وہ سارا وقت بڑی بے نیازی سے بیٹھی رہی۔ اسے لگا وہ کافی کم گو ہے، لیکن جہانزیب محض خوب صورتی سے متاثر ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے طویل عرصہ مغرب میں گزارا تھا۔ اس کے اردگرد پُراعتماد لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ اس کے ساتھ کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے والی لڑکیاں جو نہ صرف ذہین تھیں۔ بلکہ ان کا اعتماد آسمان کو چھوتا تھا۔ مغرب کی بے باکی کو ایک طرف رکھ کر وہ صرف اپنی کلاس فیلوز کے اعتماد کو سوچتا، تب بھی ایمان کا آج کا رویہ اس کے لئے بہت مایوس کن تھا۔

☆ ☆ ☆

ایم ایم عالم روڈ پہ ایک مشہور ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں گاڑی پارک کرکے وہ دونوں اندر داخل ہوئی تھیں۔ آج ثنا کی سالگرہ تھا اور ہمیشہ کی طرح آج وہ ایمان کو ٹریٹ دینے کے لیے اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں لائی تھی۔ استقبالیہ پہ دو لوگوں کا کہہ کر وہ دونوں اپنی ٹیبل سلیکٹ کرچکی تھیں۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھے لوگوں کو نظرانداز کرکے اب وہ اپنی پسندیدہ اسنیک کی ٹیبل کی طرف جارہی تھیں۔

"السلام علیکم ایمان!" خوب صورت لہجے میں کوئی بہت دھیمے انداز میں بولا تھا۔ ایمان نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ ساتھ والی ٹیبل پہ چائنیز بوفے تھا اور وہ اسی ٹیبل سے اپنے لیے کھانا لے رہا تھا۔

"جہانزیب آپ؟" ایمان نے آنکھوں میں حیرت لیے کہا۔

"جی... یہ میرا پسندیدہ ریسٹورنٹ ہے اور پہلے جب یہاں تھا تو بہت آتا تھا۔ اب آیا تو سوچا۔ آج پھر اس کو آزمایا جائے کہ کیا اب بھی اس کا معیار اتنا ہی اعلا ہے۔" خوش مزاجی سے مفصل جواب دیتے وہ مسکرا رہا تھا۔

"جی اس میں کوئی شک نہیں کہ روایتی پاکستانی کھانوں کے لیے اس سے بہتر جگہ کوئی نہیں اور پھر یہاں کا انٹیریر۔" ایمان اب نارمل انداز میں اس سے بات کررہی تھی۔

"آہم... آہم..." ثنا نے دونوں کو باتیں کرتے دیکھا تو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے گلا کھنکھارا۔

"ثنا! یہ جہانزیب ہیں۔ سکندر انکل کے بیٹے۔" ایمان نے تعارف کروایا اور جہانزیب کی مسکراہٹ کم

ہوگئی۔

"آج میری برتھ ڈے ہے اور میں ایمان کو یہاں ٹریٹ دینے کے لئے لائی تھی۔" ایمان کے نامکمل تعارف پہ تپتی ہوئی ثنا خود ہی بولی۔

"اوہ... وش یو آ ویری ہیپی برتھ ڈے۔" جہانزیب نے ثنا کو مبارک باد دی۔ "آپ بھی ہمیں جوائن کریں نا؟" ثنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں ضرور کرتا' مگر اب تو میں اپنا لنچ تقریباً" ختم کرچکا ہوں' ان شاء اللہ پھر کسی دن۔" خوش اخلاقی سے معذرت کرتا وہ اپنی ٹیبل تک گیا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ ریسٹورنٹ سے جاچکا تھا۔

یہ ایمان کی سہیلی کی طرف سے برتھ ڈے ٹریٹ تھی اور بن بلایا مہمان ہونا اسے پسند نہ تھا۔ ویسے بھی ایمان نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے جو اختصار برتا' وہ سن کر جہانزیب کے لیے وہاں رکنا مشکل ہوگیا تھا۔ ایمان کی نظروں نے ہال سے باہر جاتے جہانزیب کا تعاقب کیا۔

"کیا ڈیشنگ پرسنالٹی ہے یار!" ثنا نے جذباتی انداز میں کہا۔ ایمان مسکرادی۔

"تھوڑا اکڑو نہیں ہے۔" ثنا نے تبصرہ جاری رکھا۔

"نہیں... اس نے کہا نا وہ اپنا کھانا ختم کرچکا تھا۔" ایمان آہستہ سے بولی۔

ایمان کا ذہن اس دن والی کال میں اٹکا تھا۔ شاید وہ خفا ہو۔ اس دن کے بعد اس نے ایمان کو دوبارہ فون بھی نہیں کیا تھا۔ ایمان نے سوچا۔

ویسے تو اس دن کے بعد اگلے چند دن جہانزیب کے آفس میں کافی مصروف تھے۔ اسے فیکٹری جانا تھا۔ کچھ تعارفی میٹنگز اٹینڈ کرنی تھیں۔ ایک دو آفیشل ڈنر تھے جو ان کے کاروباری دوستوں نے جہانزیب کی پاکستان آمد اور کمپنی میں شمولیت کے پیش نظر دیے تھے۔ مگر وہ فری بھی ہوتا تو ایمان کو دوبارہ فون کرنے کی حماقت نہ کرتا۔ شاید ایمان کو فون کرکے پہلے ہی وہ غلطی کرچکا تھا۔ اس رات سب لوگ ڈنر میں مصروف تھے۔ جب جہانزیب کے موبائل پہ ہونے والی بیل نے سب کو اس کی طرف متوجہ کردیا۔

"ایک دوست کا فون ہے۔" ایکسکیوز کرتا وہ جلدی سے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھا تھا۔ موبائل اسکرین پہ ایمان کا نمبر دیکھ کر اس نے بہانا بنایا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

"ہیلو..." تیزی سے اپنے کمرے کی طرف جاتے اس نے کال ریسیو کی تھی۔ "آپ مصروف تو نہیں تھے۔" ایمان نے خوب صورت لہجے میں پوچھا۔

"میں مصروف ہوں' پھر بھی آپ جتنا مصروف ہرگز نہیں ہوتا کہ ڈھنگ سے بات ہی نہ کرپاؤں۔" جہانزیب نے بدلہ چکایا۔

"میں معذرت چاہتی ہوں۔ آپ کی اچانک کال آگئی اور پھر میں اس دن کالج سے لیٹ ہورہی تھی۔ اس لیے آپ سے مناسب بات نہ کرسکی۔" ایمان نے وضاحت کی۔

"چلیں چھوڑیں اس قصے کو۔ یہ بتائیں سکندر انکل کے بیٹے کو اس وقت فون کیسے کیا۔" وہ بھی اتنی جلدی معاف کرنے والوں میں سے نہ تھا۔

"آپ خفا ہیں؟" ایمان نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"میری کیا مجال جو توفیق انکل کی بیٹی سے ناراض ہوں۔" مسکراتے ہوئے وہ اسے شرمندہ کرنے میں مصروف تھا۔ "ویسے کیا ہمارا بس یہ تعارف ہے۔" جہانزیب بولا۔

"اس سے زیادہ ہے بھی کہاں۔" ایمان نے جتاتے ہوئے کہا۔

"اوہ تو یہ گلہ ہے محترمہ کو... پھر کرادیتے ہیں اپنا تعارف' بتائیں کب اور کہاں؟" جہانزیب نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"جہانزیب! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" ایمان گڑبڑا کر بولی۔

"لیکن میرا تو یہی مطلب تھا۔ بتاؤ کب اور کہاں ملوگی۔ ویسے بھی تمہاری ایک چیز تمہیں پہنچانی ہے۔" جہانزیب کا موڈ خاصا خوش گوار تھا اور ایمان سے تو وہ پہلے ہی ملنا چاہ رہا تھا۔ اب جہاں اتنی باتیں ہورہی

تھیں تو ملاقات کا پلان بھی بنا لیا تھا۔

"ولیکن سب لوگ کیا سوچیں گے۔" جہانزیب کی بات سن کے ایمان تو گھبرا ہی گئی۔

"یہی کہ مسٹر اینڈ مسز شادی سے پہلے ملنا چاہتے ہیں۔" جہانزیب شوخ لہجے میں بولا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں توفیق انکل سے خود پوچھ لوں گا۔ تم صرف اتنا بتاؤ کب ملوگی۔" جہانزیب نے گویا اسے بڑا آسان ساحل بتایا۔

"اس ویک تو نہیں، کچھ مصروفیت ہے۔ میری بیسٹ فرینڈ کی شادی ہے اور پھر نیکسٹ ویک سے فائنل ایگزام بھی ہیں۔ اس کے بعد سوچا جا سکتا ہے۔" ایمان نے اپنا سارا پروگرام بتا دیا۔

"کافی لمبا انتظار کروا رہی ہیں بیگم صاحبہ! چلیں کوئی بات نہیں۔ میں بھی ذرا آفس میں دو' دو ہاتھ کر لوں۔ آج کل ویسے بھی مصروفیت کچھ زیادہ ہے۔" خوش گوار موڈ میں جہانزیب نے کال بند کی۔ آج ایمان کی کال نے اسے کافی مطمئن کر دیا تھا۔

وہ بھی جہانزیب سے بات کر کے پرسکون ہو گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی ان کے رشتے کے آغاز میں ہی اختلافات یا غلط فہمیاں جگہ بنا لیں۔ اس نے اپنی پوری ایمان داری سے اس رشتے کو نبھانا تھا اور جہانزیب کو کبھی ایسا تاثر نہیں دینا تھا کہ ایمان کے دل میں کسی اور کی تصویر بسی ہے۔ جس چہرے کو اس نے آج تک کبھی دیکھا ہی نہیں اور پھر کیا پتا ایسا کوئی ہے بھی یا نہیں اور اگر ہو بھی تو ایمان ہرگز جہانزیب سے اپنے تعلقات خراب کرنے کا نہیں سوچ سکتی۔ یہ اس کے ڈیڈ کا فیصلہ ہے۔ جو انہوں نے حق سے کیا ہے۔ ایمان انہیں کبھی شرمندہ نہیں کرے گی۔

☆ ☆ ☆

کافی کا کپ لے کر وہ اسٹڈی کے دروازے پہ کھڑی تھی۔

"عمر بھائی! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔" اسٹڈی میں لیپ ٹاپ پہ انگلیاں چلاتے عمر کے سامنے اس نے کافی کا کپ رکھا۔

"بولو مانو۔" عمر کی نظریں اسکرین پہ جمی تھیں اور دھیان ایمان کی طرف۔

"حبہ کی کل شادی ہے۔ آج مہندی کا فنکشن ہے اور ضعیم اپنے فرینڈ کے ساتھ چلا گیا۔ آپ مجھے پک اینڈ ڈراپ کریں گے نا؟"

توفیق کمال کو ایمان کا رات کو ڈرائیونگ کرنا پسند نہ تھا۔ جبکہ ڈرائیور کے ساتھ ایمان کہیں نہیں جاتی تھی۔ ایسے میں اگر اسے شام کو کہیں جانا ہوتا تو اکثر ضعیم ہی پھنستا تھا' لیکن آج وہ صاف بچ کے نکل گیا تھا۔

"کہاں ہے فنکشن؟" عمر نے ایک نظر ایمان کو دیکھا۔

"ڈیفنس کلب میں۔" ایمان نے بتایا۔

"اچھا میں تمہیں ڈراپ کروں گا اور پک بھی کر لوں گا۔"

"اوکے میں تیار ہو کر آتی ہوں۔" ایمان کو معلوم تھا۔ عمر اسے انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ گلابی اور پیلا کامدار ٹخنوں تک لمبا انگرکھا پہنے' چوڑی دار پاجامہ' پاؤں میں تین انچ لمبی ہیل والی گولڈن سینڈل' ماتھے پہ سنہری بندیا اور کانوں میں بڑے بڑے آویزے۔ کھلے بال اور اپنے مخصوص ہلکے میک اپ میں وہ پرستان کی پری معلوم ہو رہی تھی۔

عمر نے پیار بھری نظر ایمان پہ ڈالی۔ جلد ہی اس کی مانو دلہن بننے والی تھی۔ اس نے دل سے اسے خوش رہنے کی دعا دی تھی۔ عمر' ایمان کو ڈراپ کرنے آیا تھا۔ باہر ہی حبہ کے والد سے سلام دعا کے بعد وہ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اصغر صاحب اسے زبردستی اندر لے آئے۔ لیکن پھر دس منٹ بعد ہی عمران سے اجازت لے کر نکل گیا تھا۔ ایمان اس دوران عمر کے ساتھ ساتھ تھی اور جب وہ چلا گیا تو ایمان حبہ کے پاس چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

"تو پھر آج ہم مل رہے ہیں۔" ایمان کے امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ اگلے دن جہانزیب نے کال کر دی تھی اور اچانک ہی ملنے کی فرمائش کر دی۔

"آپ نے ڈیڈ سے بات کی؟" ایمان نے پوچھا۔

"وہ بھی کر لیتا ہوں۔ تم تو ایسے بات کر رہی ہو جیسے میں کوئی غیر ہوں۔ میں جانتا ہوں توفیق انکل تمہاری طرح ری ایکٹ نہیں کریں گے۔" جہانزیب صحیح کہہ رہا تھا۔ اس کے ڈیڈ نے بھلا کیوں انکار کرنا تھا۔

"سنو! میں ابھی آفس سے باہر ہوں اور مال روڈ سے نزدیک ہوں، مجھے یہاں کچھ کام ہے اور تمہیں پک کرنے ڈیفنس آیا تو پھر ہم لیٹ ہو جائیں گے۔ تم ایسا کرو ابھی گھر سے نکلو، جتنی دیر میں تم آواری پہنچو گی۔ میں بھی فری ہو کے وہیں آجاؤں گا۔" مصروف سے لہجے میں بولتا وہ ساتھ ساتھ کچھ کام بھی کر رہا تھا۔ اس کا ایمان کے ساتھ سات بجے کا ٹائم سیٹ تھا اور اب چھ بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ اسے ابھی یہاں مزید آدھا گھنٹہ رکنا تھا۔ ایسے میں وہ پہلے ڈیفنس جائے، پھر ایمان کو پک کر کے دوبارہ مال پہ آئے۔ اس کے بجائے اسے یہی مناسب لگا کہ ایمان خود آواری آجائے اور وہ اپنا کام ختم کر کے دس منٹ میں ہوٹل پہنچ جائے۔

"اچھا.... میں ابھی کچھ بزی ہوں۔ تم پہنچ کے مجھے کال کرنا، مل کے بات ہو گی۔" اپنی مصروفیت کا بتا کر جہانزیب کال بند کر چکا تھا۔ لیکن ایمان کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ توفیق کمال اور شگفتہ کسی ڈنر کے لیے نکل گئے تھے۔ عمر ابھی گھر نہیں پہنچا تھا۔ ویسے بھی وہ اکثر لیٹ گھر آتا تھا اور صعیم ابھی ابھی کچھ دوستوں کے ساتھ باہر گیا تھا۔ ایمان کو جہانزیب کے ساتھ ڈنر پہ جانا تھا اور جہانزیب نے ہی اسے پک کرنا تھا۔ یہ بات سب کو معلوم تھی، لیکن اب اچانک جہانزیب نے پروگرام تبدیل کر دیا تھا۔ شاید وہ نہیں جانتا تھا۔ توفیق کمال کی طرف سے ایمان کو رات میں گاڑی ڈرائیو کرنے کی اجازت نہ تھی۔

مرتا کیا نہ کرتا کے مترادف ایمان نے اللہ کا نام لیا اور گاڑی نکال کر مین بلیوارڈ کی طرف چل پڑی۔ اکتوبر کے آخری دن تھے اور آج کل مغرب پونے چھ بجے ہو جاتی تھی۔ وہ کوئی ڈرپوک لڑکی ہرگز نہیں تھی۔ بس اپنے ڈیڈی کے اصولوں کو نظر انداز کرنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

ہمت کر کے وہ اکیلی ہی آواری آگئی تھی۔ وہ دس منٹ بعد پہنچا۔

"اتنا ٹریفک جام، مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ میں ٹائم پہ پہنچ پاؤں گا۔" بے تکلفی سے کرسی کھینچتا وہ اسے لاہور کی سڑکوں پہ ہونے والے ٹریفک کا بتا رہا تھا۔

"مجھے لگا میں لاہور نہیں لندن میں ڈرائیو کر رہا ہوں۔ نو سال میں کافی تبدیلی آگئی ہے نا۔" پانی کا گلاس پیتے اس نے تبصرہ کیا۔

اس دن کے برعکس آج وہ بلیک ٹو پیس میں تھا۔ گرے شرٹ پہ سیاہ اور گرے سلک ٹائی، بالوں کو جیل سے پیچھے کیے وہ کافی اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر ایمان کو دیکھا، جو بلیک شیفون کے سوٹ میں کافی دلکش لگ رہی تھی، مگر اسے یکسر نظر انداز کرتا وہ اسے ٹریفک جام اور اپنی آج کی مصروفیت کے قصے سنا رہا تھا۔

ہونٹوں پہ مدھم سی مسکراہٹ اور دل میں بے تحاشا بےزاری لیے وہ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ بزنس کی اسٹوڈنٹ تھی اور گھر میں بھی اس کے ڈیڈی اور عمر بھائی کاروباری باتیں کرتے تھے، مگر اس وقت جہانزیب کے ساتھ ڈنر کرتے وہ کاروباری مصروفیات، لندن اور پاکستان کی زندگی کے فرق اور پاکستان میں بڑھتے کرائم اور کرپشن کی شرح پہ سیر حاصل بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

اسے لگا جہانزیب اسے جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا تھا یا پھر وہ اپنے سامنے کسی کو خاطر میں لاتا ہی نہیں تھا۔ وہ دونوں پہلی بار اکیلے ملے تھے۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ مگر جہانزیب کی باتوں میں اس رشتے کے حوالے سے کچھ نہ تھا۔ حالانکہ اس دوران وہ کافی خوش گوار موڈ میں تھا، مگر ایمان بہت بور ہو رہی تھی۔ دھیان بار

بار اس بات پہ جا رہا تھا کہ ابھی اسے اکیلے ڈرائیو کر کے گھر واپس جانا ہے اور پھر ڈیڈی کی ڈانٹ۔ ویسے تو توفیق کمال نے ایمان کو کبھی نہیں ڈانٹا تھا' لیکن ایمان نے کبھی ایسا کچھ کیا ہی کہاں تھا جو توفیق کمال کو برا لگتا۔

"تم بور تو نہیں ہو رہی ہو؟" اسٹیک کا ٹکڑا کاٹ کر کانٹے سے لگاتے اس نے ایمان سے کہا۔

"بالکل نہیں۔ آپ کی اتنی معلوماتی باتوں پہ بور ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے بھی اس ریسٹورنٹ کے ماحول میں کرنٹ اور فارن افیئرز پہ بڑی اچھی گفتگو ہو سکتی ہے۔" ایمان نے طنزیہ کہا۔ اس کی بات پہ جہانزیب ہنسنے لگا۔

"سوری! کیا کروں پہلے کبھی ڈیٹ پہ نہیں گیا کسی کے ساتھ۔" جہانزیب نے چڑاتے ہوئے کہا۔

"ایکسکیوزمی! آپ سے کس نے کہا میں آپ کے ساتھ ڈیٹ پہ آئی ہوں۔ آپ نے کہا تھا آپ کو مجھ سے کوئی بات کرنی ہے شاید اس لیے میں نے ملنے کی ہامی بھری تھی۔" ایمان نے فورا" کہا۔

"اچھا۔۔۔ میں خوامخواہ ایکسائیٹڈ تھا کہ آج ایک حسین لڑکی کے ساتھ ڈیٹ پہ جا رہا ہوں۔" جہانزیب نے اس کے چہرے کو اپنی نگاہوں میں رکھتے ہوئے کہا۔ ایمان کے چہرے پہ دھنک کے رنگ بکھرنے لگے۔

"یہ تمہارے لیے۔" سیاہ مخمل کی ڈبیا ایمان کی طرف بڑھاتے جہانزیب نے کہا۔ کھانا کھاتے وقت وہ جتنی سنجیدہ باتیں کر رہا تھا اور جس انہماک سے اس نے اپنا کھانا ختم کیا' لگتا تھا وہ فقط ڈنر کے لیے ہی آیا ہے۔

ایمان نے اس کی طرف دیکھا۔ ایک نازک سا ڈائمنڈ کا لاکٹ وائٹ گولڈ کی چین میں جگمگا رہا تھا۔

"یہ میں لندن سے لایا تھا اور تمہیں مل کر ہی دینا چاہتا تھا۔" مسکراتے ہوئے جہانزیب نے اسے بتایا۔

ایمان کی آنکھوں میں جگنو در آئے تھے۔ کچھ لمحے دل میں چھپے ستار کے تاروں کو چھیڑ دیتے ہیں اور پھر کوئی مدھر سی دھن آپ کے انگ انگ میں بجنے لگتی ہے۔

"بہت خوب صورت ہے' شکریہ۔۔۔ اب مجھے چلنا چاہیے' کافی ٹائم ہو گیا ہے۔" ایمان نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتے کہا۔

"ارے ہاں میں تمہیں بتانا تو بھول ہی گیا۔" جہانزیب نے اٹھنے سے پہلے کہا۔ "اس ویک اینڈ پہ ممی' پاپا تمہارے گھر آئیں گے۔"

"اور آپ؟" ایمان جو سمجھ رہی تھی کہ پتا نہیں کیا خاص بات ہے' کھودا پہاڑ نکلا چوہا کے مترادف پا کر اب سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

"میں تو آنا چاہ رہا تھا' لیکن ممی نے کہا۔ شادی کی ڈیٹ لینے لڑکے خود نہیں جاتے۔" سنجیدگی سے کہتے اس نے ایمان کو دیکھا' جس کے چہرے پہ حیا کے رنگ تھے۔

"چلو تمہیں دیر ہو رہی ہے۔" گاڑی کی چابی اور اپنا موبائل سنبھالتا وہ کھڑا ہو گیا۔

نو بجے وہ دونوں ریسٹورنٹ سے باہر نکلے اور پارکنگ کی طرف بڑھے۔ ایمان کو بائے کہتا جہانزیب اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ ایمان جانتی تھی ابھی توفیق کمال اور شگفتہ نہیں پہنچے ہوں گے۔ عمر تو اکثر ہی لیٹ آتا تھا۔ اب تک کسی نے اسے فون نہیں کیا تھا۔ اس کی گاڑی اس وقت گھر نہ پا کر وہ لوگ ضرور اسے فون کرتے۔ اس کا مطلب گھر پہ کوئی نہیں تھا۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔ کتنا اچھا ہو' کسی کو پتا ہی نہ چلے وہ اکیلی رات کو نکلی تھی۔ تمام راستے اس کا دھیان اس بات میں الجھا رہا۔ حالانکہ وہ آج جہانزیب کے بارے میں سوچنا چاہ رہی تھی۔ اس کا دیا پہلا گفٹ' اس کی زبان سے نکلے چند تعریف کے لفظوں کو' اس وقت اسے صرف جہانزیب یاد تھا۔ وہ اس کی زندگی کی حقیقت تھا۔ اس کے سامنے تھا اور وہ خواب' اس کی احمقانہ آئیڈیل پرستی' وہ سب کہیں بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

مین بلیوارڈ پہ مڑنے کے بجائے اس نے شارٹ کٹ کے لیے اپنے گھر کی پچھلی سوسائٹی کا رخ کیا۔

یہاں ابھی سارے مکانات بنے نہیں تھے۔ کافی بڑے بڑے پلاٹوں کے بلاک خالی تھے اور کچھ زیر تعمیر مکانات بھی تھے۔ جو تعمیر تھے وہاں اس وقت ہلکی ہلکی بتیاں جل رہی تھیں۔ وہ لوگ اکثر اس راستے سے اپنے گھر کی طرف مڑ جاتے تھے۔ یہ راستہ اندر گلیوں سے ہوتا انہیں کم وقت میں ان کے گھر پہنچا دیتا تھا۔ ایمان نے بھی اس راستے سے جلد گھر پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ ایسے میں وہ مین روڈ کی ٹریفک سے بھی بچ جائے گی۔ اس نے خود کو تسلی دی تھی۔

دائیں گلی سے اسی وقت ایک گاڑی تیز رفتاری سے ایمان کی گاڑی کے سامنے آکر رکی۔ ایمان اگر بروقت بریک پہ پاؤں نہ رکھتی تو لازما" اس کی گاڑی سامنے والی سیاہ گاڑی سے ٹکرا جاتی۔

ایسے سڑک کے بیچوں بیچ گاڑی روکنے پہ اسے غصہ تو بہت آیا تھا اور اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لیے گاڑی سے نکلنے ہی لگی تھی، مگر پھر بجلی کی طرح ایک خیال ذہن میں کوندا۔ رات کے اس پہر، اندھیری سڑک پر اس کی گاڑی کو ایسے روکنا، یہ کوئی مجرمانہ کارروائی بھی تو ہوسکتی ہے۔ خوف کی ایک سرد لہر اس کے پورے بدن میں سرایت کرگئی۔ اس کا دھیان اس وقت اپنے پرس اور جیولری کی طرف تھا۔ کوئی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اب اس کی طرف آرہا تھا۔ اندھیرے میں وہ زیادہ دیکھ نہیں پائی اور پھر پریشانی نے اسے بدحواس بھی کردیا تھا۔ تیزی سے اس نے ایمان کی گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس کا بازو سختی سے پکڑ کر اسے باہر نکالا۔ وہ جو بھی تھا، اس نے چہرے کو رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایمان نے اس اچانک افتاد پہ چیخنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اس شخص کا مضبوط ہاتھ اس کی ناک تک آیا اور پھر ایمان اپنے حواس کھوتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

اس کا سر بھاری ہورہا تھا۔ چند لمحے اپنی آنکھوں کو مسل کر اس نے کھولنے کی کوشش کی اور پھر دھندلائی نظروں سے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ خود کو اجنبی جگہ پاکر وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔

وہ اس وقت ایک بڑے سے آبنوسی پلنگ پہ بیٹھی تھی۔ کمرہ کافی کشادہ اور سجا ہوا تھا۔ بھاری پردے اور قیمتی قالین، کمرے میں ایک صوفہ نما کرسی بھی رکھی تھی اور ٹانگ پہ ٹانگ رکھے وہ اس کرسی پہ انتہائی اطمینان سے بیٹھا تھا۔ ایمان کو اٹھتا دیکھ کر بھی وہ اپنی جگہ پرسکون تھا۔

"کون ہو تم اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" وہ تقریبا" چیختے ہوئے بولی۔ اس کی آواز کی لرزش اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ وہ بے حد خوف زدہ تھی۔ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں، تم ہو کون؟" اپنی ہمت ایک بار پھر جمع کرکے وہ بولی۔

کرسی پہ بیٹھے شخص میں حرکت ہوئی۔ دھیمے قدموں سے چلتا وہ ایمان کے بالکل سامنے آبیٹھا تھا۔ اتنا قریب کہ اب اسے دیکھنے کے لئے ایمان کو اپنی آنکھوں کو گھمانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

"میں تمہیں یہاں کوئی نقصان پہنچانے نہیں لایا۔ بس کچھ پرانا حساب نکلتا ہے۔" ایمان کی طرف دیکھتے اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ اس کا لہجہ بہت سادہ مگر پُراثر تھا۔ لیکن ایمان اس وقت کچھ نہیں سن پائی۔ وہ اس وقت صرف اپنے سامنے بیٹھے اس شخص کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں کو وہ سینکڑوں میں پہچان سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں بھرنے لگیں۔ کچھ دیر وہ اسے روتے دیکھتا رہا اور پھر نہ سمجھنے والے انداز میں سرہلاتا دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس کے رونے کی ہلکی ہلکی آواز اب بھی اسے سنائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ آیا۔

"تمہیں بھوک لگی ہوگی، کچھ کھالو۔" برگر کا ڈبہ اور ایک کین ایمان کے سامنے رکھتے اس نے کہا۔ وہ جواب کچھ دیر سے اپنا رونے کا پروگرام موقوف کرچکی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پھر آنسو اس کے رخساروں پہ چلے آئے۔ کچھ بے زاری سے اس نے ایمان کو دیکھا اور

پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔
صبح کے چار بجے وہ آیا تو ایمان اسی حالت میں بیٹھی تھی۔ اس نے کھانے کے سامان کو چھوا بھی نہیں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا وہ اب سو رہی تھی۔ آنسوؤں کی لکیر اس کے گالوں پہ نمایاں تھی۔ سوتے ہوئے وہ بہت معصوم لگ رہی تھی۔ وہ چند لمحے اس کے معصوم حسن کو دیکھتا رہا۔
"چلو تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔" ایک سنجیدہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو ایمان نے آنکھیں کھولیں اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
اس کے ہاتھ میں کپڑے کا ماسک تھا جو اس نے ایمان کی طرف بڑھایا۔ ایمان نے چپ چاپ وہ ماسک پہن لیا۔ اب وہ رسی سے اس کے ہاتھ باندھ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی اس وقت وہ کہاں ہے اور اسے کتنا وقت یہاں اس کمرے میں بند رکھا گیا تھا۔ شاید ایک دن یا پھر چند گھنٹے یا اس سے زیادہ۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور بھوک سے حالت خراب تھی۔
راہ داری سے گزار کر اب وہ ایمان کو گھر کے باہر لے آیا تھا۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اسے گاڑی میں دھکیلا اور پھر دروازہ زور سے بند کر دیا۔ تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتا وہ اب گاڑی کو مین گیٹ سے باہر نکال رہا تھا۔ راستہ طویل تھا یا شاید ایمان کو لگ رہا تھا۔ قریباً" ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد گاڑی رک گئی تھی۔
"میں تمہیں تمہاری گلی کے کونے میں اتار رہا ہوں، لیکن جب تک میں گلی سے نکل نہ جاؤں، خبردار! تم نے اپنا ماسک اتارا یا شور مچایا۔ ورنہ کبھی دوبارہ اپنے گھر والوں کی شکل نہیں دیکھ پاؤ گی۔"
غصیلی آواز میں اس کو دھمکاتا اب وہ ایمان کو پچھلی سیٹ سے باہر نکال رہا تھا۔ ایمان چپ چاپ گاڑی سے نکل آئی اور بغیر کسی مزاحمت کے اس کے جانے کا انتظار کرنے لگی۔ گاڑی کی آواز اب دور جا چکی تھی۔ ایمان نے مرے مرے ہاتھوں سے ماسک کو اپنے چہرے سے جدا کیا۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا اور سڑک پہ خاموشی تھی۔ اداس نظروں سے اس نے اس راستے کو دیکھا جہاں چند لمحے پہلے اس کی گاڑی کے ٹائروں کے نشان بنے تھے۔ کاش ایک بار وہ اس کا چہرہ دیکھ پاتی۔ اس نے تاسف سے سوچا اور بوجھل قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔

✲ ✲ ✲

رات کے ساڑھے نو بجے عمر کی کال توفیق کمال کے موبائل پہ آئی۔
"ڈیڈی ماٹو کہاں ہے؟" عمر نے پوچھا۔
"کیا مطلب.... ایمان گھر نہیں پہنچی اب تک؟ کمال ہے، جہانزیب نے اسے ابھی تک ڈراپ نہیں کیا۔" توفیق کمال، عمر کی بات سن کر حیران تھے۔ ان کے حساب سے سات بجے کی گئی ایمان اب تک گھر پہنچ گئی ہو گی۔
"ڈیڈ! ایمان اپنی گاڑی میں گئی ہے اور اب تک واپس نہیں آئی۔" عمر نے جیسے بم پھوڑا۔
"تم نے چوکیدار سے پوچھا؟" توفیق کمال نے سر پکڑ لیا تھا۔
"جی میں ابھی پہنچا ہوں اور ایمان کی گاڑی کو پورچ میں نہ پا کر میں نے چوکیدار سے پوچھا اور اس نے کہا ایمان قریباً" چھ بج کر چالیس منٹ پر اپنی گاڑی لے کر گھر سے نکلی تھی اور اب ساڑھے نو سے زیادہ ہو رہے ہیں۔" عمر نے تفصیل بتائی۔
"اچھا میں اور تمہاری ممی آ رہے ہیں۔" مختصر بات کر کے توفیق کمال نے لائن کاٹ دی۔ ایمان ابھی تک گھر نہیں آئی۔ یہ بات پریشانی والی نہ تھی۔ ایمان ان سے پوچھے بغیر رات کو اپنی گاڑی لے کے باہر نکل گئی۔ اس بات نے انہیں شدید ڈسٹرب کیا تھا۔ دس بجے توفیق کمال اور شگفتہ گھر پہنچے۔ ایمان اب تک نہیں آئی تھی۔ ضعیم بھی گھر آ چکا تھا۔ عمر اس وقت گھر میں جلے پاؤں کی بلی کی طرح گھوم رہا تھا۔
"اب تک نہیں آئی ڈیڈ!" توفیق کمال کو اندر آتا دیکھ کر وہ پریشانی سے بولا۔
"تم نے ایمان کو کال کی؟" انہوں نے تفکر سے

پوچھا' حالانکہ وہ خود راستے میں کئی بار اس کے سیل فون پہ ٹرائی کر چکے تھے۔

"وہ کال نہیں اٹینڈ کر رہی۔" عمر نے کہا۔

"جہانزیب سے پوچھا؟" شگفتہ نے کہا۔

"نہیں شاید یہ مناسب نہیں۔" توفیق کمال نے فوراً" کہا۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ سکندر ملک کی فیملی کو اس بات کی بھنک بھی پڑے' اور ابھی محض دس ہی بجے تھے' ہو سکتا ہے وہ جہانزیب کے ساتھ ہو۔ لیکن رات کے گیارہ بجے جب ایمان نہیں آئی تو مجبوراً" توفیق کمال کو جہانزیب کو فون کرنا پڑا۔

"وہ تو پورے نو بجے آواری سے نکل گئی تھی میرے ساتھ ہی اس نے پارکنگ سے اپنی گاڑی نکالی تھی۔ کیا اب تک ایمان گھر نہیں پہنچی؟" جہانزیب نے تفکر سے کہا۔

"نہیں۔" توفیق کمال کی آواز بہت دور سے آئی تھی اور پھر عمر گاڑی لے کر اسے دیکھنے نکل گیا تھا۔ کیا پتا کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو' یا گاڑی خراب ہو۔ اس نے سوچا' لیکن دونوں صورتوں میں ایمان کو فون کرنا چاہیے تھا۔ پچھلے بلاک میں اسے ایمان کی گاڑی مل گئی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے پارک تھی اور لاک تھی۔ اندر ایمان کا بیگ اور سیل فون سیٹ پہ رکھا تھا۔ ایمان وہاں نہیں تھی۔

سکندر ملک اور جہانزیب بھی کمال ہاؤس پہنچ چکے تھے۔ پولیس یا باہر کے کسی بھی فرد کو ایمان کی گمشدگی کی خبر نہیں تھی' لیکن سکندر کمال کی فیملی سے یہ بات پوشیدہ نہ رکھی جا سکی تھی۔ گھر کے ملازمین بھی اس راز سے باخبر تھے۔ پوری رات اس گھر کے ہر فرد نے آنکھوں میں کاٹی' سب کا دھیان فون کی طرف تھا شاید کسی نے اسے تاوان کے لیے اغوا کرلیا ہو۔ اس وقت ان کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا۔ چند اسپتالوں کی ایمرجنسی میں فون کرنے کے بعد اب اس کے آگے کا لائحہ عمل صرف یہی تھا کہ وہ خود کسی خبر کا انتظار کرتے۔

شگفتہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ وہ سب ہی اتنے متفکر تھے کہ کوئی کسی کو دلاسہ دینے کی کیفیت میں نہ تھا۔ سکندر ملک اور جہانزیب بھی واپس جا چکے تھے' لیکن توفیق کمال سے وہ مسلسل رابطے میں تھے۔ پوری رات سارے گھر نے اذیت میں گزاری۔ کیا کیا وہم تھے' کتنے خدشات' ایمان کی گاڑی کا گھر کے پاس ملنا اس بات کا ثبوت تھا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے' عمر نے پولیس کو اس معاملے میں انوالو کرنے کا سوچا۔ مگر توفیق کمال نے انکار کردیا۔

"ڈیڈ! آپ حوصلہ رکھیں۔ انشاء اللہ جلد ایمان مل جائے گی۔" عمر نے ان کے ہاتھ تھام کر کہا۔ شگفتہ جائے نماز بچھائے سجدے میں گری تھیں۔ ان کی پھول سی بچی پتا نہیں کن حالات میں ہوگی۔

"اے اللہ! میری معصوم بچی کو اپنی حفاظت میں رکھنا۔" سجدے میں بس ایک ہی التجا ان کے لبوں پر جاری تھی۔

صبح کے ساڑھے پانچ کا وقت تھا۔ توفیق کمال فجر کی نماز پڑھ کر لونگ روم میں آبیٹھے تھے۔ عمر نے اپنے ایک جان پہچان والے اے سی پی سے ملنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ جب مین گیٹ کی گھنٹی بجی۔

"صبح کے ساڑھے پانچ بجے کون ہو سکتا ہے۔" توفیق کمال نے سوچا۔ بیل مسلسل بج رہی تھی' جیسے کوئی انگلی اٹھانا بھول گیا ہو۔ چوکیدار دروازہ کھول رہا تھا۔ جب توفیق کمال بھی ڈرائیو وے تک پہنچ گئے۔

"ایمان میری بچی!" ایمان کو دروازے پہ دیکھ کر وہ بے اختیار لپکے۔

ایمان نے انہیں دیکھا اور اس کا وجود بے جان ہوتا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین پہ گر جاتی۔ توفیق کمال نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں سنبھال لیا۔

ایمان کو ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں تھی۔ شگفتہ اس کے بیڈ پہ بیٹھی کچھ پڑھ پڑھ کر اس پہ دم کر رہی تھیں۔ ایمان کو ہوش میں آتا دیکھ کر انہوں نے توفیق کمال کو بلایا۔

"ایمان میری بچی۔! کیسی ہو میری جان! کہاں چلی

گئی تھیں۔" ایمان کے ماتھے کو چومتے شگفتہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔ عمر اور ضعیم بھی وہاں تھے۔ وہ سب کو دیکھ کر رونے لگی۔

عمر آگے بڑھا۔ ایمان کو روتا دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ اور پھر عمر کے پوچھنے پہ اس نے ساری بات بتائی تھی۔

حیرت سی حیرت تھی' کسی نے دیدہ دلیری سے ایمان کو اغوا کیا۔ اسے کوئی نقصان پہنچائے بغیر اپنے پاس رکھا اور بغیر کسی تاوان کے دروازے پر چھوڑ گیا۔ ایسا کون ان کا دشمن تھا جس نے انہیں اپنی طاقت کا نمونہ دکھایا تھا۔ یا پھر وہ غلطی سے ایمان کو لے گیا اور اپنی غلطی کا احساس ہونے پہ ایمان کو واپس چھوڑ گیا تھا۔ عمر اور توفیق کمال ایمان کے کمرے سے نکل آئے تھے۔ اور اب اس بارے میں ڈسکس کر رہے تھے۔

"وہ جو بھی تھا عمر! ہماری عزت کو دو کوڑی کا کر سکتا تھا یا پھر کر چکا ہے۔" توفیق کمال نے اپنے بدترین خدشات کا اظہار کیا۔

سکندر ملک اور جہانزیب ایمان کی واپسی کا سن کر ملنے آئے تھے۔ طیبہ ان کے ساتھ نہیں آئی تھیں۔

"اللہ کا شکر ہے توفیق! ایمان بحفاظت گھر پہنچ گئی۔ میرا خیال ہے کچھ غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔" سکندر ملک نے اپنے لہجے کو خوشگوار کرتے ہوئے کہا' لیکن ان کی ہچکچاہٹ کو توفیق کمال محسوس کر گئے تھے۔ جہانزیب خاموشی سے بیٹھا ان لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تو اس سارے قصے میں ایک پرسنٹ بھی سچ نہیں لگ رہا ہے۔" طیبہ اس سارے واقعے سے اچھی خاصی خائف تھیں۔ سکندر ملک اور جہانزیب ابھی ابھی کمال ہاؤس سے واپس آئے تھے اور طیبہ کو ساری بات بتا رہے تھے۔

"بھلا ایسا ہو سکتا ہے لڑکی کا اغوا کیا۔ رات بھر اپنے پاس رکھا اور پھر خود ہی حفاظت سے گھر چھوڑ جائے۔ کیا خوب اسٹوری بنائی ہے توفیق بھائی نے۔" طیبہ اس بات کو کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھیں کہ ایمان اس سب مسئلے میں بے قصور ہے۔

"لیکن طیبہ! ایمان نے بتایا ہے۔" سکندر ملک نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اور اس کا کہا تو حدیث ہے۔ کیا پتا خود ہی کسی کے ساتھ چلی گئی ہو اور اب من گھڑت کہانی سنا کر سب کو بے وقوف بنا رہی ہو۔" طیبہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"طیبہ خاموش ہو جاؤ۔ میری آنکھوں کے سامنے پلی بڑھی ہے وہ۔ اس کی تربیت میں کھوٹ نہیں۔" سکندر ملک غرائے۔

"مجھ پہ مت چلائیں سکندر! ایمان کا اس سارے قصے میں کوئی قصور نہ بھی ہو تو کیا یہ سچ نہیں وہ رات بھر کسی غیر مرد کے پاس رہ کر آئی ہے اور کیا جہانزیب اس بات کو اگنور کر دے گا؟" طیبہ خاموش ہونے والی نہ تھیں۔

جہانزیب ان دونوں کی بحث خاموشی سے سن رہا تھا۔ ان کی باتوں سے بیزار ہو کر پیر پٹختا' وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس واقعے نے اس کی عقل سلب کر لی تھی' توفیق کمال کا جھکا سر اور ایمان کی خاموشی اپنی جگہ' لیکن طیبہ کی باتیں' وہ ان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

"کیا اسے ایمان سے خود بات کرنی چاہیے؟" جہانزیب نے سوچا "کیا پوچھوں گا اس سے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

طیبہ کا دل ایمان سے متنفر تھا کیونکہ وہ ایک روایتی ماں اور ساس کی طرح سوچ رہی تھیں' مگر جہانزیب تو ایک روایتی مرد نہ تھا۔ اتنے سال ایک آزاد خیال معاشرے میں رہا تھا۔ اعلا تعلیم اور پھر اس کی کلاس جہاں لڑکے لڑکیوں کا آپس میں میل جول کوئی بڑا ایشو نہیں تھا خود اس کی کتنی لڑکیوں سے یونیورسٹی میں دوستی تھی' مگر یہ اس کے ماں باپ کی اچھی تربیت تھی کہ وہ کبھی اپنی حد سے آگے نہ بڑھا تھا۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ عمر' ایمان اور ضعیم کو بھی ان کے والدین نے

بہت خیال سے پالا تھا۔ لیکن جہانزیب کے اندر کا روایتی مرد اسے بے چین کر رہا تھا۔ طیبہ کی باتیں اسے مسلسل پریشان کر رہی تھیں۔ دو راتوں سے وہ سویا نہیں تھا۔ آفس نہیں گیا تھا اور پھر اس ساری صورتحال سے بچنے کا راستہ اس نے فرار میں ڈھونڈا۔ ایک کمزور انسان کی طرح اس نے اس ساری صورت حال سے پیچھا چھڑانے کے لیے لندن جانے کا ارادہ کیا۔

"پاپا میں کل لندن جا رہا ہوں۔" جہانزیب نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے سکندر ملک سے کہا۔

"اچانک۔" سکندر ملک کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

"میں اس ساری سچوئیشن سے کافی ڈسٹرب ہوں پاپا! اور مجھے لگتا ہے کچھ وقت اس ماحول سے دور رہ کر شاید میں کوئی بہتر فیصلہ کر سکوں۔" جہانزیب نے قطعیت سے کہا۔

"میرا خیال ہے، تم ایک بار ایمان سے مل لو۔" سکندر ملک نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میرا نہیں خیال ابھی اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نکلے گا۔" جہانزیب بولا۔

"لیکن تمہارے ملنے سے ایمان کو حوصلہ ہو گا۔" سکندر ملک اس کے ایمان سے ملے بغیر لندن چلے جانے کا سن کر پریشان ہو گئے تھے۔

"ابھی تو میں خود کو ہی سنبھال نہیں پایا کسی کو کیا حوصلہ دوں گا۔ آپ پلیز مجھ پہ دباؤ نہ ڈالیں۔ میں نہیں چاہتا اس سب کا کوئی ایسا نتیجہ نکلے جس سے آپ کی دل آزاری ہو۔" جہانزیب نے تلخی سے کہا۔

اور سکندر ملک خاموش ہو گئے تھے۔ جہانزیب کوئی ٹین ایج لڑکا نہیں تھا۔ جس کو سکندر ملک حکم دیتے اور وہ ان کے آگے کچھ نہ بولتا۔ وہ ایک اعلا تعلیم یافتہ، خود مختار ستائیس سالہ مرد تھا، جس کے فیصلے پہ سکندر ملک کا بس نہیں تھا۔ وہ اسے سمجھا سکتے تھے مگر اس پر اپنے فیصلے مسلط نہیں کر سکتے تھے۔

یہ طیبہ کی سخت باتوں کا اثر تھا کہ جہانزیب، ایمان سے ملے بغیر لندن چلا گیا تھا۔

جہانزیب کے لندن جانے سے جہاں توفیق کمال پریشان ہوئے، وہیں سکندر ملک بھی شرمندہ تھے، لیکن دونوں نے اس بارے میں کوئی بات نہ کی۔

ایمان ان دنوں پہلے سے زیادہ خاموش اور اداس رہنے لگی تھی۔ ایک طرف وہ شخص نہ بھولتا تھا تو دوسری طرف جہانزیب کا اسے کچھ کہے سنے بغیر چلے جانا تکلیف پہنچا رہا تھا۔ وہ جو اپنے ٹوٹے دل کے ٹکڑوں پہ چلتی اس صبح گھر پہنچی تھی، ابھی اس غم سے نمٹنے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ جہانزیب کی بے رخی اور طیبہ کے سرد رویے نے اسے شدید اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ جہانزیب اس سے ایک بار بھی نہیں ملا تھا، اس نے کوئی سوال کیا تھا۔ نہ دلاسا دیا تھا۔ جو راہ میں آئی پہلی مشکل میں ساتھ چھوڑ جائے وہ تا عمر ساتھ کیا نبھائے گا۔

✡ ✡ ✡

اے عشق نہ چھیڑ آ آ کے ہمیں
ہم بھولے ہوؤں کو یاد نہ کر

کمرے میں نیو نور کی آواز دھیمے سروں میں بج رہی تھی۔

قسمت کا ستم ہی کم نہیں کچھ
یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر
یوں ظلم نہ کر، بے داد نہ کر

پچھلے دو ماہ میں ایک بار بھی جہانزیب یا طیبہ نے ان سے رابطہ نہ کیا تھا، سکندر ملک تو مشترکہ کاروبار کی وجہ سے توفیق کمال سے ملتے رہتے تھے، مگر ایمان کے حوالے سے دونوں طرف خاموشی تھی۔ وہ آج بھی جہانزیب کے ساتھ منسوب تھی، مگر پچھلے دو ماہ میں وہ اپنا مقام جان چکی تھی اور اسے ایک بدگمان رشتے میں قید رہنا منظور نہ تھا۔ اسے لگا فیصلہ کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

ایمان کی خاموشی، اس کا سب سے الگ تھلگ اپنے کمرے میں رہنا، توفیق کمال اور شگفتہ کو دن رات پریشان کرتا تھا۔ وہ تو پہلے بھی بہت شور مچانے والوں

میں شامل نہیں تھی، مگر اس حادثے کے بعد بہت چپ چپ رہنے لگی تھی۔ انہیں اپنی بیٹی کے اداس چہرے سے تکلیف ہوتی تھی۔ ماں باپ کتنے بھی طاقتور کیوں نہ ہوں، بیٹیوں کے معاملے میں وہ بہت بے بس ہوتے ہیں۔ اب وہ سکندر ملک اور طیبہ سے خود بات کر کے اپنی بیٹی کی قدر گھٹائیں ایسا تو بہرحال ممکن نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹیبل پر پڑا اس کا موبائل کافی دیر سے بج رہا تھا۔ عجلت میں اس نے فون کی طرف دیکھا اور پھر اسکرین پر آنے والے شناسا نمبر کو دیکھ کر اس نے کال اٹینڈ کی۔

"ہیلو۔" لہجے میں اجنبیت در آئی۔

"ایمان بات کر رہی ہوں۔" دوسری طرف خوب صورت آواز میں سنجیدگی تھی۔

"ہاں۔ کیسی ہو ایمان۔" خود کو لاپروا ظاہر کرتے جہانزیب نے کہا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ سے کچھ ضروری بات کرنا تھی، اگر آپ مصروف نہ ہوں تو؟" نپے تلے لفظوں میں ایمان نے کہا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی خاص مصروفیت نہیں۔ تم کہو۔" اپنے سامنے پڑی فائل بند کرتے اب وہ ایمان کی طرف متوجہ تھا۔

پچھلے دو ماہ میں اس نے جب بھی ایمان کے بارے میں سوچا، اس کا دل بے قرار ہو جاتا تھا، لیکن اس کے اندر کا روایتی مرد ہر بار اسے طیبہ کے الفاظ یاد دلاتا اور وہ خود کو انا کے خول میں بند کر لیتا۔ مگر آج ایمان کی آواز سن کر وہ بے چین ہو گیا تھا۔ اس کے معصوم اور دلکش نقوش کسی آبشار کی مانند دل کی شاہراہ پہ لہرانے لگے تھے اور پھر ان کی بوچھاڑ نے اس کی روح میں جل تھل کر دی تھی۔ آج میں اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگ لوں گا۔ اس نے سوچا تھا۔

"جہانزیب! میں کچھ دن میں آپ کو خلع کے پیپر بھجوا رہی ہوں۔ آپ ان پہ دستخط کر کے مجھے بھجوا دیں۔ اچھا ہے تمام باتیں گھر میں ہی ہو جائیں۔ ورنہ عدالتوں کے چکر میں دونوں گھروں کی ساکھ متاثر ہو۔ یہ مجھے مناسب نہیں لگتا۔" ایمان کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

اور وہ جو اپنے دل میں ایمان سے اپنے گزشتہ رویوں کی معافی مانگنے کا سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا۔ اس کے لئے ایمان کی یہ بات کسی بم کی طرح تھی۔

"ایمان۔۔۔ میں تم سے۔۔۔" لفظ کہیں راستہ بھول چکے تھے اور وہ جواب تک ایمان کو نروس کرتا آیا تھا۔ آج اس کی خوداعتمادی ایمان کے سامنے ہوا ہو گئی تھی۔

"آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں جہانزیب! یہ فیصلہ میں نے بہت سوچنے کے بعد کیا ہے۔ جس رشتے کی بنیاد میں یقین کی مٹی شامل نہ ہو۔ رشتے کی وہ عمارت پہلے ہی جھٹکے سے زمین بوس ہو جایا کرتی ہے۔" ایمان نے تلخی سے کہا۔

"مجھے لگا وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" جہانزیب نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"آپ جس وقت کی بات کر رہے ہیں۔ میں نے اس وقت میں پل پل اذیت جھیلی ہے۔ بے اعتباری اور بے حسی کو سہا ہے میں نے۔ وقت کی بے رحمی نے کیسے میری روح کو گھاؤ لگائے ہیں۔ آپ کو تو اس کا احساس بھی نہیں ہے۔ اس وقت نے مجھے کتنی تکلیف دی ہے، آپ کو اس کا اندازہ ہوتا تو آپ مجھے فون کرتے، میں آپ کو فون نہ کرتی۔" ایمان نے آنسو پیتے کہا۔ پچھلے دو ماہ کی بے بسی آج آنکھوں کے بند توڑنا چاہتی تھی۔

"لیکن میں نے تم سے کوئی صفائی نہیں مانگی۔" جہانزیب بولا۔

"کیوں نہیں مانگی صفائی؟ حق تھا آپ کو سوال کرنے کا۔ مجھ سے پوچھتے کیا ہوا تھا اس رات، میں بتاتی۔۔۔ سب سچ بتاتی اور نہیں تو کوئی دلاسا ہی دیتے۔ تسلی کا کوئی لفظ مجھے حوصلہ دیتا۔ مگر آپ نے صرف اپنا سوچا اور آج بھی آپ اپنے بارے میں ہی سوچ رہے ہیں۔" اس نے ہذیانی کیفیت میں کہا۔

"ایمان! مجھے لگا وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" جہانزیب نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"وقت ہی تھا جب مجھے اپنے شوہر کا اعتماد چاہیے تھا۔ پچھلے دو ماہ سے میں اس وقت کا انتظار کر رہی تھی اور آپ نے کیا کیا؟ آپ نے مجھے میرے ناکردہ گناہ کی سزا دی۔ آپ کی خاموشی نے مجھے مجرم ثابت کر دیا۔ سزا تو میں بھگت چکی جہانزیب! مگر اب مجھ میں تمام عمر کٹہرے میں کھڑے ہونے کا حوصلہ نہیں ہے۔ میں تمام عمر صفائیاں نہیں دے پاؤں گی۔" ایمان نے قطعیت سے کہا اور اس سے پہلے کہ جہانزیب کچھ کہتا۔ دوسری طرف سے لائن کاٹی جا چکی تھی۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھا تھا۔

اگلے دن ایمان نے اپنے فیصلے سے توفیق کمال کو آگاہ کر دیا۔ وہ ساری زندگی جہانزیب اور اس کے گھر والوں کے سامنے مجرموں کی طرح زندگی گزارے' اس کے ہر قدم کو شک کی نگاہ سے دیکھا جائے اور پھر جہانزیب جو آج ایک حادثے کے باعث اسے کچھ کہے سنے بغیر تنہا چھوڑ گیا۔ وہ کل کسی اور بات پہ اسے اپنی زندگی سے با آسانی نکال سکتا تھا۔

ایمان ٹھیک کہہ رہی تھی۔ یہی سچ توفیق کمال کو ایمان سے نظر نہیں ملانے دیتا تھا۔ انہوں نے اس کی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ اس سے پوچھے بغیر کیا تھا۔ اپنی عقل سے انہوں نے اس کے لیے ایک بہترین ساتھی کا انتخاب کیا تھا۔ وہ خوش شکل تھا' اعلا خاندان' دولت اور پھر اس کی تعلیمی قابلیت ان سب سے بڑھ کر تھی۔ لیکن جہانزیب ان کی بیٹی کو بے وقعت کر دے۔ اس کا اعتبار نہ کرے۔ انہیں ایمان کے لیے ایسا جیون ساتھی نہیں چاہیے تھا۔

عمر نے خود وکیل سے خلع کے کاغذات بنوا کے جہانزیب کو فیکس کیے تھے۔ ان کی ایمان اتنی ارزاں نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

زندگی آہستہ آہستہ اپنی روش پہ واپس آ رہی تھی۔

ایمان نے اپنا پانچواں سمسٹر شروع کیا تھا۔ عمر اپنی فیکٹری میں مصروف تھا۔ اس کا کام آج کل بہت بڑھ گیا تھا۔ ضیغم آج کل امریکہ میں اپنے ایڈیشن میں مصروف تھا۔ توفیق کمال اور سکندر ملک آج بھی مشترکہ کاروبار کر رہے تھے۔ ان دونوں میں آج بھی پہلے والی دوستی قائم تھی۔ ایمان اور جہانزیب کے بارے میں ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ دونوں نے اس معاملے میں رواداری نبھائی تھی۔ پچھلے چھ ماہ میں زندگی معمول پہ آ گئی تھی۔

جغرافیہ چینل پہ اس وقت فان گوگ میوزیم پہ پروگرام دکھایا جا رہا تھا۔ اٹھارویں صدی کے معروف مصور ونسنٹ وان گوگ کی تصاویر جو ایمسٹرڈیم میں واقع ایک میوزیم میں رکھی گئی ہیں اور جس کا نام بھی مصور کے نام پہ ہے۔ ایمان پوری یکسوئی کے ساتھ اس پروگرام کو دیکھ رہی تھی۔ رنگوں میں بھیگی فیلڈ آرٹ کی مایہ ناز تصاویر' میوزیم کے وسیع دالانوں میں رنگ بکھرے تھے۔ وان گوگ کی مشہور زمانہ پینٹنگ

Starry Night over the Rhone

کو دیکھ کر ایمان کی آنکھوں میں جگنو در آئے تھے۔ وہ اس پروگرام کو بہت انجوائے کر رہی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے ماما کی جان....." شگفتہ وارفتہ نظروں سے بیٹی کو دیکھتی اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کچھ خاص نہیں ممی! بس یہ پروگرام دیکھ رہی تھی۔" اس نے ٹی وی کی طرف اشارہ کرتے کہا۔

"کچھ خاص نہیں' تو پھر چلو میرے ساتھ۔" شگفتہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہاں جانا ہے؟" ایمان اس پروگرام کو ہرگز مس کرنے کے موڈ میں نہ تھی۔

"آج ایک ایگزیبیشن ہے لان کی۔ سوچا' آج دونوں ماں' بیٹی تھوڑی شاپنگ کر آئیں۔" شگفتہ نے اسے اپنا پروگرام بتایا۔

"اچھا چلیں....." ایمان نے ناچار کہا۔ وہ دونوں آگے پیچھے کمرے سے باہر نکل آئیں۔

☆ ☆ ☆

سفید کاٹن نیٹ کے امبرائیڈری والے لمبے کرتے پہ بڑا سادوپٹا اور چوڑی دار پائجامہ' آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پہ لپ گلوس لگائے وہ آج بھی اپنی دلکش سادگی میں دل کو چھو لینے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔

"ہیلو شگفتہ..." ہوٹل کی لابی سے نکلتے کسی نے انہیں آواز دی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"ہیلو امیرو..." شگفتہ نے پہچانتے ہوئے گرم جوشی سے کہا۔

"کتنے دنوں بعد نظر آئی ہو' لاسٹ ویک مرتضیٰ صاحب کے گھر پارٹی تھی۔ تم وہاں بھی نہیں آئیں۔ ارے یہ ایمان تو ماشاء اللہ بہت کیوٹ ہو گئی ہے۔" شگفتہ سے شکوہ کرتے اب وہ ایمان سے مل رہی تھیں۔

"بس آج کل صمیم کے ایڈمیشن کا سلسلہ چل رہا ہے۔ کچھ توفیق بزی ہیں تو گیٹ ٹوگیدرز میں کم ہی جایا جاتا ہے۔" امیرو کو اپنی مصروفیت کا بتاتے انہوں نے اپنے پارٹی میں نہ آنے کا بہانہ تراشا۔ ورنہ پچھلے ہفتے اور اس سے پہلے ایسی کئی محفلیں' جہاں طیبہ کی شرکت لازمی تھی' وہ نہیں جایا کرتی تھیں۔ توفیق کمال بھلے سکندر ملک سے اپنی دوستی نبھائیں' مگر شگفتہ کو ان کی فیملی سے ملنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"دراصل میں تمہیں فون کرنے ہی والی تھی اور تم سے یہاں ملاقات ہو گئی۔" مسز جاوید نے کہا۔

"ممی! میں گاڑی میں ہوں۔ یہ بیگ رکھ دوں۔" ایمان نے ہاتھ میں پکڑے چند لفافوں کی طرف اشارہ کیا۔ شاید وہ اب ان کی باتوں سے بے زار ہو رہی تھی۔ شگفتہ نے سرہلاتے ہوئے اسے شاپرز پکڑائے۔

"اچھا نیکسٹ ویک اینڈ کا کیا پلان ہے۔" امیرو کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ اب وہ مین گیٹ تک پہنچ چکی تھی۔

"ممی! آپ یہاں ہیں اور میں آپ کو ساری جگہ دیکھ چکا ہوں۔" خوب صورت لہجے میں کہتا۔ وہ ان دونوں کے قریب آگیا۔

"ارے احمر... کیسے ہو بیٹا!" شگفتہ نے پیار سے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں آنٹی... آپ کیسی ہیں اور توفیق انکل۔" اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔

چھ فٹ قد... گندمی رنگت' اٹھی ہوئی ناک' آنکھوں میں ذہانت اور سنجیدگی' دلکش نقوش اور خوب صورت لب و لہجہ' غرضیکہ وہ بھرپور مردانہ وجاہت کا حامل تھا۔ وہ اور عمر ہم عمر تھے۔ شگفتہ نے آج اسے لمبے عرصے بعد دیکھا تھا۔

"پاپا مجھے کہہ رہے تھے' تمہاری ممی یقیناً ایگزیبیشن دیکھنے چلی گئی ہیں۔ میں ابھی ہال کا چکر لگا کے آیا ہوں۔" مسکراتا ہوا اب وہ امیرو سے بات کر رہا تھا۔

"مجھے شگفتہ نظر آگئی تو میں اس سے ملنے چلی آئی۔" احمر سے کہہ کر وہ شگفتہ کی طرف پلٹیں۔ "اچھا شگفتہ! اس ویک اینڈ میں اور جاوید تمہاری طرف آنا چاہ رہے تھے۔ کوئی پروگرام تو نہیں تم لوگوں کا؟" امیرو نے جلدی سے کہا۔

احمر کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

"نہیں' کوئی خاص پروگرام نہیں۔ یو آر موسٹ ویلکم۔" شگفتہ نے خوش دلی سے کہا۔ حالانکہ وہ کافی حیران تھیں کہ امیرو جاوید اتنے سالوں میں پہلی بار ان کے گھر آنے کا کہہ رہی ہیں۔ اپنی حیرت کو ان دونوں سے چھپاتے انہوں نے کہا اور پارکنگ کی طرف چل پڑیں۔

✲ ✲ ✲

جاوید حسن' ٹیکسٹائل انڈسٹری میں ایک مقبول نام تھا۔ توفیق کمال اور وہ ایک ہی کاروبار میں ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے اچھا تعارف رکھتے تھے۔ کاروباری اور نجی تقریبات میں اکثر ملاقات رہتی اور امیرو جاوید سے شگفتہ بھی ان ہی پارٹیوں میں ملتی جلتی تھیں۔ ان کے دونوں بیٹوں' احمر اور شیراز سے بھی

اچھی طرح واقف تھیں۔ مگر آج پہلی بار امیرو ان کے گھر آنے کی بات کر رہی تھیں۔ اس بات نے شگفتہ کو ہی نہیں توفیق کمال کو بھی خاصا حیران کر دیا تھا۔

✲ ✲ ✲

"ایمان کو اس دن تمہارے ساتھ دیکھا تو بس میں نے سوچ لیا تھا میرے احمر کے لئے ایمان ہی بہترین میچ ہے۔" ڈنر کے بعد جاوید حسن، امیرو جاوید توفیق کمال، شگفتہ اور عمر ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ کافی کا گھونٹ لیتے امیرو نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

"ایمان اور احمر؟" شگفتہ کی آنکھوں میں خوش گوار حیرت تھی۔ جبکہ توفیق کمال نے شگفتہ کو پُرسکون چہرے سے دیکھا تھا۔ عمر نے پہلو بدلا۔

"آپ لوگوں کو کوئی اعتراض ہے کیا؟" امیرو نے شگفتہ کے اس سوال پہ تحمل سے پوچھا۔

"سچ توفیق بھائی۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے ایمان ہی وہ خوشی کی کرن ہے جو میرے گھر میں روشنی بھر دے گی۔" امیرو نے فرط جذبات سے کہا۔

"بھلا ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" توفیق کمال کی زبان سے نکلے الفاظ نے شگفتہ کو پرسکون کر دیا تھا۔ احمر کو دیکھ کر ان کے دل میں بھی یہی بات آئی تھی۔ اتنا ہونہار اور خوش شکل لڑکا کاش یہ ان کی ایمان کا نصیب ہو سکتا۔ مگر پچھلے نو سال سے ایمان اور جہانزیب کا نکاح زبان زد عام تھا اور پھر ان دونوں کی طلاق۔۔۔ یہ بات تو صرف دونوں خاندانوں کے درمیان تھی۔ ایسے میں کون ایمان کی شادی کا ذکر کرتا۔

ایمان کے لیے احمر سے بہتر رشتہ توفیق کمال کہاں تلاش کر سکتے تھے اور پھر جس چاہ سے انہوں نے ایمان کے لیے سوال کیا تھا۔ توفیق کمال کفران نعمت نہیں کرنا چاہتے تھے۔

انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ پھر بھی توفیق کمال، ایمان سے ایک بار پوچھنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے وقت مانگا تھا۔

"آپ کو جو مناسب لگتا ہے، آپ وہ فیصلہ کریں۔ مجھے آج بھی آپ کے کسی فیصلے سے اختلاف نہیں ہے۔" ایمان نے پختہ لہجے میں کہا۔ ابھی ابھی توفیق کمال، ایمان کے کمرے میں اس کی رائے جاننے آئے تھے اور ایمان نے ان سے کہہ دیا تھا کہ انہیں اس کے لیے کوئی بھی فیصلہ کرنے کے لیے اس کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے شفقت سے بیٹی کے سر پہ ہاتھ رکھا اور دل میں اس کی اچھی قسمت کی دعا کرتے نم آنکھوں سے باہر نکل آئے۔

"ڈیڈ! احمر جاوید ہی کیوں؟" عمر نے ناراض لہجے میں توفیق کمال سے کہا۔

"عمر! تمہیں ابھی کچھ وقت لگے گا ذہنی پختگی آنے میں۔" توفیق کمال نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"لیکن ڈیڈ! احمر کوئی واحد رشتہ تو نہیں ہے مانو کے لیے۔ ہم کوئی بہتر لڑکا ڈھونڈ سکتے ہیں۔" عمر نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"احمر میں کیا خرابی ہے؟" توفیق کمال نے سوالیہ نظروں سے عمر کی طرف دیکھا۔ عمر نے نچلا لب دانتوں سے کاٹا۔

"عمر کمال! کاروبار اور ذاتی زندگی کو الگ رکھو۔ میں آج تک اس فرق کو لے کر چلا ہوں۔ اسی لیے میرے دشمنوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔" توفیق کمال نے سنجیدگی سے کہا۔ عمر پیر پٹختا اسٹڈی سے باہر آ گیا۔

توفیق کمال جانتے تھے احمر، ایمان کے لیے بہترین ساتھی ہے۔ وہ اس کی سلجھی ہوئی طبیعت اور تحمل مزاجی سے اچھی طرح واقف تھے اور پھر کسی بھی لمبے چوڑے پروگرام کے بجائے دونوں گھروں نے ڈائریکٹ شادی کو ترجیح دی تھی۔ ضعیم کا سمسٹر شروع ہونے والا تھا اور اسے امریکہ جانا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایمان کی شادی اٹینڈ کرنا چاہتا تھا۔

✲ ✲ ✲

ایمان کی رخصتی ہو چکی تھی ارمانوں کی سیج پہ وہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اٹالین کنٹمپریری فرنیچر سے سجا کشادہ کمرہ اپنے مکین کے اعلا ذوق کا ترجمان تھا۔

گلاس ٹیبل پہ ایک نفیس گلدستہ سجا تھا۔ جس میں سفید ٹیوب روز کے ساتھ کاسنی اسپرنگ آئرس اور للی تھی۔ کمرہ کسی بھی عروسی سجاوٹ سے عاری تھا۔ سیاہ اٹالین اسٹائل بیڈ پہ بیٹھے اس نے ایک طائرانہ نگاہ کمرے پہ ڈالی۔ دائیں طرف ایک سیاہ لیدر کا صوفہ رکھا تھا۔ سامنے کی دیوار پہ ٹی وی اسکرین لگی تھی۔ کچھ میوزک سی ڈیز بھی ایک ریک میں قرینے سے لگی تھیں۔ میوزک سینس بہت اچھا ہے۔ ایمان نے مسکرا کر سر جھکا دیا۔

اس کمرے کے رہنے والے کا مزاج کافی مختلف لگتا تھا۔ آرٹ میوزک اور کتابوں کا عاشق تھا۔

کمرے کے سرمئی ٹائل فلور پر بچھے نفیس قالین کمرے کے ڈیکور کو چار چاند لگا رہے تھے۔ کیرن رگ پہ تو ایمان کی نظر کمرے میں داخل ہوتے ہی پڑ چکی تھی۔ میرون رنگ کے قیمتی لہنگے میں اس کا دلکش حسن نکھر آیا تھا۔ گلے میں نفیس ڈائمنڈ اور روبی کا نیکلس جو اس کی صراحی دار گردن کو نمایاں کر رہا تھا۔ کہنیوں تک ہاتھوں میں رچی مہندی کے خوشنما رنگ اور ان میں بھری طلائی چوڑیاں۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں خود کو ایک نظر دیکھا۔

"کاش! وہ آنکھیں آج مجھے دیکھ پاتیں۔" اپنے سراپے کو دیکھتے اس کے دل نے کتنی شدت سے یہ خواہش کی تھی۔ بوجھل نظروں سے اس نے سامنے دیکھا۔ اس کی نظر جکڑ سی گئی۔ بیڈ کے اوپر Starry Night Over The Rhone کی نقل قیمتی فریم میں لگی تھی۔

پہلی نظر میں دیکھنے والے کو وہ پینٹنگ نہیں' بلکہ کوئی کھڑکی یا چوکھٹا معلوم ہوتا تھا جہاں سے آسمان دکھائی دے رہا ہو۔ گیس لیمپس کی ٹمٹاتی روشنیوں کا عکس۔ فان گوگ کا فیلڈ آرٹ بالخصوص یہ پینٹنگ ایمان کو بے حد پسند تھی۔ ایمان کو لگا آج کے دن میں اس سے اچھی بات شاید ہی ممکن ہو۔ دروازے پہ ہلکی سی آہٹ ہوئی تھی۔ وہ چونکی اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"ویسے یہ شادی کافی مشکل کام نہیں؟ بہت تھکاوٹ ہو گئی آج تو۔ تم بھی یقیناً" تھک گئی ہو گی۔" گمبیھر آواز میں بے تکلفی سے بولتا وہ بیڈ پہ کافی ریلیکس موڈ میں بیٹھا تھا۔ جیسے ایمان کو برسوں سے جانتا ہو۔ وہ مدھم سا مسکرائی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"مجھے خواتین کی شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے' لیکن یہ ڈی بیئرز کی ایٹرنٹی کلیکشن ہے۔ میں امید کرتا ہوں تمہیں پسند آئے گی۔" اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس نے ایک قیمتی ہیرے جڑی انگوٹھی ایمان کی انگلی میں پہنائی۔

اس نے پلکوں کو ہلکی سی جنبش دی اور اپنے ہاتھ کو دیکھا جو اب تک احمر کے ہاتھ میں تھا۔

"میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں کہ آپ کی ایک نظر التفات کے قابل بھی نہ ہوں۔" گمبیھر لہجے میں کہتا وہ ایمان سے شرارت کے موڈ میں تھا۔

ایمان کو احمر کے اس جملے نے کافی خجل کیا۔ وہ ان لفظوں کا مطلب جانتی تھی۔ ایمان نے آہستہ سے پلکیں اٹھائیں اور کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔ اس کی نظریں احمر کی ٹھوڑی سے ہوتی اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پہ رکیں۔ اس کے اوپر والے ہونٹ کا کٹاؤ بہت واضح تھا۔ اس کی ناک ستواں اور مغرور تھی۔ اس کی گندمی رنگت میں اس کے چہرے کے نقش سونے پہ سہاگہ تھے۔ اس کی آنکھیں۔۔۔ ایمان کی نظریں اس کی آنکھوں پہ تھم گئیں۔

وہ آنکھیں۔۔۔ گہری سیاہ تھیں۔ ان میں کسی وادی سا سکوت تھا۔ ان میں سو بھید تھے۔ ان کو دیکھ کر صرف عشق ہو سکتا تھا۔ وہ کسی جزیرے سا اسرار رکھتی تھیں۔ ایمان پلکیں جھپکنا بھول گئی۔ اس کے بھنویں بھری بھری اور ملی ہوئی تھیں۔ پیشانی چوڑی تھی جس پہ بکھرے سیاہ بال۔

ان آنکھوں نے کیا' کیا طوفان مچائے تھے اس کی زندگی میں اور آج ایک بار پھر یہ اتنی ہی زندگی سے بھرپور اسے دیکھ رہی تھیں۔ شاید وہ اپنے تخیل کی انتہا پہ تھی کہ آج پھر اس کا خواب سچ بن کر اس کے سامنے

ابھتا تھا۔ ابھی چند دن سے اس کے خواب میں نظر آتی یہ آنکھیں اسے آج دیکھ سکتیں تو کیا دل میں اٹھی وہ تمنا اتنی شدید تھی یا پھر کوئی قبولیت کا وقت تھا کہ وہ بن مانگی دعا کی طرح سامنے آگیا تھا۔

"کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟ کب تک میں اس آسیب میں گرفتار رہوں گی؟ کیوں زندگی تنگ کرتے جارہے ہو مجھ پر؟ چلے کیوں نہیں جاتے میری زندگی سے؟" وہ ہذیانی کیفیت میں چلا اٹھی اور احمر ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

پچھلے دو گھنٹے سے وہ ٹیرس پہ بیٹھا تھا۔ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے ٹانگیں اس نے سامنے پڑی میز پہ رکھی ہوئی تھیں۔ یہ رات اس کی زندگی کی طویل ترین رات تھی۔ وہ بے شمار سگریٹ پھونک چکا تھا اور نیند سے اس کے پپوٹے دکھ رہے تھے۔ لیکن اس کا دماغ اسے پندرہ سال پیچھے لے گیا تھا۔

اپنے مڈل اسکول میں ہونے والے انگلش لینگویج پروجیکٹ کے لیے موضوع کا انتخاب وہ کرچکا تھا۔ پیرنٹل ایبوز اور اگنورنس کے موضوع کو اس نے سلائیڈز اور انگلش شاعری سے ڈسپلے کرنا تھا اور پچھلا پورا ہفتہ اس نے اس کام کی نظر کیا تھا۔

"تم تو تقریباً" اسے پورا کر چکے ہو احمر!" اس کے بہترین دوست نے اسے سراہا۔

"بس اب اس کو چارٹ پہ بنانا باقی ہے۔ مجھے یقین ہے میرا کانسیپٹ سب سے الگ ہوگا۔" اس کی آنکھوں میں جیت کا جذبہ تھا۔ ایک ہفتے بعد اسکول آڈیٹوریم میں پیرنٹل ایبوز اور اگنورنس کے موضوع پر ایک نہیں' دو پروجیکٹ ڈسپلے ہوئے' جن کی سلائیڈز اور انداز بھی کافی ملتا جلتا تھا۔ احمر کے پروجیکٹ کو مقابلے میں رکھنے سے منع کردیا گیا۔ کیونکہ دو پروجیکٹس ایک دوسرے کی کاپی تھے۔

احمر پریشان ہونے سے زیادہ حیران تھا۔ عمر کمال اس کا بہترین دوست تھا۔ اور وہ ہمیشہ اپنی نصابی و غیر نصابی

سرگرمیاں عمر سے ڈسکس کرتا تھا۔ کہیں نہ کہیں یہ طے تھا کہ عمر نے اپنے ذہن سے کام کرنے کے بجائے پورا پروجیکٹ کاپی کرلیا تھا۔

اور پھر یہ اکثر ہونے لگا۔ عمر خاموشی سے احمر کی باتیں سن کر اس کے موضوعات کو نقل کرلیتا' لیکن احمر اسے کچھ بھی کہنے کے بجائے فراخدلی سے نظرانداز کردیتا۔ عمر اس کا بہترین دوست تھا اور اسے یہ دوستی بہت عزیز تھی۔

ہائی اسکول میں برناڈ شاہ کے The Iion Androcles And پہ ڈراما ہونا تھا۔ جس کے لیے ہفتے کے دن فائنل آڈیشن تھے۔ جمعہ کی شام میں عمر کا فون آیا اور یہاں وہاں کی بات کرنے کے بعد اس نے احمر سے کہا کہ کل آڈیشن منسوخ ہوچکے ہیں اور اب نیا نوٹس پیر کو لگے گا۔

"کیا واقعی۔۔۔ میں جلدی نکل گیا تھا اس لیے نوٹس بورڈ پہ نظر نہیں پڑی۔" احمر نے حیرت سے کہا۔

"ہاں کل آڈیشن نہیں ہوں گے۔ میں سمجھا تمہیں علم ہوگا۔" عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا ہوا تم نے بتادیا' ورنہ میرا تو بے کار میں چکر لگتا۔" احمر' عمر کا ممنون ہوا' جس نے اسے بروقت بتا دیا۔

اور پھر اسی شام اپنی فیملی کے ساتھ وہ اپنے فارم ہاؤس چلا گیا تھا۔ پیر کو مین نوٹس بورڈ پہ آڈیشن کے فائنلسٹ کی لسٹ تھی جس میں عمر کا نام Androcles کے کردار کے لئے لکھا تھا۔

اس واقعے کے بعد احمر نے دوبارہ عمر سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ وہ صلح جو طبیعت رکھتا تھا اور اس میں برداشت بہت تھی' لیکن اس بات نے اسے اتنا دلبرداشتہ کیا تھا کہ اس نے اپنا اولیول مکمل کرنے کے بجائے دو ماہ بعد ہی اپنا مائیگریشن کروالیا تھا۔ عمر سے اب اس کا رابطہ مکمل ختم ہوچکا تھا۔

یورپ میں اس کی دلچسپیوں کے ڈھیروں سامان موجود تھے۔ وہ آرٹ کا دلدادہ تھا اور یورپ میں آرٹ اور کلچر کی دنیا آباد تھی۔ عمر کی مقابلہ بازی کو اس نے

ایک برے حادثے کی طرح فراموش کردیا تھا۔ وقت بڑے بڑے حادثے بھلانے کی قدرت رکھتا ہے' یہ تو پھر دو دوستوں کی رقابت تھی۔

تین سال پہلے اس نے کیلی فورنیا اسٹیٹ یونیورسٹی سے اپنا پوسٹ گریجویشن مکمل کیا تھا اور پاکستان میں جاوید حسن کے کاروبار کو جوائن کیا تھا۔ اس کا ارادہ ایک نیا اسٹچنگ یونٹ کھولنے کا تھا۔ احمر کا منصوبہ ایک ایسا اسٹچنگ یونٹ تھا جہاں ملنگ' ڈائنگ' کٹنگ اور اسٹچنگ کی تمام سہولیات کو ایک چھت کے نیچے منتقل کردیا جائے۔ اس کے علاوہ ورکرز کے لیے رہائش کا انتظام بھی اسی جگہ ہو۔ چند غیر ملکی کمپنیوں سے وہ پہلے ہی اس سلسلے میں بات چیت کرچکا تھا۔

"میرا خیال ہے پاپا! رائے ونڈ والی زمین فائنل کردی جائے۔" احمر نے جاوید صاحب سے کہا۔ وہ اس وقت ان کے آفس میں بیٹھا تھا اور اپنے پروجیکٹ کے لیے دیکھے جانے والے ڈیڑھ سو کنال رقبے کے پلاٹ سے متعلق بات کررہا تھا۔

"بالکل لوکیشن بہترین ہے اور پیسے بھی مناسب۔ تم جلد ہی بیعانہ کرلو۔" جاوید حسن نے کافی کا گھونٹ لیتے احمر سے کہا۔

"ٹھیک ہے' تو پھر میں کل ہی مقصود صاحب سے بات کرلیتا ہوں۔ میرا خیال ہے' اس ہفتے میں ڈیل ہوجائے گی۔" احمر نے کافی کا آخری گھونٹ بھرا۔

"تم نے کاغذات کی پڑتال کروالی ہے۔" جاوید صاحب اب ایک فائل کھول رہے تھے۔

"جی پاپا! کاغذات چیک کرواکر ہی میں نے آپ سے بات کی تھی۔" احمر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"پھر تو مسئلہ ہی ختم۔ اب تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" جاوید صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا۔۔۔ پھر میں ڈیلر کو کل ٹوکن کا کہہ دیتا ہوں۔" جاوید صاحب کی مصروفیت کو بھانپ کر احمر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"گڈ۔۔۔" جاوید صاحب نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور نظریں دوبارہ فائل پہ جھکائیں۔

اگلے چند دنوں میں ٹوکن ہوچکا تھا۔ کاغذات کی جانچ پڑتال پہلے ہی مکمل تھی۔ بس اب آخری مرحلہ زمین کی ملکیت کا انتقال اور زمین کی مالیت کی بینک میں منتقلی تھا کہ ایک فون کال نے احمر کی ساری منصوبہ بندی ملیامیٹ کردی۔

"مقصود صاحب یہ بچوں کا کھیل ہے؟ بیعانہ ہوچکا ہے۔ ڈیل فائنل ہے۔ اب اچانک وہ لوگ کیسے ہمیں زمین بیچنے سے انکار کرسکتے ہیں۔" احمر کو ابھی رئیل اسٹیٹ ڈیلر کی کال آئی تھی اور اس نے جیسے احمر سے یہ بات کہہ کر بم پھوڑا تھا کہ وہ پارٹی بیعانہ واپس کررہی ہے اور اب زمین احمر کو نہیں بیچنا چاہتے ہیں۔

"احمر صاحب وہ ڈبل ٹوکن واپس کررہے ہیں۔" مقصود صاحب نے اطلاع دی۔

"مائی فٹ۔۔۔ سر پہ ماریں ان کے ڈبل پیسے۔" احمر نے غصے سے میز پہ ہاتھ مارا۔

"سر! بات دراصل یہ ہے وہ زمین ان کے کوئی جاننے والے خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور وہاں سے انہیں آفر بھی ہم سے زیادہ مل رہی ہے۔" مقصود صاحب نے اصل وجہ بتائی۔

"تو پہلے وہ جاننے والے سوئے ہوئے تھے۔ کمال ہے' کوئی پروفیشنل ایتھکس ہی نہیں ہیں۔" احمر نے جل کر کہا۔

"سر! میں آپ کو دوسری لوکیشن دکھا دیتا ہوں۔ اس سے بہتر قیمت۔۔۔"

"خریدار کون ہے؟" مقصود کی بات ابھی نامکمل ہی تھی کہ احمر نے سوال کیا۔

"عمر کمال۔۔۔" مقصود نے کہا۔

دوسری طرف لائن منقطع ہوچکی تھی۔

عمر کمال۔۔۔ کسی زمانے میں اس کا بہترین دوست اور اس کا بدترین حریف۔

"اس بار میں تمہیں معاف نہیں کروں گا عمر کمال!" احمر نے غصے سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ان دنوں اس پہ شدید ڈپریشن طاری تھا اور ایسے میں ممی کو اپنے کزن کی بیٹی کی شادی پہ اسے ہر حال میں لے کر جانا تھا۔ مہندی تھی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس میں امیرو کی فرمائش پر شامل ہو رہا تھا۔ مہندی کا فنکشن ڈیفنس کلب میں تھا اور وہ لوگ وقت سے پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ وہ ہال سے نکل رہا تھا۔ جب اس نے اصغر انکل کے ساتھ عمر کو دیکھا۔ ایکس بائیس سال کی ایک لڑکی اس کے ساتھ ساتھ تھی اور جس طرح اس نے عمر کا بازو پکڑا ہوا تھا اس سے اندازہ ہو رہا تھا یہ لڑکی اس کے کافی قریب ہے۔

"یہ عمر کی بیوی ہے یا پھر بہن۔" وہ کچھ حتمی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ عمر کو اصغر انکل کے ساتھ بیٹھتے دیکھ کر وہ غصے سے دوسرے دروازے سے نکل گیا تھا۔ اسے وہ فنکشن اٹینڈ نہیں کرنا تھا۔ جس میں عمر کمال شامل ہو۔ وہ عمر کمال کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور پھر امیرو کے لاکھ کہنے پر بھی وہ شادی میں شریک نہیں ہوا تھا۔

"اس دن عمر کمال کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ تم لوگ انہیں جانتے ہو۔" حبہ اپنے شوہر کے ساتھ ان کے گھر دعوت پہ مدعو تھی جہاں موقع ملتے ہی احمر نے حبہ سے پوچھا تھا۔

"ایمان کی بات کر رہے ہیں آپ احمر بھائی؟ وہ تو میری بیسٹ فرینڈ ہے اور عمر بھائی اسی کو ڈراپ کرنے آئے تھے۔ بڑی لاڈلی ہے ایمان ان کی۔" حبہ کافی باتونی تھی اور احمر کے ایک سوال پر اس نے ساری تفصیلات من و عن بتادی تھیں۔ "آپ عمر بھائی کو جانتے ہیں؟" حبہ نے اچانک پوچھا تھا۔

"نہیں بس ایک' دو بزنس پارٹیوں میں ملاقات ہوئی ہے۔" احمر نے لاپروائی سے کہا۔

"تو وہ عمر کمال کی بہن ہے۔" اس نے سوچا اور پھر عمر سے بدلہ لینے کی پوری پلاننگ اس کے ذہن میں آگئی۔ عمر کو اس کی دھوکے بازی کا جواب صرف ایک وار میں دینے کا وقت آگیا تھا۔ عمر میں ایمان کی جان ہے۔ یہ بات اگر احمر کو پتا نہ بھی ہوتی' تب بھی کسی غیرت مند بھائی کی عزت پہ بہن کا لاپتا ہونا کیسی کاری ضرب لگا سکتا تھا۔ ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آگئی۔

کچھ ہی دنوں میں اسے ایمان کا پورا شیڈول پتا چل چکا تھا۔ جس سے اسے قدرے مایوسی ہوئی۔ ایمان صرف اپنے کالج کے لیے اکیلی نکلتی۔ وہ اکثر اپنے گھر والوں کے ساتھ ہوتی یا پھر اپنی دوست کے ساتھ۔ ایسے میں اسے کسی جگہ روکنا... صورت حال کافی مایوس کن تھی۔

وہ اس وقت آواری میں اپنے ایک دوست کے ساتھ بیٹھا ڈنر کر رہا تھا۔ جب ایمان سیاہ شیفون سوٹ میں ایک ٹیبل پہ اکیلی بیٹھی نظر آئی۔ اس کا سارا دھیان اس لڑکی پہ تھا۔ فیصل نے دو' تین بار اسے ٹوکا' مگر اس کا ذہن ایمان کی یہاں موجودگی میں اٹکا ہوا تھا۔ اسی دوران ایک ہینڈسم سا لڑکا جو کافی سوبر ڈریسنگ میں تھا۔ ایمان کی ٹیبل پہ کرسی کھینچ اس کے ساتھ بیٹھا۔ احمر اب ان دونوں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ لڑکا اس سے کافی باتیں کر رہا تھا۔ پھر اس لڑکے نے اسے ایک سیاہ مخمل کا کیس پکڑایا جسے دیکھ کر ایمان مسکرانے لگی۔ احمر کو اس لمحے اپنا دل ہاتھوں سے نکلتا محسوس ہوا۔ سیاہ لباس میں اس کی مسکراہٹ جیسے اندھیری رات میں چاندنی بھر گئی ہو۔

قریباً" نو بجے وہ لوگ وہاں سے اٹھے۔ ایمان کی گاڑی پارکنگ سے نکلی۔ احمر نے اپنی گاڑی کا ڈیش بورڈ کمپاؤنڈ کھول کر بے ہوشی کی دوا کی تصدیق کی' جو اس نے کچھ دن پہلے ہی حاصل کی تھی۔

مین بلیوارڈ کے بجائے اس نے شارٹ کٹ لیا تھا۔ اس غیر آباد علاقے میں ایمان کی گاڑی کو داخل ہوتے دیکھ کر احمر کو اپنا کام اور بھی آسان نظر آیا۔ اس نے تیزی سے پچھلی سڑک پہ گاڑی موڑ کر ایک ذیلی سڑک سے گاڑی دوبارہ مین سڑک پہ نکال لی۔ لیکن اب اس کی گاڑی ایمان کی گاڑی سے آگے تھی اور پھر اچانک اس نے گاڑی ایمان کی گاڑی کے عین سامنے روک دی۔ اپنے چہرے کو رومال سے ڈھک کر اس نے بے ہوشی کی دوا والی شیشی سے دوا ٹشو پہ انڈیلی۔ ایمان کافی

بوکھلائی ہوئی تھی۔ اس نے گاڑی سے باہر کھینچ کر ایمان کی ناک پہ تیزی سے ٹشو رکھا اور پھر چند لمحوں میں وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ ایمان کو ڈال کر اس نے ایمان کی گاڑی کو روڈ سائیڈ پہ پارک کیا۔ اس کا سارا سامان گاڑی میں بحفاظت لاک کر کے وہ اپنی گاڑی کی طرف آیا۔

راستے میں کال کر کے اس نے فارم ہاؤس کے چوکیدار کو جانے کا کہا۔ چوکیدار کے علاوہ دو اور ملازم فارم ہاؤس کی دیکھ بھال کے لئے موجود ہوتے تھے' لیکن وہ دونوں صرف دن میں وہاں آتے تھے۔ احمر کے پاس فارم ہاؤس کی چابیاں تھیں اور اس وقت احمر کو فارم ہاؤس خالی چاہیے تھا۔

وہ عمر کمال کو تکلیف پہنچانا چاہتا تھا۔ ایمان کی ذات کو نقصان پہنچانا اس میں شامل نہ تھا۔ وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔ احمر کو دیکھ کر اس نے ایک' دو سوال کیے اور پھر بے آواز رونے لگی۔ احمر کو اس کا رونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے روتے دیکھ کر احمر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ اس کے دشمن کی بہن تھی۔ پھر بھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کی خوب صورت آنکھوں سے گرتے موتیوں کے قطرے وہ اپنی ہتھیلی پہ جمع کر لے۔ وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

بہت دیر سسکیوں کی آواز اسے سنائی دیتی رہی۔ پھر آواز آنا بند ہو گئی۔ شاید وہ روتے روتے تھک کر چپ ہو گئی تھی۔ اس نے کمرے میں جھانکا۔ وہ بیٹھی بیٹھی سو رہی تھی۔ اس کا سر بیڈ کے کراؤن پہ ٹکا تھا۔ آنسوؤں کی لکیریں اس کے گلابی چہرے پہ نشان چھوڑ گئی تھیں۔ اس کے ریشمی بال بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں چمکتے سونے سے جھلمل تار اس کی رنگت پہ خوب سج رہے تھے۔ بند آنکھوں پہ سیاہ گھنی پلکیں اس کے حسن کو چار چاند لگا رہی تھیں۔

سیاہ لباس میں اس کا حسن قاتل تھا۔ کسی شاعر کی غزل جیسا سحر آفریں۔ کسی مصور کے رنگوں سے بنا دلنشین خاکہ' ایک مجسمہ ساز کا تراشا ہوا کرشمہ۔ دل کو چھو لینے والے حسن سے مالا مال اس لڑکی سے وہ شدید محبت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ صبح کے چار بجے اسے جگا کر احمر نے واپسی کا بتایا۔ بغیر کسی ردعمل کے ایمان اس کی ہر بات مان رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی اداسی احمر کے دل کو تڑپا رہی تھی۔ کیسی بے بسی تھی کہ وہ اسے اپنے دل کا حال بھی نہیں بتا سکتا تھا۔

ایمان کو اس نے بحفاظت اس کے گھر کے باہر چھوڑا تھا' لیکن اپنا بہت بڑا نقصان کر لیا تھا اور اس سے بھی بڑا نقصان اس نے ایمان کا کیا تھا۔ وہ عمر کمال سے بدلہ لینا چاہتا تھا' لیکن اس کی قیمت ایمان کو چکانی پڑے گی' یہ بات احمر نے نہیں سوچی تھی۔ امیو کو احمر کی شادی کی فکر تھی اور احمر کے دل و دماغ پہ ایمان چھائی تھی۔ اس واقعہ کو چند ماہ گزر چکے تھے۔ جب اسے اپنی ممی اور پاپا کی گفتگو سے پتا چلا کہ وہ سکندر ملک کے بیٹے جہانزیب ملک کی منکوحہ ہے۔ اسے آواری میں ایمان کے ساتھ ڈنر کرتا' وہ اسمارٹ سا بندہ یاد آگیا۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ مگر اس کے بعد ممی اور پاپا کی ہی گفتگو سے اسے یہ بھی پتا چلا کہ اس کا نکاح ختم ہو گیا ہے۔ وہ دونوں تو اچانک اس نکاح کے ختم ہو جانے پر حیرانی کا اظہار کر رہے تھے۔ مگر وہ جانتا تھا اچھی طرح۔ تب ہی اس نے امیو سے بات کر لی۔ "میں ایمان سے شادی کرنا چاہتا ہوں ممی!"

"چند ماہ پہلے اس کی طلاق ہو چکی ہے۔ کسی کو خبر بھی نہیں اندر خانہ مسئلہ کیا تھا اور تم چاہتے ہو میں اس لڑکی کو اپنے گھر کی بہو بنا لاؤں۔" امیو بھڑک گئیں۔

"آپ نہیں جانتیں' مگر میں جانتا ہوں کہ ایسا کیا ہوا ہو گا جو رخصتی سے پہلے ان کی علیحدگی ہو گئی۔" احمر نے تاسف سے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ کیا جانتے ہو تم۔" امیو نے تشویش سے پوچھا۔

"یہ نکاح میری وجہ سے ختم ہوا ہے۔" اس نے جیسے بم پھوڑا تھا۔ امیو ہق دق رہ گئیں۔ پھر احمر نے ساری بات امیو کو بتا دی تھی۔ یہ بھی کہ ایمان اور جہانزیب کی علیحدگی کا سن کر اس کا پچھتاوا اور بڑھ گیا ہے۔

امیمو سب کچھ جان کر دنگ رہ گئی تھیں۔ ان کا بیٹا بہت سلجھا ہوا اور تحمل مزاج تھا۔ اس سے ایسی مجرمانہ حرکت کی توقع اور اتنا غصہ... وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ جو غلط کر چکا تھا۔ اس پہ افسوس کرنے کے بجائے اب انہیں وہ سب ٹھیک کرنا تھا جو اس کی وجہ سے غلط ہوا تھا اور پھر انہوں نے یہ معاملہ جاوید حسن تک پہنچایا۔ ششدر تو وہ بھی رہ گئے تھے۔ مگر پھر انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب انہیں کیا کرنا ہے۔ اپنے بیٹے کی غلطی کا وہ اسی طرح ازالہ کر سکتے تھے اور پھر... صرف پندرہ دن میں احمر اور ایمان کی شادی ہو گئی تھی۔

احمر کا عمر سے دس سال بعد سامنا ہوا تھا، لیکن اس موقع پہ ان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے کوئی رنجش نہیں تھی، کیونکہ ان دونوں میں ایک قدر مشترک تھی' ایمان...

ان دونوں کے دل میں ایمان کے لیے جذبات مشترک تھے۔ سچی محبت ایمان کو پالینا اتنا سہل ہو گا۔ احمر کو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ خوشی کے رنگ اس کے چہرے پہ چھپائے نہ چھپتے تھے۔ اس کے لیے انگوٹھی خریدتے ہوئے اس کی نازک انگلیاں احمر کو یاد آئی تھیں۔ ایمان کی وہ کن لفظوں میں تعریف کرے گا۔ اپنی داستان الفت اسے کیسے سنائے گا اور اس کی ان باتوں پہ وہ کیا ردعمل دے گی۔ وہ سوچ سوچ کر مسکرا رہا تھا۔

اتنی باتیں سوچی تھیں اس نے اور ایک بات جو نہیں سوچی تھی' آج رات وہ ہو گئی تھی۔

ایمان اسے پہچان گئی تھی۔ وہ راز جس سے اس کے والدین کے سوا کوئی دوسرا واقف نہ تھا اور جس راز کو وہ ایمان کو کبھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بات ایمان کو معلوم ہو گئی تھی۔

پچھلے دو گھنٹے سے ٹیرس میں بیٹھا وہ کتنے ہی سگریٹ پھونک چکا تھا۔ ایمان کی سسکیاں اس کے کانوں میں پگھلے سیسے کی طرح گھس رہی تھیں۔

فجر کے وقت احمر کمرے میں آیا تو ایمان نڈھال پڑی تھی۔ اس کا چہرہ بخار سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے تپتے ماتھے کو چھو کر اس نے بمشکل بخار کی دوا دے کر اسے سلایا تھا۔

اگلے چند گھنٹوں میں اس کا بخار اتر چکا تھا۔ مگر بے بسی نے احمر کو جکڑ لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں ایمان! تمہارا اس سب میں کوئی قصور نہ تھا۔" احمر نے تاسف سے کہا۔ پچھلے ایک ہفتے میں ان دونوں کے درمیان ہونے والی شاید یہ پہلی بات تھی۔

ایمان نے سوالیہ نظروں سے احمر کو دیکھا۔ "کیا اس بند کمرے میں میرے کردار پہ اٹھے سوال پلٹ جائیں گے؟ کیا میرے پیرنٹس اس رسوائی کو بھول پائیں گے؟" ایمان نے تلخی سے کہا۔

"میں پاک دامن تھی' مگر رسوائی میرا مقدر ٹھہری اور آپ گناہ گار ہو کر بھی معتبر بنے رہے۔" ایمان نے زخمی نظروں سے احمر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ سچ تھا احمر کے پاس اس کی کسی بات کا جواب نہیں تھا۔

احمر کو لگا وہ اپنے دل کی بات ایمان کو کبھی نہیں کہہ سکے گا۔

"ایمان! مجھے افسوس ہے۔ میں نے اس نہج پہ نہیں سوچا تھا۔" احمر نے پچھتاوے سے کہا۔

"احمر! میں نے اپنے ڈیڈی کی بے بسی اور ان کا جھکا سر دیکھا ہے۔ چور نظروں سے وہ سکندر انکل کو میرے لاپتہ ہونے کی صفائیاں دے رہے تھے۔ میں نے انہیں کبھی اتنا کمزور نہیں دیکھا تھا۔ میری وجہ سے ان کے کندھے جھک گئے۔" آنسوؤں کی لڑیاں اس کے رخساروں پہ بہہ رہی تھیں۔

"مجھ سے ان کا جھکا سر اور آنکھوں کی شرمندگی نہیں دیکھی گئی تھی۔ میں نے پہلی بار ان کے کسی فیصلے کو رد کیا۔ میں نے خود جہانزیب سے خلع لی۔ میں اپنے ڈیڈی کو کسی کے آگے جھکتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔" اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنے بھیگے رخساروں کو

صاف کرتے ہوئے ایمان نے کہا۔
آج شام احمر، توفیق کمال کے گھر آیا تھا۔ ایمان کو لینے جو دو دن سے آئی ہوئی تھی اور پھر اس نے اقبال جرم کیا تھا کہ اپنے اور عمر کے اختلافات سے خائف ہو کر اس نے ایمان کو اس رات اغوا کر لیا تھا۔ وہ اپنے کیے پر شرمندہ تھا اور توفیق کمال سے معذرت کر رہا تھا۔ توفیق کمال شدید حیرت کے زیر اثر تھے۔ انہوں نے فوراً" عمر کو طلب کیا اور اب وہ دونوں سے پوچھ رہے تھے کہ ایسے کون سے اختلافات تھے، جس نے احمر جیسے متحمل مزاج انسان کو اس مجرمانہ کارروائی کے لئے اکسایا اور جس کا خمیازہ ایمان نے بھگتا۔
عمر کمال سوچ رہا تھا کاش وہ اپنی حریص فطرت پہ قابو رکھتا تو آج اس کے خاندان کو وہ سب نہ دیکھنا پڑتا جو انہوں نے پچھلے چند ماہ میں دیکھا۔ عمر اپنا تجزیہ کرنے بیٹھا تو ضمیر کے آئینے میں کتنا بھیانک چہرہ ابھرا تھا۔ اسکول کے وہ دو بہترین دوست یا پھر بدترین دشمن۔ کب اس کی دوستی رقابت میں بدلی، عمر کو پتا ہی نہیں چلا تھا۔ پڑھائی میں وہ کسی طرح احمر سے کم نہ تھا۔ مگر کچھ تھا احمر میں جو وہ ہر جگہ بازی لے جاتا تھا۔ اس کی اسائنمنٹ، اس کے آئیڈیاز اتنے الگ ہوتے کہ اساتذہ کی ستائش احمر کے حصے میں آتی۔ عمر کو یہ سب اچھا نہ لگتا۔ آہستہ آہستہ یہ جذبہ نفرت میں بدل گیا تھا اور پھر اس نے احمر کے کام بگاڑنا شروع کر دیے۔ احمر نے کبھی اس سے کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔ اس میں درگزر بہت تھی۔ جھوٹ بول کر اس نے احمر سے اس دن جارج برنارڈ شا کا۔ وہ لیڈ رول چھین لیا تھا۔ مگر پھر اپنا سب سے بہترین دوست گنوا دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد احمر نے عمر سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے جلد ہی اسکول چھوڑ دیا تھا۔ عمر کو اس کی چنداں پروا نہ تھی۔ بلکہ دل کے کسی کونے میں احمر کا سامنا کرتے جو جھجک محسوس ہوتی تھی۔ اب اس سے بھی نجات مل گئی تھی۔ لیکن اتنے سالوں بعد ایک بار پھر اس کا سامنا احمر سے ہو گیا تھا۔
وہ ان دنوں اپنے لیے نئی فیکٹری لگا رہا تھا۔ توفیق کمال نے اسے پوری آزادی دی تھی کہ وہ اس معاملے میں سرمائے کی پروا کیے بغیر اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرے۔ زمین وہ پسند کر چکا تھا اور اس کی لوکیشن اور رقبہ عمر کی فیکٹری کے لیے آئیڈیل تھا۔ مگر اس کے پراپرٹی ڈیلر نے اسے اس زمین کے سودے کی اڑتی اڑتی خبر دی تھی۔ اپنے پروجیکٹ کے پہلے مرحلے میں ناکامی۔ عمر کو یہ ناکامی منظور نہ تھی۔ وہ تقدیر کو تدبیر سے بدلنے کا قائل تھا۔ اپنے ذرائع سے اس نے مالکان کو پتا لگایا تو پتا چلا کہ خریدار احمر جاوید ہے۔
اتنے سالوں بعد ایک بار پھر احمر جاوید اسے ہرانے آگیا تھا اور اس بار بھی اسے احمر سے ہارنا نہیں تھا۔ اس نے زمین کے مالک کو زیادہ قیمت کے ساتھ اپنی نئی فیکٹری میں شیئرز کی آفر کر کے جنگ کا فیصلہ اپنے حق میں کروالیا۔ ان کی جنگ اس نے جیت لی تھی۔ مگر اس کے مابعد اثرات اتنے بھیانک ہوں گے۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔
"مجھے معاف کر دو احمر! میری حاسدانہ فطرت نے مجھ سے میرے بہترین دوست کو جدا کر دیا اور میری غلطیوں کی سزا میری جان سے عزیز بہن نے بھگتی۔" عمر کمال کے ضمیر کی ملامت نے اسے احمر کے سامنے لا جھکا دیا۔
"نہیں عمر! شرمندہ تو میں ہوں۔ اتنا بڑا قدم اٹھا لیا میں نے، شاید اسی لیے غصے کو حرام قرار دیا گیا کہ یہ انسان کی ہر اچھائی پہ حاوی ہو جاتا ہے۔ میرے ایک غلط قدم کا خسارہ تمہارے پورے خاندان نے بھگتا۔" احمر نے تاسف سے کہا۔
"مگر پھر بدلے میں تم نے میری ایمان سے شادی کر کے مجھ پہ جو احسان کیا ہے اس کے لیے تو تمہارا بڑا پن تسلیم کرنا پڑے گا۔" عمر نے جذباتی ہو کر کہا۔
"نہیں عمر! میں نے کوئی احسان نہیں کیا، نہ ہی اپنی غلطی کا ازالہ کیا ہے۔ میں ایمان سے شادی کسی پچھتاوے یا افسوس میں آکر نہیں کی بلکہ میں ایمان سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے ممی کو ایمان کے لیے پروپوزل کا کہا تھا مگر انہوں نے بتایا کہ ایمان کافی سالوں

سے جہانزیب سے منسوب ہے یہ جان کر میں' اپنی خواہش سے دستبردار ہو گیا' لیکن جب میں نے یہ سنا کہ ایمان اور جہانزیب کی علیحدگی ہو چکی ہے تو پھر میں خود کو روک نہیں پایا۔" احمر روانی میں عمر سے کہہ رہا تھا۔

"میری مانو خوش قسمت ہے جسے تم جیسا بہترین محبت کرنے والا ہم سفر ملا ہے۔" عمر نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

ایمان ان دونوں کی باتیں سن کر الٹے قدموں لوٹ گئی تھی۔

احمر کے لفظوں نے کتنا حسین انکشاف کیا تھا۔ وہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ احمر نے پچھتاوے میں اس سے شادی کی ہے۔ اس پہ ترس کھا کر اسے اپنایا ہے۔ وہ جو پور پور اس کے عشق میں ڈوبی تھی' آج یہ جان کر وہ دل کے اس سفر میں تنہا نہیں۔ اس نے دل میں سکون اترتا محسوس کیا تھا۔

احمر کے جذبے احسان نہیں' محبت تھے' مگر احمر کو بھی نہیں پتا کہ ایمان اسے کتنا چاہتی تھی۔ وہ ایمان کی دھڑکنوں میں شامل تھا اور آج وہ کہہ رہا تھا اسے ایمان سے محبت ہے۔ "لیکن یہ بات میں احمر سے کیسے کہوں؟ میں تو اس سے نظر ملا کے بات بھی نہیں کر پاتی۔" اس نے سوچا۔

☆ ☆ ☆

رائل بلیو اور کاسنی رنگ کا گھیر دار انگر کھا۔ اس پہ گولڈن نفیس کام' لمبی قمیص کے ساتھ نیلا شرارہ پہنے وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دے رہی تھی۔ اپنی راج ہنس جیسی گردن میں گولڈ کا قیمتی نیکلس پہننے کے بعد اس نے ایک بھرپور نگاہ خود پہ ڈالی۔ مناسب میک اپ میں اس کا سراپا کیا خوب لگ رہا تھا۔ مگر اگلے ہی پل اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ آئینے میں اس کے عکس کے ساتھ احمر بھی تھا۔

ایمان کو وارفتہ نگاہوں سے دیکھتا وہ اس کے پیچھے کھڑا' ایمان کے دل میں ہلچل مچا رہا تھا۔ احمر کے کزن آیان کی شادی تھی اور وہ دونوں اسی شادی میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ امیرو اور جاوید حسن تو پہلے ہی شیراز کے ساتھ جا چکے تھے اور اب احمر' ایمان کو لے کر وہاں جانے والا تھا۔

"تم نے چوری کرنی کب سیکھی؟"

آئینے میں ایمان کو دیکھتے' بازو سینے پہ باندھے استحقاق بھری نظروں سے دیکھتا اس کے اتنا قریب تھا کہ اگر وہ پیچھے مڑتی تو اس کا سر اس کے سینے سے جا ٹکراتا۔ وہ پیچھے نہیں مڑی تھی۔ اس نے آئینے میں سوالیہ نگاہوں سے احمر کے عکس کو دیکھا۔

"پہلے میرا دل چرا لیا اور آج میری پسندیدہ پینٹنگ کے سب رنگ اپنے حسین سراپے میں قید کر لیے ہیں۔ دیکھو تو اسٹاری نائٹ کیسی پھیکی لگ رہی ہے۔" احمر نے دیوار پہ لگے فریم کی طرف اشارہ کرتے شرارت سے کہا۔

دل کی دھڑکنوں میں کہیں اتھل پتھل ہوئی تھی۔ الفاظ تھے کہ جادو۔ ایمان کو لگا اس سے پہلے اسے کسی نے اتنے حسین لفظوں میں نہیں سراہا تھا۔ پلکوں کی جھالریں گرائے وہ ہولے سے مسکرائی اور احمر کو اس مسکراہٹ میں بہار کے سب رنگ نظر آئے تھے۔

"ایک بات پوچھوں ایمان۔۔۔ سچ بولو گی۔" احمر نے اچانک کہا۔ اس کی نظریں آئینے پر ہی تھیں۔

"جی۔۔۔" ایمان نے رخ موڑ کر کہا۔

"تمہیں مجھ سے محبت ہے؟" احمر نے کیسا سیدھا سوال کیا تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے۔" ایمان نے سادگی سے پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے' تم بھی مجھے پسند کرتی ہو۔" احمر نے کہا۔ اس کی نگاہیں اب بھی اس پر جمی ہوئی تھیں۔

"ٹھیک لگتا ہے۔" ایمان مختصراً بولی۔

"اچھا یہ بتاؤ اس دن تمہیں مجھ سے کیوں خوف آیا تھا؟" احمر نے اس رات کے حوالے سے پوچھا۔

"تمہاری آنکھوں کو دیکھ کر آیا تھا۔" ایمان نے سادگی سے کہہ دیا۔

"کیا میری آنکھیں اتنی خوف ناک ہیں؟" احمر نے ایمان کی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔" ایمان نے سر ہلایا۔ "اتنی پرکشش آنکھیں ہیں تمہاری کہ میں خود سے ڈر گئی تھی۔" ایمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"رئیلی؟ اور تم پہ یہ انکشاف اس اغوا والی رات ہوا۔ تم اپنے اغوا سے خوف زدہ ہونے کے بجائے میری آنکھوں سے امپریس ہو رہی تھیں۔" احمر نے برجستہ کہا۔

"پہلی بار میں نے تمہاری آنکھیں اپنے خواب میں دیکھی تھیں۔ مجھے تو تب ہی پتا چل گیا تھا کہ میں تمہاری آنکھوں سے عشق کرتی ہوں۔" ایمان نے اعتماد سے کہا۔

احمر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"پچھلے ایک سال سے میں ایک خواب اکثر دیکھ رہی تھی، جس میں تمہاری آنکھیں، پیشانی اور اس پہ بکھرے بال مجھے واضح نظر آتے تھے۔ تم اسے میری فینٹیسی سمجھو، میرا آئیڈیل فلاں یا پھر میری چھٹی حس، مجھے خواب یاد نہیں رہتے۔ میں نے کوئی بھی خواب اتنی جزئیات سے یاد نہیں رکھا۔ مجھے خواب میں تمہاری آنکھیں دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ میں کب تم سے محبت کرنے لگی، میں نہیں جانتی، مگر اس رات جب میں نے تمہیں اپنے سامنے دیکھا تو ایک لمحے میں تمہاری آنکھوں کو پہچان لیا تھا۔ یہ آنکھیں میرا عشق تھیں۔ انہیں میں کیسے فراموش کر دیتی۔ اس رات میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تم ہو کون۔ میں تو بس اس لیے رو رہی تھی کہ میرا خواب حقیقت بن کر سامنے بیٹھا ہے اور میں کتنی بے بس ہوں جو نہ اسے پا سکتی ہوں نہ ہی بتا سکتی ہوں۔"

ایمان نے شروع سے آخر تک سب کہہ دیا تھا۔

"اور میں اب تک حیران تھا، تم نے مجھے شادی کی رات پہچانا کیسے۔" احمر نے مسکراتے ہوئے اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ "تم نے مجھے معاف کر دیا نا ایمان؟" احمر اس سے پوچھ رہا تھا۔

"میرے دل میں اپنے لیے تو تم سے کوئی گلہ تھا ہی نہیں احمر! میں تو اپنی فیملی کی وجہ سے ڈسٹرب تھی۔ مگر تم نے ڈیڈی اور عمر بھائی کو سب بتا کر میرا یہ گلہ بھی ختم کر دیا۔" ایمان نے اپنے ہاتھ کو احمر کے ہاتھ میں دیکھ کر کہا۔ وہ چاہتی تھی احمر یہ ہاتھ کبھی نہ چھوڑے۔

☼ ☼ ☼

سبزے کے قالینوں میں گھری سرمئی پتھروں سے بنی عالی شان عمارت۔ وسیع دالانوں سے گزرتے سیڑھیاں چڑھ کر وہ دونوں رنگوں میں بھیگے نمائشی ہال میں داخل ہوئے۔ ہال کی دیواروں پہ آبنوسی قدیم طرز کے دیدہ زیب فریموں میں جڑی رنگین پینٹنگز، ونسنٹ وان گوگ کے شاہکار ان کی آنکھوں کے سامنے تھے۔

یہ ان کے ہنی مون کے آخری دو دن تھے اور آج وہ دونوں ایمسٹرڈیم میں تھے۔ اپنے وعدے کے مطابق احمر اسے وان گوگ میوزیم دکھانے لایا تھا۔ وان گوگ ایمان اور احمر کا پسندیدہ مصور تھا اور مشہور زمانہ اشاری نائٹ کا پورٹریٹ دیکھنا اور یہاں میوزیم میں اس کی اصل دیکھنا بالکل منفرد تجربہ تھا۔ گیس لیمپس کی روشنی میں دمکتا نیلگوں آسمان، دریائے رہون کا نیلا کانچ پانی، کاسنی زمین اور دریائے رہون کے مغربی کنارے پہ کھڑے رنگوں میں بھیگے دو نفوس، محبت کرنے والوں کی شبیہہ۔

اس پینٹنگ کی نقل احمر اور ایمان کے بیڈ روم میں تھی اور اصل اس میوزیم میں۔ لیکن اس میوزیم میں موجود سارے رنگ محبت کے ان رنگوں سے ہلکے تھے، جن سے ایمان اور احمر کے وجود بنے تھے۔

قرۃ العین رائے

"چٹاخ....!" تھپڑ کی گونج نے لاؤنج میں بیٹھے ہر ذی نفس کو اپنی جگہ پر ایک پل کو ساکت کر دیا تھا۔ مگر اگلے لمحے ہی سب حرکت میں آ گئے تھے۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟ جرأت کیسے ہوئی تمہیں تھپڑ مارنے کی۔"

"شرم نہیں آئی میری پھول سی بچی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔"

"خاور ہوا کیا ہے؟ کیا کیا ہے ناعمہ نے۔" امی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو دبوچتے ہوئے پوچھا۔ اچھا بھلا تماشا لگ گیا تھا اور وہ گال پر ہاتھ رکھے شاک کی حالت میں تھی تو وہ بھی چہرے پر سختی سجائے دانت بھینچے کھڑا تھا۔

"بکتا کیوں نہیں۔ کیوں مارا ہے تھپڑ؟" صدیق صاحب نے آگے آ کر اس کے کندھے کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ بیٹا ان کے قد سے چار انچ اوپر چلا گیا تھا۔ اس کی حرکت پر اسے بدلے میں تھپڑ نہیں مار پائے تھے اور جیسے وہ تن کر کھڑا تھا۔ شدید غصے میں ہونے کے باوجود شدید ردعمل کا اظہار نہیں کر پائے تھے۔ ورنہ جتنے غصے کے تیز گرم مزاج تھے کوئی اور ہوتا تو دھنک کر رکھ دیتے۔ جوان بیٹے کی جوان مردی کا شدت سے احساس اجاگر ہوا تھا۔

"ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا شادی کو اور تمہاری یہ مجال کہ میرے سامنے ہی ناعمہ کو تھپڑ دے مارا۔ بھائی جان! دیکھ رہے ہیں آپ۔" بی بی پھپھو نے واویلا شروع کر دیا۔

"بس... کوئی بھی ہم میاں بیوی کے درمیان نہیں بولے گا اور پھپھو! بند کریں یہ تماشا بہت عرصے اس گھر نے آپ کا یہ ڈراما دیکھ لیا۔ ایسے ہی واویلا مچا کر آپ نے ہمیشہ میری امی کو مار پڑوائی۔ آج پتا چلا اس درد کا جو ہم لوگوں کو ہوتا تھا۔ ایسے ہی دل پر ہاتھ پڑتا تھا ہمارے جب ابا آپ کی لگائی بجھائی پر امی کو ہم سب کے سامنے پیٹتے تھے۔ اس گھر پر حکمرانی کرنے کے لیے آپ نے کیسے کیسے نہیں امی کو زچ کیا۔ ہم سب جانتے ہیں تو بس سمجھ لیجئے جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ بساط پلٹ گئی ہے۔" وہ چلا رہا تھا۔

ایک بار پھر ہر کوئی اپنی جگہ پر ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔ ناعمہ کے آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی۔ اس انکشاف کے بعد کہ خاور نے اس سے شادی پسند سے نہیں بلکہ بدلہ لینے کے لیے کی ہے۔

صدیق صاحب کے چوڑے کندھے ایک ان دیکھے بوجھ سے یک دم ڈھلک گئے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو خاور! تم نے یہ شادی۔ ایسی تربیت تو میں نے نہیں کی۔"

امی سے حیرت اور دکھ کے باعث پوری بات ہی نہ کی گئی۔ وہ اندر سے بے حد خوف زدہ بھی تھیں۔ بیٹے کی اس حرکت کی جواب دہی ان سے ہی تو ہونی تھی اور صدیق صاحب کے عتاب کا نشانہ بننے کی اب ان میں ہمت نہ رہی تھی۔

"بچپن سے لے کر جوانی تک آپ کو خواہ مخواہ ابا کے غصے کا شکار دیکھا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ آپ دادی اور بیوہ پھپھو کے ساتھ ناروا سلوک کرتی ہیں جبکہ بات اس کے الٹ تھی۔ دادی اور پھپھو نے

ہمیشہ آپ کا جینا حرام کیے رکھا' اس خوف کی بنا پر کہ اگر
آپ کو دبا کر نہ رکھا تو وہ بے آسرا ہو جائیں گی۔ حالانکہ
آپ ایسی نہیں اور ابا جو اس گھر کے سرپرست ہیں'
کبھی بھی دونوں طرف توازن نہ رکھ پائے۔ ماں اور
بہن کے حقوق تو ازبر رہے۔ بیوی اور بچوں کے حقوق
کیا ہیں اس کا علم ہی نہیں۔ آج سے پانچ سال پہلے
جب ابا نے پھپھو کی غلط بیانی پر آپ کو مارا تھا تو اسی دن
میں نے ٹھان لی تھی کہ آپ کے ساتھ ہوئے ظلم و ستم

کا بدلہ میں انہیں یوں ہی نہیں دیا کروں گا۔"

خاور چہرے پر پتھروں کی سی سختی سجائے بولتا چلا گیا اور اس کے ارادوں نے ایک معصوم دل کو لرزا کر رکھ دیا۔

"ہونہہ سنپولیا کہیں کا' ایسا میں ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ میری بیٹی گری پڑی نہیں ہے۔ باپ نہیں تو کیا ماں تو زندہ ہے۔ چلو ناعمہ! میرے کمرے میں چلو۔ جب تک یہ ناک رگڑ کر اپنی اس حرکت کی معافی نہیں مانگے گا اور آئندہ ایسا نہ کرنے کی قسم نہیں کھائے گا' تم میرے پاس ہی رہوں گی۔" پھپھو نے ناعمہ کا ہاتھ پکڑ کر سختی سے کہا۔

"ہاں بی بی! لے جاؤ ناعمہ کو اپنے کمرے میں۔ دیکھتا ہوں میں کیسے نہیں یہ معافی مانگتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی ماں کا بھی دماغ ٹھکانے نہ لگایا تو صدیق نام نہیں میرا۔" بہن کے انداز پر صدیق صاحب بھی اپنی جون میں لوٹ آئے۔

"اگر یہ یہاں سے ہلی تو کھڑے کھڑے طلاق دے دوں گا۔ ساری عمر بیوگی کی زندگی گزاری ہے پھپھو نے اور بیٹی مطلقہ کی گزارے گی۔ جانتے ہیں ناں' ہمارے خاندان میں ایک مطلقہ کو چھوت سمجھا جاتا ہے اور خاندان سے باہر شادی کرنا بھی گناہ مانا جاتا ہے۔ اگر آپ کو اس کی زندگی برباد کرنی ہے تو کرلیں مجھے تو چار کی اجازت ہے۔"

خاور کے جملے صدیق صاحب اور بی بی پھپھو کے ساتھ ناعمہ پر بھی تیزاب کے چھینٹوں کی طرح پڑے تھے۔

"خاور! اللہ کا واسطہ۔ ہوش کر کیوں مجھے اس بڑھاپے میں ذلیل کر رہا ہے۔ مت کر ایسی باتیں۔" سکینہ بیگم نے اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"ایسی بات ہے تو میں تمہاری ماں کو طلاق دے دوں گا۔" صدیق صاحب نے غصے میں چلاتے ہوئے کہا۔

"دے دیں۔ جوان بیٹا ہے ان کے پاس۔ سنبھال لے گا۔ اچھا کماتا ہوں۔ ماں بھاری نہیں ہے مجھ پر۔ اپنی بھانجی کا سوچیے اس کا کیا ہوگا؟" خاور اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلا تھا۔ صدیق صاحب جھاگ کی طرح بیٹھ گئے تھے۔

"دیتا ہے تو دے طلاق۔ اس ڈر سے میں اس کی زندگی جہنم نہیں بننے دوں گی۔" بی بی پھپھو نے عاقبت نااندیشی دکھاتے ہوئے کہا اور ناعمہ کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ "چل ناعمہ! اپنے کمرے میں چل۔"

"ناعمہ! اگر تم یہاں سے ہلیں بھی تو۔" خاور کی دھمکی پر آنسوؤں سے لبریز آنکھیں ماں کی جانب اٹھی تھیں۔

"نہیں امی! میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے منظور ہے ان کا ہر ظلم ہر ستم لیکن آپ جیسی زندگی نہیں اور یہ ہم میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے۔ آپ میں سے کوئی اس میں کچھ نہیں بولے گا۔" ناعمہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور بات ختم کرکے اپنے اور خاور کے کمرے بھاگ آئی اور بیڈ پر اوندھے منہ گر کر رونے لگی۔

خاور سر جھٹکتا گھر سے نکل گیا۔ صدیق صاحب اور بی بی پھپھو بعد میں واویلا کرتے رہے' سکینہ بیگم چپ چاپ صوفے پر ہاتھ میں سر گرائے بیٹھی رہیں۔

☆ ☆ ☆

بہت اونچے گھر میں بیاہا تھا اختر خان نے اپنی اکلوتی چہیتی بیٹی ثمینہ کو۔ ثمینہ کا شوہر بھی اکلوتا تھا' لیکن ثمینہ کی بدنصیبی کہ ناعمہ ابھی سال کی تھی تو ایک کار ایکسیڈنٹ میں ان کا شوہر چل بسا اور ثمینہ ناعمہ کے ساتھ بیوگی کی چادر اوڑھے اپنے میکے کی دہلیز پر پھر آن بیٹھیں۔ بیٹی کے غم میں اختر خان جلد ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے اور صدیق کے کندھوں پر اپنے بیوی بچوں سمیت ماں' بہن اور اس کی ننھی بیٹی ناعمہ کا بھی بوجھ آن پڑا۔ وہ ایک سرکاری دفتر میں معمولی ملازم تھے۔ ثمینہ کو امیر شوہر نے خوب ناز و نعم میں رکھ کر ان کی عادتیں بگاڑ ڈالی تھیں' لیکن شوہر کی وفات کے بعد پتا چلا کہ وہ کافی مقروض تھے۔ جو کچھ تھا قرض خواہوں

لو دے دلا کر خالی ہاتھ بھائی کے گھر آن بیٹھیں۔ ماں اور بیٹی کو ہر وقت یہی ڈر رہتا کہ اگر صدیق نے اپنے بیوی بچوں کے آگے انہیں کچھ نہ جانا تو پھر ان کا کیا ہو گا۔ تعلیم بھی واجبی تھی۔ کوئی ملازمت بھی نہیں کر سکتی تھیں بس اسی ڈر کی بنا پر انہوں نے گھر میں سازشوں کا جال بچھا دیا' صدیق صاحب کو سکینہ سے متنفر کیے رکھا۔ ہر وقت کان بھرتی رہتیں اور صدیق کو بیوہ ماں اور بیوہ بہن کی آہ و بکا سے اتنا ڈر لگتا کہ بیوی بچوں کے حقوق یکسر فراموش کر بیٹھے۔

خاور ان کا بڑا بیٹا تھا۔ وہ ایسے ماحول میں پل کر جوان ہوا' ماں کے آنسو اور بے بسی اس کے گرم خون کو لاوا بنا ڈالتی تھی اور پھر کچھ سال پیشتر جب باپ نے پھپھو کی لگائی بجھائی پر ماں کا گلا دبانے کی کوشش کی۔ خاور نے پہلی بار بیچ میں آکر ماں کو بچانا چاہا تو صدیق صاحب نے چلاتے ہوئے سکینہ کو دھمکی دی تھی کہ ابھی اسی وقت انہیں طلاق دے کر گھر سے نکال دیں گے۔ تب سکینہ بیگم نے خاور کو تھپڑ مارتے ہوئے میاں بیوی کے معاملے میں نہ بولنے کا کہا تھا۔ اس روز ہی خاور نے دل میں فیصلہ کر ڈالا تھا کہ بہت جلد وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر ناعمہ سے شادی کر کے اپنی ماں پر کیے ہر ظلم کا بدلہ لے گا۔

اچھی شکل صورت اور بہترین ملازمت۔ رشتے سے انکار کیوں کر ممکن تھا۔ جبکہ ان کے ہاں شادی بھی خاندان سے باہر نہ کرنے کا رواج تھا۔ اس لیے خاور اور ناعمہ کی جھٹ منگنی پٹ شادی ہو گئی تھی۔

اور آج ٹھنڈی چائے کا گھونٹ لیتے ہی خاور نے جس زور سے ناعمہ کو تھپڑ کو مارا تھا' ثمینہ کو بازی الٹ جانے کا احساس ہوا تھا۔ اور پھر آنے والے وقت نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ وہ ماضی میں کیا کرتی آئی تھیں۔ کیسے کیسے بیج بوئے جس کی فصل آج وہ کاٹ رہی ہیں۔ بیٹی کی ویران شکل دیکھتیں' خاور سب کے سامنے اسے بری طرح جھڑک دیتا۔ ذلیل کرتا معمولی معمولی بات پر جھاڑ کر رکھ دیتا اور یہ سب وہ خاص طور پر سب کے سامنے کرتا۔ وہ ان کی پھول سی بچی سے بدلہ لے رہا تھا۔ مرجھا کر رہ گئی تھی وہ چند دنوں میں ہی لیکن وہ خاور کی ہر زیادتی کو خاموشی سے سہ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ خاور کے اس رویے کے پیچھے کیا محرکات ہیں۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتی تھی کہ ان سب باتوں میں اس کی ماں قصور وار تھی وہ صبر کی عملی تفسیر بن گئی۔

صدیق صاحب اپنی جگہ پر شرمندہ تھے اگر انہوں نے گھر میں توازن رکھا ہوتا تو آج جو بگاڑ نظر آ رہا ہے۔ وہ کبھی نہ ہوتا۔ سکینہ کے ساتھ ان کا رویہ بدل گیا تھا۔ شاید اسی طرح سے خاور ان کی بھانجی کو اچھی طرح قبول کرے۔ سب مہرے اب خاور کے ہاتھ میں تھے۔ سکینہ موقع ملنے پر بیٹے کو سمجھاتیں "اس سے دو چھوٹی بہنوں کو بھی ایک روز بیاہ کر جانا ہے' سوچو کیا سلوک ہو۔ ڈرا دیتیں لیکن وہ اپنے موقف سے ٹس سے مس نہ ہوتا۔

ناعمہ کی زندگی اس نے کانٹوں بھری کر ڈالی تھی' وہ اذیت پسند بن چکا تھا۔ جس بچے نے باپ کے ہاتھوں ماں کو آئے دن ذلیل ہوتے دیکھا ہو۔ وہ کیسے اس آدمی کی پیاری بھانجی سے التفات برت سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بس میری تو اللہ سے دعا ہے کہ اللہ ناعمہ کو بیٹا دے۔ پہلی اولاد اور وہ بھی بیٹا۔ میری ناعمہ کے قدم تب ہی مضبوط ہو پائیں گے اور بیٹے کی ماں بننے کے بعد ہی خاور اس کی قدر کرے گا۔"

بی بی پھپھو نے دوپٹے سے آنسو صاف کرتے ہوئے تہہ دل سے دعا کی۔ جب سے ناعمہ کے گھر نئے مہمان کی آمد کی خبر سنی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے وہ سب لوگ یہی دعا کرتے تھے کہ ناعمہ کو اللہ بیٹا دے۔

سکینہ بھی ایک بیٹے کی ماں ہے۔ کیسے اس کے بیٹے نے سب کو دن میں تارے دکھا کر رکھ دیے ہیں۔ اللہ میری ناعمہ کو بیٹا عطا کر دے" اٹھتے بیٹھتے یہی وہ یہی دعا کرتی تھیں۔ خاور کا رویہ آج بھی ناعمہ کے ساتھ سخت تھا لیکن اس کی حالت کے پیش نظر وہ گھر میں کم ٹکتا تھا تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ دور رہ کر اسے

تکلیف پہنچایا ہے۔

☆ ☆ ☆

ناعمہ کے صبر اور اپنی ماں کے فیصلے کو قبول نہ کرنے پر اس کے دل سے بغض کے بادل چھٹنے لگے تھے ' پھر سکینہ بھی اسے موقع ملنے پر سمجھاتی تھیں ' لیکن خاور جیسے ہی پھپھو اور ابا کو دیکھتا اسے غصہ چڑھنے لگتا۔

درد اس کی جان نکال رہا تھا۔ برداشت ختم ہو رہی تھی۔ وہ بہت ڈری بھی ہوئی تھی۔ درد سے دہرے ہوتے اس نے خاور کا ہاتھ سختی سے پکڑا تھا اور خاور اس کے لرزتے ہاتھ کی لرزش پر کپکپا کر رہ گیا تھا۔

فوراً" ہی اسٹریچر پر اسے آپریشن تھیٹر منتقل کر دیا گیا تھا۔ جان کنی کا عالم طاری تھا اس پر اور لبوں پر ایک ہی دعا کا ورد۔

ثمینہ ' سکینہ اور صدیق صاحب باہر اس کے لیے فکر مند دعا گو تھے۔ پھپھو تو بس اللہ سے ایک ہی دعا کیے جا رہی تھیں کہ اللہ اسے بیٹا عطا کر دے اور ان کی بیٹی کو بھی زندگی عطا کرے۔

آپریشن کامیاب رہا تھا۔ جلد ہی اسے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ چند گھنٹوں بعد ناعمہ کو ہوش آگیا تھا اور پھر اس نے خاور کی گود میں کمبل میں لپٹے وجود کی طرف ممتا سے سرشار ہوتے دیکھا تھا۔

اللہ نے اس کی دعا سن لی تھی۔ اس نے رو رو کر سجدوں میں گر کر دعا کی تھی کہ اللہ اسے بیٹی عطا کرے۔

"ارے دھیان سے۔" چھوٹی بہن کے اٹھانے پر خاور تیزی سے بولا تھا۔ اور اسی لمحے اس کی نظریں ناعمہ سے ٹکرائی تھیں۔ آج بیٹی کا باپ بن کر اسے احساس ہوا تھا کہ بیٹی کتنی نازک ہوتی ہے ' کانچ کی طرح کسی بھی سرد گرم رویے پر ٹوٹ جانے والی۔ ناعمہ بھی تو کسی کی بیٹی تھی۔

ناعمہ کی نظروں میں جو کچھ تھا۔ خاور کو سمجھ میں آ رہا تھا تب ہی وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے پاس آیا تھا۔

"نئی زندگی مبارک ہو ناعمہ اور مجھے میرے گزشتہ رویے پر معاف کر دو آج بیٹی کا باپ بن کر سمجھ میں آیا کہ یہ کتنی نازک ہوتی ہے۔ ڈر گیا ہوں کہ میرے گناہوں کی سزا اگر میری بیٹی کو بھگتنی پڑے۔ اللہ نہ کرے۔" اپنی بات پر وہ خود ہی لرز گیا تھا۔

سب لوگ خاور کی کایا پلٹ پر حیران رہ گئے ہر آنکھ اشک بار تھی ' پھپھو نے بھی آگے بڑھ کر اپنی غلطیاں تسلیم کی تھیں ' سب ایک دوسرے کی خطاؤں کو معاف کر چکے تھے۔

سکینہ نے صدیق صاحب کی۔ خاور نے پھپھو کی اور ناعمہ نے خاور کی۔

صرف اس ننھی رحمت کے آنے پر ہی سارا ماحول یکسر بدل دیا گیا تھا۔

"سچ ہے بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں۔" ناعمہ نے پر سکون ہو کر آنکھیں موند لی تھیں۔

اس کی بیٹی اس کی زندگی میں رحمت بن کر آئی تھی۔ اس کے صبر کا پھل اسے دے دیا گیا تھا۔ وہ اللہ کی شکر گزار تھی جس نے اس کی دعاؤں کی لاج رکھ لی تھی۔

"بھئی بیٹی کا نام کیا رکھا ہے۔" صدیق صاحب نے پوچھا۔ خاور اور ناعمہ کے منہ سے ایک ساتھ ادا ہوا تھا۔ "رحمت!"

"ہائے بھائی! اتنا اولڈ فیشن نام۔"

خاور کی چھوٹی بہن نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔

"پگلی رحمت کبھی اولڈ فیشن نہیں ہوتی۔" دونوں کے ایک ساتھ نام لینے پر اور خاور کے جواب پر سب ہنس پڑے تھے۔

بے خبر سوئی ہوئی وہ سفید اور گلابی سی نازک پری جس کا نام رحمت رکھا گیا تھا ' نیند میں شفاف اور معصوم سی مسکراہٹ سے کسمسائی تھی اور خاور کو اس پر بے تحاشا پیار آیا تھا۔ جب ہی اپنی گود میں بھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔ اور ناعمہ ان دونوں کو دیکھتے ہوئے اطمینان اور سکون سے آنکھیں موند گئی تھی۔

☆

سمیرا حمید

امرحہ کی پیدائش کے وقت اتفاقی طور پر رونما ہونے والے چند ناگوار اور نقصان دہ واقعات کے سبب وہ اپنے خاندان میں "منحوس" مشہور ہو جاتی ہے۔ اس کے بابا 'اماں' دادی اور تینوں بہن بھائی دانیہ 'عماد اور علی اسے اکثر جنم جلی 'منحوس' کالی نظر اور کالی زبان کہتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی منگنی بھی ان ہی افواہوں کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنی نحوست کے صبح شام قصے سن کر امرحہ خود ترسی کا شکار ہو کر روتی رہتی ہے۔
پورے گھر میں صرف دادا ہی اس کی دل جوئی کرتے ہیں اور گھر والوں کی باتوں کو لغو قرار دیتے ہوئے امرحہ کو بھی ان پر کان دھرنے سے منع کرتے ہیں۔ امرحہ کی اپنے دادا سے خوب بنتی ہے۔ وہ سارا دن ان کے ساتھ پنجاب لائبریری میں گزارتی ہے۔ جہاں وہ لائبریرین تھے دادا اسے سمجھاتے ہیں کہ تم پڑھائی پر دھیان دو اور اسکالرشپ لے کر باہر ملک چلی جاؤ۔ امرحہ اپنے باقی بہن بھائیوں کی طرح پڑھائی میں کمزور ہے 'مگر دادا کی بات پر وہ ٹاپ کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتی ہے 'مگر پھر بھی بہت اچھے نمبر حاصل نہیں کر پاتی۔ اسی دوران اس کی شادی کا سلسلہ چلتا ہے 'مگر پندرہ روز قبل دولہا کی جوان بہن کے بیوہ ہو جانے پر اس کی شادی رہ جاتی ہے اور اس کی نحوست پر مہر لگ جاتا ہے۔ امرحہ دل برداشتہ ہو کر نیند کی گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد امرحہ کی زندگی مزید تلخ ہو جاتی ہے۔ وہ مختلف بیرون ملک کالج و یونیورسٹیوں کے ہزاروں آن لائن اسکالرشپ فارم بھرتی ہے 'مگر ہر جگہ سے انکار ہوتا رہتا ہے۔ بالآخر مانچسٹر یونیورسٹی سے اسے اسکالرشپ مل جاتا ہے۔ جو اس یونیورسٹی کی طلبا سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے دیتی ہے۔ جس کی رو سے امرحہ کو تیس فیصد ادا کرنا ہوتا ہے باقی ستر فیصد کی ادائی ان کی طرف سے ہو گی۔ اس کے علاوہ دو دن کی میزبانی کے

مکمل ناول

بعد امرحہ کو اپنی رہائش اور اخراجات کا خود بندوبست کرنا ہوگا۔ یہ سب باتیں اسے برطانیہ پہنچنے کے بعد معلوم پتا ہے۔ دادا جی امرحہ کے لیے پیسے اکٹھے کرکے اسے برطانیہ بھجوا دیتے ہیں۔ باقی اسے خود اپنے بل بوتے پر کرنا ہوگا۔ عذرا' شرلی' بیٹی لو اور للی کول سے اس کی ابتدائی ملاقات ہوتی ہے۔

امرحہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک کافی شاپ میں جاب کرنے لگتی ہے اور لیڈی مہر کے گھر اس کی رہائش کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ لیڈی مہر بے اولاد خاتون ہیں۔ انہوں نے شنل کاک نامی اپنے ہاسٹل نما گھر میں مختلف بچوں کو اولاد کی طرح رکھا ہے۔ ان ہی میں ایک عالیان مارگریٹ ہوتا ہے۔ وہیں سادھنا' ویرا اور این اون سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ جاب کے دوران وہ ڈیرک کے ساتھ مل کر ڈاکومنٹری فلم بنانے لگتی ہے۔

اسی دوران امرحہ کے بابا جن کی اعظم مارکیٹ میں قالین کی دکان ہوتی ہے' آگ لگ جاتی ہے' جس سے ان کا بیس، پچیس لاکھ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ انہیں اٹیک ہو جاتا ہے۔ امرحہ انہیں تسلی دیتی ہے اور ڈاکومنٹری فلم سے ملنے والے پیسے ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ لیڈی مہر بھی اسے ایک چیک دیتی ہیں۔ امرحہ وہ رقم بھی پاکستان بھجوا دیتی ہے۔ امرحہ کے والد بہت خوش ہوتے ہیں۔ امرحہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے جب عالیان مارگریٹ کسی اسپائیڈر مین کی طرح اس کی کھڑکی میں جھانکتا ہے۔ امرحہ کی چیخ نکل جاتی ہے۔

عالیان بتاتا ہے' یہ اس کا کمرہ ہے' وہ اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا' تھوڑی دیر بعد گھر میں آوازیں گونجنے لگیں تو سادھنا نے بتایا کہ لیڈی مہر کا بیٹا آیا ہے۔ وہ لیڈی مہر کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ وہ لیڈی مہر کے بیڈ پر بیٹھا انہیں کیک کھلا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ لیڈی مہر نے ایک بار بتایا تھا کہ ان کا بیٹا بھی اس کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور بہت قابل ہے۔

امرحہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا نام عالیان تھا اور اس کی ماں کا نام مارگریٹ۔ اسے عجیب سا لگا' ناجائز؟

دوسرے دن لیڈی مہر کی سالگرہ تھی' جوان کے بچوں نے بڑے اہتمام سے منائی۔ انہوں نے امرحہ کو عالیان کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے اسے ایک ادارے سے لیا تھا اور بڑی تن دہی سے اس کی تربیت کی ہے۔ امرحہ کو افسوس ہوا کہ اس کی اماں نے کبھی بیٹوں کی تربیت پر توجہ نہیں دی تھی۔

ویرا کا ساتھ امرحہ کو احساس دلا رہا تھا کہ عورت بھی بہادر ہو سکتی ہے۔ عالیان کی توجہ نے امرحہ کو ایک عجیب احساس سے دوچار کر دیا' وہ لاشعوری طور پر عالیان سے متاثر ہو رہی تھی۔

ہارٹ راک میں امرحہ اور ویرا کی باتیں ریکارڈ کرکے چلانے پر امرحہ ویرا سے ناراض ہو جاتی ہے۔ امرحہ کو شدت سے احساس ہوتا ہے کہ عالیان کے بارے میں یہ سب کہہ کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ ہارٹ راک کیفے کے باہر امرحہ' عالیان کا انتظار کرتی ہے' مگر وہ اس سے صحیح سے بات نہیں کرتا۔ رات کو عالیان ویرا کو شنل کاک چھوڑ کر جاتا ہے امرحہ کو یہ بات بری لگتی ہے کہ عالیان اپنی سائیکل پہ ویرا کو چھوڑنے آیا۔ ویرا امرحہ کو بتاتی ہے کہ وہ گر گئی تھی۔ اس کے پیر پر چوٹ آئی تھی اس لیے عالیان اسے گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔

امرحہ ہمت کرکے عالیان سے ملنے دوبارہ جاتی ہے۔ وہ اسے ٹوئیٹ میں چاکلیٹ دیتی ہے۔ عالیان حیران ہوتا ہے' مگر پھر اس کی ٹوئیٹ لینے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس پر امرحہ کہتی ہے کہ اگر تم ٹوئیٹ دو تو میں ابھی بھی تیار ہے۔ عالیان لاجواب ہو جاتا ہے۔

۶

چھٹی قسط

"کون ہیں آپ؟"

"میرا خیال ہے تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے' میں نے تمہیں ایک بہت بڑی رقم آفر کی ہے تم اس بارے میں سوچو۔"

"میں ابھی بھی پولیس کو فون کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔"

"تم جلد ہی مجھے فون کرو گی اتنے پیسے کم نہیں ہوتے۔۔۔" کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس کے جانے کا انداز ایسا تھا جیسے اسے یقین تھا کہ اسے ضرور فون کیا جائے گا' کیوں کہ اس نے مبالغے کی حد تک ایک بہت بڑی رقم آفر کردی تھی۔ اس کے لیے کسی کا بھی لالچ میں آجانا فطری ہے۔

امرحہ خود کو کسی فلم کا کردار محسوس کرنے لگی۔ مارگریٹ جوزف کے بیٹے عالیان مارگریٹ کو کوئی ڈھونڈ رہا ہے۔۔۔ کون؟ مارگریٹ کے خاندان کا کوئی فرد یا اس کے باپ کے خاندان کا۔۔۔ یا اس کا باپ ہی۔۔۔ یہ شخص عالیان کا باپ یا کوئی انکل نہیں ہو سکتا کیوں کہ ایک تو وہ سیاہ فام تھا دوسرا وہ چالیس سال سے کم کا تھا۔

مگر عالیان کے لیے لیڈی مہر نے درخواست کی تھی کہ کوئی کچھ بھی پوچھے اسے نہ بتایا جائے' لیکن کیوں؟ وہ عالیان کو کیوں چھپا رہی ہیں؟

گھر آنے تک وہ کافی دیر اس سلسلے میں سوچتی رہی اور پھر لیڈی مہر کے کمرے میں جا کر انہیں سب بتا دیا وہ اس شخص کا حلیہ پوچھنے لگیں۔

"تم کسی سے ذکر نہ کرنا اس بات کا' خاص کر عالیان سے۔"

"یہ کون تھا؟"

"امرحہ! یہ سب معاملات اتنے نازک ہیں کہ میں اس بارے میں کسی سے بھی بات نہیں کر سکتی اور تمہارے لیے یہ جاننا ضروری بھی نہیں۔"

"کیا آپ عالیان کو اس کی ماں یا باپ کے خاندان سے چھپا رہی ہیں؟" امرحہ نے سنگ دلی سے پوچھا۔

انہیں اس بات سے تکلیف ہوئی۔ "میں جو کر رہی ہوں عالیان کے لیے کر رہی ہوں۔"

امرحہ کو تھوڑا غصہ آیا' وہ سب معاملات اپنے ہاتھ میں کیوں رکھنا چاہتی ہیں۔ انہیں عالیان کو اس سلسلے میں باخبر رکھنا چاہیے' اسے لگا کہ وہ اس معاملے میں خود غرضی دکھا رہی ہیں' انہیں شاید عالیان کے چھن جانے کا ڈر ہے' وہ عمر کے اس حصے میں اسے کسی کے ساتھ بانٹنا نہیں چاہتیں یا انہیں لگتا ہو گا کہ ایسے وہ ان سے بہت دور چلا جائے گا۔ امرحہ کے بیگ میں اس شخص کا دیا کارڈ رکھا ہے امرحہ اس بات کو گول کر گئی۔۔۔ اس نے اس بات کو مختلف انداز میں سوچا اور اندر ہی اندر اس کے منفی پہلوؤں پر ہی غور کرتی رہی۔

عالیان کا ایک خاندان ہو گا' شاید بھائی' بہن' انکل' آنٹی' نجانے کون کون۔۔۔ کسی وجہ سے اگر وہ عالیان سے دور ہوئے بھی تو اب تو وہ عالیان کو ڈھونڈ رہے ہیں نا۔۔۔ یونیورسٹی میں امرحہ نے عالیان کو دیکھا تو اس کا دل چاہا کہ اسے جا کر بتائے کہ کوئی اسے ڈھونڈ رہا ہے۔۔۔ یہ اتنی بڑی بات تھی کہ اس سے صرف اپنے اندر رکھی نہیں جا رہی تھی۔۔۔ اور وہ خود کو بار بار اس پر سوچنے سے بھی نہیں روک سکی۔

٭ ٭ ٭

سادھنا کے ساتھ وہ اس سے ملنے اس کے ہال آئی تھیں اور دونوں لان میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔

"آپ نے یہاں آکر مجھے حیران کر دیا۔"

"اگر میں تمہارے جیسی ہوتی تو میں بھی تمہاری کھڑکی سے آتی تم سے ملنے۔۔۔"

"اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ میں سپرمین بن جاؤں اور آپ کو اپنے ساتھ اڑاؤں۔۔۔"

"اگر تم سپرمین بن بھی گئے تو بھی میں تمہارے ساتھ کسی چوٹی یا بادل کے ٹکڑے پر جانے کے لیے تیار نہیں ہوں گی۔"

"آپ کو تیار ہونے کی نہیں صرف آنکھ بند کرنے کی ضرورت ہو گی۔"

"اپنے ساتھ اڑانے کے لیے تم کسی اور کو تیار کرو۔۔۔ ڈگری کے بعد کیا پلان ہے تمہارا؟"

"مزید ایک اور ڈگری کے ساتھ کوئی بزنس شروع کروں گا۔"

"ٹھیک ہے... میں سوچ رہی ہوں ہم کسی اور ملک چلے جائیں۔"

"کس ملک اور کیوں ماما؟؟"

"کسی بھی ملک تم دیکھ لینا' جو تمہیں اچھا لگے۔"

"آپ نے ایک دم سے برطانیہ چھوڑنے کے بارے میں کیوں سوچ لیا؟؟"

"کافی عرصے سے سوچ رہی ہوں' بس تم اس بات کو ذہن میں رکھنا۔"

"ٹھیک ہے' لیکن میں حیران ہوں... میں جانتا ہوں آپ کو مانچسٹر سے کتنی وابستگی ہے۔"

"مجھے اپنے بچوں کے علاوہ کسی سے کوئی وابستگی نہیں۔"

"میں سمجھا نہیں ماما...!"

"تم اسے چھوڑو... مجھے یہ بتاؤ کہ امرحہ اور تمہارے درمیان کیا چل رہا ہے؟؟"

"کیا مطلب؟؟"

"دوستی ختم کردی ہے اس سے... تم ایسے تو نہیں ہو دوست بنا کر چھوڑ دینے والے... امرحہ لوگوں کو جلد ناراض کردیا کرتی ہے' لیکن اسے جلد ہی اس بات کا احساس بھی ہوجاتا ہے' اس میں خوبیاں اور خامیاں ساتھ ساتھ ہیں اور یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہم سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔" کہہ کر انہوں نے عالیان کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیا۔

"دیکھو' جواب میں تم خاموش ہو... یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے... مجھے تم سے ایک اور بات پوچھنی ہے عالیان... میں تمہاری ماں ہوں' شاید تمہارا دل دکھے لیکن..."

"مجھے اس شخص سے نہیں ملنا ماما... نہ مجھے اسے ڈھونڈنا ہے۔"

"شاید تمہیں اس سے مل کر اچھا لگے..."

"وہ میرے لیے گالی ہے اور گالی کبھی اچھی نہیں لگتی۔ مجھے اس شخص کے تذکرے سے ہی اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ مجھے لگنے لگتا ہے..."

"ٹھیک ہے بات ختم... بس خاموش رہو' پرسکون رہو... میں شارلٹ کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔ فون پر اس کی ساس نے بہت سخت اور چبھتے ہوئے انداز میں مجھ سے بات کی۔"

"آپ جورڈن کا سوچیں' اس کی ماما کا نہیں... پریشان نہ ہوں۔"

"پریشان نہیں دکھی ہوں' اس نے کڈز سینٹر میں پرورش پائی ہے ایک مسلم خاتون کی وہ لے پالک بیٹی ہے۔ کتنی بڑی وجوہات ہیں یہ..."

عالیان سے زیادہ اب کون جان سکتا تھا کہ کتنی بڑی وجوہات ہیں یہ...

"اچھی بات تو یہ ہے ماما کہ جورڈن شارلٹ سے محبت کرتا ہے۔"

"اس ایک شخص کی محبت ناکافی ہونے لگتی ہے جب اس کے ساتھ جڑے دوسرے لوگوں کی ناپسندیدگی بڑھنے لگتی ہے۔"

"نہیں ماما...! پھر دوسروں کی ناپسندیدگیوں کی پروا نہیں رہتی۔"

"تو تم "محبت" کے بارے میں سوچتے ہو' اس شخص اور اس شخص کے بارے میں..."

"نہیں... آپ جانتی ہیں مجھے ماما مارگریٹ نہیں بننا۔"

"تو تم ماما مہر بن جاؤ... میں نے اپنے شوہر سے بے لوث محبت کی ہے۔"

"اور آپ کو بدلے میں بے لوث محبت ملی بھی..."

"تمہیں بھی ملے گی' مجھے خوف محسوس ہوا ہے یہ جان کر کہ تم محبت سے دور بھاگ رہے ہو' تم جوان ہو' زندگی کے عملی میدان سے ابھی دور ہو' اپنے ذہن و دل کو وسعت دو اور یاد رکھو "بھاگ جانا" کسی جذبے سے ہو یا عمل سے نقصان دہ ہوتا ہے۔"

"نہ بھاگنا بھی فائدے مند نہیں ہوتا ماما... مجھے

"یہ اور برا ہے تمہاری زندگی صرف ایک تعلق تک محدود نہیں ہونی چاہیے۔" انہوں نے عالیان کو گہری نظروں سے بہت دیر تک دیکھا۔

"تم آج کل مارگریٹ کی ڈائریاں پڑھ رہے ہو؟ تم اپنی عمر سے بہت بڑے لگ رہے ہو۔"

"کیا آپ مجھے وہ ڈائری بھی دے سکتی ہیں جو آپ کے پاس ہے۔"

"جب تم شادی کرلوگے اور اپنے بچوں کو سائیکل ریس میں ہرادیا کروگے تو وہ تمہیں ملے گی' تم نے پھر سے مارگریٹ کی باتیں شروع کردی ہیں' اسے یاد کرو' لیکن ایسے آہ کے انداز سے نہیں' خوش ہو کر یاد کرو اسے...."

"جو انسان زندگی میں خوش نہیں رہا اس کے مرنے کے بعد اسے خوشی سے یاد نہیں کیا جاسکتا اور ہم اس شخص کی بدقسمتی کا موازنہ اپنی قسمت کے ساتھ کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔"

"تم بدقسمت نہیں ہو' تمہیں میرے عالیان کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔"

"اگر دنیا میں آپ نہ ہوتیں تو میں دنیا کے ہر انسان سے نفرت کرتا۔"

"میں نہ ہوتی تو کوئی اور ہوتا...."

"نہیں ماما! کوئی اور نہ ہوتا آپ کے علاوہ کوئی مجھ سے ایسی محبت نہ کرتا.... آخر کار میں نے یہ جان لیا ہے۔"

☆ ☆ ☆

بہار کی دلہن کی شادی کی تیاریاں اتنے زور و شور سے کی جارہی تھیں جیسے وہ شاہی خاندان کا آخری چشم و چراغ ہو' ڈیزائنرز' ویڈنگ پلانرز اور ان کی ٹیم گھر میں ایسے آتے جاتے نظر آتے جیسے وہ اسی گھر میں رہتے ہوں بس کچھ دیر کو گھر سے باہر چلے جاتے ہوں۔

"ماما! آپ اتنے پیسے کیوں برباد کررہی ہیں؟" ویک

"تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ تم پر مزید اور احسان نہ کروں' کرسمس پر تحائف لیتے بھی تم سب کو شرم آتی ہے' اب تم مجھے دینا چاہتے ہو' لیکن کچھ لینا نہیں' کیا ایسا کرکے تم سب مجھے دوسری عورت' دوسری ماں ہونے کا احساس دلاتے ہو' میرا سب کچھ تمہارا ہے' میری آنکھوں کا نور اور میرے زندہ رہنے کی قوت بھی.... تم مجھ سے فرمائش نہیں کرتیں کیوں کہ میں دوسری عورت ہوں۔" وہ خفا ہوگئیں۔

"شادی کے دن مجھے ہاتھی چاہئیں' دس بارہ تو ضرور ہی ہوں' جھیل کنارے چہل قدمی کریں۔" شارلٹ نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں' فرمائشیں شروع ہوگئیں۔

"اگر تمہیں ہاتھی چاہیے تو شادی سری لنکا میں کرنی ہوگی یا افریقہ میں۔" "نہیں ہاتھیوں سے اب بھی مسئلہ نہیں تھا۔

"نہیں! مجھے تو مانچسٹر میں ہی ہاتھی چاہیے اگر آپ نے مجھے اور جذباتی کیا تو میں سفید چیتوں کی فرمائش بھی کرسکتی ہوں۔ آپ ہی میری آنکھوں کا نور اور زندہ رہنے کی قوت ہیں۔"

"تم اور جذباتی ہوسکتی ہو' لیکن صرف اتنا بتادو کہ تم شادی کرنا چاہتی ہو یا جنگل آباد کرکے شکار؟"

ماما مہر نے قہقہہ لگایا۔ شارلٹ نے دھڑادھڑ ان کا منہ چومنا شروع کردیا۔

شادی سے ایک ہفتہ پہلے جورڈن کا خاندان امریکا اور دوسرے ملکوں سے مانچسٹر میں اکٹھا ہوگیا اور وہ سب عارضی رہائش گاہ میں رہنے لگے۔ شارلٹ ان کے استقبال کے لیے گئی اور کافی پریشان صورت واپس آئی۔ جورڈن ماما مہر کے بلانے پر اپنے ماما پاپا کے ساتھ ڈنر پر آیا تھا۔ تمام وقت ماحول میں تناؤ رہا' اس کی ماما اعصاب تانے سارا وقت خاموش بیٹھی رہیں اور پاپا نشست گاہ میں ٹنگی مشہور پینٹنگز دیکھتے رہے' کھانے کے نام پر چند نوالے کھائے گئے اور جانے میں جلدی کی گئی۔

"تمہیں یقین ہے، جورڈن تمہیں خوش رکھ سکے گا"
اس کی ماں کی نظروں میں واضح حقارت تھی تمہارے لیے، اگر تم اس سے محبت نہیں کرتیں تو چھوڑ دو اسے، میں نہیں چاہتی کہ دنیا میں کوئی بھی تمہیں ان نظروں سے دیکھے۔" لیڈی مہر کی آنکھیں اس وقت سے نم تھیں۔
"جورڈن مختلف مزاج کا ہے ماما!" وہ کہہ نہ سکی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اب اسے چھوڑ نہیں سکتی وہ بھی صرف اس کی ماں کی حقارت کی وجہ سے۔۔۔
"محبت کرتا ہے تم سے، خالی خولی بڑ تو نہیں مار رہا۔۔۔"
"مجھے یقین ہے اس کے جذبے پر۔۔۔ آپ ایسے پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"تمہارا یہ یقین ہمیشہ قائم رہے۔۔۔ میں دعا گو رہوں گی۔"
لیڈی مہر نے سادھنا اور امرحہ کو جورڈن کے گھر بھیجنا چاہا، جورڈن کے کچھ اور رشتے دار بھی آچکے تھے وہ چاہتی تھیں کہ دونوں جا کر ذرا جانچ پڑتال کر کے آئیں کہ جورڈن کے خاندان کے باقی افراد خاص کر خواتین کس مزاج سے تعلق رکھتی ہیں تاکہ شادی کے انتظامات میں وہ ان کی پسند کے مطابق ردوبدل کر دیں۔ میڈیا کو بلانے کا خیال تو انہوں نے دل سے ہی نکال دیا تھا، اتنے نازک مزاج لوگ تھے نہ جانے کس بات سے بھڑک اٹھتے۔

☼ ☼ ☼

یہ فرمائش سنتے ہی امرحہ اور سادھنا کا دم سا نکل گیا۔ جورڈن کی ماما کی تنی ہوئی بھنوؤں کو دیکھ کر ہی وہ ڈر گئی تھیں کہاں اب دوسری خواتین سے ملنا۔
"ہم بہانہ کیا کریں گے کہ کیوں آئے ہیں؟" امرحہ گھبرا گئی۔
"سادھنا! تم کہہ دینا میں جورڈن کو ابٹن لگانے آئی ہوں، مارکیٹ سے تھال لیتی جانا، بتا دینا شارلٹ میری چھوٹی بہن جیسی ہے ابٹن کی رسم کرنی ہے۔"
سادھنا کا رنگ ابٹن جیسا پیلا ہو لیا۔
امرحہ شلوار قمیص، سادھنا ساڑھی میں "دلہا جورڈن" کو ابٹن لگانے آگئیں۔
"تمہیں فون کر کے آنا چاہیے تھا جورڈن گھر نہیں ہے۔" جورڈن کی ماما نے بھنوؤں کی کمانوں میں تیر رکھتے ہوئے کہا۔
"اس رسم میں بنا بتائے آتے ہیں۔" امرحہ نے مسکرا کر کہا۔ شکر ہے۔ ایسی باتیں گوگل نہیں ہو سکتیں۔
وہ دونوں چھ عدد خواتین کے نرغے میں بیٹھی تھیں کچھ ادھر ادھر ٹہل رہی تھیں۔ امرحہ نے ایک ہی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ سب بہت نازک مزاج اور جدید فیشن کی دلدادہ ہیں۔ ان سب نے ایسے ملبوسات اور زیورات پہن رکھے تھے کہ اگر ان میں سے صرف ایک خاتون کو اٹھا کر بھاگ لیا جاتا اور مارکیٹ میں بیچ دیا جاتا تو ساری عمر پیسے کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہ رہتی۔ یا امرحہ کے سامنے بیٹھی جورڈن کی آنٹی کا ایک ہاتھ ہی کاٹ کر ساتھ لے جایا جاتا تو بہت ہوتا بلکہ بہت زیادہ ہوتا۔
دن روشن تھا اور وہ سب قلعے نما عمارت کے سامنے دور تک پھیلے لان میں بیٹھے تھے جس میں کئی لمبے لمبے درخت بھی تھے۔ دو مرد اور تین لڑکے درختوں سے ذرا آگے نشانہ بازی کا کھیل کھیل رہے تھے اور کافی ہنگامہ کر رہے تھے۔ امرحہ اور سادھنا کو اٹھنے کی جلدی تھی کہ کہیں دولہا جورڈن ہی نہ آجائے اور انہیں ابٹن کی رسم کرنی ہی پڑے، لیکن جورڈن کی ماما نے چائے کا آرڈر دیا تھا اور آرڈر تھا کہ آ کر نہیں دے رہا تھا۔
"آنٹی جولیا! اب آپ کی باری۔" تماشائیوں کے ہجوم میں سے ایک لڑکا آیا اور بندوق آگے کی۔
"میں نے مردوں کو ہرانا چھوڑ دیا ہے رافیل!" آنٹی جولیا جواہرات سے سجی انگلیوں کو لہرا کر مسکرائیں۔
اسی دوران رافیل کی نظریں سادھنا سے ہو کر امرحہ پر آکر ٹھہر گئیں۔
"یہ کون ہیں؟" وہ امرحہ کو دیکھے جا رہا تھا۔

"یہ شارلٹ کے گھر سے آئی ہیں کوئی ہندوانی رسم کرنے۔۔۔"

"کیا رسم ہوگئی؟" اس نے بندوق کی نال امرحہ کے کندھے پر رکھ کر پوچھا۔ امرحہ کو اس کی جرات پر حیرت ہوئی۔ وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔

"ہمیں چلنا چاہیے" سادھنا جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

"چائے پی کر جانا۔۔۔ بیٹھ جاؤ، تم ہندوستانی لوگوں کو نشست و برخاست کے آداب کب آئیں گے؟" آنٹی جولیا کی آواز ناپسندیدگی کے جذبے سے پر تھی۔

امرحہ نے کندھے پر ٹکی بندوق کی نال کو ہاتھ سے جھٹکا "یہ کن آداب میں سے ہے؟" آنٹی جولیا کا منہ بن گیا، رافیل مزے سے امرحہ کو دیکھتا رہا۔

"رافیل! تم انہیں لے جاؤ ان کی نشانہ بازی دیکھو۔" انداز استہزائیہ تھا، لیکن ہتک سے بھرا۔

"او ہاں۔۔۔" رافیل نے کسی قدر کمینگی سے اپنی ٹھوڑی مسلی۔

"انہیں تو گانا آتا ہوگا یا ناچنا، ایسے کام ان کے مرد کرتے ہیں، یہ تو مردوں کے صرف پیر چھوتی ہیں جھک جھک کر۔۔۔" جورڈن کی ماما کہہ کر دیر تک ہنستی رہیں۔

سادھنا ضبط سے سرخ ہوگئی اگر بات شارلٹ اور لیڈی مہر کی نہ ہوتی تو دونوں اتنا ضبط بالکل نہ کرتیں، سادھنا خاموشی سے دوبارہ بیٹھ گئی۔

"دنیا بھر میں بے حس لوگوں کے انداز اطوار ایک جیسے ہوتے ہیں وہ ہتک کر کے شرمندہ ہوتے ہیں نہ خوف زدہ، انہیں دوسروں کو گراتے رہنے کا مشغلہ محبوب ہوتا ہے۔"

وہ سب ان دونوں کو ہندوستانی سمجھ رہے تھے۔ رافیل نے بلند و بانگ قہقہہ لگایا اور سادھنا اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔ امرحہ کھڑی ہوگئی اور ہاتھ آگے کیا کہ بندوق اسے دے دی جائے۔

"آہاں۔۔۔" وہ مسکرایا یعنی اسے چڑایا۔ بندوق اس کے ہاتھ میں ہی تھی۔ سادھنا اپنی جگہ سے گرتے گرتے بچی۔ "چلو جلدی گھر چلیں" وہ اس کے قریب جلدی سے اٹھ کر آئی۔

"رکو ذرا۔۔۔" امرحہ رافیل کے ساتھ چلنے لگی۔

"یہ پاگل پن ہے۔" ہندی میں سادھنا چلائی۔

"آج یہ پاگل پن ہو جانے دو۔۔۔ دنیا میں کسی بھی انسان کو کسی بھی ہنر یا قابلیت کی بنا پر کسی دوسرے انسان کی بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

درختوں سے ذرا اس طرف پانچ بناوٹی کھوکھلے کدو مختلف فاصلوں پر رکھ دیے گئے تھے۔ ایک سے دوسرا دور تھا دوسرے سے تیسرا اور پہلے سے آخری۔۔۔ پہلے رافیل نے نشانے لگائے اور دیکھتے ہی دیکھتے چار کدو ہوا میں منتشر ہوگئے، پانچواں نشانہ چوک چکا تھا پھر بھی وہ سب اس کے لیے تالیاں بجا رہے تھے یعنی پانچواں کدو ذرا مشکل سے ہی منتشر ہو نا تھا۔ اس کا فاصلہ زیادہ اور نشانہ ذرا مشکل تھا۔

"دیکھنا تمہاری کلائی نہ ٹوٹ جائے۔" رافیل نے بندوق اس کے آگے کی۔

وہ سب استہزائیہ ان دونوں کو دیکھ رہے تھے یعنی ان کا خیال تھا کہ وہ سراسر جذباتی ہو رہی ہے۔ ناچ گانے کے علاوہ کیا آتا ہوگا انہیں بھلا۔

امرحہ نے بندوق پکڑی اور پکڑ کر ایسے اس میں کارتوس بھرا کہ رافیل کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

امرحہ دادا کے ساتھ بلوچستان جاتی رہی تھی نا، دادا کے اس دوست کے گھر میں تین لڑکے اور اس کی ہم عمر چار لڑکیاں تھیں۔ وہ سب رات دن یہی نشانے لگانے کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ دادا کے دوست کو شوق تھا کہ سالانہ مقامی مقابلوں میں ان کے بیٹے اول آئیں اور وہ آتے بھی تھے۔ لڑکے دن رات مشق کیا کرتے تو لڑکیاں بھی کر لیتیں اور جب امرحہ وہاں جاتی تو امرحہ بھی یہی کھیل کھیلتی تھی۔ امرحہ کی ہم عمر لڑکیاں تو اتنی ماہر تھیں کہ اپنے بھائیوں کو ہرا دیتی تھیں۔

بائیں آنکھ بند کر کے، سانس کو اندر گم کر کے، صرف ہدف پر نظر رکھ کے، آنکھ کی پتلی کو ساکت رکھ کر امرحہ نے ٹریگر دبا دیا۔۔۔ اور

سادھنا نے اپنا رکا ہوا سانس چھوڑا' دونوں بند آنکھوں کو کھول کر اسے دیکھا۔

دوسرا کدو پہلے سے زیادہ فاصلے پر تھا وہ بھی منتشر ہوا' تیسرا' چوتھا اور پھر پانچویں کی باری آگئی۔

"مقابلہ برابر نہیں ہونا چاہیے اب۔" سادھنا نے کان میں سرگوشی کی۔

"مقابلہ برابر نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے خود سے کہا۔ بلوچستان میں اس نے جتنی بھی مشق کی ہو' وہ ایک ماہر نشانچی نہیں تھی کبھی کبھار وہ لاہور میں پٹھانوں سے بندوق لے کر غباروں پر مشق کر کے اپنا شوق پورا کرلیا کرتی تھی۔ اس نشانے کا لگ جانا قسمت ہوتا معجزہ ہوتا...

ذرتاش نے کہا تھا "نشانہ بازی میں فاصلہ اتنا اہم نہیں جتنا ارتکاز' ہدف پر ایسے نظر رکھو جیسے پوری دنیا میں وہ ہدف ہی باقی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں... ہتھیار کو اپنے ارتکاز کے ہم آہنگ کرو۔ اور ٹریگر دبا دو۔"

اور اس نے ٹریگر دبا دیا۔

فاصلہ زیادہ تھا... نشانچی مشرقی تھا... مجمع خاسدو متکبر تھا اور پانچواں کدو منتشر تھا۔

امرحہ نے بندوق پر سے دونوں ہاتھ چھوڑ دیے' وہ پٹاخ سے گری اس کی بلا سے بے کار ہو جائے۔ اب صرف مرد حضرات اور سادھنا نے تالیاں بجائیں۔

رافیل کی شکل دیکھنے لائق تھی۔ اس کے ہم عمر لڑکے نظروں ہی نظروں میں اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

وہ دونوں واپس آگئیں اور اپنے پیچھے سناٹا چھوڑ آئیں۔

"اینٹ کا جواب چمتکار۔" سادھنا بہت خوش تھی

"تم آریان کی فیورٹ آنٹی ہو۔"

گھر آکر انہوں نے نشانوں والی بات چھپا کر باقی سب بتا دیا۔ امرحہ شاید وہ نشانے نہ لگاتی اگر سادھنا "کاش یہاں ویرا ہی ہوتی" نہ بڑبڑاتی۔

☆ ☆ ☆

"تم سب یونیورسٹی سے اپنے دوستوں کو بلا سکتی ہو

مہر نے ان سب کو اجازت دی۔

امرحہ نے سائی کو بلایا' ویرا نے کسی کو بھی نہیں این اون نے چند جاپانی دوستوں کو اور عالیان نے کارل کو...

"تمہیں کس نے بتایا کہ کارل بھی آرہا ہے؟"

"کارل ایک بورڈ پشت پر لٹکائے گھوم رہا ہے کہ جو اسے اپنا بہترین سوٹ دے گا یا لے کر دے گا وہ اس کے چند اہم کام کردے گا... تم جانتی ہو نا اس کے اہم کاموں کا مطلب؟"

"کوئی بھی اس کی نامعقول حرکتوں سے خوش نہیں' کسی سے سوٹ نہیں ملے گا اسے..."

"کسی سے؟ ویل پیاری ڈی کوئین مانچسٹر ٹاپ بزنس مین کی بیٹی اسے مک لارین میں بٹھا کرلے گئی تھی خریداری کروانے' سنا ہے اسے اپنے سابقہ بوائے فرینڈ کا کوئی حساب برابر کروانا ہے کارل سے..." شانے اچکا کر ویرا ہنسنے لگی۔

امرحہ ہنس نہ سکی۔ وہ تو یہ بھی چاہتی تھی کہ شادی پر ویرا ابھی نہ ہو' لیکن اس کے چاہنے سے کچھ نہ ہو سکا اور شادی کا روشن نکھرا نکھرا دن سب سمیت آموجود ہوا۔ ہیڈن پارک کی طرز کا پارک تھا جہاں شادی کا انتظام تھا۔ گھاس کا وسعت لیے پھیلا میدان تھا' جھیل تھی' جھیل پر پل تھا' پل کے اس طرف گھاس کے میدان' لمبے لمبے درخت اور پھول تھے' کہیں کہیں پہاڑیوں کے ٹیلے بھی تھے۔ پل کے اس طرف سامنے ایک قدیم طرز کی عمارت تھی جس کے اندر رات کی پارٹی کا انتظام تھا۔

پل کے اس طرف سفید گھوڑے چہل قدمی کررہے تھے اور جابجا پھیلے سوان تھے جو آسمان سے نازل ہوتے دن کو خواب ناک بنا رہے تھے۔

پریوں کی شہزادی ماما مہر کی بیٹی کی شادی تھی' انہیں یہی سب چاہیے تھا۔ گلابی پھولوں سے سجے گول چبوترے کے پس منظر میں' جھیل' پل' درخت' ٹیلے' سوان اور گھوڑے تھے اور چبوترے کے سامنے

دو اطراف نشستیں... امرحہ نے گلابی چوڑی دار پر سفید کامدار دوپٹہ لیا تھا' ویرا اور این اون شارلٹ کے ساتھ تھیں وہ باہر آ گئی' مہمان آ رہے تھے اور تقریب شروع ہونے میں کچھ وقت تھا۔ سفید گھوڑوں اور سوان کو دیکھنے کے لیے وہ پھولوں سے سجے پل سے جھیل کے اس طرف چلی گئی۔ اس طرف سے دھند بہت چھوڑی جا رہی تھی تاکہ تقریب کے آغاز سے پہلے قدرتی شکل اختیار کر لے۔

ابھی اس نے پل کے اس طرف پیر رکھا ہی تھا کہ مشین سے مصنوعی دھند کا ایک اور ریلا چھوڑا گیا۔ پہلے ہی اتنی دھند چھوڑی گئی تھی کہ مزید چھوڑ دی گئی'

ہاتھ کا پنکھا بناتی وہ دھند ہٹانے لگی کہ اس کا ہاتھ تھپڑ کی صورت انسانی کھال سے ٹکرایا۔

وہ انسانی کھال عالیان کی تھی۔ وہ اس کے عین سامنے کھڑا تھا۔ اس کے گال سے اس کا ہاتھ چھوا تھا۔

اگر ان کے درمیان آنے والے اس پل کو کھینچ کر لمبا کر دیا جائے تو اس دوران کچھ یہ ہوا کہ اس نے عالیان کو دیکھا' اس کی سرد مہر' لیکن دنیا میں سب سے خوب صورت آنکھوں میں سے دو آنکھوں کو جن میں دیکھنے کے بعد نہ دیکھنے کا راستہ نہیں ملتا تھا' جن کی چمک چکاچوند میں بھی مدھم نہیں پڑتی' جو بینائی رکھنے کے علاوہ بھی کئی کمالات رکھتی ہیں' جن سے مل کر بچھڑا نہیں جاتا' پھر پیشانی پر گرتے اس کے بھورے بالوں اور ان کے نیچے تنی بھنوؤں کو' پھر چند دنوں کی بڑھی شیو کو اور پھر "عالیان" کو جس کے وجود سے شناسائی کی جھلک ابھر کر معدوم ہو چکی تھی اور اس کے اردگرد پھیلی دھند کو' اس دھند میں دھندلے نظر آتے درختوں' پھولوں' سفید گھوڑوں اور سوان کو...

"ہاں وہ ایک شہزادہ ہی تھا... بلاشبہ۔"

لیکن وہ سنڈریلا نہیں تھی وہ اس کا جوتا لے کر آیا تھا نہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گھوڑے پر بٹھانے۔

وہ ایک لمحہ تھا... وہاں ایک امرحہ تھی اور ایک عالیان تھا۔

ایک ساحر تھا... اس کا سحر تھا۔

اور ایک باب محبت تھا جسے پڑھ کر بند کیا جا چکا تھا۔

زمین پر بکھیرتی دھند رقص کناں ہونے کے لیے تیار ہوئی اور پھر جھوم کر ان کے قریب آ گئی۔ امرحہ نے چاہا کہ وہ دھند کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر اس کی آنکھوں میں بھر دے کہ وہ کہیں جانے کا راستہ ڈھونڈ نہ پائے اور وہیں کھڑا رہے... پھر کیا حرج تھا اگر قیامت بھی آ جائے۔

"اوہ ایم سوری!" اس نے اس سے معذرت کی جبکہ دھند سے شکریہ کہا۔

وہ آگے بڑھنے لگا اور اس کے دوپٹے میں الجھ کر گر گیا دھند میں اسے اس کا سفید دوپٹا کیسے نظر آ سکتا تھا۔

"اف... مجھے پھر سے معاف کر دو..." دوپٹے کا شکریہ۔ جو ایک بار پھر سے اسے معافی مانگنے کا موقع دیا۔

وہ جھنجلا کر اٹھا اور ایسا کرتے اس کے بال پیشانی پر اور پھیل گئے اور اس پر سے نظریں ہٹانے کے لیے ارادے مضبوط کرنے پڑے۔

"تم اتنا غصہ کیوں کرنے لگے ہو عالیان؟" دوپٹا سنبھالنے کے بجائے اس نے اور پھیلا دیا کہ وہ پھر سے گر جائے۔

"تم اتنا غصہ کیوں دلاتی ہو؟" اس نے غصے سے کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہا۔

"سرد ملک میں رہ کر تم اتنی جلدی گرم کیوں ہو جاتے ہو؟" وہ جلدی سے اس کے سامنے آئی۔ عالیان کے پاس کئی جواب ہوں گے' لیکن اس نے اسے ایک بھی دینا ضروری نہ سمجھا۔

"اگر تم میری تھوڑی سی مدد کر دو اور مجھے کسی ایک سفید گھوڑے پر بٹھا دو..." چوڑی پاجامہ اونچی ہیل اور کانوں میں بندے پہنے امرحہ وہاں گھوڑے پر بیٹھنے آئی تھی۔

"اگر تم گھوڑے کی لگام پکڑ لو گے تو مجھے گھوڑے سے ڈر نہیں لگے گا۔" وہ اسے بتا رہی تھی کہ اس کا' عالیان کا اور گھوڑے کا ایک ساتھ ہونا کس قدر

ضروری ہے۔

چچ چچ کی شکل بناتا' تاسف سے سرہلاتا وہ پھر سے آگے جانے لگا۔

"چلو تم گھوڑے پر بیٹھ جاؤ اور میں لگام پکڑ لوں گی۔۔۔ اب خوش۔۔۔ چلو اب مسکرادو۔۔۔۔"

وہ پھر سے اس کے سامنے آئی جلدی سے۔

"ان گھوڑوں پر لگام اور زین نہیں ہے' انہیں تمہاری سواری کے لیے یہاں نہیں لایا گیا۔" وہ جواب دیے بغیر رہ نہیں سکا۔

"اچھا۔۔۔ زین اور لگام کیوں نہیں ہے؟"

"وہ تم گھوڑوں سے جاکر پوچھ لو۔"

"چلو ہم دونوں چل کر پوچھ لیتے ہیں' ویسے بھی مجھے گھوڑوں کی زبان نہیں آتی۔"

"تمہیں تو انسانوں کی زبان بھی نہیں آتی۔" اس نے گہرے انداز سے کہا۔

اس کی آنکھوں کی ماند پڑتی چمک سے امرحہ افسردہ ہوگئی۔

"تم پہلے والے عالیان کیوں نہیں بن جاتے؟"

"تمہیں خاموش رہنا سیکھنا چاہیے۔۔۔ ورنہ دور رہنا۔"

"تم سکھادو یہ سب۔۔۔"

"تم تو خود ایک استاد ہو امرحہ' جو سبق تم دیتی ہو' وہ کوئی اور نہیں دے سکتا۔"

"ہوسکتا ہے میرے پلو سے یہ سبق باندھ دیے گئے ہوں۔"

"مجھے یہ سب جاننے میں دلچسپی نہیں۔"

"تمہیں اپنے بال تراشنے چاہیے تھے' تمہارے بالوں کی نوکیں تمہاری آنکھوں کو پریشان کررہی ہیں۔"

غیر ارادی طور پر اس نے اپنے بال پیشانی سے اٹھائے اور امرحہ مسکرادی جس پر وہ اور خفا سا ہوگیا۔

"میں نے تو صرف اس لیے کہا کہ تمہارے بالوں سے زیادہ مجھے تمہاری آنکھوں کی فکر ہے۔"

"میں اپنی فکر کرنے کے لیے خود ہی کافی ہوں۔" اس کی آواز تیز ہوگئی۔

"میں جانتی ہوں۔ تمہیں خود پر ناز ہے۔" امرحہ اس کی تیز آواز سے گھبرا گئی' لیکن کہے بغیر وہ رہ نہیں سکی کیوں کہ وہ بات کو طول دینا چاہتی تھی۔

"ہاں اتنا تو ضرور ہے کہ میں تم جیسا نہیں ہوں۔" امرحہ کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے انداز میں دیکھ کر اس نے کہا۔

امرحہ کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی

"جب تم مشرق کا سفر کروگے تو تم پر بہت سے راز کھلیں گے۔"

"مجھے ایسے خطے کا سفر نہیں کرنا جہاں رازوں اور روایتوں کا احترام انسانوں سے بڑھ کر کیا جاتا ہے۔"

امرحہ لاجواب ہوگئی وہ آگے بڑھ گیا اور وہ اس کی پشت سے چلائی۔

"جب تم بوڑھے ہوجاؤ گے تو تم ضرور پچھتاؤ گے۔۔۔ تمہیں گھوڑے پر بیٹھنے میں میری مدد کردینی چاہیے تھی۔"

امرحہ جھیل میں نظر آتے اس کے عکس کو دیکھتی رہی۔ جھیل خوب صورت تھی۔ اس پر تنا آسمان یا اس میں جھلملاتا اس کا عکس۔

اس کی نظروں نے اس کے عکس کے حق میں فیصلہ دیا۔

پل پر سے گزرتے عالیان نے برائے نام گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور ایسا کرنے پر اسے افسوس ہوا کیوں کہ اس نے خود کے ساتھ کیے عہد کو توڑ دیا تھا۔

امرحہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ایک پل ان کے درمیان بھی تھا۔ وہ اِس اور اُس طرف تھے۔ اب وہ جہاں ہوا کرتی ہے' وہ وہاں سے چلا جایا کرتا ہے اس نے خود کو اتنا بدل لیا ہے اور اسے اس پر افسوس بھی نہیں۔

امرحہ نے اپنا دوپٹا سنبھالا اور اس طرف آنے لگی

جہاں وہ شخص کھڑا ہو گا جو آج اہتمام سے تیار ہو کر آنا بھول گیا تھا اور جس نے ٹائی باندھنے کا تردد بھی نہیں کیا تھا، جسے تقریب میں آنے کی جلدی نہیں رہی ہو گی اور کان میں سرگوشی کرنے کی بھی۔

"مجھے بتایا جائے کیا دلہن صرف سفید لباس والی ہے۔۔۔ اچھا۔۔۔ اور سفید دوپٹے والی؟"

☆ ☆ ☆

شارلٹ کی شہ بالیاں اس بار صرف دو تھیں، شارلٹ کی دوست اور ویرا۔ امرحہ کو کہا گیا تھا، لیکن اس نے اور سادھنا نے انکار کر دیا، جورڈن کے خاندان کی نازک مزاجی نے انہیں برہم کر دیا تھا۔ انہیں ان سب کی نظروں میں آنے کی خواہش نہیں تھی۔

شارلٹ دلہن بن کر آئی تو امرحہ نے دیکھا کہ دلہن کے بعد سب نے جس چہرے کو دیر تک دیکھا، وہ ویرا کا تھا۔ اس نے ہلکا ارغوانی آف شولڈر فراک پہنا تھا اور وہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ اگر بلیک آؤٹ کے دنوں میں اسے کسی عمارت کی چوٹی پر بٹھا دیا جاتا تو وہ آدھے شہر کو اپنے حسن کی چکاچوند سے منور کر دیتی۔

"ویرا نے اتنی خوب صورتی کا کیا کرنا ہے؟" امرحہ نے دیکھا کہ دور کھڑے عالیان نے بھی ویرا کو دیکھا اور امرحہ یہ سوچے بنا رہ نہیں سکی۔

"اگر ویرا صحرائے گوبی کی طرف کا سفر اختیار کرلے اور صحرا میں بھٹک جائے اور پیاسی۔۔۔ پیاسی۔۔۔" امرحہ اسے یہ بددعا دیے بغیر نہیں رہ سکی، وہ یہ کرنے پر مجبور تھی۔

دو خاندان ایک جگہ موجود ہو کر بھی کیسے الگ الگ رہتے ہیں یہ شارلٹ اور جورڈن کی شادی میں دیکھا جاسکتا تھا۔ تناؤ موجود تھا اور خوشی کے بجائے گھبراہٹ ہو رہی تھی، وہ سب آپس میں دھیمی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے اور مسکرانے میں اس قدر کنجوسی کر رہے تھے کہ کہیں ان کی مسکراہٹوں کا غلط مطلب نہ نکال لیا جائے۔ ان کے بیش قیمت لباس، زیورات ان کے ہاتھوں کی حرکات، ان کے لبوں کا وا ہونا کچھ ایسا تھا کہ سانس گھٹنے لگتا۔ وہ ایک شادی میں شریک ہونے سے زیادہ کسی نیلامی میں شریک ہوئے لگتے تھے جہاں وہ اپنے رتبے کی بولی سننے آئے ہوں۔

شادی کی رسم شروع ہو گئی اور جب انگوٹھی پہنانے کی باری آئی اور دولہا نے اپنے شہ بالے کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ انگوٹھی اسے دی جائے تو شہ بالے نے اپنی جیبیں ٹٹولنی شروع کر دیں۔

"انگوٹھی تو نہیں ہے۔" رافیل نے ہاتھ اٹھا دیے۔

"تم دیکھو، شاید تمہارے پاس ہو۔" اس نے دوسرے شہ بالے سے کہا۔

اس نے بھی اپنی جیبیں ٹٹولیں اور ہاتھ اٹھا دیے۔

"میرے پاس بھی نہیں ہے۔"

دونوں نے یہ حرکت کرتے کافی وقت لیا تھا، پادری بے زاری سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"تم دیکھو، شاید تمہارے پاس ہو؟" دوسرے شہ بالے نے تیسرے سے کہا۔

تیسرے نے بھی خود کو ٹٹولا اور اس بار جورڈن کے انکل سے کہا۔

"آپ کے پاس تو نہیں انکل۔۔۔! میرے پاس بھی نہیں ہے۔"

انکل نے بھی اپنا کوٹ کھنگالا اور ساتھ بیٹھی آنٹی جولیا سے یہی کہا۔ آنٹی جولیا نے اپنا پاؤچ اور ہاتھوں کی انگوٹھیاں دیکھیں اور اگلی خاتون سے کہا "آپ کے پاس ہو شاید" اگلی خاتون نے بھی کم و بیش یہی کہا اور اپنے سے اگلے کی طرف اشارہ کر دیا۔ آگے سے آگے۔۔۔ قطار در قطار وہ اپنے سے آگے بیٹھے کو اشارے کرنے لگے۔

پادری صاحب حد سے زیادہ بے زار ہو چکے تھے، دلہن رو دینے کو ہو رہی تھی۔ لیڈی مہر اپنی نم آنکھیں چھپا رہی تھیں۔

"یہ لوگ واقعی شارلٹ کو پسند نہیں کرتے۔"

آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ ان کی

تلاشیاں ہی ختم ہونے میں نہیں آرہی تھیں اور پھر آخر کار جب ان کے ایک ایک بوڑھے 'عورت' مرد' لڑکے' لڑکی اور بچے نے خود کو کھنگال ڈالا اور کوئی ایک بھی نہ بچا تو وہ...

"انگوٹھی نہیں ہے... یہ شادی نہیں ہو سکتی۔" وہ یک آواز چلائے۔

سکوت چھا گیا... تناؤ اور بوجھل پن اور بڑھ گیا۔

شہ بالے رافیل نے چھینک ماری اور انگوٹھی اس کے منہ سے نکل کر باہر گری اسے اٹھا کر اس نے دولہا کو دی۔

شادی کی رسم ہو گئی۔ لیڈی مہر کے چہرے کے سارے رنگ اڑتے ہی رہے۔

شادی میں ہنسی مذاق 'شرارت معمول کا حصہ ہیں' لیکن اس مذاق پر ہتک غالب تھی۔ انہیں شارلٹ کے ساتھ یہ سلوک پسند نہیں آیا تھا۔ عالیان انہیں لے کر ذرا دور چلا گیا اور جب واپس لایا تو وہ مسکرا رہی تھیں۔

رات کی تقریب قلعے کے اندر وسیع ہال میں تھی جسے سفید اور بنفشی رنگوں کے امتزاج سے خواب ناک بنایا گیا تھا جیسے کسی قدیم شہزادی کی خوشیوں کے نام جام لہرائے جا رہے ہوں۔ کارل اور عالیان شادی کی تقریب کے دوران سے ہی غائب تھے۔ اسے ان دونوں کے غائب ہو جانے کی سمجھ نہیں آئی' بلکہ کارل تو ایسے تیار ہو کر آیا تھا جیسے اسی کی شادی ہو۔ امرحہ کو کارل کے جانے کی خوشی تھی۔ اس نے سادھنا اور این لون کے ساتھ انگلش طرز پر گول گول گھومنے کی کوشش بھی کی تھی۔

ابھی کیک نہیں کاٹا گیا تھا۔ شارلٹ کافی مرجھائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ بہر حال کیک کی ٹرالی لائی گئی اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں کیک کاٹتے 'ہال کا دروازہ دہشت ناک انداز سے کھلا اور ایک پاگل دیوانہ شخص بھاگتا ہوا شارلٹ کی طرف آیا' جسے دیکھتے ہی شارلٹ نے چیخ ماری اور اتنی شدت سے ماری کہ ہال کا ماحول جامد ہو گیا اور سب اسے دیکھنے لگے اور ٹھیک اسی دوران اس پاگل نے سر سے ہاتھ اوپر اٹھا کر پسٹل سے فائر کیا۔

"فریز... کسی نے بال برابر بھی جنبش کی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔" فائر کی آواز سے سہم کر چیخوں سے گونجتا ہال سناٹے سے بھر گیا۔

"تم میرے ساتھ یہ کیسے کر سکتی ہو شارلٹ؟" وہ چلایا اور پسٹل کا رخ جورڈن کی طرف کر دیا۔ "تم شادی کر رہی ہو... تم شارلٹ... تم... یہ سب..."

شارلٹ بری طرح سے سہم گئی اور جورڈن تو تھا ہی ایکٹر وہ ایسے سہما کہ ذرا دور کھڑی اس کی ماں سے دل کا دورہ چند انچ کے فاصلے سے گزرا...

"یہ پاگل خانے سے کیسے بھاگا۔" ہال میں سے کسی کی آواز ابھری اور وہ خود بھی... وہ سائی تھا جو اس پاگل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"اپنی جگہ پر واپس چلے جاؤ ورنہ مجھے اپنے اس ہاتھ کی انگلی کو زحمت دینی پڑے گی۔" اس نے شرٹ کے اندر سے دوسرا پسٹل والا ہاتھ نکال کر اور اس کی طرف تان کر کہا' پہلا پسٹل بدستور جورڈن پر تنا تھا۔

"چلے جاؤ یہاں سے میک!" سائی قریب جاتے چلایا۔

امرحہ نے حیرت سے سائی کو دیکھا بھلا اس کا کیا کام' یہ تو شارلٹ کو جانتا بھی نہیں تھا اور اس پاگل نے اپنی انگلی کو زحمت دے دی اور فائر کر دیا۔ گولی سائی کے بازو میں لگی اور خون کی دھار اس کے بدن سے پھوٹی وہ وہیں گر گیا۔

"سائی!" امرحہ نے چیخ ماری اور اس کی طرف لپکنے لگی کہ ویرا نے اس کا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا۔

"ہمیشہ گڑبڑ کرتی ہو' بیٹھ جاؤ ورنہ تمہیں تو وہ شوق سے گولی مارے گا۔" ویرا نے ایک ہاتھ اس کی کمر میں دیا اور ایک اس کے منہ پر رکھا اور اس کے کان میں کہا۔

"میں نے کہا نا کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔" وہ حلق کے بل دھاڑا۔

اس کا حلیہ ہی ایسا تھا کہ ہال میں سب دبک گئے... سکوت چھا گیا۔

ذرا دور سے ایمبولینس کے سائرن کی آوازیں آنے لگیں اور پولیس مئے کے بھی... یعنی ان کے بچاؤ کے لیے لوگ آرہے تھے۔ جلد ہی شارلٹ کے سابقہ پاگل عاشق کو پکڑ کرلے جائیں گے۔

"تم تو مجھ سے پیار کرتی تھیں شارلٹ اور شادی... شادی... وہ کس سے کر رہی ہو؟" پسٹل کا رخ جورڈن کی طرف رکھ کر وہ اچھل اچھل کر چلایا' اتنی اونچی آواز میں کہ ان کے کانوں کے پردے ہل گئے اور خوف سے آنکھیں بند کرلینے کو جی چاہا۔

"سائی!" مرحہ اس دوران سسک رہی تھی۔

"میری جگہ تم کسی اور کو لے آئیں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

"ٹھیک ہے میں اپنی جگہ خالی کروالیتا ہوں۔" اس نے جورڈن کی کنپٹی پر پسٹل رکھی۔ جورڈن کی ماما اور چند دوسری خواتین کی چیخیں نکل گئیں جس کے جواب میں اس پاگل نے پسٹل کا رخ ان کی طرف کر کے ہوائی فائر کردیا۔

"کوئی آواز نہیں..." وہیں ان کی آواز بند بلکہ گم سی ہوگئی۔

"چلو شارلٹ میرے ساتھ..."

"میری شادی ہوچکی ہے میک...! جورڈن میرا شوہر ہے۔"

"جورڈن تمہارا شوہر تھا... یہ ابھی مردہ ہونے جارہا ہے۔" اس نے تھا کو لمبا کھینچ کر کہا۔

"مجھے تم سے نفرت ہے... میں تمہارے جیسے پاگل انسان کے ساتھ ایک منٹ کے لیے نہیں رہ سکتی... سائیکو... نفرت ہے مجھے تم سے۔"

"مجھے اس سے نفرت ہے میں ایک اور منٹ اسے زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔"

ہال کے اندر بھاگتے ہوئے تین چار لوگ آئے' حلیے سے وہ اسپتال کے ملازم لگتے تھے اور پاگلوں کا پاگل نظر آتا ایک ڈاکٹر جس کی آنکھوں پہ بہت بڑا چشمہ تھا۔

"میک۔ چھوڑ دو اسے۔ ہمارے ساتھ واپس چلو۔" ڈاکٹر ذرا دور سے محتاط انداز میں چلایا۔ ہال والوں کی نظریں اب ڈاکٹر پر تھیں۔

"مجھے پاگل سمجھا ہے کیا؟" اس نے جنونی قہقہہ لگا لیا اور پسٹل کا رخ ڈاکٹر کی طرف کردیا۔ "حساب کتاب تو تم سے بھی باقی ہیں میرے۔"

"تم یہ نہیں کرسکتے۔" میک یعنی پاگل کو اور بھڑکایا۔

"میں یہ ضرور کروں گا۔" اچھل اچھل کر وہ چلانے لگا۔ اسے دیکھ دیکھ کر خوف اور بڑھنے لگا اور اس وقت خوف سے دم ہی نکل گیا' جب ڈاکٹر نے اچھلتے میک کو غافل سمجھ کر اس پر قابو پانے کے لیے ایک دم سے حملہ کردیا۔ حملے کی صورت دو فائر فوری ہوئے ہال خواتین کی چیخوں سے گونج اٹھا جن میں سب سے نمایاں چیخ جورڈن کی ماما کی تھی۔ فائر کے ساتھ ہی ہال کی لائٹس بجھ گئیں۔ لوگوں کے اٹھنے' گرنے' بھاگنے کی آوازیں بھی آئیں اور جورڈن کے کراہنے اور ماما جورڈن کے چلانے کی بھی۔

ایک منٹ سے بھی کم وقت میں یہ ہوا۔ اتنی چیخ و پکار پر بھی لائٹس آن نہ کی گئی اور جب لائٹس آن ہوئیں تو کیک کے پاس نہ مردہ دولہا تھا نہ دلہن اور اس کا پاگل خانے سے بھاگا ہوا ئے فرینڈ اور نہ ہی اس پاگل کا ڈاکٹر۔

وہ سب غائب تھے۔ وہ سب کہاں تھے۔ ہال میں نظریں گردش کررہی تھیں۔

ہال میں آرکسٹرا نے دھن چھیڑی اور اونچی چھت تلے بنے۔ وسیع گول دائرے نما اندھیرے ڈانس فلور پر اسپاٹ لائٹ روشن ہوئی اور روشنی چلتی چلتی ایک جگہ پر آکر رک گئی' دولہا اور دلہن پر۔ جورڈن نے ہاتھ اوپر اٹھایا جسے دلہن نے تھام لیا اور گول گول گھومنے لگی۔

دوسری اسپاٹ لائٹ چلتی وہ اور لوگوں پر آ کر رک گئی۔ پاگل کارل اور ڈاکٹر عالیان پر۔ انہوں نے سر کو جھکا کر داد لینی چاہی اور دولہا' دلہن کی نقل اتارتے گول گول گھومنے لگے۔ رکے ہوئے سانس' تنفس سے بحال کیے گئے۔ انہیں گمان تک نہیں ہوا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے۔

دلہن والوں اور دلہا کے صرف مردوں نے کھڑے ہو کر تالیاں بجا بجا کر ہال سر پر اٹھالیا۔ کارل اور عالیان کے ویڈنگ پرانک (مذاق) نے میدان مار لیا تھا۔ کچھ کو تو مار ہی ڈالا تھا۔

امرحہ بھی کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہی تھی آج اسے کارل اچھا لگا تھا۔ ویرا نے اس کے کان میں سب بتا دیا تھا صرف چند گھنٹوں میں سب پلان کیا گیا تھا' شارلٹ اور جورڈن بھی ان کے ساتھ تھے۔ کارل اور عالیان کا گیٹ اپ ایسا تھا کہ امرحہ نے انہیں بہت دیر میں پہچانا۔ ان کی پرفارمنس لاجواب تھی۔ پاگلوں سے بڑھ کر کارل پاگل لگ رہا تھا۔

تو اسی لیے ہر چار میں سے تیسرے کو کارل ہونا چاہیے۔ ہر تین میں سے دوسرے کو اور ہر دو میں سے پہلے میں تھوڑا کارل ضرور ہونا چاہیے۔ کیونکہ کبھی کبھی یہ بہت ضروری ہو۔

✲ ✲ ✲

"مجھے اچھا لگا امرحہ نے میرے لیے اتنی دردناک چیخ ماری۔"

"مجھے تو یہ لگنے لگا تھا کہ پرانک' مذاق الٹا ہمارے گلے ہی پڑ جائے گا۔ خواتین کی چیخوں کی حالت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔"

"میں دیکھ رہا ہوں کہ بات بدلنے میں تم کافی ماہر ہو چکے ہو۔"

"تمہیں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے کہ مجھے بات بدلنی پڑے یا جس کا میں جواب دینا نہ چاہوں۔"

"عالیان! میں اچھا برا سب سنتا ہوں لیکن صرف وہ کہنے کی کوشش کرتا ہوں جو ٹھیک ہو۔ میری بات غور سے سنو عالیان! اگر میری جگہ کوئی تمہیں لگتی تو تم دیکھتے کہ ہال امرحہ کی چیخوں سے گونج اٹھتا اور تم یہ بھی دیکھتے کہ۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔ مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں نہ پالنی ہے مجھے۔"

"تم سائی پر وہم کا الزام نہیں لگا سکتے۔"

"ٹھیک ہے لیکن اب میں اس سے آگے نکل آیا ہوں۔"

"پلٹ کر دیکھو' کسے پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ اور یاد رکھنا ہمیں صرف یہ گمان ہی ہوتا ہے کہ ہم آگے بڑھ آئے ہیں۔ صرف گمان۔ میں چاہتا ہوں اس گمان کے غلط ثابت ہونے سے پہلے تم خود ہی اسے غلط ثابت کر دو۔"

"سائی ہم خود کو کتنی بھی بلندی پر کھڑا کرلیں' کچھ لوگوں کے لیے ہم ہمیشہ پستیوں کے پاس ہی رہتے ہیں' ان دیکھے سیاہ دائرے جو ہمارے گرد کھینچ دیے جاتے ہیں' ہمیں نظر آئیں نہ آئیں' ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے۔"

"میں اختلاف نہیں کروں گا تم سے۔"

"تم میں یہ خوبی ہے سائی کہ تم ہر بات کو جلد سمجھ جاتے ہو۔"

"عالیان میں بات کو نہیں' جس حالت میں وہ بات کی جاتی ہے بس اسے سمجھ جاتا ہوں۔ اور تم سے بھی یہی کہوں گا اس حالت کو سمجھنے کی کوشش کیا کرو جس میں ناپسندیدہ باتیں کی جاتی ہیں۔"

"میرا خیال ہے ہمیں سب چھوڑ دینا چاہیے اور پرسکون ہو جانا چاہیے۔ کیا تم مجھے اجازت دو گے کہ میں کوئی اور بات کروں؟"

سائی نے ٹھنڈا سانس لیا۔ "تم چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ کرو کوئی اور بات۔"

"کیا تم نے کبھی کسی کا انتظار کیا ہے کہ وہ تمہارے پاس آئے اور تم اسے سنو۔"

"بہت سے ہیں اور ان میں سے ایک کارل ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں وہ کبھی میرے پاس نہیں آئے

گا۔"

"ہاں وہ کبھی نہیں آئے گا وہ خود پر یہ نوبت ہی نہیں لائے گا' جانتے ہو وہ اپنا اتنا بڑا مداح ہے کہ اپنے کمرے میں لگے شیطان کے پوسٹر کے پاس کھڑا ہو کر کہہ رہا تھا۔ "کارل کے بعد میں تمہاری ذہانت کا مداح ہوں۔"

"شیطان کہتا ہوگا" خود سے پہلے میں بھی تمہارا ہی مداح ہوں جناب کارل!" کہہ کر سائی اور عالیان دیر تک بچوں کی طرح ہنستے رہے۔

جناب کارل کہیں اور دل ہی دل میں قہقہے لگا رہے تھے۔

"این! تم بیٹھے بیٹھے اتنی موٹی کیسے ہو گئیں؟" ایک دم سے اسے سائیکل وزنی لگنے لگی تھی۔

"موٹی نہیں موٹا۔" نیلی آنکھوں کو مٹکا کر وہ مسکرایا۔

اپنے خدشے کے سچ ہو جانے کے خوف سے اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے کارل بیٹھا تھا اور این ذرا دور کھڑی دانت نکال رہی تھی۔

"کیا ہوا امرحہ چلاؤ نا سائیکل۔"

کھڑے ہو کر اس نے سائیکل کو جھٹکا دیا کہ وہ گر جائے بھلا وہ کوئی عالیان تھا جو جھٹ سے گر جاتا۔ وہ آرام سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اگر تم مجھے اپنی سائیکل کے پیچھے بٹھا لو تو میں اس وقت تک بیٹھا رہ سکتا ہوں جب تک پاکستان نہ آ جائے۔ حتیٰ کہ چاند تک لے جانا چاہو تو بھی۔"

"میں تمہیں اس وقت تک ضرور بٹھائے رکھ سکتی ہوں جب تک جہنم نہ آ جائے۔"

"ٹھیک ہے اپنے ٹھکانے تک لے چلو۔ آگے جنت تک میں پیدل چلا جاؤں گا۔"

امرحہ پیدل ہی سائیکل لے کر آگے آگے چلنے لگی اس کے ہوتے وہ اسے چلانے کی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اسے ایسے گرا دے کہ وہ بستر سے ہی نہ اٹھ پائے۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم سائیکل اچھی چلا لیتی ہو۔ ایک ریس ہو جائے؟"

امرحہ کو اس کی بات پر ہنسی آئی لیکن وہ ہنسی نہیں سنجیدگی سے آگے آگے چلتی رہی وہ ساتھ آنے سے باز نہ رہا۔

"تم مجھے نظر انداز کر رہی ہو۔ چلو میں تمہاری اس حرکت کو نظر انداز کرتا ہوں۔ سنو چند سالوں بعد میں میئر بن جاؤں گا پھر بہت جلد ہی وزیر اعظم' پھر میرا ارادہ تیسری عالمی جنگ شروع کروانے کا ہے تاکہ تم جیسے بے کار اور ڈرپوک لوگ ختم ہو جائیں' تم سمجھ ہی رہی ہوگی کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں کہ مجھ جیسی عالمی شخصیت جس پر کئی ہزار کتابیں لکھی جا رہی ہوں گی۔"

"اور جو کئی ملکوں کی پولیس اور فوج کو مطلوب ہوگا۔" امرحہ نے معصومیت سے اس کی بات مکمل کی۔

"تمہیں مجھے ٹوکنا نہیں چاہیے تھا لیکن میں تمہیں اس حرکت پر معاف کرتا ہوں۔ تو مجھ جیسی بے مثال شخصیت سے ہار جانا بھی بہت زیادہ قابل فخر ہوگا۔"

"تو پھر میں تم اس فخر کو حاصل کرنے کا اعزاز دوسروں کو کیوں نہیں دیتے۔"

"میں اپنے مقابلے میں عام لوگوں کو نہیں لاتا' اس پر خوش ہو جاؤ کہ تم خاص ہو۔"

"تم اور عالیان ایک ریس کیوں نہیں لگاتے۔ میں عالیان پر بیٹ لگانا چاہتی ہوں۔"

"تم عالیان کی سپورٹر ہو۔ آئی سی۔"

"بالکل۔"

"دم بھی بھی۔؟"

"ہمیشہ رہوں گی۔"

"بے چارا عالیان۔"

"دی گریٹ عالیان۔" اس نے گردن کو فخریہ اٹھا کر کہا کہ کارل دیکھتا ہی رہ گیا۔

"میں تمہیں بتادوں کہ میں اس سے حسد رکھتا ہوں نہ اسے ہرانے کی خواہش میں اسے کئی بار ہرا چکا ہوں۔ اگر تم نے مجھے ہرادیا تو میں تم دونوں کی دوستی کرواسکتا ہوں۔ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تمہیں میری قابلیت پر شک نہیں ہونا چاہیے۔"

"اس سے دوستی کرنے کے لیے مجھے تمہاری مدد نہیں لینی چاہیے۔ یہ میرے دماغ کے بائیں حصے کا مشورہ ہے۔ مجھے اس بائیں حصے کے مشورے پر شک نہیں کرنا چاہیے۔"

"ریس تو ہوگی امرحہ۔ ورنہ تمہاری بہت بے عزتی ہوگی۔"

"دیکھتے رہو خواب۔" وہ سائیکل لے کر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

دادا آج کل بہت خوش رہتے تھے جیسے وہ مل گیا ہو جس کی تلاش ہو۔ وہ پوچھتی تو ہنس کر خاموش ہوجاتے۔ ان کے ایسے انداز کے بعد اسے بے سکونی سی رہتی وہ کلاس میں توجہ سے لیکچر سن پاتی نہ اسٹور پر ٹھیک سے کام ہوپاتا۔ دادا کے رویے اسے سہا دیتے۔ اتنا کہ وہ بزنس ڈیپارٹمنٹ کی طرف جاتے جاتے پلٹ آتی۔

"میں کئی بار مل چکا ہوں اس سے اور میں بتا نہیں سکتا کہ میں کس قدر خوش ہوں میں اسے تقریباً ہر طرح سے آزما چکا ہوں ابھی میں نے گھر میں بات نہیں کی۔"

اسے پہلی بار دادا کی آواز بھدی لگی اور الفاظ بدنما۔

"آپ کو مجھ سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں دادا۔" وہ بہت مشکل سے یہ کہہ پائی۔

وہ حیران ہوئے "تم شرما رہی ہو تو نہیں کرتا۔"

"بالکل نہیں بس مجھے تعلیم مکمل کرنے دیں۔"

"شادی تمہاری ڈگری کے بعد ہی ہوگی امرحہ۔"

"میری شادی نہیں ہوگی مجھے شادی نہیں کرنی۔"

"شہریار بہت روشن خیال اور۔"

"وہ ورلڈ بینک کا صدر اور کسی یونیورسٹی کا چانسلر ہی کیوں نہ ہو۔"

"تو تم فیصلے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہو؟" دادا کا انداز ایسے سنجیدہ ہوگیا کہ پہلے کبھی نہیں ہوا ہوگا۔

دونوں کے درمیان سکوت چھا گیا جس سے دادا کے خدشات کی تصدیق ہوئی۔

"ٹھیک ہے لیکن مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔"

"میں صرف ہاں ناں کا اختیار استعمال کررہی ہوں۔"

"میں تمہاری ناں سے بھی واقف ہوں اور ہاں سے بھی انجان نہیں مجھے پاگل مت بناؤ۔"

"تو آپ چاہتے ہیں میں خود کو پاگل کرلوں۔" وہ چیخ کر بولی۔

ایک بار پھر سکوت دونوں کے درمیان تن گیا۔ دادا اس کے انداز پر دنگ رہ گئے۔

"کون ہے وہ امرحہ۔ پاکستانی امریکی مصری روسی برطانوی کون ہے وہ؟ مسلم۔ غیر مسلم۔ جو کوئی بھی ہے مجھے بتانے لگو تو اس کا حسب نسب ہاتھ میں رکھ کر بیٹھنا تمہیں ملک سے باہر پڑھنے کی اجازت دی تھی بغاوت کی نہیں جانتی ہونا تم سے متعلق سب مجھ سے سوال کرتے ہیں یہ بھی جان لو تم سے پہلے انگلیاں مجھ پر اٹھیں گی۔" دادا کا انداز بھی تیز تھا اور آواز بھی۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ اندر ہی اندر چیخ کر ٹوٹ گئی۔

"ڈگری لے لو پھر بات کرتے ہیں۔" دادا نے مزید اسے سننا گوارا ہی نہ کیا۔

"حسب نسب ہاتھ میں لے کر بیٹھنا" کتنے ہی دن کتنی ہی بار اس نے سر کو جھٹکا لیکن وہ اس فقرے کی گونج سے جان نہیں چھڑا سکی اس کے دل پر اس پہاڑ کا بوجھ آگرا جسے کبھی سر نہ کیا جاسکا ہو۔ یونی میں وہ عالیان کے راستے کی طرف جاتی اور پلٹ آتی۔

"کیا فائدہ؟" خود سے کہتی بھی اور پوچھتی بھی۔

سمسٹر ختم ہونے کو تھا لیکن زندگی تو ختم نہیں ہو رہی تھی نا۔ اور پھر ایسے لوگوں کی زندگی ویسے بھی بہت لمبی ہو جاتی ہے جو من چاہے راستوں کی طرف جاتے بھی ہوں اور پلٹ آنے پر بھی مجبور ہوں۔ وہی لوگ جو بے اختیار ہو کر جاتے ہیں اور کسی اختیار والے کے خوف سے لوٹ آتے ہیں۔ سفر شروع کرتے ہیں نہ ختم۔ پابند رہتے ہیں نہ آزاد۔

اس نے سیف روم میں جا کر کئی نوٹ دیواروں سے چپکا دیے۔

"کاش اللہ انسان کی عظمت اور پستی اس کی پیشانی پر کندہ کر دے "یہ میرا بندہ ہے۔" یہ میرا بندہ نہیں ہے۔" پھر حسب نسب، خاندان، ذات، مذہب پر سوال نہ اٹھیں۔"

وہ کالی سیاہی سے سنہری حروف لکھتی جاتی۔

"مجھے افسوس رہے گا کہ کائنات کی بہترین چیز اٹھا لینے کا اختیار میری ہتھیلیوں کو نہیں دیا گیا پھر اس نے یہ بھی لکھا کہ "لاچاری اور بے بسی اپنے عروج پر ہے، میں اپنی آنکھوں کو مائل ہونے اور کانوں کو متوجہ ہونے سے روکنے سے معذور ہوں۔ سمعی اور بصری حسیں میرے اختیار سے پہلے نکلیں اور پھر مجھے یاد نہ رہا کہ کبھی یہ میرے حلقہ اختیار میں بھی تھیں، میں دنیا میں کسی بھی انسان کو ٹھیک ٹھیک یہ سمجھا نہیں سکوں گی کہ اپنی ہی چیزوں کا اپنے اختیار سے نکل جانا کب ہونا شروع ہوتا ہے اور پھر اسے ختم کر دینا ناممکنات میں سے ایک ہو جاتا ہے۔ میں ایک کمزور انسان ہوں ناممکنات کی طرف پیش قدمی کیسے کروں؟ مجھے رک جانے کا عندیہ نہ دیا جائے۔ مجھے چلتے رہنے کی نوید سنا دی جائے۔ کوئی سجدوں میں سر جھکائے اور صرف میرے لیے ہاتھ اٹھائے۔ میں یہاں وہاں پابند ہوں وہ مجھے آزاد کروا لے جائے۔"

☆ ☆ ☆

"میری ایک چھوٹی بہن ہے فیشن ڈیزائننگ پڑھ رہی ہے ماسکو میں، اور چھوٹا بھائی نیویارک فلم اکیڈمی کا اسٹوڈنٹ ہے۔ ماما پاپا دونوں ریسٹورنٹ دیکھتے ہیں میں نے اپنے ریسٹورنٹ میں بہت کام کیا ہے ان فیکٹ پاپا نے مجھ سے بہت کام لیا ہے۔ وہ خود بھی بہت بہت کام کرتے ہیں اگر تم ہمارے ریسٹورنٹ آؤ تو تم کسی بھی چیز کا اچھی طرح سے مشاہدہ کرنے کے بعد بھی یہ معلوم نہیں کر سکو گے کہ وہ کتنی پرانی ہے اور کتنے عرصے سے وہاں زیر استعمال ہے۔"

"یعنی تمہارے پاپا چیزوں کو سنبھالتے نہیں ان سے پیار کرتے ہیں؟"

"ہاں بالکل۔ ویسے وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"واقعی؟"

"ہاں! وہ کہتے ہیں اچھے انسان کا دنیا میں موجود ہونا قدرت کی طرف سے انعام ہوتا ہے۔"

"میں اچھا انسان ہوں؟" عالیان گھاس پر نرمی سے ہاتھ پھیر رہا تھا اور یہ سوال کرتے اس کے ہاتھ رک گئے۔

"بالکل۔" ویرا نے سر کو خم دے کر مسکرا کر کہا۔

"تمہیں کیسا پتا؟"

"اچھے انسان کے بارے میں بتا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، اپنی اچھائیوں کے سارے پتے وہ اپنی ذات میں رکھتا ہے۔"

"اگر میں اچھا ہوں تو ماما کی وجہ سے۔"

"تم یہ کیوں نہیں مانتے کہ تم اپنی وجہ سے اچھے ہو؟"

"کیونکہ میں نہیں ہوں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ مستقبل میں تمہارا ہوٹل کھولنے کا ارادہ ہے؟"

"ابھی اس کے بارے میں میں نے نہیں سوچا۔ ڈگری کے بعد میں دنیا گھومنے کا ارادہ رکھتی ہوں، جب سے پیدا ہوئی ہوں پڑھ ہی رہی ہوں، اچھا کیا میں تمہیں وہ باتیں بتا سکتی ہوں جو مجھے تم میں اچھی لگتی ہیں؟"

"نہیں۔"

"میں پھر بھی بتاؤں گی اور اس سے پہلے یہ بتانا چاہوں گی کہ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو تم ڈیپارٹمنٹ کے کسی اسٹوڈنٹ کے ساتھ آنکھیں بھینگی کرنے کی مشق کررہے تھے' پھر تم دونوں زبان کو ٹھوڑی سے لگانے لگے' آئی مسٹ سے تمہاری زبان بہت لمبی ہے پھر تم دونوں نے کانوں کو پھڑپھڑانا شروع کردیا' میں نے اپنی کلاس فیلو سے پوچھا کیا اسپیشل لوگ بھی یہاں پڑھتے ہیں تو اس نے ہنس کر آنکھ مار کر تمہاری طرف دیکھ کر کہا "یہ تو واقعی اسپیشل ہے۔"

ہاہاہا۔ "اچھا؟"

"ہاں' اور جب کلاس میں سب اپنا تعارف کروا رہے تھے تو مجھ سے اگلی رو میں بیٹھے تم ایک ایسے پھول کی پتیاں بنا رہے تھے جو تخیل میں تو ہوسکتا ہے زمین پر نہیں۔"

"تو یہ اچھی بات ہے؟"

"ہاں' کیونکہ تم ان چیزوں کے بارے میں بھی سوچتے ہو جو سرے سے موجود ہی نہیں ہیں تو تم ان کے بارے میں کتنا سوچتے ہوگے جو موجود ہیں۔ تم انجان رہنے والوں میں سے نہیں ہو۔"

"اپنے بارے میں جان کر اچھا لگا ویرا۔ تم ایک سمجھدار لڑکی ہو۔" عالیان مسکرا دیا۔

"تم ایک اچھی لڑکی ہو۔" اگر تم یہ کہتے تو مجھے اچھا لگتا۔"

"تم ایک اچھی لڑکی ہو۔"

"ہاں' اب ٹھیک ہے۔"

ویرا مزید اسے اس کی خوبیاں بتاتی کاغذ کا بنا ایک جہاز اڑتے ہوئے ان کے درمیان آکر گرا۔ اس نے اسے اٹھایا اور پڑھا۔ پہلے وہ حیران ہوئی پھر مسکرانے لگی۔

"اچھا عالیان پھر ملتے ہیں۔" ہاتھ ہلا کر وہ چلی گئی۔ عالیان نے جہاز اٹھا کر پڑھا "امرحہ!" بس اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔

ویرا امرحہ کے سر پر پہنچ چکی تھی "تم نے میرا سر فخر سے بلند کردیا ہے' میں روز تمہیں دو تین گھنٹے مشق کرواسکتی ہوں' صبح جلدی اٹھ جایا کرنا۔"

"کیا کہہ رہی ہو اور کس چیز کی مشق؟"

"سائیکل کی۔"

"وہ کیوں؟"

"کارل کو چیلنج دیا ہے نا تم نے' اب کیا ریس میں ہارنا ہے؟"

وہ کریم کافی پینے کی تیاری کررہی تھی کہ پورا مگ گرا بیٹھی "کس نے کس کو چیلنج دیا ہے؟"

"تم نے کارل کو۔"

"ویل ڈن امرحہ۔" اسی دوران آرٹ ڈیپارٹمنٹ کی شنا خاص اس کے پاس آئی۔

"میں نے تم پر پندرہ پونڈ شرط بھی لگادی ہے۔"

امرحہ اس کی شکل دیکھنے لگی کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔

"شکر ہے کسی نے تو کارل کو ٹکر دینے کا سوچا۔"

امرحہ دیوانوں کی طرح سامنے کھڑی شنا اور قریب بیٹھی ویرا کو دیکھنے لگی۔ دونوں کے ہاتھ میں کاغذ سے بنے جہاز تھے۔ جس کے ایک طرف "امرحہ کارل سائیکل ریس" اور دوسری طرف وقت' دن' جگہ لکھی تھی اور نیچے یہ تفصیل کہ امرحہ نے کارل کو چیلنج کیا ہے اور کارل نے قبول کرلیا ہے۔

یہ جہاز یونی بھر میں خوب اڑتے پھررہے تھے' ایک امرحہ کے سر پر بھی آکر لگا دور کارل کھڑا دانت نکال رہا تھا۔ امرحہ فوراً اس کے پیچھے لپکی تو وہ بھاگ گیا۔

تھوڑی دیر وہ اسے ادھر ادھر ڈھونڈتی رہی' لیکن وہ نہیں ملا اور جب وہ پیر پٹخ کر چل رہی تھی تو وہ ایک دم سے اس کے سامنے آگیا۔

"مجھے ڈھونڈ رہی ہو؟ لو میں حاضر ہوں۔"

"یہ کیا ہے؟" اس نے جہاز اس کے آگے لہرایا۔

"تمہاری ریس... اگلے ہفتے... امرحہ اور کارل... ساتھ ساتھ..."

"میری طرف سے ہزار دو ہزار جہاز اور اڑا دو یونی میں' مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

"فرق پڑے گا تمہاری بہت بے عزتی ہوگی' ریس ضرور ہوگی۔"

"اگر میں تمہیں قتل کردوں تو...... تو تمغہ ملے گا۔"

"نہیں سیلوٹ...... جو میں خود تمہیں دوں گا' اگر تم مجھے قتل کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو..... سنو امرحہ' بلکہ دیکھو ڈی کوئین تم ڈر کیوں رہی ہو..... چلو تم یہاں کھڑے کھڑے مان لو کہ آئی ایم کارل دی گریٹ۔ اور تم کارل دی گریٹ سے ڈرتی ہو۔"

"ہونہہ..... کارل دی گریٹ....." کارل سے بحث فضول جان کر وہ پلٹ آئی' اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی' نہ فکر کہ کارل یونی میں کیا اعلان کرتا پھر رہا ہے' وہ کیا پاگل تھی جو اس کے ساتھ ریس لگاتی۔

"چلو آؤ' میں تمہیں مشق کروادوں۔" رات کو ویرا اسے کمرے سے لے جانے آئی۔

"پاگل ہوگئی ہو تم بھی' چار دن مجھے سائیکل چلاتے نہیں ہوئے کہ میں ریس لگانے چل پڑوں...... ناممکن اور مجھے کوئی دلچسپی بھی نہیں۔"

"ناممکن کا سوچ کر بیٹھی ہو تو اسے ممکن کیسے کرسکتی ہو بھلا۔"

"یہ پاگل پن ہے ویرا۔"

"گرگز رویہ پاگل پن..... پاکستانی اور ہندوستانی کافی جذباتی ہورہے ہیں۔ تم پر شرط لگائی ہے۔ تم لوگ عجیب ہو ویسے' مقابلے میں کوئی تیسرا غیر ملکی ہو تو تم پاکستانی ہندوستانی ایک ہوجاتے ہو..... اینی وے تم اب پیچھے نہیں ہٹو گی۔"

"ویرا! مجھ سے تو سائیکل ہی نہیں چلے گی۔"

"میدان میں اترو گی تو دیکھنا کیسا جوش آئے گا تم میں۔"

"ہوش آئے گا تو جوش آئے گا نا۔"

سادھنا لیڈی مہر کو معلوم ہوا تو انہوں نے بھی ہاتھ لہرا لہرا کر تقریریں کیں کہ معمولی سی ریس ہی تو ہے۔ کون سا اولمپک کی دوڑ ہے۔

این اون بھی آگئی اور جاپانی مقولے ترجمہ کرکر کے سنانے لگی۔ ساتھ اس نے کھڑے کھڑے تین' چار شجاعت اور بہادری سے لبالب بھری جاپانی کہانیاں بھی سنادیں۔ اس کے علاوہ سب پرجوش تھیں اور اس میں ناک تک جوش بھر دینے کو تیار تھیں۔ نشست گاہ میں رات بھر چار خواتین اسے اپنے نرغے میں لئے بیٹھی رہیں اور تب تک نہیں چھوڑا جب تک اس کا سر ہاں میں نہیں ہل گیا۔ صبح سب سے پہلے وہ بزنس ڈیپارٹمنٹ گئی۔ کارل اور عالیان کھڑے باتیں کررہے تھے..... وہ ان کے قریب گئی۔

"میں ریس کے لئے تیار ہوں۔" اس نے این کی کہانی کے کردار کی طرح گردن کو بلند کرکے کہا اور صرف عالیان کو مسکرا کر دیکھ کر آگئی۔

"پوری یونی میں تمہیں امرحہ ہی ملی تھی ریس لگانے کے لئے؟"

"ہاں..... جیسے پوری دنیا میں تمہیں ایک وہی ملی تھی پرپوز کرنے کے لئے۔" کارل نے مذاق بالکل نہیں کیا تھا' وہ یہ بات کہتے سنجیدہ تھا۔

✲ ✲ ✲

وہ لائبریری کے اطراف میں ٹہل رہی تھی کہ کب وہ آتا ہے اور وہ اسے آتا نظر آگیا۔ وہ جلدی سے اس کے پاس گئی۔

"ہائے عالیان کیسے ہو..... بال کٹوا کر بڑے اچھے لگ رہے ہو' اچھا سنو ہفتے کو میری ریس ہے' تم آؤ گے؟"

وہ خاموش چلتا رہا..... اور اچھا لگ رہا تھا ایسا کرتے۔

"کیا تم مجھے تھوڑی سی مشق کرواسکتے ہو' میں نے کارل سے اس لئے ہاں کہی' کیونکہ تم نے ایک بار کہا تھا' ہار جانے والے ان لوگوں سے ہزار درجے بہتر ہوتے ہیں جو مقابلہ کرنے کی ہمت ہی نہیں کرتے۔'"

جواب کے انتظار میں وہ اس کی طرف دیکھنے لگی' لیکن وہ خاموش تھا۔ دونوں ہاتھوں کو پینٹ کی جیبوں میں ڈالے وہ بے نیاز نظر آنے کے نئے انداز ترتیب

دے رہا تھا۔

"دیکھو مجھے تمہاری ساری باتیں یاد ہیں۔ ایک بار پھر مجھے داد دو' میں ہمیشہ یہ بھول جاتی ہوں کہ مجھے کس نمبر کا جوتا آئے گا' لیکن مجھے یہ یاد ہے کہ میرے اسٹور میں تمہیں کس نمبر کا جوتا فٹ آیا تھا۔ کس نمبر کا تمہیں ذرا سا تنگ تھا اور کس جوتے کو اٹھا کر تم نے کہا تھا۔ "اتنا مہنگا جوتا... اگر مستقبل میں' میں اتنا مہنگا جوتا لینے کا ارادہ کروں گا تو میں سمجھ جاؤں گا میرا دماغی توازن کھو چکا ہے۔

اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم اپنے بے کار جوتوں کے کار آمد لیسز دوسرے جوتوں میں بدل بدل کر استعمال کرتے ہو اور یہ بھی کہ تمہارے پاس ایک بند رسٹ واچ ہے جسے تم سات دنوں میں ایک بار ضرور پہنتے ہو' وجہ میں نے جان لی ہے' تم چیزوں کو صرف اس لئے نہیں پھینک دیتے کہ وہ بے کار ہو چکی ہیں۔ تم ان سے وابستہ ہو جاتے ہو' تمہارے لئے ان سے الگ ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ تم چیزوں کے ساتھ بھی خود غرضی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔ تم میرے ساتھ ایسا کچھ رحم دلی کا مظاہرہ نہیں کر رہے' لیکن فی الحال میں اسے نظر انداز کر دیتی ہوں۔"

رک کر اس نے سانس لیا اور اسے دیکھا... ابھی بھی وہ بولنے پر مائل نہیں تھا۔

"ایک بار پھر مجھے سراہا جانا ضروری ہے' میں نے تمہاری سائیکل کی کہانی بھی معلوم کر لی ہے۔ سائی جیسا ایک فرشتہ صفت لڑکا تمہارا دوست تھا۔ تم دونوں ایک دوسرے کی سائیکلوں کے پیچھے بیٹھ کر آیا جایا کرتے تھے۔ ڈگری لینے کے بعد جب وہ جانے لگا تو یادگار کے طور پر تمہیں اپنی سائیکل دے گیا اور تمہاری ساتھ لے گیا۔ اس نے ایک اچھا کام یہ کیا کہ وہ یادگار کے طور پر تمہیں ہی اٹھا کر نہیں لے گیا... میرے ڈیپارٹمنٹ کی کچھ شرارتی لڑکیوں کا کہنا ہے کہ تمہیں اغوا کیا جانا ضروری ہو گیا ہے اور ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر انہیں کسی نائٹ رائیڈر کی خدمات حاصل ہو گئیں تو وہ یہ کر گزریں گی۔ تم کتنے لوگوں کو مطلوب ہو عالیان... خیر... مجھے ایک اور بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ سینئرز میں کوئی لنڈا نامی لڑکی تھی۔ وہ جب تک رہی بہانے بنا بنا کر تم سے ٹکراتی رہی اور یہ ٹکریں اتنی مشہور ہو گئیں کہ اسے "لنڈا دی بل" اور تمہیں "عالیان دی فائٹر" کہا جانے لگا۔ اسے دیکھتے ہی تم ادھر ادھر ہو جایا کرتے تھے۔ پھر بھی وہ تمہیں ڈھونڈ لیتی تھی۔ ویسے اچھا ہوا وہ لڑکی چلی گئی۔ میں اسے ایسی بچکانہ حرکتیں کرتے ہوئے دیکھتی تو یقیناً "اسے سمجھا دیتی کہ "دی بل" آخر کہتے کسے ہیں۔

اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جو تمہارا دوست نہیں بھی ہوتا وہ بھی یہ چاہتا ہے کہ تم اس کی پارٹی میں ضرور آؤ' اور یہ بھی کہ ایک ڈری سہمی معصوم دل لڑکی نے اس وقت تمہیں دیکھتے ہی تھپڑ مار دیا تھا جب تم نے کارل سے کوئی گیم ہارنے پر اپنے سر کے بال صاف کروا لئے تھے۔ "اپنا سر کٹوا لیتے بال کیوں کٹوائے۔" اس نے تم سے یہ کہا تھا۔ ویسے وہ کچھ زیادہ ہی کہہ گئی اسے کہنا چاہئے تھا۔ "کارل کا سر کٹوا دیتے۔ اپنے بال کیوں کٹوائے۔"

اور مجھے تم سے ایک شکایت بھی ہے۔ چند دن پہلے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ پچھلے سال ہالوین پر تم اور کارل کسی اونچی عمارت پر چڑھ کر ہالوین کدو آنے جانے والوں پر لڑھکا رہے تھے۔ مجھے تم سے یہ شکوہ ہے کہ تم نے کارل کو اوپر سے نیچے کیوں نہیں لڑھکایا... اگر تم یہ کر دیتے تو کتنا ثواب کماتے... ویسے عالیان ایک اور راز کی بات بتاؤں... اگر میں عالیان ہوتی تو فوراً" امرحہ سے دوستی کر لیتی... اسے ٹوئیٹ میں چاکلیٹ کا ڈبہ دیتی... اور پھر یہ ٹوئیٹ واپس بھی نہ لیتی اور ہر روز ٹوئیٹ دیتی رہتی اور لیتا بھول جاتی۔" اس کے بولنے کا انداز قابل دید تھا۔ "اگر میں عالیان ہوتی۔

"میں باتوں میں بھٹک چکی ہوں' لیکن ایک اور بات سن لو' میں زندگی میں بہت بار فیل ہوئی ہوں۔ الیف

ایس ای میں ٹاپ نہیں کر سکی۔ بی اے میں اے پلس نہیں لے سکی۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ میں زندگی میں بڑی بے چاری' بے چاری سی رہی ہوں۔۔۔ اب میں چاہتی ہوں کہ تم مشق میں میرا ساتھ دو' تاکہ اگر میں ہاروں بھی تو ذرا قابل فخر انداز سے۔۔۔ لیکن شاید تم مجھے جتوا ہی دو۔۔۔ ہے ناں"

"بیسٹ آف لک!" دو قدم اس سے آگے چلتے عالیان نے مڑے بغیر کہا' اور چاکلیٹ نکال کر کھاتے لائبریری کے اندر چلا گیا۔

امرحہ واپس پلٹ آئی۔ وہ یہ محسوس نہیں کر سکی تھی کہ آگے آگے چلتے عالیان نے اپنی رفتار آہستہ کرلی تھی۔۔۔ ریک سے کتابیں نکالتا عالیان بھی لاعلم تھا۔ اس نے لائبریری آنے میں اتنا وقت کیوں لیا تھا۔

ویرا کے ساتھ جی جان لگا کر مشق کرتے وہ ایک بار بھی ویرا کو ہرا نہیں سکی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ کارل کو تو کسی صورت نہیں ہرا پائے گی۔ لیکن ظاہر ہے مقابلہ اہم ہے ناکہ صرف جیت۔

"گراؤنڈ میں ان دونوں کو جاننے والے کافی اسٹوڈنٹس موجود تھے۔ سب کی خواہش تھی کہ کارل ہار جائے' جبکہ سب جانتے تھے کہ یہ ناممکن ہے۔۔۔ ویرا اس کی کوچ اس کے کان میں گھسی ہوئی تھی۔

"بھول جاؤ کہ یہاں کوئی کارل یا کوئی اور موجود ہے۔ پوری قوت لگا کر سائیکل دوڑانا۔۔۔ پوری قوت لگا کر۔۔۔ بس آج تمہیں یہی کرنا ہے۔"

امرحہ نے دعا کی' بلکہ منت شنت کی کہ کتنا مزا آئے۔ اگر وہ واقعی میں جیت جائے' اگر کارل پر سائیکل چلانے کے دوران فالج کا حملہ ہو جائے تو کیسا رہے؟ یا اس کی نظر دھندلا جائے۔۔۔ بلکہ اگر وہ نابینا ہی ہو جائے۔

"اگر تم نے مجھے ہرا دیا تو تم جو کہو گی میں وہ کروں گا مینڈکی۔۔۔" کارل نے سائیکل اس کے برابر میں لا کر کہا۔

"اگر میں جیت گئی تو پتا نہیں کیا کر گزروں گی۔۔۔ آہ۔۔۔" اس نے دل میں سوچا۔

کھلونا گن سے فائر کیا گیا اور ریس شروع ہو گئی۔ ساری دنیا غائب ہو گئی۔ ایک ٹریک رہ گیا اور اس پر دوڑتی امرحہ خاتون پاکستان کی سائیکل۔۔۔

اور کارل۔۔۔ وہ مزے سے پیڈل چلا رہا تھا۔ امرحہ بہت دور آگے جا چکی تھی۔ کارل کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ سہانے موسم کا لطف لیتا۔ سیٹی بجاتا بہت آہستہ سائیکل چلا رہا تھا۔ پھر امرحہ جب بہت آگے جا چکی تو اس نے ایک دم سے رفتار پکڑی اور بجلی کی سی تیزی سے امرحہ کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گیا اور پھر رفتار آہستہ کرلی امرحہ پوری جان مارتی کارل کے پیچھے سے ذرا سی آگے نکلی اور ذرا سی دور ہوئی کہ کارل نے پھر رفتار پکڑی۔ پلک جھپکتے میں امرحہ سے آگے ہوا اور پھر رفتار آہستہ کرلی اور سیٹی بجاتے سائیکل کو واک کروانے لگا۔ وہ اسے عام انداز سے نہیں' شان دار انداز سے ہرانا چاہتا تھا۔

امرحہ اسے دیکھ رہی تھی' نہ ہی اسے اس وقت معلوم تھا کہ کارل یہ سب کر رہا ہے۔ یہ سب اسے بعد میں بتایا گیا۔ وہ صرف ونگ لائن کو دیکھ رہی تھی۔

اور پھر جب دور سے ونگ لائن نظر آئی تو ویرا کے کہنے کے مطابق اس نے اپنی قوت کو سو سے ضرب دی جو کہ دی نہ گئی۔ لیکن جتنی بھی حاصل قوت ملی۔ اس نے سائیکل پر لگا دی۔

کارل اس سے پیچھے سیٹی بجا رہا تھا۔ اس نے اب ایک دم پیڈل مارے۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ جو خرگوش اور کچھوے والی کہانی میں خرگوش کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہی کارل کے ساتھ ہوا' وہ تیزی سے امرحہ کے عین ساتھ آیا ہی تھا کہ وہ سائیکل سے گر گیا۔ بعد ازاں اس کا بیان تھا کہ ایک پتھر اس کی کنپٹی سے آ کر لگا تھا۔ اس کا سر گھوم گیا تھا۔ کسی نے اس ڈرامے باز کارل کی بات کا یقین نہیں کیا۔ سب کا ماننا تھا کہ اپنی بری حکمت عملی سے جب اسے اپنی ہار صاف دکھائی دینے لگی تو اس نے خود کو گرا لیا۔

لیکن امرحہ۔۔۔ وہ ونگ لائن کے اس طرف تھی۔

"میں سو بار پہاڑ پر چڑھا اور گر گیا اور جب میں نے پھر چڑھائی شروع کی تو پہاڑ کو اپنے سامنے جھکا ہوا پایا۔"

"میدان سُنتر کے پرندے میدان عمل میں گرا نہیں کرتے۔"

اور۔۔۔

"مقابلہ دیکھنے والے کبھی یہ نہیں جان سکتے کہ جیت جانے والے کس آسمان کا سفر کر کے زمین پر پلٹتے ہیں۔"

امرحہ نے جیت کر اسٹوڈنٹس میں اس شخص کو ڈھونڈ کر دیکھنا چاہا جس کے قول پر اس نے اس ریس میں حصہ لیا تھا اور جیت بھی گئی تھی۔ اس شخص کی باتیں اسے دعا کی طرح لگتی تھیں۔ وہ خود بھی ایک دعا ہی تھا۔

☆ ☆ ☆
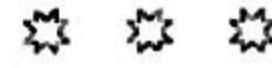
"وہ فائر تم نے کیا تھا؟" کارل کو صرف عالیان پر شک تھا۔

"مجھے کیا ضرورت تھی۔"

"تم مجھے ہرانا چاہتے تھے۔"

"میں کون سا خود تمہارے مقابلے پر تھا۔"

"تم نے تو کہا تھا تمہیں ایسی بچکانہ ریس دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں، پھر تم آئے کیوں؟"

"تمہاری سپورٹ کے لئے۔"

"سپورٹ کے لیے تم آئے تھے، پر میری نہیں۔۔۔ میری ساتویں حس کہہ رہی ہے کہ وہ تم ہی تھے۔"

"میری پہلی حس میری زبان یہ کہنا چاہتی ہے کہ بکواس نہ کرو۔"

"اگر وہ تم نکلے تو وہ تمہارا اس زمین پر آخری دن ہوگا۔"

"اگر وہ میں نہ نکلا تو وہ تمہاری ساتویں حس پر لعنت ملامت کا دن ہوگا۔ شاید کسی نے یہ سوچ کر ایسا کیا کہ اگر وہ ہار جاتی تو آئندہ کبھی مقابلہ نہ کر سکتی۔"

"بھاڑ میں جائے اس کی مقابلے کی حس، میرا ریکارڈ خراب کر دیا۔"

کارل کو چڑانے کے لئے عالیان منہ کھول کر ہنسنے لگا۔ سب ہی ہال میٹس باقاعدہ ہنس چکے تھے کہ وہ ایک لڑکی سے ہار گیا۔ وہ بھی امرحہ سے، انہوں نے میوزک بار کی دیوار پر چاک سے کارل کا کارٹون بنایا تھا جو موٹے موٹے آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

"میں تمہارے دانت توڑ دوں گا عالیان۔۔۔"

"کس کس کے توڑو گے؟" عالیان نے دوسرے ہال میٹس کی طرف اشارہ کیا جو کھی کھی کر رہے تھے۔

"شروعات تم سے کرتا ہوں۔" اس نے گلاس اٹھا کر اسے دے مارا جو عالیان نے کیچ کر لیا۔

"گلاس پھینکا جائے یا کیچ کیا جائے۔ ٹوٹنے کی صورت میں پیسے تم دونوں سے لوں گا۔" کاؤنٹر بوائے چلایا۔۔۔ کارل نے ایک گلاس اسے بھی دے مارا جو وہ کیچ نہ کر سکا اور ٹوٹ گیا۔

"اب تم بھی بھرنا پیسے۔" کارل چلایا اور تیسرا گلاس بھی اٹھا لیا۔

جس کے لئے ایسے لڑا جا رہا تھا۔ وہ اگلے دن یونی محراب کے پاس اداس سی کھڑی تھی، جہاں بچھڑے اور بکھرے دوستوں کا ایک ٹولہ موجود تھا۔ "دوست۔۔۔"

اگر تیز اور طاقت ور بگولہ آدھی دنیا کو اٹھائے اپنے ساتھ گول گول گھما رہا ہو تو اس بگولے کے ساتھ گول گول گھومتے بھی جو شخص آپ کی فکر میں گھل رہا ہوگا وہ آپ کا دوست ہوگا۔

وہ چار تھے اور دنیا کے مختلف ملکوں میں رہتے تھے اور ہر سال ایک مخصوص دن وہاں ضرور موجود ہوتے تھے۔ وہ اٹھارہ سال پہلے یونی سے پڑھ کر نکلے تھے اور اٹھارہ سالوں سے ہر سال اس ایک دن وہاں آ رہے تھے۔ محراب کے پاس اٹھارہ سال پہلے کھینچی گئی تصویر سی تصویر کھنچوانے۔۔۔ اسٹوڈنٹس ان کے گرد گھیرا بنائے کھڑے ان سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اپنے پانچویں دوست کا انتظار کر رہے تھے۔

"یہ عالیان ہے۔۔۔" جو ان میں سب سے زیادہ خوب صورت تھا۔ اسے امرحہ نے عالیان کا خطاب دیا۔

"یہ لمبی لڑکی ویرا۔۔۔ اور وہ نرم خو' پیاری سی گلابی گلابی لڑکی امرحہ اور وہ۔۔۔"

"وہ سائی۔۔۔" وہ کارل کا نام لینا نہیں چاہتی تھی۔

وہ چاروں بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔ انہیں پانچویں دوست کا انتظار بہت شدت سے تھا۔

"تو وہ آگیا۔۔۔" ویرا چلائی۔

"اتنی دیر۔۔۔" عالیان نے آنے والے کو سر کے بالوں سے پکڑا۔

"فلائٹ میں سیٹ نہیں مل رہی تھی۔ بہت مشکل سے ایک بڈھے کو یقین دلانے میں کامیاب ہو سکا کہ آج ہوا کا دباؤ اتنا زیادہ ہے کہ پچاس سال سے اوپر والوں کو جہاز میں ہارٹ اٹیک کا جان لیوا خطرہ ہے۔ انتظامیہ یہ بات چھپا رہی ہے۔ لیکن جان کا رسک لینا بے وقوفی ہوگی۔"

"کارل!" امرحہ نے منہ بنایا۔ وہ ریس جیت گئی تھی اور اس نے کارل سے کہا تھا۔ "تمہارے سر اور بھنوؤں پر پورے ایک سال تک ایک بھی بال نہیں رہنا چاہئے۔" اور کارل نے یونی میں موجود دوسرے کارل کو سر اور بھنوؤں کو صاف کر لینے پر راضی کر لیا اور اس کے سامنے لا کھڑا کیا۔

"کارل نے یہ کر دکھایا۔" اس نے دوسرے کارل کی طرف اشارہ کیا اور دانت دکھا کر چلا گیا۔

"ان پرانے دوستوں کا ٹولہ تصویر بنوانے لگا۔ اسٹوڈنٹس جن کے ہاتھوں میں ان کی پرانی تصویریں تھیں انہیں ہدایات دینے لگے۔ مسٹر مارٹن آپ کا ہاتھ مس کیرولین کے کندھے کے اوپر ہوگا۔۔۔ ہاں ذرا سا اوپر۔۔۔ بس۔۔۔ اور مسٹر بلاٹر آپ کی گھڑی کلائی پر مضبوطی سے بندھی ہے۔ ڈھیلی نہیں ہے' مس لینا آپ اپنی چھنگلی کو ذرا سا کھولیں۔"

ان کی سالانہ تصویر بن گئی تو اسٹوڈنٹس ان کے ساتھ تصویریں بنوانے لگے۔ امرحہ پر رقت سی طاری ہونے لگی۔

"وہ یہاں سے چلی جائے گی تو سالانہ تصویر کے لئے بھی نہیں آسکے گی۔ وقت گزر جائے گا۔ وہ بوڑھی ہو جائے گی۔ ویرا روس میں بزنس کر رہی ہوگی' کارل مر چکا ہوگا۔ سائی دنیا کے مفلوک الحال خطوں میں ٹرسٹ چلا رہا ہوگا اور عالیان؟"

وہ سوچوں میں ہی خاموش سی ہو گئی۔

ایک جگہ اکٹھے رہنے والے آئندہ آنے والے وقت میں اکٹھے نہیں ہوں گے۔ یہ تصور بہت بھاری گزرتا ہے دل پر' اس کا دل بھر آیا کہ وہ رونے لگی۔

"کتنا مشکل ہوتا ہے ایک ہو کر دو ہو جانا' چار' چھ' آٹھ ہو جانا۔"

کارل نے اسے ٹشو دیا۔ وہ بھی پرانے اسٹوڈنٹس کے ساتھ تصویریں بنوا رہا تھا۔ امرحہ نے ٹشو لے لیا تو وہ حیران ہوا۔

"تم اپنے گھر والوں کو یاد کر کے رو رہی ہو؟"

"نہیں۔۔۔ تم سب کو۔۔۔"

"ہم سب کو؟"

"ہاں۔۔۔ ایک دن سب ختم ہو جائے گا۔۔۔ سب۔۔۔ میں پاکستان چلی جاؤں گی' ویرا روس' سائی افریقہ' این جاپان اور تم۔۔۔ تم مر چکے ہو گے۔"

کارل کو اس سب میں صرف اپنے اکیلے کے مرنے پر افسوس ہوا۔ "اور عالیان؟"

"وہ دنیا کے کسی گم نام خطے میں بزنس کر رہا ہوگا۔"

"وہ بزنس کر رہا ہوگا اور میں مر چکا ہوں گا۔ تم کبھی ایک اچھا انسان ہونے کا ثبوت نہیں دے سکتیں امرحہ۔" اس کے ہاتھ سے ٹشو چھین کر وہ چلا گیا اور پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اس قدر اداس تھی کہ اسے دیکھ کر اسے بھی اداسی ہونے لگی۔

وہ عالیان کے پاس جانے لگی' ٹھیک ہے۔ وہ بولتا نہیں۔ لیکن سنتا تو ہے نا۔۔۔ اتنا بھی کافی ہے۔۔۔ سن لینا بھی نعمت ہے۔

گھاس پر بیٹھی ویرا جو گٹار بجا رہی تھی سے ہوتی، اس کی نظر عالیان پر گئی اور سارے الفاظ اپنے اپنے پنجوں میں پھر سے مقید ہو گئے۔

ویرا کوئی روسی گانا ہی گا رہی ہو گی، لیکن دنیا میں کوئی گانا کتنا بھی اچھا ہو وہ اتنا اچھا تو نہیں ہو سکتا تا کہ ویرا عالیان کے سامنے گائے اور عالیان اتنی توجہ سے اسے سنے۔

آس پاس بیٹھے دوسرے اسٹوڈنٹس بھی اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے اس کا گٹار اور گانا سن رہے تھے۔ دھوپ اس کی پشت پر پھیلے سنہری بالوں سے چھن کر اس کے گالوں پر پڑ کر انہیں سرخ کر رہی تھی۔ اس کی لمبی گردن دائیں بائیں ہل رہی تھی اور سر ایسے جھوم رہا تھا جیسے روسی گیت فراک کا کونا ہاتھ میں پکڑے پیروں کے بل محو رقص ہو۔

ویرا کی آواز اچھی تھی اور انداز بھی وہ اسے بھی کئی گانے سنا چکی تھی۔ لیکن اسے عالیان کو گانا نہیں سنانا چاہیے۔

"کارل میسرین چکا ہو۔۔۔ عالیان بزنس کر رہا ہو گا اور روس کے برفانی طوفان میں گھر کر ویرا مر چکی ہو گی۔"

اس نے کھڑے کھڑے اپنے خیال میں رد و بدل کی یہ اس نے خود کو تسلی دی تھی۔ لیکن قدرے بھونڈے انداز سے۔۔۔۔

کارل، عالیان اور ان کے ہال میٹس اینڈی اور نیل رات گئے لڑکیوں کے ہال کے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر ایک ایک بورڈ پکڑ رہا تھا۔ جن پر اندھیرے میں دکھائی دینے والی روشنائی سے " Will You Marry Me " (کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟) لکھا تھا۔

وقفے وقفے سے کارل تیسری منزل کی ایک کھڑکی پر سرچ لائٹ کی تیز روشنی ڈال رہا تھا۔ لیکن کھڑکی کھل رہی تھی، نہ کوئی اور ہلچل دکھائی دی رہی تھی۔

"وہ تمہیں پسند نہیں کرتی۔" کارل نے بیان جاری کیا۔

"نہیں ایسا نہیں ہے۔۔۔ میں جانتا ہوں اسے اس انداز میں ایک پرپوزل چاہیے تھا۔ وہ اسی قسم کی فلمی سی لڑکی ہے۔"

"اگر وہ فلمی لڑکی ہے تو تمہیں اسے ایفل ٹاور کی بلندی پر کھڑا کر کے طیارے میں گول گول گھومتے ہوئے پرپوز کرنا چاہیے تھا۔ جیسے ٹام کروز نے کیٹی کو کیا تھا۔ تم نے تو کافی بھونڈا فلمی انداز اپنایا ہے۔"

"میں یہی بھونڈا انداز افورڈ کر سکتا تھا۔ میں خود ٹام کروز ہوں نہ میرا باپ جارج کلونی۔"

"کیا تم نے اس سے کہا تھا کہ تم آج رات آؤ گے۔" عالیان نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ یہ تو سرپرائز ہے۔"

"وہ گہری نیند سو رہی ہو گی اور جب اسے خواب آئے گا کہ کھڑکی کے نیچے تم کھڑے ہو تو وہ کھڑکی پر آ کر تمہیں کوئی جواب دے گی۔" کارل ہنسا گیا۔

"ہرگز نہیں، اس نے کہا نہیں، لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ہر رات میرا انتظار کرتی ہے۔"

"پروفیسرز کے لیکچرز تمہاری سمجھ میں آئے نہیں اور اس نے کچھ کہا بھی نہیں اور تم سمجھ گئے۔ میں تمہیں یاد دلا دوں کہ ہمارا صبح تک یہاں کھڑے رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

کارل سے لائٹ لے کر عالیان نے کھڑکی پر ماری۔

"اندھیرے میں پردے کے پیچھے کوئی مجھے کھڑا نظر آیا ہے۔" وہ جوش سے بولا۔

اینڈی نے سرچ لائٹ کھڑکی پر ماری تو وہاں اندھیرا تھا اور کوئی وہاں نہیں کھڑا تھا۔ آخر جب وہ کھڑے کھڑے تھک چکے اور کارل نے آنسو صاف کرنے کے لئے اینڈی کے آگے ٹشو کیا اور بورڈ نیچے کر کے وہ اپنی سائیکلوں پر بیٹھ کر جانے لگے تو ایک دم تیزی سے ہال کی کئی کھڑکیاں کھلیں اور ان چاروں پر کئی سرچ لائٹس پڑیں کہ سڑک روشن ہو گئی اور چلا کر ان سب نے کہا۔

"یس....!" لڑکیوں کی آواز میں شرارت حد سے زیادہ نمایاں تھی۔

"یس...." کی تان اتنی لمبی تھی کہ ان چاروں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔

"تم اتنی ساری لڑکیوں سے شادی کرو گے؟" کارل نے دانت نکالے۔

"اگر سارہ نے اجازت دی تو...." اینڈی کے بھی دانت نکل آئے۔

پھر ان اتنی ساری کھڑکیوں میں "یس" کے بورڈ نظر آنے لگے۔ فلمی انداز سے پرپوز کرنے پر فلمی انداز سے ہی جواب دیا گیا تھا۔

"میں سارا مانچسٹر اکٹھا کرلاؤں گا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر جب تم سارے مانچسٹر کو کھڑا دیکھو گی تو تمہیں "ہاں" کا بورڈ اٹھا کر سب کو دکھانا ہی پڑے گا۔"

ان سارے بورڈوں پر عالیان کو اپنے الفاظ لکھے نظر آئے۔ اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے اینڈی کے مسکراتے چہرے سے نظر پھیر لیں۔

ان کا اگلا پڑاؤ ایک پرائیویٹ ہال کی طرف تھا۔ خوشی سے اینڈی سے سائیکل ہی نہیں چلائی جارہی تھی۔ وہ دو' تین بار خوشی سے سائیکل گرا چکا تھا۔ وہ سب آگے نکل جاتے اور وہ پیچھے گرا پڑا ہوتا اور اٹھنے کی جلدی بھی نہ کرتا۔

پرائیویٹ ہال کے سامنے تناور درخت کے ساتھ انہوں نے کئی سو پرچیاں چپکائیں۔ یہ وہ پیغامات تھے جو نیل کی طرف سے ایجھل کے لیے درخت پر ثبت کیے جارہے تھے۔ جب وہ سب پرچیاں.... چپکا چکے تو انہوں نے ایک بڑا بورڈ درخت میں ٹھونک دیا جس پر "میسج ٹری فار ایجھل" بڑے حروف میں لکھا تھا۔

ہال میں اپنے کمرے میں واپس آکر عالیان نے اپنے وارڈ روب میں سے ایک بڑا باکس نکالا اور اس میں موجود ننھے منے ہاتھ سے بنے کارڈز کو نکال کر جلا دیا۔ یہ کارڈز اس نے رنگ برنگے دھاگوں میں پرو کر شٹل کاک میں کھڑکی کے سامنے لگے درخت سے باندھنے تھے.... اور وہ گھنٹیاں جوان دھاگوں کے ساتھ ننھی کرنی تھیں۔ اسے اس نے کوڑادان میں پھینک دیا۔

"ان سب کے ساتھ یہ بہت پہلے ہوجانا چاہیے تھا۔" وہ رات بھر خود سے کہتا رہا۔

شٹل کاک کے باغ میں لگے تناور درخت کے سامنے کی کھڑکی میں رات کے اس وقت بیٹھی وہ رنگے برنگے کاغذوں پر مختلف رنگوں کے مارکرز سے پیغامات لکھ رہی تھی۔ وہ کئی گھنٹوں سے بیٹھی یہ کام کررہی تھی۔ یہ پیغامات اسے سیف روم کی دیواروں پر نہیں چپکانے تھے۔

ان پیغامات کو وہ عالیان کو دینے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کب وہ یہ نہیں جانتی تھی کیسے.... اس نے اس بارے میں بھی نہیں سوچا تھا ابھی وہ صرف ان پیغامات کو لکھنے کی جرات ہی کرسکی تھی۔ وہ پیغامات کو سجا بنا رہی تھی۔ جیسے اس کے شاہکار آخری مراحل میں ہوں۔

☆ ☆ ☆

دیر رات کا وقت ہے' سڑکیں سنسان سی ہیں۔ کہیں دور سے کسی کے کراہنے اور بے ہنگم طریقے سے گٹار بجانے کی آوازیں گڈمڈ ہو کر آرہی ہیں۔ ایسی آوازیں جن پر کان کھڑے ہوجائیں اور مسام پسینے سے بھیگ جائیں۔

ہفتے کی رات ہے' بڑی تعداد میں اسٹوڈنٹس اپنی اپنی جاب' بار' کلب سے واپس اپنے اپنے ہالز کی طرف آرہے ہیں۔ کچھ ہوش سے بے گانہ بھی ہیں۔ انہوں نے پی رکھی ہے۔ سنسان سڑک سے گزرتے ایسے مختلف ٹولوں کو رات کے مختلف اوقات میں ذرا دور ایک جوکر نظر آتا ہے۔ وہ اسے کسی فاسٹ فوڈ کمپنی کا ورکر سمجھے ہیں۔ جوکر کے ہاتھ پشت پر ہیں۔ پھر وہ ایک دم ان ہاتھوں کو سر سے اوپر اٹھاتا ہے اور ہاتھ میں پکڑے ہتھوڑے کو پوری قوت سے زمین پر گرے انسان کی کھوپڑی پر دے مارتا ہے۔

انسانی کھوپڑی پاش' پاش ہوجاتی ہے۔ خون فوارے کی صورت سڑک پر بکھرتا ہے۔ ذرا دور سے یہ

منظر دیکھ لینے والے اسٹوڈنٹس بمشکل اپنی چیخیں دباتے ہیں کہ جوکر ان کی طرف متوجہ نہ ہو جائے اور خود میں بھاگنے کی قوت بیدار کرتے وہ الٹے پیروں بھاگتے ہی ہیں کہ عین ان کے پیچھے سے دوسرا جوکر نمودار ہوتا ہے جس کے ہتھوڑے سے خون ٹپک رہا ہوتا ہے۔ آگے اور پیچھے والے دونوں جوکرز "خرخر" کی آوازیں نکالتے' ان کی کھوپڑیوں کا نشانہ لیتے بھاگنے والوں کی طرف لپکتے ہیں' جبکہ تیسرا جوکر قہقہے لگاتا' گٹار بجاتا ماحول کو مزید خوف ناک بننے میں معاون ثابت ہوتا چہل قدمی کرنے لگتا ہے۔

سڑک اسٹوڈنٹس کی چیخوں سے گونج اٹھتی ہے۔ خاص کرتب تو مزا ہی آجاتا ہے جب ان ٹولوں میں بڑی تعداد لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ پورا مانچسٹر ہل جاتا ہے.... آگے آگے وہ پیچھے پیچھے۔ "ہتھوڑا مار جوکرز...."

پرانک سیزن آن ہے۔ سینئرز فارم میں آچکے ہیں۔ "دی کلون کلر" سے عملی مذاق کی ابتدا کر دی گئی ہے۔ انہیں آفیشلی بھی نہ روکا جائے۔

عالیان.... کارل.... سائی اور شاہ ویز نے اس ڈرامے کی پہلی قسط سڑک پر چھپ کر دیکھی اور ہنس ہنس کر ان کے پیٹ میں درد ہو گیا تھا۔ انہیں اس پرانک کی خبر پہلے سے ہی مل چکی تھی۔ کارل نے تو یہ تک سوچا تھا کہ ایک جوکر وہ بھی بن جائے' لیکن عالیان نے اسے روک دیا۔ "ہم اپنے وقت پر کریں گے۔"

یونی لائبریری جانے والے راستے میں ایک مصروف جگہ ایک مجسمہ کھڑا دیکھا گیا' جس کے ایک ہاتھ میں کتاب تھی اور دوسرا ہاتھ ٹھوڑی پر تھا۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ جو کوئی اس مجسمے کے قریب سے گزرتا اور سر پر کتاب پڑنے کی صورت میں پیچھے پلٹ کر دیکھتا تو وہ تین ہارٹ اٹیک اس کے جسم کے آرپار ہو جاتے' کیونکہ ان کی پشت پر کھڑا وہی مجسمہ انہیں کتاب مار رہا ہوتا اور مسکرا کر ہائے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا ہوتا۔

دھوکے کے لیے وہاں اتنے دن اصلی مجسمہ رکھا گیا تھا۔ اس دن مجسمے کی جگہ سینئرز اسٹوڈنٹس میں سے ایک نے مجسمے کا بہروپ بدل کر مجسمے کے انداز میں خود کو وہاں کھڑا کر لیا۔ کبھی وہ گزرنے والوں کے آگے ہاتھ کر کے ہائے کہتا کبھی ٹھوڑی پر سے ہاتھ اٹھا کر بال ٹھیک کرنے لگتا اور کبھی ہاتھ سے اپنی جمائی روکتا اور کبھی گزرنے والے کو "ہاؤ" کہہ کر ڈرا دیتا۔

کئی کمزور دل لڑکیاں پوری جان سے چلاتی ہوئی پائی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک امرحہ بھی تھی۔ وہ بس بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔'

جتنے زیادہ مذاق یونی میں کیے جارہے تھے۔ اس سے زیادہ ہالز میں کیے جارہے تھے۔ ایک مذاق کی بازگشت یونی تک آئی کہ عالیان اپنے کمرے کو لاک کرنا بھول گیا تھا۔ یہ وہ فاش غلطی ہوتی ہے جو پورے تعلیمی دورانیے کے دوران کسی بھی اسٹوڈنٹ کو مر کر بھی نہیں کرنی چاہیے۔ جب تک اسے احساس ہوا کہ وہ کمرہ کھلا چھوڑ آیا ہے۔ تھوڑی دیر ہو چکی تھی۔ اس کا سارا سامان' اس کا بیڈ' میز' کرسی' کپڑے' جوتے' شیمپوز تک ہال کے لان میں رکھے تھے اور ان پر پرائز ٹیگ لگ چکے تھے۔ اس کے دو جوڑے جوتے' ایک شرٹ اور پرفیوم تو بک بھی چکے تھے۔ اس دن بہت سے اسٹوڈنٹس کمرے لاک کرنا بھول گئے تھے۔ کیونکہ وہ رات کو ٹھیک سے سو نہیں پائے تھے اور اس لیے سو نہیں پائے تھے کہ رات گئے فائر الارم بجنے لگا۔

سب ہڑبڑا کر اٹھے اور کمروں سے باہر بھاگے' اسی دوران بجلی بند ہو گئی۔ گرتے پڑتے جب وہ سب باہر نکلے تو کوریڈور میں بکھرے کئی سو غبارے جن میں پٹاخے بھرے گئے تھے۔ ان کے پیروں سے پھوٹنے لگے۔ پٹاخوں کی دھمک' اندھیرا اور ایک دوسرے کے دھکے.... ماحول مضحکہ خیز بھی تھا اور المناک بھی' ساتھ مزے دار بھی۔

ایک دوسرے پر گرتے وہ زخمی بھی ہو گئے۔ عالیان کی ناک پر چوٹ آئی اور اسے ناک پر بینڈیج لگاتے کافی

شرم سی آئی۔ یہی پرانک لڑکیوں کے ہال میں بھی ہوا تھا اور عینی شاہدین کا کہنا تھا کہ پٹاخوں اور لڑکیوں کی چیخوں نے ہال کی عمارت کو زمین سے چند فٹ اوپر اٹھانے کا ریکارڈ بھی بنایا تھا۔ ایسا ہونا ممکن ہے.... بالکل۔

لاتعداد پرانک کالز کی گئیں۔ ایک کال دادا کو بھی موصول ہوئی کہ امرحہ نے ایک عیسائی لڑکے سے رجسٹر میرج کرلی ہے۔ دادا کی صحت اچھی تھی۔ ورنہ انہیں ہسپتال جانے سے کوئی نہ روک پاتا۔ امرحہ کے لئے دادا کو یہ سمجھانا محال ہو گیا کہ یہ سینئرز لڑکیوں کی شرارت ہے اور کچھ نہیں۔ لیکن دادا یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ ویرا کے پاپا کو بتایا گیا کہ ویرا ماسک پہن کر چاقو کی نوک پر مانچسٹر والوں کو لوٹتے ہوئے کئی بار دیکھی گئی ہے اور لیڈی مہر کو کال گئی کہ عالیان نے ہال کی بلڈنگ سے کود کر خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے۔

انگلش ڈیپارٹمنٹ کے سینئرز نے ایک دن سو رنگ رچائے تھے۔ ایک مصری لڑکی امرحہ بنی تھی اور اس نے اتنا لمبا دوپٹا لیا تھا کہ سب اس دوپٹے سے الجھ کر گرنے کا ڈراما کرتے پائے گئے اور آرٹ ڈیپارٹمنٹ کے سینئرز نے یونی کے مشہور، ذہین اور کچھ زیادہ ہی مضحکہ خیز قسم کے اسٹوڈنٹس کی عجیب و غریب تصویریں ڈیپارٹمنٹ میں آویزاں کی تھی کہ ساری یونی اُمڈ آئی تھی۔ ان تصویروں کو دیکھنے کے لئے، ان میں کارل "ناگہانی بلا" نامی پوسٹر کی صورت سب سے زیادہ دیکھا گیا۔ وہ تو "ہارٹ بریکر" پوسٹر کو ہی دیکھتی رہی۔ تصویر میں عالیان کی آنکھیں بھینگی تھیں پر پھر بھی اسے اچھی لگ رہی تھیں۔ اس نے اس پوسٹر کی ایک کاپی حاصل کرلی اور اپنے پاس محفوظ کرلی۔

ان ہی دنوں یونی میں ٹوئیٹ بہت عام ہو گئی تھی۔ خاص کر سینئرز بہت فیاض ہو گئے تھے۔

"ٹوئیٹ امرحہ!" اس کے پاس سے گزرتی سارہ نے چاکلیٹ اس کے آگے کی جو امرحہ نے فوراً" لے لی اور کھول کر ایک بڑی بائیٹ لی.... آخ تھو.... اس کا منہ صابن، سرخ سیاہی اور نجانے کس کس چیز سے بھر گیا۔ اس کے ہونٹ.... زبان، دانت اور ٹھوڑی کا کچھ حصہ سرخ ہو چکے تھے۔ اس نے عالیان کو دیکھا تو اس کا بھی یہی حال تھا۔ وہ اتنا ہنسی، اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

"دو بھوکے...." اس نے اس کے پاس جاکر اشارے سے اپنی اور اس کی طرف اشارہ کیا اور بچی ہوئی صابن ٹوئیٹ اس کے آگے کی جو اوپر نیچے سے چاکلیٹ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "ٹوئیٹ.... میری طرف سے.... اسے بھی کھالو...." ہنسی کے دوران وہ بمشکل بولی۔

"تم مانو یا نہ مانو عالیان ہم دونوں ایک جیسے ہیں.... اور تم یہ بھی مان لو کہ دنیا میں کوئی تم سا ہے اور نہ ہی مجھ سا...." وہ چابی کی گڑیا کی طرح سر مٹکا کر کہہ گئی۔

☼ ☼ ☼

جوجو سے درخواست کر کے اس نے عالیان کا ایک اسکیچ بنوالیا تھا اور اب وہ یہ اسکیچ عالیان کو دینے جارہی تھی، یہ کہہ کر یہ اس نے کئی ہفتوں کی محنت کے بعد اس کے لئے بنایا ہے۔ جبکہ وہ تو سیب ایسے بناتی تھی کہ پتا نہیں چلتا تھا کہ یہ سرپراگی دم والی کرکٹ کی گیند ہے یا ٹینس کا.... یا گیند کی شکل کی کوئی دوسری چیز.... بس وہ کچھ بھی ہو تا سیب نہ ہوتا۔

آخری کلاس لے کر وہ باہر نکلا ہی تھا۔ اس نے اسکیچ ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ یونی میں آس پاس معمول سے زیادہ ہی اسٹوڈنٹس ٹہل رہے تھے۔ فارغ فارغ سے، پھیلے ہوئے سے، جیسے یونی کے اندر کوئی نہ ہو سب باہر ہی ہوں۔ وہ عالیان سے ذرا سی دور ہی تھی کہ آس پاس پھیلے ہوئے چلتے اسٹوڈنٹس نے منہ سے یک آواز رولو ٹک طرز کا ساؤنڈ نکالا.... ساؤنڈ اونچا بھی تھا اور سر میں بھی جیسے اسپیکرز سے نکل رہا ہو۔

"زیرو… ون ٹو… زیرو ون ٹو…"

امرحہ اور امرحہ جیسے دوسرے چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ بہت تیز اور مرتب آواز تھی۔

"زیرو ون ٹو… اسٹارٹ ساؤنڈ۔ ایکشن آن۔"

فوجوں کی طرح پیر زمین پر مارے گئے اور جو جہاں کھڑا تھا وہ وہیں کھڑا ہو گیا۔ جامد… فریز… کئی سو اسٹوڈنٹس… کئی سو مختلف انداز میں…

امرحہ اور عالیان جیسے دوسرے اسٹوڈنٹس سر اٹھا اٹھا کر ارد گرد دیکھنے لگے۔ دور، دور تک یہی منظر تھا۔ جو اسٹل تھے۔ ان کے درمیان جو اسٹل نہیں تھے۔ وہ اڑسے، پھنسے کھڑے تھے۔ کلاسز لے کر نکلتے دوسرے… اسٹوڈنٹس اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھنے لگے… دور، دور تک یہ ساکن انسانی مجسمے کھڑے تھے۔

امرحہ دو لڑکیوں اور ایک لڑکے کے درمیان پھنسی کھڑی تھی۔ عالیان پانچ لڑکوں میں گھرا کھڑا تھا۔ سمجھنے میں وقت نہ لگا، بڑے پیمانے پر کچھ ہونے جا رہا ہے۔ کچھ وقت ایسے ہی گزر گیا، جب یونی کے اندر سے اپنی آخری کلاسز لے کر دوسرے اسٹوڈنٹس بھی نکل آئے تو روبوٹک آواز پھر گونجی۔

"کیپ کام… اسٹے اسٹل… ایکشن آن۔"

کوئی گھوم گیا، کسی نے سر گھما لیا، کسی نے پیر، کسی نے ہاتھ اور کوئی جھک گیا اور وہ نئی روبوٹک شکل میں ڈھل گئے۔ جیسے روبوٹس رک رک کر بھاگ رہے ہوں… اور پھر اگلے ایکشن پر انہوں نے ایک ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لئے اور چوکور خانوں کی شکل اختیار کر گئے اور ان چوکور خانوں میں جونیئرز آ گئے۔ عالیان اور امرحہ آمنے سامنے کے خانوں میں تھے۔

"ہائے عالیان میں یہاں ہوں۔" امرحہ نے خوشی سے اسے آواز دی۔

غیر ارادی طور پر عالیان نے فوراً گردن موڑ کر دیکھا، وہ اپنے موبائل سے ویڈیو بنا رہا تھا۔

"میں تمہارے لئے کچھ لائی ہوں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے اسکیچ کو لہرا کر کہا۔ عالیان نے واپس ایسے گردن موڑی جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں۔

ایکشن آن کی ایک اور زوردار گونج اور پیروں کی دھمک چوکور خانے تکون کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ دور، دور تک ایک دوسرے سے جڑا تکونی جال بنا نظر آنے لگا۔ کئی سو اسٹوڈنٹس اب کئی ہزار ہو چکے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اس میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔ یونی کے کونے کھدروں سے نکل کر، انہوں نے یقیناً اس کی مشق کی تھی۔

کارل دور سے بھاگتا ہوا آیا اور ایک تکونی ڈبے میں کود گیا۔ ایسا ہی دوسرے ان اسٹوڈنٹس نے کیا جو اس تکونی جال سے باہر کھڑے تھے۔ انہیں تو انتظار تھا اس لمحے کا…

"زیرو ون ٹو، ون ٹو، اسٹے فوکس۔"

اس بار وہ گھومے ہاتھ چھوڑے، پھر ہاتھ پکڑے… اب وہ دائروں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ لاتعداد دائروں کی… ایک ساتھ جڑے دائروں کی…

"اسٹے فوکس… کیپ کام… اٹس ٹریبوٹ ٹائم۔"

آوازیں اور… اور بلند ہو گئیں۔ ہاتھ چھوڑے، گھومے اور پھر پکڑ لئے… پہلے سے بڑے دائرے بن گئے تھے۔

عالیان، امرحہ ایک دائرے میں آ چکے تھے اور کارل سامنے والے میں۔

"اٹس ٹریبوٹ ٹائم۔" آوازیں پیروں کی دھمک کے ساتھ گونج رہی تھیں اور پھر انہوں نے ان کے گرد گول گول گھومنا شروع کر دیا۔ فوجی مارچ کرنے کے انداز میں… کئی پروفیسرز بھی آ چکے تھے اور ڈین کو بھی آنا پڑا۔ سینئرز کی آوازوں کے علاوہ ہر کوئی خاموش رہنا چاہتا تھا۔ وہ کئی ہزار تھے اور جس انداز سے وہ یہ سب کر رہے تھے وہ قابل تحسین تھا۔ ان کی ریہرسل کی اڑتی اڑتی خبریں ان تک پہنچی تھیں۔

- We are Champions

ان کے گرد گول گول مارچ کرتے انہوں نے اپنی آواز کو ایک ساتھ ملا کر گانا شروع کیا۔ انہوں نے کامیاب ریہرسل کی تھی۔ ان کی آواز کورس میں

تھی۔

وہ گا رہے ہیں۔۔۔ وہ جو یونی سے جا رہے ہیں۔

ٹو ون' زیرو.

ایکشن ری لوڈڈ۔۔۔ اسٹے اسٹل گول دائروں میں گھومتے وہ رک گئے۔ ان کا رک جانے کا عمل قابل داد تھا۔

"ایکشن ری لوڈڈ۔ ایکشن آن۔"

دائروں سے باہر نکلے کھڑے سینئرز نے دائروں کے درمیان میں آکر بڑے بڑے غبارے چھوڑے اور جیسے ہی وہ تھوڑے اوپر اٹھے انہیں فائر کر کے پھوڑ دیا گیا۔

وہ اور بلند آواز سے گانے لگے۔ ساتھ تالیاں بجانے لگے اور داستان کو نے اپنا پین اور ڈائری بیگ میں رکھ کر بیگ کراس کیا اور بھاگ کر دائرے بنانے والوں میں شمولیت اختیار کی اور آواز کے ساتھ آواز ملائی۔

غبارے، جو فضا میں پھوٹے تھے ان سے نکلی افشاں بکھرنے لگی۔ سنہری' سبز' سرخ' پیلی' ہر رنگ کی۔۔۔ ان کے بالوں اور سروں پر۔۔۔ ان کے ہاتھوں اور چہروں پر۔۔۔

امرحہ نے ہاتھ میں پکڑا اسکیچ کھول کر پھیلا لیا۔ افشاں اس پر گرنے لگی۔ اس نے اسے افشاں سے بھیگ جانے دیا' خود کو بھی۔

ہر چہرہ سج گیا' رنگ گیا۔۔۔ کاش تالیوں کی گونج' قدموں کی دھمک اور گانے کے بول کبھی ختم نہ ہوں۔ کاش فضا میں بکھری افشاں کبھی سمیٹی نہ جائے اور کاش کوئی جادوگر کمال کر دکھائے' وہ وقت کو ٹھہرا جائے۔

مانچسٹر یونیورسٹی کو یہ یاد رکھنا پڑے گا۔۔۔ جاتے ہوئے سینئرز نے اسے کیسا خراج پیش کیا تھا۔

رہ جانے والوں کی آنکھوں میں نمی آنے میں وقت نہ لگا۔ دائروں میں مقید اسٹوڈنٹس نے اسے اعزاز سمجھا۔ ان کے لئے جو گانا گایا انہیں وہ ترانہ لگا۔

اور امرحہ کو یہ ٹریبوٹ اس لئے بھی زیادہ اچھا لگا کہ اس نے ایک ہی دائرے میں خود کو اور عالیان کو کھڑے پایا۔۔۔ کاش ایسے دائرے روز بنیں۔۔۔ اور پھر کبھی نہ ٹوٹ سکیں۔

سینئرز نے ایک پارٹی کا اہتمام کیا تھا جو ایک اسٹوڈنٹ کے گھر کے لان میں ہو رہی تھی۔ امرحہ آچکی تھی۔ ویرا نے کہا تھا وہ دیر سے آئے گی۔ البتہ کارل وہاں پہلے سے موجود تھا۔ عالیان بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ پارٹی میں سب نارمل ہی تھا۔ بس تین چیزیں ذرا سی ابنارمل تھیں۔ "روئی سے بنی شرٹس۔" جنہیں تین اسٹوڈنٹس نے پہن رکھا تھا۔ مختلف نظر آنے کے لئے یا ایونٹ کو یادگار بنانے کے لئے روئی کی گول گول گیندوں کو سی کر شرٹ کی صورت دی گئی تھی۔ بقول ان کے اپنی طرز کا ایک مختلف پہناوا۔

"بھالو ہی لگ رہے ہیں۔" امرحہ اس طرف دیکھنے سے اجتناب کر رہی تھی کہ پھر اس کی ہنسی نہیں رکنی تھی۔ ایک لڑکی آئی اس کے پاس اسے اپنی لپ اسٹک پکڑائی۔

"اسے تھوڑی دیر کے لیے پکڑو میں ابھی آئی اپنا پاؤچ کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں۔"

امرحہ نے لپ اسٹک پکڑی اور جیسے ہی لڑکی گئی۔ اسے کھول کر دیکھا کہ اس کا شیڈ کیسا ہے' لیکن اس میں سے شیڈ کے بجائے آگ کا شعلہ نکلا۔ وہ ٹھیک اسی دوران اس سے ذرا دور شور اٹھا' اسے آگ کے شعلے نظر آئے ساتھ چلانے کی آوازیں۔ میزوں پر سجے مشروبات ان پر اچھالے گئے' ان پر جنہوں نے روئی سے بنی شرٹس پہن رکھی تھیں اور جن کی شرٹس میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ تینوں بری طرح سے اچھل رہے تھے' اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا تھا پارٹی میں۔

"آگ بجھا دی گئی لیکن یہ آگ ان کی شرٹس میں لگائی کس نے؟"

"اس نے۔" کارل نے امرحہ کی طرف اشارہ کیا۔

"ہر وقت مذاق کا وقت نہیں ہوتا کارل!" امرحہ نے بہت سخت انداز سے کہا۔ ماحول بہت سنجیدہ ہو چکا تھا ان تینوں کو فرسٹ ایڈ کے لیے اندر لے جایا گیا تھا۔ ساری پارٹی کا ماحول بدل چکا تھا اس پر کارل کا یہ مذاق۔

"یقیناً تم نے مذاق میں نہیں سنجیدگی سے یہ حرکت کی۔؟ امرحہ کی سنجیدگی دیکھ لی آپ نے" کارل نے سب سے پوچھا۔

"جھوٹ بول رہا ہے یہ۔ مجھے کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی۔" امرحہ نے دیکھا سینئرز کے موڈ ایک دم سے بدل گئے۔

"میں نے خود دیکھا ہے اسے آگ لگاتے' اس کے ہاتھ میں لائٹر بھی ہے۔" کارل مذاق کے موڈ میں قطعاً نہیں تھا۔

"یہ حرکت صرف تم کر سکتے ہو۔" امرحہ بھی مذاق نہیں کر رہی تھی۔

"لیکن اس بار تم نے کی۔ انتہائی فضول حرکت امرحہ۔ بہت فضول!"

"ایسے کام میں نہیں تم کرتے ہو' یہ لائٹر مجھے اس نے پکڑایا۔" کہہ کر اس نے لڑکی کی تلاش میں آس پاس نظر دوڑائی لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔

"کس نے؟" کارل پوچھ رہا تھا۔

"ایک لڑکی نے۔ اب وہ یہاں نہیں ہے۔"

"وہ یہیں ہے۔ وہ تم ہو۔"

"وہ تم ہو۔" امرحہ کو تیز آواز سے چلانا پڑا۔ "سب جانتے ہیں ایسے کام صرف تم کرتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں اسی لیے اس بار تم نے یہ حرکت کی' تاکہ سب مجھ پر الزام لگائیں' تم نے مجھے تنگ کرنے کے لیے انہیں جلانا چاہا۔ ایسی جان لیوا حرکتیں میں نے کبھی نہیں کیں۔"

"تو تم مجھ پر کبھی کیسے الزام لگا سکتے ہو۔ یہاں اور بھی تو لوگ ہیں۔" اس کی آواز اور تیز ہو گئی۔

"کیونکہ میں نے خود تمہیں دیکھا ہے اور میرا دعوا ہے کچھ اور لوگوں نے بھی تمہیں دیکھا ہو گا۔"

"جھوٹ' غلط' مجھے تو ہنسی بھی نہیں آرہی ایسے گھٹیا الزام پر۔"

"شرمندگی تو ہونی چاہیے نا امرحہ!" کارل اور سنجیدہ ہو گیا۔

"جس کسی اور نے مجھے آگ لگاتے دیکھا ہے وہ بتائے؟" امرحہ نے سب کے سنجیدہ چہروں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جو بھی ہوا اسے جانے دیں' لیکن امرحہ! تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" پارٹی ہوسٹ نے قدرے تاسف سے کہا۔

امرحہ اسے دیکھتی رہ گئی "تم میری بے عزتی کر رہے ہو تم کارل کی بات کا۔"

"بات کارل کی نہیں ان لوگوں کی جان کی ہے' مجھے اچھا نہیں لگا تم نے یہ کیا۔"

"جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ تم دونوں ملے ہوئے ہو۔"

"میرا خیال ہے ہمیں بات ختم کر دینی چاہیے۔ پارٹی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی' لیکن ایسی شرارتیں بڑے نقصان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں امرحہ۔" سینئر لڑکی سارہ نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

ان سب کی نظروں میں ملامت اور افسوس تھا۔ اس کا دل بھر آیا۔ ان سب سے اس کی کتنی اچھی ہائے ہیلو تھی پھر بھی وہ کارل کی بات کا یقین کر رہے تھے۔ ایک صرف لائٹر اس کے ہاتھ میں تھا اور ان کے پاس کیا ثبوت تھا۔ امرحہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اسے یہ خیال بھی آیا تھا کہ وہ سب مذاق کر رہے ہوں گے' لیکن ان کی شرٹس میں آگ لگی تھی ماحول گواہی دے رہا تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہے اور وہ اسی پر شک کر رہے ہیں۔

"میں نے آگ نہیں لگائی' میں پاگل ہوں جو ایسی حرکت کروں گی' شرٹس کے ساتھ انہیں بھی آگ لگ سکتی تھی' اتنی عقل ہے مجھ میں' آپ سب اس کارل کی بات کا یقین کر رہے ہیں' یہ تو دشمن ہے میرا۔ ہاں میں اسے ضرور آگ لگاتی اور پھر ان بھی لیتی اگر یہ جل

کر مر جاتا تو۔" اس کی آنکھیں چھلک جانے کے قریب تھیں۔

"میں نے بھی تمہیں آگ لگاتے دیکھا ہے امرحہ۔!" جیک نے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے کہا۔

امرحہ نے جیک کو بے یقینی سے دیکھا "کیا تم سب میرے ساتھ پرانک کر رہے ہو؟"

"پرانک تو تم نے کر دکھایا۔" جیک نے طنزاً کہا۔

اور جیک کے اس انداز پر اس کی آنکھیں چھلک پڑیں' آنسو بہہ نکلے۔ ایسے ماحول میں رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا اب۔

"میرا خیال ہے مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

وہ مڑ کر جانے لگی تو اسے اب یہ امید نہیں رہی تھی کہ کوئی اسے آواز دے کر روکے گا' لیکن جیک کی آواز آئی۔

"تم ایسے نہیں جا سکتیں امرحہ۔!"

"کیوں؟ تم پولیس بلوانا چاہتے ہو؟" اس نے تلخی سے مڑ کر کہا۔

"نہیں۔"

"تو پھر اور بے عزتی کرنی ہے میری؟"

"نہیں صرف اتنا بتانا ہے کہ تمہاری روتی صورت دیکھے بغیر ہم میں سے کوئی بھی یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ روئی کے بھالو بھی۔" جیک نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ تینوں بھالو نئی شرٹس میں بنے ٹھنے کھڑے دانت نکال رہے تھے۔

کارل نے آنکھ دبائی "انہیں میری مدد چاہیے تھی اور میں انہیں انکار نہیں کر سکا۔" امرحہ ان سب کو دیکھ رہی تھی۔

"آخر بڑھاپے میں ہمارے پاس کچھ تو اثاثہ ہونا چاہیے۔ ہمیں معاف کر دینا۔ اور ہمیں یقین ہے تم جانے والوں کو معاف کر دو گی۔"

وہ ضرور جانے والوں کو معاف کر دے گی۔ لیکن انہیں کبھی یہ نہیں بتا سکے گی کہ انہوں نے اسے اس کیفیت کا شکار کر دیا ہے۔ وہی پارٹی ہے' وہی اسٹوڈنٹس' وہی ماحول' وہی پرانک اور ان کا شکار وہی امرحہ۔ لیکن وہ کہاں ہے جو اس کی روتی صورت پر ہنس نہیں سکا تھا وہ جو عین اس کے سامنے آبیٹھا تھا۔

جس مرد کی آنکھوں کو اتنے قریب سے اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ تو کیا وہ ابتدا تھی۔ وہ اس کے رونے پر فدا ہوا تھا۔ وہ اسے روتا نہیں دیکھ سکا تھا۔ یہ سب اسے اب کیوں معلوم ہو رہا ہے اس نے پہلے کیوں نہیں سوچا کہ ابتدا کہاں سے ہوئی تھی۔

وقت ایک بہروپیا ہے' یہ ہمیں ڈھونڈ کر ایک نئے سوانگ میں ہمارے سامنے آکھڑا ہوتا ہے اس کا ہر سوانگ ہمیں محظوظ کرتا ہے نا محفوظ۔ وقت ایک ظالم بہروپیا ہے۔

آخری لمحوں میں عالیان پارٹی میں آچکا تھا اس نے محسوس کر لیا تھا۔ اور وہ اس میں غلط نہیں ہو سکتی تھی اور اگر اب بھی وہ دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دے گی تو کیا وہ اس کے عین سامنے آبیٹھے گا۔ کیا اس کی صورت سے لگے گا کہ وہ اب بھی اس کے ساتھ رونے کو تیار ہے۔

عالیان نے آخری منظر دیکھ لیا تھا اس کی ڈبڈبائی آنکھوں کا اور دیکھ کر فوراً" اپنی نظریں پھیرلی تھیں اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کے پاس اس کے عین سامنے جا کھڑا ہوتا۔ اور یہ ٹھیک نہ ہوتا کیونکہ کل رات ہی تو اس نے مارگریٹ کے الفاظ اپنے ذہن میں نقش کیے تھے۔

"میں ہر رات اس سے نفرت کرنے کا عہد دہرا کر سوتی ہوں میں ہر صبح اس عہد کو توڑتے ہوئے اٹھتی ہوں۔ دنیا میں ہر بیماری کا علاج ہو گا محبت کا نہیں۔ بے شک محبت ایک بیماری ہے اس صورت میں جب یہ ختم ہونے میں نہ آئے اور ختم کر دے۔"

اور وہ خود ختم ہونا نہیں چاہتا تھا وہ اس بے لگام جذبے کو ختم کرنا چاہتا تھا' وہ بے قاعدہ مارگریٹ کی ڈائریاں پڑھنے لگا تھا جس درد کے احساس سے پڑھنے سے ڈر رہا تھا۔ پہلے۔ وہ ان لفظوں کو اپنے دل پر کندہ کر رہا تھا جن لفظوں کو کسی نے رد کیے جانے کے کرب سے کشید کیا تھا۔ یہ عام لفظ نہیں تھے یہ وہ احساسات تھے جنہیں لیے کوئی مر چکا تھا۔ عالیان مارگریٹ کو اب

یہ ڈائریاں پڑھتے رہتا تھا۔

✿ ✿ ✿

امرحہ کی ڈائری کا ایک صفحہ

وہ سب چلے گئے' اپنے ساتھ وقت کو لیے اور اس وقت کی ہر یاد کو بھی۔ دنیا کے مختلف کونوں میں بکھرنے' کبھی دوبارہ نہ ملنے' میوزک بارز' کلب اور کینٹین میں مل بیٹھ کر فٹبال میچ دیکھنے والے اب گھروں کی خاموشی میں دیکھا کریں گے۔ میزوں پر چڑھ کر جیت کا جشن منانے والے کندھوں پر دوستوں کو اٹھا کر ہا' ہو کرنے والے اب ایسی حرکتوں کو بچکانہ سمجھیں گے۔

کاروں کی ریس لگانے والے' میوزک کنسرٹس کی ٹکٹوں کے لیے بھاگ دوڑ کرنے والے' پورا ہفتہ ویک اینڈ کا انتظار کرنے والے' ہر ہفتے گھر جانے والے ماما ز بوائے اور بار بار بلانے پر بھی گھر نہ جانے والے نام کڈز اور سیکرٹ سوسائٹی کے سبھی جیٹ لی' بروس لی۔ یہ سب چلے جائیں گے۔ ان کی اسٹوڈنٹ ڈائریاں گرد آلود ہو جائیں گی اور کسی اداس شام سڑک کے کنارے چلتے' دریا کے کنارے بیٹھے' کیفے میں کسی کا انتظار کرتے یا آتش دان کے قریب بیٹھ کر یونیورسٹی پر بنی کوئی فلم دیکھتے یہ گزرے وقت کو سوچ کر اداس ہو جایا کریں گے۔

اس پارٹی میں سب نے ایک ایک منٹ کی تقریر کی تھی۔ سب سے پہلے ویرا نے ان کے لیے ایک الوداعی روسی گانا گایا۔ میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور دور جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے لیے جو ناپسندیدگی میں نے دل میں چھپا رکھی تھی اب وہ باہر بھی آنے لگی تھی اور مجھے اس پر کوئی افسوس نہیں تھا۔

کارل نے تقریر میں کہا کہ اسے افسوس رہے گا کہ وہ ان میں سے چند ایک کو الو نہیں بنا سکا تھا کیونکہ باقی الوؤں نے ہی اس کا سارا وقت لے لیا تھا۔ عالیان نے بہت کچھ کہا اور میں نے چاہا کہ وہ بس بولتا ہی رہے۔

اس نے کہا۔

"میں تم سب کو تمہاری عادتوں سمیت یاد رکھوں گا بھلا میں یہ کیسے بھول سکتا ہوں کہ کیسے تم سب نے اپنی اپنی برتھ ڈے پارٹیز میں ایک ایک پونڈ کے کیک سے ساٹھ ستر اسٹوڈنٹس کے پیٹ بھرے اور پھر اترا اترا کر اسے گرینڈ برتھ ڈے پارٹی کا نام بھی دیتے رہے۔ تم میں سے اکثر نے جب بھی مجھے کو ٹریٹ دی۔ میرے ہی ساتھ بیٹھ کر' ساتھ ساتھ کھا کر دی' یعنی آدھی اور جب بھی واپس لی پوری لی۔ اپنے خالی والٹ مجھے دکھا دکھا کر تم سب مجھے خود پر ترس کھانے کے لیے کہتے رہے اور میں نے ترس کھایا بھی اور جب جب میں نے اپنا خالی والٹ تمہارے آگے کیا تو تم نے منہ بنایا وہ بھی دی ہک جتنا بڑا اور ہرا۔"

عالیان کے بعد میں کھڑی ہوئی میز پر تقریر کے لیے اس کے بعد اور اس کے ساتھ میرا ہی نام آنا چاہیے نا۔ اور میں نے کہا۔

"مجھ میں سمیٹ لینے کا ہنر ہوتا تو تم سب کو چھوٹے چھوٹے بونے بنا کر ایک ڈبے میں سمیٹ کر اپنے ساتھ رکھ لیتی' کہیں جانے نہ دیتی۔" میری اس بات پر سب نے بہت تالیاں بجائیں۔ اور سائی۔ وہ پورے دو منٹ تک کھڑا روتا رہا اس کی جگہ کارل نے تقریر کی۔

"میں نے ایک کتاب لکھ لی ہے جس میں تم سب کے راز عیاں کیے گئے ہیں۔ جاتے جاتے سب ہزار ہزار پونڈ میرے پاس جمع کرواتے جانا اور کتاب میں سے اپنا نام اور راز کٹواتے جانا' ورنہ چند سالوں بعد اخبارات کی سرخیاں بنتے' طلاقیں لینے اور دیوالیہ ہونے کے لیے تیار ہو جانا۔"

شکریہ۔ نیک تمنائیں۔ سائی ان بھیس کارل۔

میں نے عالیان کو اسکیچ نہیں دیا تھا۔ ایگزامز کی تیاری کے دوران میں علی ... نگ میں کئی بار اس کے پاس سے جا کر پلٹ آئی' یہ سوچ کر کہ شاید وہ اب سیٹ ہو جاتا ہو۔ اور اس کا رزلٹ خراب ہو جائے کیونکہ ہر

حال میں اتنا تو جان گئی ہوں کہ میں اس کے لیے ایک وبال بن گئی ہوں۔ سینئرز اور جونیئرز کے چند گروپس میں ایگزامز کے بعد کھیلوں کے مقابلے ہوئے تھے۔

کشتی رانی کے مقابلے کے دوران عالیان اور کارل کی کشتی الٹ گئی تھی۔ اس وقت کنارے پر کھڑے میں نے خود کو ناک تک گہرے پانیوں میں ڈوبا پایا تھا اور اس حالت میں مجھ پر بہت سے انکشافات ہوئے تھے۔
اسٹوڈنٹ یونین کے لیے رضاکار بنے میں نے بھی جانے والے اسٹوڈنٹس کی چیئرٹی کے لیے دیے جانے والے سامان کو اکٹھا کیا تھا۔ کتابیں، کپڑے، گھریلو استعمال کی دوسری چیزیں اور نہ جانے کیا کیا جو وہ ان سالوں میں خریدتے رہے تھے اور اپنے ساتھ واپس نہیں لے جاسکتے تھے۔ اس سامان کو ہم نے نیلام کردیا تھا۔

اوک ہاؤس سے اکٹھا کیے جانے والے سامان میں سے مجھے ایک ڈائری ملی جس پر "سائی کو دے دی جائے" لکھا تھا۔ اور کوئی نام نہیں تھا۔ اگلے دن سائی کو دینے سے پہلے میں خود کو اس کی ورق گردانی سے روک نہیں پائی۔ ڈائری لکھنے والا بہت ہی حساس اسٹوڈنٹ تھا اس نے خزاں میں گرنے والے پتوں پر بھی آنسو بہائے تھے۔ ڈائری کے آخری صفحات میں، میں نے اپنا نام پڑھا اور اس کے آگے صرف اتنا لکھا تھا۔
"میں نے اسے روتے ہوئے دیکھا۔ وہ بار بار اپنی آنکھوں کو مسل رہی تھی۔ مانچسٹر سے دور دنیا کے کسی حصے میں رہتے ہیں، کبھی کبھی یہ ضرور سوچوں گا۔ کیا وہ دونوں ایک ہوگئے۔"
ان سطروں نے میرے اندر سناٹا بھر دیا اور پھر میرے وجود نے اندر ہی اندر ساری دنیا سے چھپ کر خاص کر معاشرے اور روایات سے عالیان، عالیان کا ورد کیا۔
میری آنکھ میں بہت خوب صورت مناظر قید ہیں۔ میں نے ماضی میں خود کو بہت کم مبہوت ہوتے پایا ہے لیکن جب عالیان کے بکھرے بالوں پر، پلکوں پر افشاں گرنے لگی اور گر گر کر ٹھہرنے لگی تو میں نے مبہوت ہونے کا مطلب جان لیا۔ وہ اچھل رہا تھا، ان کے ساتھ گا رہا تھا، اپنے سر کو جھٹک رہا تھا۔ میں نے اس منظر کو تصور میں جلد کیا اور خود کو اس کی آنکھوں کے قریب کرکے اس کی آنکھوں پر پلکوں پر پھونک ماری
اور افشاں کو ہتھیلی میں قید کرلیا اور پھر اپنی پوروں سے اس کی پلکوں کو چھو کر میں نے وہ افشاں سمیٹ لی۔ میں نے مٹھی بند کرلی۔ میری پشت پر ہزاروں سوال چیخ چنگھاڑ رہے تھے، واویلا مچا رہے تھے لیکن میں نے کسی کو نہیں سنا۔ میری مٹھی کو کھول کر میری افشاں چرائے جانے کی ہمت اب کوئی نہیں کرسکے گا۔
وہ ویڈیو بنانے میں مصروف تھا اور میں آنکھوں کی پتلیوں سے اس کی تصویریں لینے میں۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ میرے آس پاس کیا ہورہا ہے۔ اور مجھے اس سے مطلب بھی نہیں تھا۔ میں اسے چند بار سائیکل سے گرا چکی ہوں، میرا خیال ہے یہ صرف اتفاق ہے لیکن دیکھنے والوں کا ماننا ہے کہ "صرف اتفاق تو نہیں" میں اس پر وضاحت نہیں دوں گی۔ میں اب وضاحتوں سے بچنا چاہتی ہوں، میری کلاس فیلو ٹریسا کا کہنا ہے کہ سوچیں آدھی خوشی نگل لیتی ہیں اور انسان کو پوری خوشی ملتی ہی کہاں ہے کہ وہ آدھی کو بھی کھودے۔
میں اس پر بھی وضاحت دینا پسند نہیں کروں گی کہ میں ہارٹ راک جانے والے راستے پر خود کو کھڑا کیوں رکھتی ہوں اور ہر رات پیغامات لکھ کر انہیں سنبھال لینا میں نے اپنا معمول کیوں بنالیا ہے، میں سمجھتی ہوں کہ اپنی ذات کا حساب کتاب اگر ہم کسی اور سے نکلواتے ہیں تو ہمیشہ جواب غلط نکلتے ہیں اور خود ہمیں اس حساب کتاب کو کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ میں نے اب اجازت لیے بغیر اپنی ذات کے سارے سوالات نکال لیے ہیں اور جوابات میں "عالیان" کو نکلتے پایا ہے۔ "گوشوارہ امر حسنا عالیان"
ڈائری کے ان آخری صفحات تک آتے آتے میں نے سوچنا کم کردیا ہے کیوں کہ اگر میں نے ایسا کرنا

شروع کیا تو مجھے اپنی مٹھی کھولنی پڑے گی اور میری افشاں اڑ جائے گی۔

☼ ☼ ☼

عالیان کی ڈائری کا صفحہ :

میرے بہت سے ہال میٹس 'یونی فیلوز اور دوست جا چکے ہیں اور ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ میں سہم گیا ہوں ' میرا مانچسٹر' میری دنیا ماما سے آباد ہیں 'لیکن اس بار مجھے دنیا خالی خالی لگنے لگی ہے 'کیا یہ سب ان کے جانے سے ہوا؟

میں نے خود کو فضول کام کرتے بھی پایا' سڑک پر چلتے بسوں اور کاروں کو گنتے 'لوگوں کے چہروں پر نہ جانے کیا تلاشتے اور ان کے چلنے کے انداز اور جوتوں کی بناوٹ پر غور کرتے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں بے مقصد زندگی گزار دوں گا اور عملی طور پر کچھ نہیں کر سکوں گا۔ مجھے خود کو پر جوش کرنے کے لیے ماما مہر کو یاد کرنا پڑتا ہے اور ماما مارگریٹ کا خیال آتے ہی میں کسی سزا کی کیفیت میں آجاتا ہوں۔ میرے لیے مسکرانا آسان ہو گیا ہے اور خوش رہنا مشکل۔ وہ ساری چھوٹی چھوٹی کہانیاں جو میں سنا کرتا تھا اب مجھے ان سے نفرت سی کیوں ہونے لگی ہے 'اور میں نے جو اتنا عرصہ خود کو ماما کے خطوط اور ڈائریوں سے دور رکھا اب ہر وقت میں انہیں پڑھنے پر مائل کیوں رہتا ہوں۔ کیا میں ان کی اور اپنی کیفیات کا موازنہ کرنا چاہتا ہوں۔

میں ماما کی ڈائریوں سے سبق لے رہا ہوں کیوں کہ مجھے وہ نہیں بننا جو ماما بن گئی تھیں۔ وہ کمزور تھیں 'میں بھی کمزور ہوں 'لیکن کسی کو تو ہمت دکھانی ہی پڑے گی ان جذبوں کے سامنے جو ہم اپنی ہتھیلیوں میں بھر کر' گھٹنوں کے بل جھک کر کسی کے قدموں میں نچھاور کر چکے ہوتے ہیں۔

میں خود کو مجبور بھی پاتا ہوں اور پابند بھی 'میں دو حصوں میں بٹا ہوا ہوں 'اگر مجھے ایک پر سکون زندگی گزارنی ہے تو مجھے دونوں حصوں کو ایک کرنا ہو گا تو پھر مجھے ویرا کو ہاں کہہ دینا چاہیے تھا روس دیکھنے کے لیے۔ اس کا روس اچھا ہی ہو گا۔ اس کی طرح۔ اور مجھے زندگی کو اور زیادہ جوش سے جینا ہو گا تاکہ بے خودی مجھے ہرا نہ دے۔

☼ ☼ ☼

ایگزامز کے بعد میں روس جانا چاہتی تھی۔ مجھے پاپا سے ملنا تھا' برف پر پھسلنا تھا' لیکن ساری تیاری کر کے بھی میں نہیں گئی۔ میں بھی کیوں نہیں گئی۔ میرا خیال ہے عالیان ہاں کہہ دیتا تو اب ہم دونوں روس بیٹھے ہوتے۔ اس نے کہا ابھی وہ روس دیکھنا نہیں چاہتا' ٹھیک ہے پھر میں نے بھی اپنا سامان کھول دیا۔ مجھے اپنے آس پاس کے لوگوں سے محبت کرنی بھی آتی ہے اور ان کا خیال رکھنا بھی 'اسی لیے میں عالیان کا بہت خیال رکھ رہی ہوں کیوں کہ میرے خیال میں پوری دنیا میں اس وقت ایک اسے ہی سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

☼ ☼ ☼

امرحہ نے جو ڈائری مجھے دی۔ اسے پڑھ کر میں کئی راتیں سو نہیں سکا۔ وہ ایک ایسے اسٹوڈنٹ کے احساسات سے بھری ہوئی تھی جو کئی سالوں تک یہ فیصلہ کرنے میں ناکام رہا تھا کہ اسے اپنی دوست سے محبت ہے یا صرف لگاؤ۔ لڑکی اس کے ملک میں اس کے آبائی شہر میں اس کے گھر کے سامنے والے گھر میں رہتی تھی۔ ایک رات اسے اوک ہاؤس میں لڑکی کی اچانک موت کی اطلاع موصول ہوئی' لڑکی کے دماغ کی نس پھٹ چکی تھی پھر اسے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گئی کہ "اب وہ اس کے بغیر ایسے زندہ ہے جیسے اس کے ساتھ ہی مر چکا ہے" کچھ فیصلے صرف دائمی جدائی کے ہاتھوں ہی طے پاتے ہیں اس سے پہلے خبر ہوتی ہے نہ احساس۔ اور میں بہت سے لوگوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ٹھیک ٹھیک وہ تحریر

پڑھنے کی کوشش کریں جو کوئی آپ کی ذات میں رقم کر گیا ہے۔

✿ ✿ ✿

کارل کی ڈائری

کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں جارج کا گلا دبا کر اسے ختم کر ڈالوں' یعنی کہ وہ جارج میری پوری گیارہ ٹوئیٹس لے کر بھاگ گیا اور جینا جس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ جاتے ہوئے مجھے اپنی کار دے کر جائے گی اگر پروم نائٹ کی متوقع کوئین کاؤرلیس یا منہ میں کسی طرح سے بگاڑ دوں' یا اسے پروم نائٹ میں آنے کے قابل ہی نہ چھوڑوں' تو میں نے دوسرا کام کر دکھایا اور فوڈ پوائزن سے اسے پروم نائٹ سے دور رکھا اور جینا اپنا بوریا بستر اور کوئین کراؤن سمیٹ کر کار سمیت مجھ سے ہی دور ہو گئی۔ میں نے اس کے گھر کا پتا ڈائری میں محفوظ کر لیا ہے ایک دن جینا جان جائے گی اچھا ہوتا اگر وہ مجھے کار دے جاتی۔۔۔ میں جلد ہی امریکا جاؤں گا۔

آج کل میں کافی مصروف ہوں۔ ویلکم ویک کے لیے اس بار میں نے کچھ ایسے مصنوعی کیڑے دریافت کیے ہیں جو کھال کے ساتھ چپک کر کھال کو نیلا کر دیتے ہیں۔ یہ وہی کیڑے ہیں جنہیں دیکھتے ہی لڑکیاں اچھلنے اور پھدکنے لگتی ہیں اور اس بار میں نے پین میں پہلے سے زیادہ طاقت ور بیٹری فکس کی ہے صرف اتنی طاقت ور کہ جب تجربے کے طور پر میں نے شاہ ویز کو اس سے چھوا تو وہ اچھل کر دور جا گرا اور اس نے اقرار کیا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ کچھ اور بھی آلات ہیں' لیکن ابھی میں ان پر کام کر رہا ہوں۔

فریشرز آخر تم کب آؤ گے۔۔۔ تمہارا کارل۔۔۔ نیک تمنائیں۔

✿ ✿ ✿

آسک می کی شرٹ پہنے اور آسک می کا بورڈ پکڑے وہ کافی خوش سی تھی۔ وہ اپنا بورڈ لے کر سب سے پہلے عالیان کے پاس گئی۔

"پوچھو! مجھ سے کیا پوچھنا ہے۔۔۔ جس وقت میں تمہارے پاس آئی تھی اس وقت تم نے کافی کے ہزار دو ہزار کپ پی رکھے تھے۔۔۔ وہ تو میں حوصلہ مند تھی جو تمہارے انداز اور لب و لہجے پر رونے لگی تھی۔ ویسے مجھے یہ بات بعد میں ڈیرک نے بتائی تھی کہ لڑکیاں جان بوجھ کر بار بار آکر تمہیں تنگ کر رہی تھیں اور حیرت ہوئی یہ سن کر کہ ایسی لڑکیوں کے سر پر تم نے آسک می کا بورڈ کیوں نہیں دے مارا' شاید ان سب کا غصہ تم نے مجھ پر نکال دیا تھا۔ کیا تمہیں ذرا سا بھی ترس نہیں آیا تھا مجھ پر۔۔۔ اچھا تم ایسا کرو میرے ساتھ کھڑے ہو جاؤ' میں تمہیں بتاتی ہوں کہ جب مجھ جیسی ڈری سہمی اور بے چاری سی لڑکی آتی ہے تو اسے کیسے ڈیل کیا جاتا ہے اور اگر اسے اس جگہ تک چھوڑ آیا جائے جہاں جانے کے بارے میں وہ پوچھ رہی ہو تو ہماری عظمت اور شان میں کمی نہیں آجاتی۔۔۔ ویسے آج بھی کافی ہی پی کر نکلے ہو نا۔۔۔ ٹھیک ہے آج تو ضروری تھا ضرورت بھی کیا ہے سب سے نرم خوئی سے بات کرنے کی۔۔۔" وہ اس کے ساتھ کھڑی بولتی ہی جا رہی تھی۔

ایک اسٹوڈنٹس عالیان کے پاس اس سے کچھ پوچھنے لگا ہاتھ کے اشارے کے ساتھ وہ اس اسٹوڈنٹ کے ساتھ جانے لگا اور دور چلا گیا۔ اسی دوران ایک ایشیائی لڑکی اس کے پاس آئی اور کافی دیر تک اس کا سر کھاتی رہی یا تو اس لڑکی میں بولنے کی طاقت بہت زیادہ تھی یا اس نے سمجھ رکھا تھا کہ دوسروں میں سننے کا حوصلہ بے مثال ہے۔ وہ کافی تفصیل سے اسے یہ بتانے لگی کہ کن خطرناک مراحل سے گزر کر اس کا داخلہ یونی میں ہوا ہے' کیوں کہ اس کے دادا مان ہی نہیں رہے تھے۔ ایک دوسری لڑکی آئی اور کھڑے کھڑے یونیورسٹی کے بارے میں سب جان لینا چاہا حتیٰ کہ اس نے یہ سوال بھی پوچھ لیا کہ اسٹوڈنٹ یونین کے صدر کا انتخاب کن مراحل سے گزر کر کیا جاتا ہے

اور معزول کن مراحل سے گزر کے۔۔۔

اور کچھ کا خیال تھا کہ "آسک می" سب بتا سکتے ہیں یہ بھی کہ آکسفورڈ روڈ سے بس کہاں کہاں لے جاتی ہے اور یہ بھی کہ کینٹین میں برگر کتنے کا ہے اور کافی کتنے کی۔۔۔ ایک نے یہ بھی پوچھ لیا کہ اس کی دوست ڈمی کہاں ہوگی اس وقت یونی میں کسی کا سوال صرف اتنا سا تھا کہ کس طرح کی ڈریسنگ کر کے آنے سے وہ یونی میں جلد مشہور ہو جائے گی۔

تو ایک سال پہلے عالیان نے اس کے ساتھ بالکل ٹھیک کیا تھا کیوں کہ ہر برداشت کی ایک حد بالآخر ہوتی ہے۔۔۔ تو جس جس مقام سے وہ گزرا ہے اس اس مقام سے وہ گزرے گی تو جان پائے گی کہ حقیقتاً "ہوتا ہے کیا اور پھر محسوسات کیا ہو جاتے ہیں۔

"جیسمین یہ تمہاری گردن پر کیا ہے؟" گہرے سرخ بالوں والی لڑکی نے چلانے میں کنجوسی برتی نہ احتیاط۔۔۔ دونوں امرحہ سے ذرا سی دور تھیں۔

جیسمین نے تڑپ کر سرخ بالوں والی کی طرف دیکھا۔ "کیا ہے میری گردن پر؟"

"او مائے' مائے' تمہاری گردن تو نیلی پڑ گئی ہے یہ چھوٹا سا کیڑا یہ تو زہریلا لگتا ہے اُف یہ تو تمہاری گردن سے اتر ہی نہیں رہا اور یقیناً" اس نے اپنا ڈنک تمہاری گردن میں گاڑ رکھا ہے۔۔۔ زہر پھیل رہا ہے تمہاری گردن میں۔۔۔" یہ سن کر جیسمین نے چلانے میں اپنی دوست کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔

ان دونوں کے تاثرات دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی امرحہ کی ہنسی نکل گئی۔ ان سب میں یہ خاموش معاہدہ طے تھا کہ کارل کے بارے میں کوئی اپنی زبان نہیں کھولے گا۔

اس بار فریشرز میں نمونوں کی بھرمار تھی جیسے کہ ایک لڑکی کو دیکھ کر کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے پیرس فیشن ویک کے ریمپ سے چلتی سیدھی یونیورسٹی آ گئی ہو اور ایک نے کانوں میں اتنے بڑے بڑے بندے اور کلائیوں میں ایسے ایسے کڑے پہن رکھے تھے کہ گمان ہوتا تھا

کہ کرتب کے کرتب سازوں کے آلات فن چرا لانے کا شغل رکھتی ہوں اور چند فریشرز کو دیکھ کر امرحہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ "دنیا ایک جنگل ہے اور ہم اس کے باسی۔۔۔" یا یہ کہ بہت رہ لیا اس قدیم سی دنیا میں چلو اب کسی اور سیارے کی طرف نکلیں۔" یا شاید یہ ثابت کرنا چاہ رہے تھے کہ "میں انسان بنے رہنے سے تھک گیا ہوں جب سے پیدا ہوا ہوں انسان ہی ہوں اب مجھے کوئی اور مخلوق ہونے کا شرف بھی حاصل کرنا چاہیے۔"

ڈیرک آیا اس کے پاس "میری جگہ کھڑی ہو' کیسا لگ رہا ہے؟" کہہ کر دانت نکالے "کچھ بتا نہیں سکتی کاش میری بھی ناک لمبی ہوتی تو میں اپنے احساسات جان پاتی۔۔۔"

"ہاہا" جس طرح تم میری ناک کو گھور رہی تھیں میں نے اس رات سنجیدگی سے ناک کی سرجری کروانے کے بارے میں سوچا تھا۔"

"پھر سوچنا ترک کیوں کر دیا؟" اس نے دانت نکالے۔

اسے ایک چاکلیٹ ٹوئیٹ دے کر' تھوڑی گپ شپ لگا کر وہ چلا گیا۔

ویلکم ویک کا آخری دن تھا' معمول سے زیادہ اسٹوڈنٹس کا رش تھا کہ انتہائی ہائی فائی ڈریسنگ میں' آنکھوں پر چشمہ لگائے' کسی مشہور و معروف ہیئر اسٹائلسٹ سے بال بنوائے ایک لڑکا اسٹار ڈم کی دھول اڑاتے چار عدد کالے پینٹ کوٹ اور چشمے چڑھائے گارڈز کے نرغے میں یونی کے اندر آیا۔ اس کے آگے پیچھے فوٹو گرافرز کا ہجوم تھا جو دھڑا دھڑ اس کی تصویریں بنا رہا تھا۔

امرحہ منہ کھولے دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ کیا وہ اتنا ہی خوب صورت ہے۔۔۔ ہمیشہ سے۔۔۔ اگر گارڈز اور فوٹو گرافرز اس کے گرد نہ بھی ہوتے تو بھی وہ ہجوم کو روک لینے کا کمال رکھتا تھا۔۔۔ اس کا فیورٹ سپر

اسٹار اس سے کچھ ہی فاصلے پر تھا... کیا یہ سچ تھا؟

فریشرز جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے خاص کر افریقی، ایشیائی، چھوٹے اور ترقی پذیر ملکوں کے اسٹوڈنٹس اس خوب صورت اور مشہور انسان کو گردنیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے جس کی تصویریں کھینچنے کے لیے فوٹو گرافرز مرے جا رہے تھے اور ان کے پیچھے مائیک ہاتھ میں لیے ٹی وی چینلز کے رپورٹرز لائیو کوریج کر رہے تھے۔

"مسٹر جین نے مانچسٹر یونیورسٹی میں پڑھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ایک دانش مندانہ فیصلہ ہے، لیکن میں تھوڑا تشویش میں مبتلا ہوں کہ کیا یونیورسٹی انتظامیہ ان کے لاکھوں فینز کو یونیورسٹی تک آنے سے روک سکے گی، مجھے خدشہ ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکے گی۔" مائیک ہاتھ میں لیے ٹی وی رپورٹر اپنی پونی ٹیل کو ہلا ہلا کر تیز تیز بول رہی تھی۔

پینٹ کی ایک جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ کھڑا ہو گیا اور یونی کو سر اٹھا کر دیکھنے لگا اور ایسا کرتے اس نے گردن کو ایسا خم دیا کہ امرحہ سانس لینا بھول گئی۔

اپنے سارے ضروری کام چھوڑ کر فریشرز انہماک سے مسٹر جین کو دیکھ رہے تھے، یہ ضرور کوئی فلم اسٹار ہے یا شاہی خاندان کا فرد یا کسی بڑے، لیکن غیر معروف ملک کا متوقع شہزادہ... کوئی فٹ بالر، سنگر جسے فی الحال وہ نہیں جانتے... ہاں وہ نہیں جانتے... فریشرز نے مزید وقت ضائع کرنا فضول سمجھا اور پاگلوں کی طرح معروف مسٹر جین کی موبائل سے تصویریں اور ویڈیو بنانے لگے تاکہ اپنے ملکوں کے مقامی اخبارات کو دے سکیں، سوشل میڈیا پر وائرل کر سکیں۔

اسی دوران لڑکیوں کا ٹولہ چلاتا ہوا اس کی طرف لپکا، گارڈز نے لڑکیوں کو دور سے ہی روک لیا۔

"آنے دیں انہیں...." اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

لڑکیوں نے خوشی سے بے ہوش ہونے سے پہلے اپنے اپنے ہاتھ آٹوگراف کے لیے آگے کیے اور لڑکے لڑکیاں بھی آنے لگے اور گارڈز کا حلقہ توڑنے کی کوشش کرنے لگے۔

اب تو کوئی شک ہی نہیں رہ گیا تھا۔ فریشرز بھی آگے بڑھے، وہ بے چینی اور جوش کا شکار تھے۔ کوئی ابہام نہیں رہ گیا تھا وہ خوش ہیں کہ کوئی اسٹار ان کی یونی میں ان کے ساتھ پڑھے گا۔

"ان کے فینز نے ان پر ہلا بول دیا ہے۔ ویل ایسے ماحول میں یہ صرف پڑھ نہیں سکیں گے یا پڑھنے نہیں دیں گے، لیکن یہ قابل تعریف ہے کہ مسٹر جین نے اتنی کامیابیاں سمیٹ لینے کے بعد بھی پڑھنے کا فیصلہ کیا۔"

پونی ٹیل والی کی تیز آواز میں رپورٹنگ جاری تھی اس کی آواز اتنی تیز تھی کہ فریشرز کا آدھا مجمع آرام سے سن سکتا تھا اسی کی طرح کی دوسری رپورٹر دوسری طرف کھڑی تیز تیز آواز میں رپورٹنگ کر رہی تھی۔

ویلکم ویک کے اس آخری دن یہ سب آنا "فانا" ہوا وہ آیا اور چھا گیا، چند منٹ لگے اور فریشرز اس کے گرد

گھیرا بنا کر کھڑے ہو گئے اور جو ادھر ادھر تھے وہ بھی اسی کی طرف دیکھنے لگے کہ کون آیا ہے۔۔۔ سب کے موبائلوں والے ہاتھ بلند تھے اور پھر اس گھیرے کے اندر ایک بورڈ بلند ہوا جس کے ایک طرف لکھا تھا۔

"ویلکم فریشرز۔۔۔ وی آر یور سینئرز۔ تھینکس فار دی اٹینشن۔"

اور بورڈ کی دوسری طرف لکھا تھا۔ یو آر آسم فولز۔"

نئے آنے والے ہونقوں کی طرح بورڈ پڑھتے رہ گئے اور پھر ان بلند بانگ قہقہوں کو سننے لگے جو مسٹر جین اس کے گارڈز، فوٹو گرافرز اور اس کے فینز ان کی طرف اشارے کر کر کے لگا رہے تھے خفت ان کے چہروں پر لکھی تھی، سینئرز نے انہیں آتے ہی دھر لیا تھا۔

جب فینز عالیان سے آٹو گراف لے رہے تھے تو وہ بھی فوراً "اس کے پاس گئی تھی اور ایک سادہ کاغذ اس کے سامنے کیا تھا۔

"اس پر اپنا نام لکھ دو۔" امرحہ نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر بہت خوش ہوتے ہوئے کہا۔ کیمروں کے فلیک فلیشز ان دونوں پر پڑ رہے تھے وہ اس انسان کے سامنے کھڑی تھی جو پوری یونی کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

عالیان نے کاغذ پر ایسے ہی لکیریں کھینچ دیں۔

"مجھے تمہارا نام چاہیے لکیریں نہیں۔" اس نے اردو میں کہا۔

ناچار اس نے اپنا نام لکھ دیا اور وہ گارڈ نے کارل کو دھکا دے کر حلقے سے باہر نکل آئی اور رپورٹنگ کرتی ویرا کے قریب سے گزرتی خود کو ہجوم سے دور لے گئی۔

اس کا خیال تھا وہ ایک معرکہ سر کر آئی ہے وہ اس کا نام لکھوا لائی ہے اور اس سے پہلے جب اس نے بے نیازی سے اپنی فینز کو دیکھا تو امرحہ دنگ رہ گئی۔ کیا وہ ایسا ہی ہر فن مولا ہے۔۔۔ اس میں کتنی لوائیں ہیں کہ ختم ہونے میں آتی ہیں نہ گنتی میں۔۔۔

جب وہ اس کا نام لکھوا لے گئی تو عالیان کو لگا وہ اس کا مذاق اڑا گئی ہے۔ اور اب اسے یہ زیادہ شدت سے لگنے لگا کہ وہ اس کا کھلونا ہے، جب جی چاہا کھیل لیا ورنہ توڑ دیا اور پھر جوڑنے کے لیے آ گئے۔

انہوں نے نئے آنے والوں کو الو بنایا۔۔۔ اب وہ سب ہنس رہے تھے۔ یہ عالیان کا ظاہر تھا، لیکن اندر سے وہ خاموش تھا۔ وہ سوچ رہا تھا ایک مذاق تو اس کے ساتھ بھی ہوا جو اتنا عملی تھا کہ اسے ہی بے عمل کر ڈالا تھا۔

✲ ✲ ✲

امرحہ کی ڈائری کا صفحہ

"میں نے اسے انکار کر دیا۔ مجھے ایک مسلمان سے شادی کرنے میں دلچسپی نہیں تھی۔ پھر میں نے ہر رات جاب سے واپسی پر اسے اپنے راستے میں کھڑے پایا۔۔۔ ہر رات، ہر صبح۔ وہ مجھے دیکھا رہتا اور میں اس کے پاس سے گزر جاتی وہ اتنا مستقل مزاج ہے کہ میرے انکار پر بھی میرے راستوں میں کھڑا رہتا ہے میرے ساتھ بس میں سفر کرتا ہے، خریداری کے دوران میرے آس پاس رہتا ہے اور پھر کتنے ہی مہینوں بعد جب میں نے اسے وہاں صرف ایک دن کھڑے نہیں پایا تو میں نے اپنی آنکھوں کی روشنی کم ہوتے ہوئے محسوس کی۔ اس کا وہاں کھڑے رہنا کیوں ضروری تھا اور ایک اس کے وہاں نہ ہونے سے دنیا میں کچھ باقی کیوں نہ رہا اور میں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا "خدا کی تلاش میں" کہ وہ مجھے بتائے کہ کیا ایسا ہی ہے۔

میں گھر واپس آ گئی اور رات صدیوں پر محیط ہو گئی۔ پلکوں کی جنبش کے سوا میرے وجود نے حرکت نہ کی۔ مجھے اس سے محبت نہیں ہو گئی تھی، لیکن وہ میرے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ اب اگر وہ مجھے صبح و شام دیکھنے کو نہیں ملے گا تو میری بینائی پر اثر پڑے گا۔ اب اگر اس کا سایہ میرے پیچھے پیچھے نہ رہا تو میرا وجود بے سایہ ہو جائے گا اور اس رات میں نے پہلی بار سوچا اسے ہاں کہہ دینے میں مجھے تامل کیوں ہے کیا میں مغرور ہوں کہ میں بہت خوب صورت ہوں یا کوئی اور فرق غالب ہے؟

"لیکن وہ انسانوں کی پہلی شناخت تو انسان ہونا ہوتا ہے نا۔" اس رات صرف پلکوں کی جنبش پر اختیار نہ رکھتے ہوئے میں نے یہ فلسفہ گھڑا۔ یہ میری اپنی قابلیت تھی یا اس شخص کی قوت کہ میں نے ایسا فلسفہ خود کو سکھادیا۔

محبت دنیا میں سب سے بے اختیار جذبہ ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خرابی ہے۔"

عالیان نے کئی بار اسے اپنے راستوں میں کھڑا دیکھا تھا وہ ایسے ظاہر کرتا جیسے اسے دیکھا ہی نہیں۔ اسے یقین تھا کہ اُس شخص اور اس امرحہ میں ایک جیسی خامیاں اور خوبیاں ہیں۔ پہلے جکڑ لینا پھر جھٹک دینا' پہلے ہنسانا پھر رلانا' پہلے اپنے ساتھ زندہ رکھنا پھر اپنے بغیر مردہ کر جانا۔ یہ لوگ ایک جیسے ہوتے ہیں' برباد کردینے والوں لوگوں کی رمزیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ سراب ہوتے ہیں ان کے پیچھے بھاگو انہیں پالو اور پھر یہ دلدل بن جاتے ہیں۔ ان میں دھنس کر دم توڑ دیا جائے یہ یہی چاہتے ہیں۔

"تو مارگریٹ کی زندگی میں آنے والا شخص اور اس کی زندگی میں آنے والی لڑکی دونوں ایک جیسے ہیں۔"

اپنی منتشر ذہنی حالت میں اس نے خود کو کئی بار یہ کہتے پایا۔ کسی ضروری کام کی طرح اس نے اسے خود کو بھولنے نہ دیا۔

"امرحہ پر ترس کھاؤ عالیان...."

"سائی! تمہیں ہر وقت اس کا وکیل بنے رہنے کا شوق کیوں ہے؟"

"تم غلطی پر ہو' وکیل میں تمہارا ہوں' خود کو دیکھو عالیان بڈی تم کس کو دھوکا دے رہے ہو؟"

"دھوکے سے ہی تو نکل آیا ہوں۔"

"یہ سال بھی گزر جائے گا.... وہ چلی جائے گی۔"

"تو چلی جائے...."

"جب چلی جائے گی تب بھی اتنی ہی آسانی سے کہہ سکو گے؟"

"بالکل...."

"دیکھو' وہ ایک مختلف ماحول سے آئی ہے۔"

"مارگریٹ کا شوہر بھی مختلف معاشرے سے آیا تھا۔ سب خود غرض اور بے حس لوگ ایک جیسے ماحول اور معاشرے سے آتے ہیں۔" اس کے خیالات کتنے واضح ہوگئے تھے۔

"وہ بے حس نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر میں ہوں۔"

"تمہیں اس پر اتنا غصہ ہے یاد رکھنا غصہ اپنوں پر ہی ہوتا ہے۔"

"اپنا وہ ہوتا ہے سائی جس کے دل میں تمہارے لیے احساس ہوتا ہے اور امرحہ.... ٹھیک ہے سنو امرحہ کیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس کے لیے کیا جذبات رکھتا ہوں بے وقوف نہیں تھی وہ۔ وہ مجھ سے دور کیوں نہیں ہوئی۔ اس نے مجھے روک کر یہ کیوں نہیں کہا کہ تم ایک غیر مسلم عورت کے بیٹے ہو' تمہارے باپ کی خبر نہیں.... مجھے تم سے تعلق نہیں رکھنا' اگر ماما نے میری تربیت نہ کی ہوتی اگر ایک مسلمان کی حیثیت سے میں نے صبر کا درس نہ لیا ہوتا تو جانتے ہو۔ میرے ساتھ کیا ہوتا' میں ذہنی انتشار کا شکار ہو کر پاگل ہو جاتا۔ مجھے بے وقوف بنا کر میرے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا۔ میں اس پر بھڑکا نہیں اس پر چلایا نہیں اور اسے یہ بتایا نہیں کہ وہ کس قدر خود غرض ہے۔ میں نہیں بھول سکتا کہ سب جانتے بوجھتے وہ کیسے میرے ساتھ رہی' جیسے میرا دل توڑنا اس کا مقصد تھا۔ کیا محبت اور دوستی میں فرق نظر نہیں آتا.... نظر آتا ہے صاف نظر آتا ہے اور اگر دوستی ہی تھی تو اسی دوستی کا لحاظ رکھ کر وہ میری کچھ تو عزت کرتی۔ ویرا کے سامنے اس نے میری' میری ماں کی کیسے بے عزتی کی.... احترام وہ ہوتا ہے جو تنہائی میں بھی کیا جائے۔ جو دل و دماغ کی سوچوں میں بھی کیا جائے۔

سائی اگر میری ماں سے محبت کرنے والا' دھتکار کر اسے اپنی زندگی سے الگ کرنے والا ایک صرف احترام اور عزت کا راستہ اپنا لیتا تو آج میری ماں زندہ ہوتی۔ امرحہ کو ایک کھلونا چاہیے تھا۔ "دوست" یونیورسٹی کا سب سے موسٹ وانٹڈ (Most Wanted

اسٹوڈنٹ اس کا دوست ہے' اس کے ساتھ ہے' اس کے آس پاس رہتا ہے اور اس پر فدا ہے۔ بس یہی حیثیت تھی اس کے نزدیک میری۔ وہ آج بھی میرے پاس آتی ہے کہ میں پھر سے اس کا دوست بن جاؤں' جب تک اسے ثبوت نہیں مل گیا اس نے مجھے لانڈہب سمجھا۔ مجھے لے کر وہ ایک فارم بھرتی رہی اور خانوں میں ٹِک' کراس لگاتی رہی اتنی ہمت تو میری ماں نے بھی کی تھی۔ سائی! دو انسانوں میں پہلی اور ضروری مشترک تو اس نے بھی ڈھونڈ نکالی تھی۔ میں کس بلندی سے زمین بوس ہوا تھا تم نہیں سمجھ سکتے' کیوں کہ تم نے کڈز سینٹر میں پرورش پائی ہے نہ تمہاری ماں مارگریٹ رہی ہے۔"

سائی کو دکھ ہوا۔ اسے "سے اٹ آل" نہیں ہونا چاہیے تھا' ایسے دکھ سن کر وہ کیسے سکون سے سو پایا کرے گا۔ عالیان کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ رو دینے کو تھا۔

"میں کئی حصوں میں بٹا ہوا ہوں' مجھے خود کو اکٹھا کر لینے دو' فیصلہ کر لینے دو مجھے۔"

"فیصلہ دماغ سے کرنے جا رہے ہو...؟" سائی نے نرمی سے پوچھا۔

"نہیں تجربات سے... اپنی ماں کے..."

"تو تم اس سے محبت کرنا چھوڑ چکے ہو؟" یہ سوال کرتے سائی کا دل بھر آیا۔

"میں اس بارے میں سوچنا چھوڑ چکا ہوں۔"

"تم اپنی ماں کی اور اپنی زندگی کا موازنہ کر رہے ہو اور غلط کر رہے ہو۔"

"جب ٹھیک کر رہا تھا تب بھی غلط ہی ہوا تھا۔"

"تمہارے لیے دعا گو ہوں۔ کاش میں تمہیں وہ ڈائری دے سکتا جو میرے لیے اوک ہاؤس میں ایک اسٹوڈنٹ چھوڑ گیا تھا اس نے ایک جگہ لکھا کہ اب وہ اس چیز کی قدر جان گیا ہے جو اس کے پاس نہیں رہی۔"

"میرے ہاتھ بھی خالی ہیں کچھ نہیں ہے ان میں..."

اس نے لکھا ہے "زندگی وضاحت سے میرے سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔ میرے لیے یہ کھو کھلی ہے۔"

"زندگی کی حقیقت مجھ پر کھل چکی ہے اور یہ کام امرحہ نے کیا۔"

"اور اس نے یہ بھی لکھا ہے۔

"میں نے اپنے جذبے کو سلائے رکھا اور اسے بتا نہیں سکا۔ اب وہ سو چکی ہے اور میں خود کو بتاتا پھرتا ہوں۔"

"میں اسے بتا چکا تھا سائی بتا چکا تھا..." عالیان چلا اٹھا۔

"اور آخری بات اس ڈائری میں یہ ہے۔

"اور میں نے یہ جان لیا محبت کے واقع ہونے سے زیادہ اس کے قیام پر قائم رہنا ضروری ہے۔"

"سائی!" عالیان نے سائی کو اس کی شرٹ کے کالر سے پکڑا۔ "کیا تم سسکتی بلکتی' تڑپتی مارگریٹ کو بھی یہ مشورہ دیتے... بولو... کیا تم اسے بھی یہی فلسفے سناتے... مارگریٹ کی ڈائریاں بھی لے جاؤ... اور پھر مشورے دینا... میں دیکھوں گا سائی! تم کتنے انسان دوست ثابت ہو سکتے ہو... میں دیکھوں گا۔"

اور سائی اس بات پر چپ ہو گیا... اس کے وجود میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

موسم پھر سے سرد ہونے لگا تھا اور اتنا گرم تھا ہی کب کہ سرد ہونے میں وقت لیتا۔ چلتے چلتے بارش ہونے لگتی اور چلنے کے دوران ہی رک بھی جاتی۔ فریشرز کے بارے میں آئے دن کچھ نہ کچھ نیا سننے کو ملتا رہتا۔ وہ فریشرز کو حسرت سے دیکھتی۔ کاش وہ بھی ان ہی میں سے ایک ہوتی اور وہ سب نہ ہوا ہوتا جو ہو چکا ہے۔ وہ اب عالیان سے ملتی اور اس بار زیادہ سمجھ داری کا ثبوت دیتی اور پھر اسے سڑک پر اکیلے نہ چلنا پڑتا' موسم کے بدلنے پر اسے اداسی نہ ہوتی۔ کسی نے فرصت نکال کر اسے بددعا تھی کہ وہ اس حالت میں

آچکی تھی۔ عالیان اس کے ساتھ زیادہ سختی سے پیش آنے لگا تھا۔ اس میں تیزی سے تبدیلیاں آرہی تھیں' ہر دن وہ پہلے سے زیادہ سخت اور بدلا ہوا لگتا تھا۔

"زندگی کی بدترین صورت حال جانتے ہو کون سی ہوتی ہے سائی۔۔۔! دو پیاروں میں سے ایک کو چننا۔۔۔"

"اور دو میں سے ایک کو چھوڑ دینا۔۔۔"

"ہاں اور اس سے بھی بدترین وہ ہو جاتی ہے جس میں جسے چنا ہو اس کے ساتھ خوش نہ رہا جائے۔"

"اپنے بارے میں سوچ سوچ کر تھک چکی ہوں سائی' کیا شخصیت ہے میری' ساری زندگی روتی رہی اتنی ہمت نہ کر سکی کہ اپنے ماحول کے خلاف ڈٹ جاتی۔۔۔ اسے بدل دیتی۔ احساس کمتری کا شکار رہی۔ میرے ماضی میں کچھ بھی قابل ذکر نہیں' میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میری زندگی کا مقصد کیا ہے۔ میں کسی کو خوش رکھ سکی نہ خود کو' میری ایک دوست کہتی ہے کہ دوسروں سے پہلے اپنا بننا ضروری ہے۔ میں کبھی اپنی نہیں بنی' بس ہر وقت بے چارے بنے رہنا' کیا ہوں میں' کمزور ہوں' جھوٹی' خود غرض' بے حس۔۔۔ کیا ہے میرے ہاتھ میں؟"

"تمہارے ہاتھ میں یہ سوچ ہے کہ تم کیا ہو۔۔۔ جب انسان خود سے سوالات پوچھنے لگتا ہے تو وہ خود کو بلندی کی طرف لے جا رہا ہوتا ہے۔"

"کیسی بلندی سائی! میں نے عالیان کے ساتھ کیا کیا۔ ویرا کے سامنے میری' میرے معاشرے کی بے عزتی نہ ہو جائے۔ میں نے عالیان کی کھل کر بے عزتی کردی الفاظ تو وہی ہوتے ہیں نا جن پر احترام کی لگامیں ہوں' ورنہ تو سب ہتک ہے' انداز' آواز سب۔۔۔ اگر میں عالیان کی جگہ ہوتی تو ساری عمر امرحہ کی شکل نہ دیکھتی۔ میں اس جگہ کو ہی چھوڑ دیتی جہاں امرحہ ہوتی' میرے خاندان میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جن سے میں سالوں نہیں ملی' بات نہیں کی' سلام نہیں کیا' انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا۔۔۔ یہ سب لوگ وہ ہیں جنہوں نے میرا دل دکھایا تھا۔ میری تذلیل کی تھی۔ میری انتہا پسندی دیکھو کہ کالج کی میری دوست جو میرے بارے میں سب جانتی تھی' ایک دن میرے ساتھ چلتے چلتے گر گئی اور ونڈا قا" کہنے لگی "تمہارے ساتھ چل رہی تھی' گرنا تو تھا ہی۔" اور پھر اس کے لاکھ منانے پر بھی میں نے اس سے کبھی بات نہیں کی۔ اس کے فادر کی ڈیتھ ہو گئی۔ میں نے اس سے صرف افسوس کیا جبکہ اسے میری اس سے زیادہ ضرورت تھی۔

مجھے بس یہ یاد رہتا ہے کہ مجھے تکلیف ہوئی۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ بس عالیان کے کھردرے سخت رویے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے اور میں اس تکلیف کو لے کر بیٹھ جاتی ہوں۔ مجھے اپنی کتنی فکر رہتی ہے۔ میرا اور عالیان کا کوئی مقابلہ نہیں ہے جانتے ہو' سادھنا کو آریان کے لیے سب سے زیادہ پیسے وہ جمع کر کے دیتا ہے۔ سادھنا سے زیادہ اسے یاد رہتا ہے کہ آریان کی سرجری کب ہونا ہے۔۔۔ وہ بھڑکتا نہیں ہے' چلاتا نہیں ہے۔ وہ کتنا ذہین ہے' جتاتا نہیں ہے' اس کے خیالات کس قدر عظیم ہیں۔ وہ سکھاتا ہے۔ اتراتا نہیں ہے۔"

"یہ سب تمہیں اب معلوم ہوا ہے امرحہ؟" سائی اتنا افسردہ ہو گیا کہ امرحہ جان ہی نہیں سکتی تھی۔

"معلوم تو تھا قدر نہیں تھی سائی! کہا نا مجھے افسوس ہے خود پر مجھ میں کچھ قابل ذکر نہیں ہے۔ مجھے ویرا اچھی نہیں لگتی' مجھے اس کی ضرورت پڑتی ہے تو میں اس سے کام نکلوا لیتی ہوں' اس سے مسکرا کر بات کر لیتی ہوں اور منہ پھیر کر ناپسندیدگی سے اس کے بارے میں سوچتی ہوں۔ اسے معلوم ہو کہ میں اس کے بارے میں کیسے سوچتی ہوں تو اسے بھی دکھ ہو۔۔۔ وہ مجھ سے ایک ہی سوال پوچھے۔ "میں نے تمہارے ساتھ ایسا کیا برا کیا ہے؟"

میں سب کے ساتھ برا کرتی ہوں اور بے چاری بھی خود ہی بن جاتی ہوں۔۔۔ یہ منافقت اور سنگ دلی ہے۔"

"تم ایک مشکل وقت سے گزر رہی ہو۔۔۔ لیکن امرحہ! انسان جب اپنا احتساب کرتا ہے تو وہ وقت بہت خاص ہوتا ہے۔"

سب کھو چکا ہوتا ہے۔"

"تم پاکستان کیوں نہیں جاتیں' اپنے گھر والوں سے ملو' انہیں نئے ماحول کی اچھی اچھی باتیں بتاؤ' لوگوں سے جب تک ملا نہ جائے وہ برے اور عجیب ہی لگتے ہیں۔۔۔ تم ذہنی طور پر اچھا محسوس کرو گی۔"

"کیا واقعی؟"

"ہاں' یونی میں ایک لڑکی جب جب میرے قریب سے گزرتی' اسے دیکھ کر مجھے لگتا کہ یہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ ایک لمبا عرصہ ایسے ہی چلتا رہا' پھر ایک دن ایک اسٹوڈنٹ نے مجھے اس کی طرف سے ایک رقعہ دیا جس پر لکھا تھا۔ "تم مجھے پسند نہیں کرتے۔۔۔ پر کیوں؟"

"فاصلے ابہام پیدا کرتے ہیں اور ابہام شیطان کا پہلا ہتھیار ہے کیوں کہ یہ ہر مثبت جذبے اور سوچ پر حملہ آور ہو کر اسے چت کر ڈالتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو سائی! لیکن عالیان کیوں اس ابہام کے زیر اثر آرہا ہے۔"

"تم جانتی ہو امرحہ! میں کسی کی بتائی کوئی بات نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے' لیکن مجھے کوئی مشورہ دو۔۔۔۔"

سائی اسے دیکھ کر رہ گیا وہ اسے ایسا کیا مشورہ دے سکتا تھا جو سب ٹھیک کر سکتا۔۔۔ اس کے پاس بلاشبہ ایسے لفظ تھے نہ ایسا جادو۔۔۔

"بہت دیر نہیں ہونی چاہیے کہ انتظار پر فرمان غالب آجائے۔۔۔ اور فراق کو رخصت ہونے کی اجازت نہ ملے۔"

سائی ہولے سے بڑبڑایا اتنا کہ امرحہ نے سن لیا۔۔۔ اسے یاد آرہا تھا یہ جملہ اس نے کہیں پڑھا تھا۔ کہاں۔۔۔ ہاں اوک ہاؤس سے ملنے والی ڈائری میں۔۔۔ اس ڈائری کے جملے کو استعمال میں لایا جاتا امرحہ کو سحر لگا۔

☆ ☆ ☆

ویرا اسے کافی کے لیے کیفے لے کر آئی تھی' جو ہر بار اسے انکار نہیں کر سکتا تھا' کیوں کہ اسے احساس تھا کہ انکار کتنا بھی ٹھیک ہو' تکلیف وہ ہوتا ہے۔

کافی پینے کے بعد انہوں نے پل پر چہل قدمی شروع کر دی' شام رات کے ساتھ جا ملنے والی تھی' بارش پھوار صورت برس رہی تھی اور ویرا ننھے بچوں کی طرح سر اٹھا اٹھا کر آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ ساتھ اسے روس کے کھانوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔

"کرسمس کی چھٹیوں میں تو روس چلو گے نا؟"

"نہیں ویرا' میں ماما کے ساتھ جانا چاہتا ہوں' ہم گرم علاقوں کی طرف سفر کریں گے۔"

"ٹھیک ہے' لیکن کیا وہ روس نہیں آسکتیں؟"

"بہت زیادہ ٹھنڈ ان کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"

"پھر ڈگری کے بعد۔۔۔؟"

"ابھی تو بہت وقت ہے۔"

"تم بہت وقت پہلے ہی مجھے ہاں کہہ دو نا۔۔۔"

وہ خاموش ویرا کے بالوں پر گرنے والی پھوار کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کہیں اور تھا۔

"میں لاہور آنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"کیوں نہ آؤں؟"

"تم نے تو کہا تھا۔ ابھی تم ایشیا کے سفر کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"میں ایشیا کے سفر کا ارادہ ابھی بھی نہیں رکھتا۔ میں لاہور کی بات کر رہا ہوں۔"

"لاہور ایشیا میں ہی ہے۔"

"لاہور ایشیا میں نہیں' میری ٹاپ لسٹ میں ہے جہاں پہلی فلائٹ سے جایا جائے۔"

"اچھا۔۔۔ دیکھ لو ویسے لاہور میں مچھر بھی ہوتے ہیں۔"

"تم مجھے مچھروں سے ڈرا رہی ہو۔۔۔ ہاں تم یہی کر رہی ہو۔"

"بالکل نہیں صرف خبردار کر رہی ہوں۔۔۔ تم نے ڈینگی کا نام سنا ہے۔۔۔ اس کے کاٹتے ہی انسان فوراً"

سے پہلے مرجاتا ہے... بالکل جھٹ پٹ۔"

"تو لاہور میں ایسا فوری مار دینے والا ڈینگی ہے ورنہ دو تین گھنٹے تو دنیا کا ہر ڈینگی مچھر دے دیتا ہے مرنے کے لیے۔"

"تمہارے پاس وی آئی پی ڈینگی ہے... اپنے رسک پر لاہور آنا' مجھ سے شکایت نہ کرنا۔"

"کیا وہ لاہور والوں کو نہیں کاٹتا؟"

"نہیں... یہی تو اس کی خصوصیت ہے' وہ غیر ملکیوں پر حملہ آور ہوتا ہے۔"

"جب میں لاہور جاؤں گا تو کیا میں بھی غیر ملکی ہوں گا اس کے لیے۔"

"ڈینگی کے لیے؟"

"نہیں لاہور کے لیے...؟"

"روس کی برف کو جانتے ہونا' پھر نہ کہنا بتایا نہیں...."

"ہاں اس کے کاٹنے سے انسان مرجاتا ہے۔"

"ہاہاہا' برف کاٹتی نہیں عالیان...!"

ہلکی سی جھرجھری کا وہ شکار ہوا... وہ ویرا تھی اور ہنستی جارہی تھی۔

"میں نے تو ولید کو اتنا لمبا عرصہ ستا بھی نہیں تھا' مٹھی سے ریت کی طرح پھسل جانے والے زندگی کے صرف چند سال ہی' اور ان چند سالوں میں ہی اس نے مجھے اپنے سوائے سب کے لیے بہرہ کردیا اور دوسروں کے لیے گونگی تو میں تب ہی ہوگئی تھی' جب اس سے ہم کلام ہونا شروع ہوئی تھی۔ یہ وہ ابتدا تھی جو اس کے جانے کے بعد انتہا کو پہنچی... میں عالیان کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں اتنی غلطیاں کرچکی ہوں اور نہ کروں اور میں پھر غلطی کرجاتی ہوں' میں ولید کے لیے آنسو بہانے لگتی ہوں۔ میں یہ غلطی اپنی ہر سانس کے ساتھ کرتی ہوں اگر دنیا میں مجھے کسی کو نصیحت کرنے کا موقع دیا جائے تو میں نصیحت کروں گی کہ "خود کو ختم کردینے کے ہزاروں طریقوں میں سے "محبت" کو سب سے آخر پر بھی نہ رکھیں... زندہ درگور ہونے کے لیے کسی اور جذبے کا انتخاب کریں۔"

جیسے اس ایک لمرے کے لمر میں وہ ہر وقت چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ میں پیدائشی اندھی ہوجاتی' لیکن ایسی اندھی نہ ہوتی کہ مجھے میرا بیٹا نظر نہ آئے' لیکن اسے دھتکار دینے والا شخص ہر جگہ نظر آئے... تو کیا مجھے ایسی بے اختیاری پر کوڑے نہیں برسانے چاہئیں۔

عالیان نے اپنی ہتھیلی میں بارش کی پھوار سمیٹی۔

"ٹھیک ہے ہم ضرور چلیں گے ویرا!" اپنی بے اختیاری کو اس نے بھی معاف نہ کیا۔

چند دنوں بعد وہ رات کو شٹل کاک آیا اور ماما مہر کی گود میں سر رکھ کر لیٹا رہا۔ وہ چھت کو دیکھ رہا تھا پھر وہ دیوار پر ٹنگی تصویر دیکھنے لگا پھر اس کی نظریں کھڑکی سے باہر بھٹکنے لگیں۔

"کیا تلاش کررہے ہو؟"

"آپ کو کچھ بنا کر کھلاؤں؟" سائی ٹھیک کہتا ہے وہ بات بدلنے میں ماہر ہوچکا ہے۔

"رات کے اس وقت؟"

"کیا وقت ہوا ہے؟"

"تمہیں آئے آدھا گھنٹہ گزر چکا ہے اور تم ایسے خاموش ہو کہ مجھے لگ رہا ہے کہ تم نے کئی دنوں سے کسی سے بھی بات نہیں کی' این بتارہی تھی یونی میں بھی تم ایسے ہی رہتے ہو' منہ کھولو اور مجھے اپنی زبان دکھاؤ' اس میں ضرور کوئی مسئلہ ہوگا۔"

اس نے فرماں برداری سے منہ کھول کر زبان دکھا دی۔

"اب کھڑکی کے پاس جاؤ اور زور سے چلاؤ مجھے معلوم ہو کہ تم میں کتنی قوت باقی ہے۔"

وہ کھڑکی کے پاس آیا... باہر امرحہ کھڑی اسی کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی بظاہر اس کے ہاتھ میں فون تھا اور وہ ٹھنڈ میں ٹہل رہی تھی۔

"چلانا پڑا... آجاؤ۔"

وہ واپس آکر بیٹھ گیا۔ "این کو آپ نے میرے پیچھے جاسوسی کے لیے لگا رکھا ہے؟"

"اسے چھوڑو' یہ بتاؤ کہ اتنے مشینی سے کیوں ہورہے ہو... تم میں جو خاصی نرمی کا عنصر ہوا

کرتا ہے وہ کہاں ہے؟"

"کیا میرا رویہ برا ہے؟"

"برا نہیں عجیب... سمادینے والا... کیا یونی میں پھر کسی لڑکی نے تمہیں پرپوز کر دیا ہے جسے انکار کر کے تمہیں اس کا دل توڑنا ہے اور تم اس کے لیے حساس ہو رہے ہو۔"

"نہیں!" اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔

"تو کیا تم نے کسی کو پرپوز کیا ہے اور اس نے انکار کر کے تم سے ان آٹھ دس لڑکیوں کے بدلے لے لیے ہیں؟"

"کرسمس کی چھٹیوں میں میرے ساتھ چلیں گی ماما؟"

"میں... مجھے کہاں کہاں سنبھالتے پھرو گے... کارل ہے تم ویرا امرحہ سب مل کر جانا۔"

"آپ ہر بار انکار کر دیتی ہیں۔"

"انکار نہیں کرتی' تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی' کیا تم مجھے سویڈن لے کر جانا چاہتے ہو؟"

"ہرگز نہیں مجھے سویڈن نہیں پسند..."

"تم کتنا بدل رہے ہو عالیان! جب تم واپس آئے تھے تو تم نے کہا تھا۔"

"وہ بیان غیر حقیقی تھا ماما... حقیقت یہ ہے کہ اب مجھے کبھی سویڈن نہیں جانا۔"

"تمہیں جلد شادی کر لینی چاہیے... بس... اس سے پہلے کہ تمہیں سب غیر حقیقی لگنے لگے۔"

"میں ایک نارمل انسان ہوں ماما' فکر نہ کریں... میں ابنارمل نہیں ہوں گا۔"

"تمہیں امرحہ کیسی لگتی ہے؟"

"آپ کو ویرا کیسی لگتی ہے؟" اس نے فوراً کہا۔

"ویرا؟"

"جی... وہ ایک سمجھ دار لڑکی ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسانوں کی عزت کرنا جانتی ہے اس کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسانی نفسیات کو بہت اچھی طرح سے سمجھتی ہے' میں نے اسے بے غرض اور پر خلوص پایا ہے۔ وہ ہر ایک کی مدد کے لیے تیار رہتی ہے' وہ حسد و رشک سے پاک ہے۔ اس میں بہت سی خوبیاں ہیں ماما...!"

"تم نے ویرا کی بات ایک دم سے ایسے کی جیسے اس کی وکالت کر رہے ہو' لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ وکالت تم نے میرے لیے کی یا خود اپنے لیے۔"

اس آخری بات نے عالیان کے چہرے کے سب ہی رنگ نچوڑ لیے۔

"عالیان! دنیا میں کوئی ایسا انسان نہیں جو مجھے ناپسند ہو' کیوں کہ میں کسی نہ کسی طرح سے قابل نفرت انسانوں سے بھی محبت کرنے کا راستہ نکال لیتی ہوں اور مجھ پر یہ گراں نہیں گزرتا۔"

"میں کسی سے نفرت نہیں کرتا ماما سوائے ایک کے۔"

"ہم کتنوں سے محبت کرنے کے قابل ہو چکے ہیں اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ہم کتنوں سے نفرت کر رہے ہیں انسان "محبت" میں کورا ہو نہ ہو نفرت میں "کورا" ضرور ہونا چاہیے' کوئی نقطہ کوئی نشان نہیں ہونا چاہیے اس جذبے کے نام پر..."

"میں اس شخص سے محبت نہیں کر سکتا... میں مارگریٹ نہیں بن سکتا۔"

"میں صرف اسی کی بات تو نہیں کر رہی۔" انہوں نے بہت سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"پھر مجھے پتا نہیں' آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟"

"مجھے ڈر تھا عالیان! کہ ایک دن تم ضرور مارگریٹ کو لے کر بہت سوچا کرو گے۔"

"ماما کے بارے میں سوچنا برا ہے کیا؟"

"مارگریٹ کے بارے میں سوچنا نہیں... بس اس کے ساتھ جو ہوا' اس کے بارے میں سوچنا... تم میری اولاد ہو' تمہاری آنکھ کی پتلی کی حرکت بھی پہچانتی ہوں میں... ان آنکھوں کے رنگ اور چمک کہاں گم کر آئے ہو۔ یہ پوچھا نہیں تم سے... ابھی بھی نہیں پوچھوں گی... صرف اتنا کہوں گی کہ پر سکون رہو... جلد باز مت بنو... خود کو وقت دو... ٹھہراؤ خود کو..."

"میں جلد باز تو نہیں ماما..."

"ہاں نہیں ہو... لیکن بعض معاملات میں ہم ہو جاتے ہیں اور ہمیں خود کو پتا نہیں چلتا۔" وہ خاموش ہو گیا۔ ایک جملہ اس کے ذہن میں بجنے لگا۔

"پہلے اس نے مجھے یہ بتایا کہ میں اس کے لیے کس قدر ضروری ہوں پھر اس نے یہ ثابت کر دکھایا کہ میں کتنی غیر ضروری تھی۔"

☆ ☆ ☆

دادا کا اجاڑ پلاٹ بک گیا تھا اور انہوں نے لیڈی مہر سے قرض لی رقم واپس کرنے کے لیے اسے دے دی تھی اور کچھ مزید رقم بھی تاکہ وہ دائم کو دے سکے۔

"دائم کو پیسے میں دوں گی۔"

"اب جب پیسے ہیں تو اسے دے دو امرحہ! تم صرف دل لگا کر پڑھو' بے شک جاب چھوڑ دو..."

"نہیں دادا! جو کام میں نے اپنے ذمے لیے ہیں میں وہ خود ہی کروں گی..."

"تمہارا آخری سال ہے' میرا مشورہ ہے کہ جاب چھوڑ کر پڑھو' تمہیں اب اخراجات کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے' میں نے سب پیسے تمہارے اور دانیہ کے لیے رکھے ہیں۔"

"سب دانیہ کے لیے رکھ دیں مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"تو اب تمہیں کیا چاہیے امرحہ... تمہیں باہر آنا تھا تم آگئیں' اب سے پہلے تک تم بہت خوش خوش مجھ سے بہت ساری باتیں کیا کرتی تھیں' پچھلے دنوں تم اس لیے اتنا اداس رہیں کہ تمہارے بہت سے یونی فیلوز چلے گئے۔ اب نئی وجہ کون سی ہے اداسی کی مجھے بتاؤ' تمہارا آخری سال ہے یونی میں' دل لگا کر صرف پڑھو..."

"یاد ہے مجھے' یہ میرا آخری سال ہے... لگتا ہے دادا زندگی کا ہی آخری سال ہے۔"

"اب ایسی باتیں کرنے لگی ہو...؟"

"معلوم نہیں دادا! لیکن اس سے آگے مجھے زندگی نظر نہیں آتی۔ سب ختم ہوا سا لگتا ہے۔"

"تم مجھے اپنی طرف سے مزید فکر مند کر رہی ہو امرحہ...!"

"دادا! کبھی میں خوش ہوتی ہوں تو فوراً" غم زدہ ہو جاتی ہوں' زندگی اچھی لگتی ہے تو فوراً" بری بھی لگنے لگتی ہے' بھاگتے بھاگتے پھر چلنے کی ہمت رہتی ہے نا چاہ... میری ایک کلاس فیلو کہتی ہے کہ ایسی کیفیات خطرناک ہوتی ہیں۔ آپ کسی کنارے کھڑے ہوتے ہیں اس طرف آتے ہیں نہ اس طرف جاتے ہیں۔"

"تمہیں کس طرف جانا ہے وہ بتاؤ امرحہ...؟" دادا کی آواز کھردری ہو گئی۔

"حسب نسب نہیں ہے میرے پاس کیسے بتاؤں۔" سر پر لٹکتی تلوار کو اس نے گر جانے دیا دونوں کے درمیان سکوت رہا اگلی بات کرنے میں دادا نے کافی وقت لیا۔

"کون ہے وہ...؟" ان کے انداز میں حوصلہ افزائی ناپید تھی۔

"دوست..."

"خرابی دوستی سے ہی شروع ہوتی ہے۔"

"نہیں... خرابی گھٹن سے شروع ہوتی ہے۔"

اگلی بات کرنے میں دادا نے کچھ وقت لیا۔

"تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے؟"

"مجھ سے یہ نہ پوچھیں' جو میں آسانی سے بتا رہی ہوں' وہ میرے لیے اتنا آسان نہیں رہا۔"

"میری سماعت پر یہ جتنا گراں گزرا ہے' تمہاری زبان پر نہیں گزرا ہو گا۔ تم پاکستان آؤ گی تو یہ باتیں ہوں گی۔"

وہ تلخی سے ہنسی۔ "دادا! آپ چاہتے ہیں کہ بس میں پاکستان آجاؤں۔ آپ کی احتیاط اچھی ہے کہ اس طرح دور بیٹھے باتیں کرنے سے بات بڑھ جائے گی۔ میں آپ کے ہاتھ سے نکل جاؤں گی میں' جو یہاں اتنی دور اکیلی ہوں۔ کچھ بھی کر سکتی ہوں اور اگر یہیں کی یہیں رہ گئی تو آپ کیا کریں گے۔"

دادا نے کوئی جواب نہیں دیا...

"میں نے اتنی بڑی بات کہہ دی اور آپ خاموش

ہیں۔"

"تم بھی خاموش رہو امرحہ... میں جان گیا ہوں کہ اس میں ضرور ایسی کوئی خرابی ہے کہ اس کے بارے میں بات کرتے تمہارا انداز ایسا ہے۔"

"وہ ایک عیسائی عورت کا بیٹا ہے اور میں اس کے بارے میں نہیں جانتی وہ ایک اچھا انسان اور ایک اچھا مسلمان ہے بلکہ..."

"امرحہ! میں پاکستان میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔ تمہیں پاکستان آنا ہے۔"

اور دادا نے بھی وہی انداز اپنا لیا جس کی وہ توقع کررہی تھی۔ وہ خاموش ہوئی اس نے محسوس کیا کہ وہ کئی گھنٹے بت بنی بیٹھی تو رہ سکتی ہے' لیکن دادا کے اس انداز کے بعد بولنے کی ہمت نہیں کرسکتی۔ وہ دادا کو بتانا چاہتی تھی کہ اس نے کسی کی پلکوں سے افشاں چن لی ہے۔ وہ جو چار قدم اس سے دور جاتی تھی اور دو قدم اس کی طرف بڑھاتی پھر پلٹ جاتی تھی وہ اب عین اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی ہے اور وہ دادا کو یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ ان کا اس پر اور خود اس کا خود پر اختیار نہیں رہا۔ اور یہ بھی کہ اب اگر وہ پلٹی تو پتھر کی بن جائے گی' نہ وہ ان کے کام کی رہے گی نہ اپنے... اس نے اتنا سب جان لیا ہے تو ہی ایسے دادا سے بات کی ہے نا...

"امرحہ! میں پاکستان میں تمہارا انتظار کررہا ہوں..." دادا کو پھر سے کہنا پڑا۔

اسے دادا کے انداز پر غصہ آگیا' دکھ بھی ہوا اس کا دل چاہا جواب دیے بغیر لاگ آف ہوجائے۔ لیکن وہ بھڑک کر یہ کہنے سے خود کو روک نہیں سکی۔

"آپ چاہتے ہیں میں خود پر زندگی حرام کرلوں اس دروازے پر دستک دوں جو صرف مرنے والوں کے لیے کھلتا ہے۔"

"مرنے کی بات کررہی ہو امرحہ! پھر یہ بھی یاد رکھنا بوڑھوں پر موت بنا کسی تردّد کے جلد مہربان ہوتی ہے۔"

امرحہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔

دادا چلے گئے۔

"کیا ہوا ایسے کیوں بیٹھی ہو؟" سادھنا نے کمرے کے آگے سے گزرتے اسے دیکھا تو اندر آگئی۔

"زندگی میں کون سا مقام ایسا ہوتا ہے سادھنا کہ لگنے لگتا ہے کہ بس اب زندہ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے؟"

"جب ہم کچھ ایسا کر گزریں جو ہمیں نہیں کرنا چاہیے..." سادھنا کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔

"ایسا کیا؟"

"میں دوسروں کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن میں نے اپنے لیے ایسا محسوس کیا تھا' آریان کے پاپا سے پسند کی شادی کی تھی۔ ہم دو مختلف ذاتوں سے تھے۔ میرے گھر والے نہیں مان رہے تھے' پھر ہم نے خود شادی کرلی اور جب ہمیں آریان کی بیماری کے بارے میں معلوم ہوا' مجھے لگا مجھے میرے ماتا پتا کی بددعا لگی ہے۔ میں ان سے پہلے ہی معافی مانگ چکی تھی' وہ مجھے معاف کرچکے تھے لیکن میری ماں نے ایک بات کہی تھی' وہ بولیں "تم نے تو اپنی خوشی جی لی اور اب ہمیں اپنا دکھ مرن سے تک کاٹنا ہے۔ ہم تمہارے دشمن نہیں تھے۔ بس سماج میں سر اٹھا کر چلنا تھا۔ تم نے ہمارا سر ہی کاٹ ڈالا۔ دھن دولت قسمت سے' مان سمان سماج سے۔"

"غلط وہ نہیں تھے' غلط میں بھی نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں پر مجھے ایسا لگتا ہے امرحہ کہ ماں باپ اور اولاد اگر آمنے سامنے ہوں اور دونوں ہی غلط ہوں' اور دونوں ہی ٹھیک... تو بھگوان ان دو میں سے ماں باپ کا ساتھ دیتا ہے' کیونکہ جو مان سمان ان کا ہوتا ہے وہ ہمارا نہیں ہوتا... اس وقت میں نے سوچا تھا۔ میرے پاس رمیش نہ ہوتا آریان بھی نہ ہوتا۔ میرے ماتا پتا کے پاس ان کا مان سمان ہوتا۔"

امرحہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔

اگلے دنوں دادا نے اس سے بات چیت ہی بند کردی۔ وہ کتنی ہی فون کالز کرتی وہ فون نہ اٹھاتے لاگ آن نہ ہوئے' یہ ان کی ناراضی کا عملی ثبوت تھا'

صرف ابھی بات کرنے پر امرحہ کو ایسی صورت حال کا سامنا تھا۔ اس نے فیصلہ سنا دیا تو وہ جان دے کر ثبوت دیں گے کہ دیکھو دو ضدیوں میں سے اس بڈھے ضدی کی جیت ہوئی۔

دانیہ نے اس سے بات کی۔

"کیا کہا ہے دادا سے تم نے ایسا... وہ تو کسی سے بات ہی نہیں کر رہے۔"

"میں نے ان سے پیسے لینے سے انکار کیا تھا۔"

"اب وہاں جا کر تم اتنی بڑی ہو گئی ہو امرحہ! کہ دادا کو انکار کرنے لگی ہو۔ تمہاری تو جان ہے دادا میں... ہے نا؟"

دانیہ طنز کر رہی تھی' یہ بات اسے تھپڑ کی طرح لگی۔ وہ اعلان کیا کرتی تھی کہ دادا اس کی جان ہیں تو اب... اس جان کا خیال کیوں نہیں رہا اسے... وہ اسے جذباتی بلیک میل نہیں کر رہے تھے بس پرانے وقتوں کے آدمی تھے تو اتنی بڑی بات سنبھال نہیں سکے۔

عیسائی ماں' لاپتا باپ... گھر نہ خاندان' نام نہ نشان...

وہ ان پیغامات کو کس دل سے عالیان کو دیتی جو کئی راتوں سے وہ لکھ رہی تھی۔ وہ دادا کی جان پر رحم کرتی تو اپنی جان کا کیا کرتی... دادا سے بات کرنے سے پہلے ہی تو اس نے ان پیغامات کو عالیان کو دینے کی کوشش کی تھی اور اچھا ہی ہوا اس نے انہیں نہیں لیا۔

☆ ☆ ☆

"یہ تمہارے لیے چند پیغامات میں نے بہت جرات سے لکھے ہیں پلیز انہیں پڑھ لو۔"

"انہیں بھی سیف روم میں جا کر لگا دو۔"

"دنیا دکھاوے کے لیے نہیں ہیں یہ عالیان...!"

"ان میں جو لکھا ہے' وہ میں ہارٹ راک میں سن چکا ہوں۔"

"ان میں جو لکھا ہے' وہ سنا گیا ہے نہ کہا..."

"امرحہ! اب تمہیں جو کہنا ہے' وہ سننے کے لیے میں خود کو موجود نہیں پاتا۔"

"تم کس قدر ضدی ہو عالیان!"

"ہاں۔ میں بہت ضدی ہوں۔"

"تم نے کہا تھا تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

"کرتا تھا اور یکو اس کر رہا تھا۔"

"جھوٹ بول رہے ہو نا تم۔ جھوٹ... ایسی ہی بات تھی تو سائی کے منہ سے پال کے حملے کا سن کر تم اپ سیٹ کیوں ہو گئے تھے۔ پال مجھ پر دوبارہ حملہ نہ کر دے تم اسٹور سے گھر تک مجھے چھوڑنے کیوں آتے رہے تھے۔ رافیل کو تم نے جھیل میں دھکا دے دیا کیونکہ وہ بار بار مجھے تنگ کر رہا تھا۔ کارل کو تم نے فائر کر کے گرایا تھا کہ میں ریس جیت لوں... اتنے سارے سچ ہیں اور تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"تم خوش فہمی میں مبتلا ہو امرحہ! کارل پر فائر کرنے کے لیے مجھے ویرا نے کہا تھا' وہ جانتی تھی کہ اگر تم ہار گئیں تو دوبارہ کبھی کسی سے مقابلہ نہیں کر سکو گی ...وہ ہر حال میں تمہیں جیتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ کارل کے ساتھ کوئی بھی یہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھا تو میں نے کر دیا صرف ویرا کے لیے۔"

"صرف ویرا کے لیے۔" امرحہ کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔

"تم نے کبھی یہ غور ہی نہیں کیا کہ دوسرے تمہارے لیے کیا کچھ کرتے ہیں' انہیں تمہاری کتنی فکر ہے۔ تمہیں صرف اپنی نادانی کی فکر ہے۔ پال نے تم پر حملہ کیا۔ مجھے یہ جان کر دکھ ہوا تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا مجھے دکھ ہوتا۔ کارل نے خاص جا کر پال کو سمجھایا۔ یعنی اسے بھی دکھ ہوا... ایسا ہونا نارمل ہے اور جے پیٹرسن کے کہنے پر ہم تین لوگ تمہیں گھر تک چھوڑتے رہے تاکہ پال دوبارہ ایسی حرکت نہ کرے۔ خود جے پیٹرسن کتنی ہی راتیں یہ ڈیوٹی دیتا رہا۔ یہ میری ڈیوٹی تھی امرحہ! اور رافیل کو صرف اس لیے دھکا دیا کیونکہ وہ پرانک کا ماسٹر مائنڈ تھا۔ اس نے ماما کو اداس کر دیا تھا۔"

"یہ سب جھوٹ ہے عالیان... یہ سب تم خود کرنا چاہتے تھے۔ خود..."

"جو میں خود کرنا چاہتا ہوں وہ صرف اتنا ہے کہ میں تم سے دور رہنا چاہتا ہوں۔"

"جن سے ایک بار محبت کی جاتی ہے ان سے نفرت کرنے کا گناہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"جن سے ایک بار دھتکار ملے ان کے پاس پلٹ کر جانے کا جرم نہیں کرنا چاہیے۔ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی پریڈ میں تمہارے پیچھے آنا تھا۔ میں تمہارا کھلونا نہیں ہوں۔ امرحہ!"

"تمہیں کیا پتا! میں کس کس کا کھلونا ہوں۔" وہ سوچ کر رہ گئی اور کہہ نہ سکی۔

"یونیورسٹی بھری پڑی ہے کسی کو بھی جا کر دوست بنالو۔" اس کا انداز کبھی بھی ایسا نہیں ہوا تھا جیسا اب ہو گیا تھا۔

امرحہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ "دوست" ہاں وہ دوست.... دوستی ہی تو کر رہی تھی تب بھی۔ اب بھی....

"ٹھیک ہے وہ دادا سے بات کرے گی۔" اس نے اپنی اور اس کی آخری ملاقات میں سوچا تھا۔ وہ بات کر چکی تھی۔ اور دادا کے ایسے ناراض ہونے پر سوچ رہی تھی کہ ابھی وقت اس کے ہاتھ میں ہے۔

"وقت اس کے ہاتھ میں ہے۔" یہ اس کا اپنا خیال تھا کیونکہ "برننگ مین" جلنے کے لیے تیار کیا جا چکا تھا۔ وہ پورے کا پورا جل جائے گا.... آگ کی لپٹیں اس میں سے اٹھیں گی اور وہ دیکھتی رہ جائے گی۔

"بلیک روک ڈیزرٹ" میں ہونے والے برننگ مین طرز کا فیسٹیول ایک دوسری کمپنی مانچسٹر شہر سے ذرا دور کروا رہی تھی۔ یہ فیسٹیول صرف ایک رات پر مشتمل تھا جو ایک بہت بڑے میدان میں ہو رہا تھا۔ وہ جاب سے گھر جا رہی تھی کہ این اسے لینے آ گئی۔ ویرا اسے پہلے ہی جانے کے لیے کہہ چکی تھی لیکن وہ نہیں گئی وہ اپنے آپ میں اتنی گم صم سی ہو گئی تھی کہ نہ کسی سے بات کرنے کو دل چاہتا نہ ہی ملنے کو....

"چلو وہاں ساری یونی اکٹھی ہوئی ہو گی 'مرے جا رہے تھے سب وہاں جانے کے لیے۔"

"عالیان بھی ہو گا وہاں؟" اس نے پوچھا۔

"ہونا تو ضرور چاہیے۔"

عالیان بھی وہاں ہو گا وہ سوچ کر این کے ساتھ آ ہی گئی۔ ایک سو بیس فٹ اونچا برننگ مین میدان کے عین درمیان میں ایستادہ تھا۔ آس پاس آگ کے کئی کرتب ہو رہے تھے ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ کوئی منہ سے نکال رہا تھا' کوئی ہاتھ میں لے کر اچھال رہا تھا کوئی کمر کے گرد گھما رہا تھا۔ کہیں آگ کی سائیکل چلائی جا رہی تھی کہیں آگ سے جلتی تنی رسی پر چلا جا رہا تھا اور کہیں آگ سے جلتے دائروں میں قلابازیاں لگائی جا رہی تھیں۔ ہر دس قدم پر آگ ایک نئے انداز سے موجود تھی.... رش بہت زیادہ تھا' وہ این اور این کی ایک دوست کے ساتھ ساتھ گھومتے رہے' وہ عالیان کو ڈھونڈ رہی تھی۔ این نے بھی منہ میں تیل ڈال کر آگ منہ سے نکالی اور ایسا کرتے اس کی بھنوؤں کے بال صفائی سے صاف ہو گئے۔

"کتنی پیاری لگ رہی ہو اب تم' ویسے ہی تمہاری بھنوؤں پر چار بال تھے وہ بھی برداشت نہیں ہوئے تم سے۔" این کی دوست ہنسے جا رہی تھی۔

"تم بھی کرو امرحہ؟" امرحہ نے ناں میں سر ہلایا۔

"کب لگے گی اسے آگ؟" امرحہ نے پوچھا۔

"بارہ بج کر ایک منٹ پر...."

"یورپ والے بھی اچھے فارغ لوگ ہیں پتا نہیں کیا کیا کرتے رہتے ہیں۔" امرحہ نے تبصرہ کیا سب بہت انجوائے کر رہے تھے لیکن اسے کوئی مزا نہیں آ رہا تھا۔

"دنیا ان ہی کھیل تماشوں سے بچی ہے امرحہ....!"

"اچھا! ویسے تم آج کل کس جاپانی فلسفی کو پڑھ رہی ہو؟" امرحہ چڑ گئی۔

"ابن اون کو۔" این نے دانت نکالے جو امرحہ کو اچھے لگے چھوٹے چھوٹے بچوں سے۔

"یہ تمہارے دودھ کے دانت ہیں نا؟"

"نہیں! دانت کے دانت...." اس نے اور زیادہ دانت نمایاں کر کے کہا۔

"بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری...." امرحہ ہنس

ہی دی۔

"بالکل جیسے تمہاری سائیکل چلتی ہے...."

امرحہ کی نظر کارل پر گئی جو منہ سے آگ نکال رہا تھا "آگ' آگ کو آگ لگا رہا ہے.... خدا کرے آگ ہی لگ جائے۔"

این کارل کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ کارل کافی کرتب دکھا رہا تھا آگ سے.... لوگوں کی ایک بڑی تعداد اسے دیکھ رہی تھی۔ سائی بھی اسے وہیں مل گیا۔

"تم نے تو کہا تھا تم نہیں آؤ گی؟" سائی کچھ خوش نہیں ہوا تھا اس کے وہاں آنے سے۔

"بس این لے آئی.... عالیان کو دیکھا ہے تم.... آیا ہے وہ....؟"

"آیا تو ہے وہ اب پتا نہیں کس طرف ہے .... تم نے وہ ڈھانچہ دیکھا ہے. جس پر سب اپنی زندگی کے پچھتاوے لکھ رہے ہیں.... پھر وہ ڈھانچہ بھی جلایا جائے گا.... آؤ وہاں چل کر کچھ لکھیں...."

وہ سائی کے ساتھ آ گئی.... ایک روتے بسورتے آدمی کی شکل کا ڈھانچا تھا۔ صرف سر جو میدان میں پڑا تھا اور اتنا بڑا تھا کہ کوئی سو افراد بیک وقت اس پر اپنے پچھتاوے لکھ رہے تھے۔

"میں تاعمر پچھتاؤں گی کہ میں نے تمہارا بہت دل دکھایا' میں تمہارے لیے بہت زیادہ تکلیف کا باعث بنی عالیان۔"

سائی کو وہیں چھوڑ کر وہ عالیان کو ڈھونڈنے لگی وہ تو اسے نظر نہیں آیا ویرا اسے پشت سے نظر آ گئی۔ وہ کسی کے کان میں بات کر رہی تھی اور جب وہ ذرا پیچھے ہوئی تو امرحہ کو معلوم ہوا کہ وہ کان عالیان کا تھا۔

دونوں نے سیدھے کھڑے ہو کر منہ سے آگ نکالی ایک ساتھ پھر ان کے دو کلاس فیلوز نے نکالی پھر ان دونوں نے نکالی جو کافی دور تک گئی۔ شاید ان دونوں کے گروپس میں کوئی شرط لگی تھی۔

مجمع میں کھڑی امرحہ اکیلی ہو گئی۔

جب وہ منہ سے آگ نکالنے سے فارغ ہو چکے تو ویرا نے عالیان کو کھڑا ہونے کا اشارہ کیا اور ہاتھ میں فائر پوئی (Fire Poi) تھام لی اور اسے اپنے ساتھ تیزی سے گول گول گھمانے لگی۔ آگ کی لہریں اس کے جسم کے ساتھ گول دائروں میں مختلف اشکال میں کئی رنگوں میں بنتی چلی گئیں.... وہ اسے کمر کے پیچھے لے گئی' سر سے اوپر' دونوں پیروں کے نیچے سے پھر سر کے اوپر....

فائر پوئی اس کے وجود کے ہم آہنگ ہو گئی وہ اتنی تیزی اور کمالیت سے اس کے نت نئے کرتب دکھا رہی تھی کہ لگتا تھا کہ وہ ساری عمر صرف اسی کھیل کو کھیلتی رہی ہے اس نے صرف اسی کو مشق کی ہے۔

اگر وہاں اس کے سامنے عالیان موجود نہ ہوتا تو امرحہ ضرور داد و تحسین سے اس کی طرف دیکھتی.... لیکن اب جتنی آگ ویرا کے ہاتھ میں تھی اس سے کہیں زیادہ امرحہ کی نظر میں تھی.... امرحہ کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کی سبھی حسیں انگشت بدنداں تھیں۔

اب ویرا نے عالیان کے گرد گھومنا شروع کر دیا.... آس پاس موجود پوئی فیلوز ان دونوں کو دیکھنے لگے.... امرحہ نے اپنے دل پر آگ کی لپٹیں محسوس کیں.... اس نے ذرا غور کیا اپنی غلط فہمی دور کرنی چاہی' لیکن وہ اور بڑھ گئی ویرا نے وہی لباس پہن رکھا تھا جو اس نے پینٹ ہاؤس کے شوکیس سے ڈرا کیا تھا اور جو بن کر اسے اتنا اچھا نہیں لگا تھا وہ ایک دوبارا سے یونیورسٹی پہن کر جا چکی تھی پھر وہ ایک عرصے تک اس کی وارڈ روب میں پڑا رہا امرحہ کو لگتا تھا وہ اب اسے پھینک دے گی.... لیکن اسے پھینکا نہیں گیا تھا۔

عالیان کھڑا تھا اور ویرا کے کرتب ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے اور پھر وہ رک گئی عین عالیان کے سامنے' بہت کم.... بہت ہی کم فاصلہ رکھ کر.... اس نے کچھ کہا۔

عالیان خاموش اسے دیکھتا رہا۔

اتنی دور سے.... اتنی زیادہ دور سے بھی اسے یہ سننے میں ذرا مشکل نہ ہوئی کہ ویرا نے اس سے کیا کہا ہے۔

"میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں.... میرے ساتھ روس چلو گے پاپا سے ملنے؟" بارہ گھنٹے بجے.... اور مجمع میں سکوت چھا گیا اور پھر بارہ ایک کا گھنٹہ بجا....

جمع نے سلوٹ کو شور سے توڑا... سٹرٹ اوپچ
ڈھانچے میں آگ بھڑکی اور وہ جلنے لگا... سر سے گردن
... گردن سے سینے تک... پھر پورے کا پورا... اس
آگ نے قیامت کا منظر برپا کر دیا... اس سے نکلنے والی
لپٹیں دنیا کو سمیٹتی ہوئی لگیں جیسے تباہی کا نقطہ آغاز ہو
اور آبادی کاری کا نقطہ انجام...

سب جل جانے کا وقت آچکا ہو۔

عالیان نے ویرا کے ہاتھ کو نرمی سے چھوا اور
مسکرایا۔

اور اسی پر بس نہیں ہوئی۔ ویرا نے یونی فیلوز کی
طرف گھوم کر تالی بجائی اور انہیں متوجہ کیا اور عالیان
کی طرف اشارہ کیا اور بولنے لگی اور پھر وہ زمین پر
عالیان کے سامنے بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور
تیز تیز بولنے لگی۔ اس کا انداز بچکانہ تھا اور دلربا بھی
...

یونی فیلوز دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے اور
پھر عالیان نے کچھ کہا کہ تالیاں بجنے لگیں اور ویرا
کھڑی ہو کر مسکرانے لگی... یہ وہی مسکراہٹ تھی جو
پہلے کبھی ویرا کے ہونٹوں پر دیکھی نہیں گئی تھی۔

سائی اس کے عین پیچھے کھڑا تھا "امرحہ! یہاں
کھڑی کیا کر رہی ہو؟" سائی کی آواز لرز رہی تھی۔

امرحہ نے مڑ کر اسے دیکھا سائی اس کی حالت دیکھ
کر ڈر گیا۔

"ویرا عالیان سے کیا کہہ رہی ہے۔ تم جانتے ہو...
ہے نا؟"

سائی نے اس سے آنکھیں چرائیں اور وہ جان گئی
کہ سائی جانتا ہے۔

"ویرا تمہارے پاس آئی تھی سائی... کچھ کہا تھا
اس نے؟" امرحہ چلا اٹھی۔

سائی خاموش کھڑا رہا اور وہ کیسے کسی کا راز کسی اور کو
دے سکتا تھا۔

امرحہ جھٹکے سے پلٹی۔

"زندگی میں سب کو آگے بڑھنا ہوتا ہے امرحہ!"
سائی نے نرمی سے کہا۔

امرحہ کے آنسو اس زمین پر گرنے کے لیے جہاں الاؤ
ہی الاؤ دہک رہے تھے۔ "تو عالیان ویرا کے ساتھ آگے
بڑھ رہا ہے..." کہانی کا یہ وہ موڑ تھا جو اس کے دل کی
آنکھ سے اوجھل تھا۔

"اگر ہم کچھ نہیں پا سکتے تو ظاہر ہے اسے کوئی اور پا
لیتا ہے۔" سائی کے لیے مشکل تر ہو گیا اس کی طرف
دیکھ کر بولتے رہنا۔

امرحہ تیزی سے آگے بڑھی۔

"کہاں جا رہی ہو امرحہ؟"

"گھر..."

"اتنی جلدی! دیکھو ابھی تو برننگ مین جلنا شروع
ہوا ہے۔" اس نے اس کا دل بہلانے کی اپنی سی
کوشش کی۔

"وہ تو کب کا جل چکا..." وہ آگے بڑھ گئی رش کو
پرے کرتی ہوئی رش سے پرے ہوتی ہوئی۔ سائی اس
کے پیچھے لپکا لیکن اس کی رفتار کے ساتھ اسے پا نہ سکا۔

ایک چنگاری اڑتی ہوئی... اس کے فرشی دوپٹے پر
گر گئی۔

"یہ تو ہونا ہی تھا..." وہ بڑبڑائی۔

"کیا یہ ہونا تھا؟" وہ کراہی۔

وہ ساری یادیں ذہن سے کھرچ ڈالے گی صرف
اس ایک منظر کو ذہن سے مٹانے کے لیے۔ جو اس نے
ابھی ابھی دیکھا تھا... ویرا اور عالیان... عالیان اور ویرا

وہ اسے پسند کرتی تھی وہ یہ جانتی تھی وہ اسے شادی
کے لیے پسند کرے گی' وہ یہ نہیں جان پائی۔

"امرحہ تمہارا دوپٹہ!" این چلائی۔

اس کے دوپٹے کا فرشی پلو آگ پکڑ چکا تھا اس کے
بال بھی پیچھے سے جل چکے تھے۔

"کیا ہوا نظر نہیں رہا۔" این اس کا دوپٹہ زمین پر
رگڑ رہی تھی۔

"آ رہا ہے نظر... جل گئی ہوں میں..."

سب ہاؤ واؤ کر رہے تھے' چنگاریاں اڑ رہی تھیں

.... ہر طرف آگ ہی آگ تھی....

"امرحہ سنو.... کیا ہوا ہے تمہیں؟" این نے اس کی حالت پر غور کیا۔

اسے جواب دیے بغیر وہ چلی آئی' آگ سے بھرے میدان کو پار کرکے.... اس سے باہر نکل کر اسے ٹیکسی کے لیے دور تک چل کر جانا تھا وہ لمبی سڑک پر پیدل چلنے لگی اس کی پشت پر برننگ مین ایستادہ تھا.... اسے لگا وہ ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے.... وہ دیکھو وہاں بھی کوئی جل رہا ہے اور مجھ سے زیادہ جل رہا ہے.... وہ مجھ سے پہلے جل کر راکھ ہو جائے گا۔

اسے پیدل چلنے میں کوئی قباحت نہ ہوئی کیونکہ اسے معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کہاں کیا کر رہی ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے محسوسات چلا رہے تھے کہ اس نے دیر کر دی.... اس کی آنکھ کی پتلی اسے بار بار چند مناظر دکھا رہی تھی۔

وہ جھک کر اس کا ماسک اٹھا رہا ہے.... ویرا اس کے آگے جھکی ہوئی ہے.... وہ ہزاروں کی پریڈ میں اسے ڈھونڈ رہا ہے.... وہ ہزاروں کے مجمع میں ویرا کا ہاتھ نرمی سے تھپک رہا ہے.... وہ اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود رہا ہے وہ اسی کھڑکی سے رخ موڑے جا رہا ہے.... دور.... بہت دور.... وہ دور جا چکا ہے۔

اور یہ رات کے آخری پہر کا قصہ ہے۔

آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے اس نے باکس کھولا اور سب سے پہلی چیز جو اس کے ہاتھ نے اٹھانی چاہی وہ رول ہوا کاغذ تھا۔ اس نے اس کا ربن کھول کر اسے اپنے سامنے پھیلا لیا اور گھٹنوں کے بل نیچے ایسے بیٹھ گئی جیسے عقیدت کے پیش نظر ایسا کرنا لازم تھا۔

"سویڈن جاتے میں نے ٹرین میں بیٹھے بیٹھے اسے بنانا شروع کیا تھا پھر جہاں جہاں میں گیا یہ میرے ساتھ رہی.... میں نے ہر خوب صورت جگہ رک کر اس کی نوک پلک سنواری.... دریا کے ساتھ ساتھ چلتے میں نے ان بیلوں میں رنگ بھرے' چار اطراف پہاڑوں میں گھر کر مجھے ان بیلوں پر پھول بنانے کا خیال آیا اور ہزاروں کے ہجوم میں گھومتے میں نے یہ سوچنے اور فیصلہ کرنے میں کافی وقت لیا' یہ زمین کو چھوئے گی یا نہیں.... اور کیا تم نے کبھی پھولوں کو کمر کے گرد لپیٹا ہے.... دیکھو اس فراک پر کمر کے گرد لپیٹے یہ کیسے لگ رہے ہیں...."

اس نے اس تصویر کو ان سب خوب صورت جگہوں پر بیٹھ کر بنایا تھا جہاں جہاں وہ چاہتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہو.... وہ اسے ساتھ لے گیا تھا۔ "سویڈن سے صرف یہی لائے ہو میرے لیے؟"

"یہ صرف نہیں ہے۔" اس کا منہ بن گیا وہ بہت اداس ہو گیا۔

"تم نے کبھی آرٹ کی کوئی کتاب نہیں پڑھی' ہر تصویر بولتی ہے۔" وہ اداسی سے ہی گویا ہوا۔ جو کہانی وہ لکھ کر لایا تھا امرحہ نے اسے نہیں پڑھا تھا۔

"مجھے انسان کی زبان سمجھ میں آجائے یہی کافی ہے"۔

اداسی کو جھٹک کر اس نے ایک نئی داستان کراس بیگ میں سے نکالی اور ایسا کرتے وہ بہت خوش تھا.... اداسی ختم ہو چکی تھی.... جیسے وہ جانتا تھا یہ جادو ضرور چلے گا۔

وہ ایک لکڑی کا پل تھا جو بہت بڑی جھیل کے اوپر بنا تھا۔ پل کے اس طرف ایک لڑکا کھڑا منہ پر ہاتھ رکھے کسی کو آواز دے رہا تھا۔ پل کے دوسری طرف جنگل اور پہاڑ تھے ایک درخت کے پیچھے ایک لڑکی اپنی ہنسی دباتی چھپی کھڑی تھی۔

وہ کتنی زبانیں اور داستانیں اپنے ساتھ لایا تھا' وہ اسے کیا کچھ سنا رہا تھا کیا کچھ بتا رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے گھاس پر اس ماڈل کو نکال کر رکھا امرحہ نے اپنا سانس کم ہوتے پایا۔

"تو کیا وہ ابھی اس سے سوال کر دے گا.... اور اسے

انکار کر دینا ہو گا جیسا کہ اس نے سوچ رکھا تھا... یہ خواب اتنی جلدی ختم ہو جائے گا... پھر وہ ایسے اس کے آس پاس نہیں رہے گا۔"

"یہ کس بچے کے لیے لائے ہو؟" اس نے سنگ دلی سے اس کا خواب توڑ دیا۔

"بچے؟" وہ دیر تک حیران رہا اور جیسے اس کا ننھا سا دل بھی ٹوٹ گیا۔ زمین سے پھوٹتی' پھولوں سے لدی دلکش رنگوں والی بیلیں لپٹی تھیں۔ جیسے وہ قدیم لیکن بار بار دہرائی جانے والے داستان کی شاہی ریاست کا محل ہو' ایک لڑکی جس کے پس منظر میں یہ سب تھا زمین کو چھوتی پوشاک جو کمر سے چست اور پھولوں سے لپٹی تھی میں ملبوس چمکتے سورج کو شرارت سے دیکھ رہی تھی اس کا ایک ہاتھ گول ہیٹ کے کنارے پر تھا جو اسے سر سے گرنے کے قریب تھی... لڑکی کے لمبے بال اس کی پشت پر بکھرے تھے...

وہ امرحہ تھی۔

"کیسی ہے؟" اس نے بہت شوق سے پوچھا اس خیال کے متعلق پوچھا جس کی کہانی وہ بنا کر لایا تھا "اچھی ہے..."

"تم ذرا تفصیل سے دیکھو..." اس کی آواز کمزور ہو گئی۔

"بہت تفصیل سے دیکھ چکی ہوں۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

تصویر میں یونی کے اندر سے ایک تقریباً" نہ نظر میں آنے والا سایہ لڑکی کی طرف آتا نظر آتا تھا جو پھولوں اور بیلوں کا حصہ لگتا اور جسے پہلی نظر میں دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ امرحہ نے خود کو دیکھنے سے پہلے اس عکس کو دیکھ لیا تھا۔ "وہ عالیان تھا۔" جس پر اس نے انگلی نہیں رکھی تھی اس پر امرحہ نے نظر رکھ لی تھی۔

اسے ایک پل لگا تھا سمجھنے میں وہ سب جان گئی تھی۔ وہ اس کی کھڑکی کے نیچے کھڑا مسکرا کیوں رہا تھا۔ وہ یونی میں اس کے پیچھے پیچھے کیوں رہتا ہے وہ کہیں سے بھی گزرے وہ سامنے کیوں آجاتا ہے وہ شو اسٹور میں اس کی منت کرنے کیوں آیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ چلے... مانچسٹر میں پہلی برف دیکھتے ہی اس نے اسے اپنے چار اطراف محسوس کرتے ہی... برف پر گر کر بیٹھے اس نے سب جان لیا تھا اس کے ہاتھ میں تھم اس کی ہر جنبش ہر جملے کا جواب آگیا تھا وہ وہ کہانی سمجھ گئی تھی جو ابھی سنائی نہیں گئی تھی۔

اسی وقت وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ وہ اپنے پیچھے اس کے قدموں کی چاپ نہ سنتی تو بے چین ہو جاتی' وہ سامنے نہ آتا تو کوئی اسے سامنے آتا اچھا نہ لگتا' وہ اسے ڈھونڈ نہ لیتا تو وہ خود اس کے قریب پہنچ جاتی جس جگہ وہ اسے ہائے کہنے کے لیے کھڑا ہوتا اس جگہ کو وہ بہت دور فاصلے سے ہی اپنی نظروں میں رکھتی... وہ فاصلوں سے اسے دیکھتی اور قریب جانے پر لاپروا بن جاتی...

"تو یہ کھلونا نہیں ہے؟" اس نے مزید اس کا دل توڑ دیا۔ وہ اس کی مشق بہت پہلے سے ہی کرتی رہی تھی۔

"نہیں... یہ ایک تصور کی عملی صورت ہے امرحہ... اسے چھوا جا سکتا ہے' سمجھا جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے... دیکھو پل کے اس طرف کھڑا یہ لڑکا اس لڑکی کو آواز دے رہا ہے' جس کے ساتھ اسے مچھلی کا شکار کرنا ہے یا جھیل کے پانی میں پیر ڈبو کر بیٹھنا ہے اور سورج کو چڑھتے اور ڈھلتے دیکھنا ہے یا جنگل کی طرف ہاتھ پکڑ کر لے جانا ہے اور تتلیوں کے پیچھے بھاگنا ہے۔"

"تو کھلونا ہی ہوا نا' تتلیوں کے پیچھے بچے ہی تو بھاگتے ہیں۔"

"بچے نہیں امرحہ! معصوم دل تتلیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں' کیا تمہارا دل نہیں چاہتا' سارا مانچسٹر' تمہارا لاہور' یہ ہماری دنیا ہر رنگ کی تتلیوں سے بھر جائے' ہم ان میں گھر جائیں' وہ ہمارے ساتھ اڑیں' ہمیں اپنے ساتھ اڑائیں..."

"تم بزنس کے اسٹوڈنٹ ہو نا عالیان؟"

"میرا دماغ بزنس کا اسٹوڈنٹ ہے دل نہیں... تم

کتنی معمولی باتیں بھی نہیں سمجھتیں... چلو کوئی بات نہیں میں تمہیں ہر بات تفصیل سے سمجھا سکتا ہوں۔" اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ ہر بات وہ تفصیل سے سمجھ چکی تھی... اس وقت وہ یہی چاہتا تھا کہ پل کے اس طرف کھڑا عالیان جو اسے آواز دے رہا ہے تو اس کی آواز پر وہ درخت کے پیچھے سے نکل کر چلتی اس کے پاس آجائے اور کہے۔

"لو میں آگئی۔ تم اپنی بے سُری آواز کو تھوڑا سریلا کر کے آواز نہیں دے سکتے..."

"جب تم میرے پاس نہیں ہوتیں تو یہ بے سری ہو جاتی ہے... اب سنو کیا اس میں سُر آئے..."

"ہاں اب کچھ بہتر ہے..." ہیٹ کو سر پر جمائے وہ اس سے آگے چلے گی۔

"تمہاری ٹوکری میں کیا ہے؟" وہ اس کے پیچھے آئے گا... ضرور آئے گا...

"چیری!" وہ مڑے بغیر ادا سے کہے گی۔

"اتنی کم چیری؟" اسے صرف بات کرنے کا بہانہ چاہیے ہو گا۔

"میں اتنی ہی کھاتی ہوں... ہاہاہا... تمہارے نہیں لائی میں۔"

"لیکن میں تو تمہارے لیے لایا ہوں؟" وہ لینے سے زیادہ صرف دینے پر تیار رہے گا۔

"کیا؟" اب وہ پلٹے گی اسے دیکھے گی۔

"یہ..." اس نے مٹھی کھول دی اور تتلی اڑتی ہوئی اس کے سر پر سے گزر گئی وہ سمجھ گئی کہ وہ کیا سوچتا ہے... تتلیوں کے پیچھے بھاگنے کا بہانہ کرتے دراصل اس کے پیچھے بھاگنا... اسے تتلیاں نہیں چاہیے تھیں ان کے پیچھے بھاگتی امرحہ چاہیے تھی... اسے مچھلیوں سے مطلب نہیں تھا... اسے اس کے ساتھ بیٹھنے سے غرض تھی... اسے پھول اچھے لگتے تھے اگر وہ اس کی پوشاک میں گندھے ہوں، اس کی کمر سے لپٹے ہوں یا اس کے سر پر تاج صورت رکھے ہوں۔

"یہ جو تمہیں کھلونا لگ رہا ہے امرحہ جس دن یہ تمہیں کھلونا نہ لگے مجھے بتانا۔"

"اچھا! تم کیا کرو گے...؟" اس کا دل ڈوب گیا۔

"جس دن اسے سمجھنے کی سمجھ لے کر آؤ گی اس دن یہ سوال نہیں کرو گی۔"

"اگر مجھے کبھی بھی سمجھ نہ آئی تو..." اپنے خوف کو اس نے زبان دی۔

"ایسا ہونا ممکن نہیں... یہ پھر کوئی بددعا ہی ہو گی جو تمہاری عقل کو دی گئی ہو گی۔" بددعا اس کی عقل کو نہیں قسمت کو دی گئی تھی... اس نے درخت کے پیچھے کھڑی لڑکی کو لے جا کر اس کے ساتھ کھڑا کر دیا... دونوں کو جھیل کے کنارے بٹھا دیا... سورج ڈھلنے لگا... وہ وہیں بیٹھے رہے... وہ یہ چاہتا تھا تو وہ بھی یہی چاہتی تھی... لیکن اس کا چاہنا وہ بند کمرے میں ایک عملی تصور کے ساتھ ہی کر سکتی تھی... اس نے مانا کہ وہ ایک نحس وجود ہے، وہ عالیان کے لیے نحوست لے کر آئی تھی... ایک ایسے شخص کے لیے جو بچوں سے زیادہ معصوم تھا جو اس کے لیے نت نئی کہانیاں بنتا تھا اور ایسا کرنے وہ کتنی ہی راتیں جاگتا رہا ہو گا۔

☼ ☼ ☼

"اچھا چلو ایک کہانی سنو۔" رات کو یہ بہانا کرتے

کہ وہ بس اس کے اسٹور کے سامنے سے گزر رہا تھا وہ گھر تک کے لیے اتفاق سے اس کا ہم راہی بن گیا اور راستے میں اسے کہانی سنانے لگا۔

"تم سب کو کہانیوں کا اتنا شوق کیوں ہے... سنتے بھی ہو سناتے بھی ہو..." کہانی کا بہانا کر کے وہ رات کو اس سے ملنے آیا تھا یا کہانی کے لیے بہانہ بنایا تھا امرحہ اس سے پوچھ لینا چاہتی تھی۔

"ہم فرشتے ہیں نا...!"

"فرشتے...؟"

"ہاں، بچے فرشتے ہی تو ہوتے ہیں..." شٹل کاک سے کتنی ہی دور پہلے وہ اسے بس سے لے کر اتر گیا۔

"کتنے اسٹاپ پہلے اتر گئے تم!" وہ چلا اٹھی۔

"ڈاکٹرز کہتے ہیں اگر رات کو چہل قدمی کر کے سویا جائے تو بہت گہری نیند آتی ہے۔"

"یقیناً" ان ڈاکٹرز میں سے ایک ڈاکٹر عالیان ہوں گے۔"

"ہاہاہا۔۔۔ تمہیں میری باتوں پر یقین کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔"

"مجھے تمہارے جھوٹ پکڑنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"چلو کہانی سنو۔ ایک جادوگرنی نے ایک شہزادے کو جادو سے غائب کر دیا۔۔۔ غائب مطلب وہ موجود ہے لیکن کسی کو دکھائی نہیں دیتا' وہ سن سکتا ہے لیکن بول نہیں سکتا۔ اسے ایک شہزادی سے محبت ہوتی ہے لیکن شہزادی اس سے لاعلم ہوتی ہے۔ جادوگرنی شہزادے سے کہتی ہے کہ اگر اس نے شہزادی کو اپنی محبت کا یقین دلا دیا تو وہ اس کے جادو سے آزاد ہو جائے گا۔"

"اچھا پھر۔۔۔؟"

"پھر اب تم پوری کرو۔"

"کیا؟"

"کہانی۔۔۔"

"پر کہانی تو تم سنا رہے تھے۔"

"یہ ایسی ہی کہانی ہے نا۔۔۔ آدھی سنانے والے کی آدھی سننے والے کی۔۔۔ اب تم یہ بوجھو کہ شہزادہ کیسے شہزادی کو اپنی محبت کے بارے میں بتائے گا۔۔۔"

"اس کے سرہانے پھول رکھ کر۔۔۔"

"پھولوں سے اسے کیسے یہ معلوم ہو گا کہ یہ وہی رکھ رہا ہے۔۔۔"

بہت عجیب پہیلی اور غریب کہانی ہے۔۔۔"

"کوشش تو کرو۔"

"کبھی بہت فارغ ہوئی تو کوشش کروں گی۔۔۔ اور ڈاکٹرز ٹھیک کہتے ہیں مجھے بہت گہری نیند بس آنے ہی والی ہے۔۔۔" اس نے اسے خاموش کروا دیا جبکہ وہ فوراً" کہانی بوجھ چکی تھی۔

شہزادہ پیغامات لکھے گا اور اسے کسی ایسی جگہ باندھ دے گا جہاں سے شہزادی کا گزر ہوتا ہو۔ چلو مان لیتے ہیں شہزادی کے کمرے کے باہر لگے درخت کے ساتھ' رات کے وقت' وہ ان کے ساتھ گھنٹیاں باندھ دے گا اور ان گھنٹیوں کو ہلائے گا' شہزادی نیند سے جاگ جائے گی اور اسے جاگتے ہی رہنا پڑے گا جب تک وہ درخت کے پاس آکر پیغامات نہیں پڑھ لیتی۔ وہ درخت کی شاخوں میں جابجا بندھے پیغامات کو پہلے حیرت سے دیکھے گی پھر وہ انہیں ایک ایک کر کے پڑھے گی اور پھر ہر رات کو وہ گھنٹیوں کے بجنے کا انتظار کرے گی۔۔۔ اور پھر ایک دن شہزادہ جادو سے آزاد ہو جائے گا۔۔۔

اس رات وہ سو نہ سکی ایسی کہانی سن کر نیند کیسے آ سکتی تھی اور آخری پہر کی اس رات اس نے اسکیچ کے پیچھے وہ ساری کہانی لکھ دی۔۔۔ لیکن یہ کیا۔۔۔ جادو الٹا ہو گیا۔۔۔ اب وہ سن رہا تھا نا ہی بول رہا تھا۔۔۔ اور یہ سب خود اس کی اپنی وجہ سے ہوا تھا۔۔۔ وہ سب سمجھتی تھی اور انجان بنتی تھی۔ اسے یہ فخر حاصل ہو گیا تھا کہ کوئی اس پر ایسے فدا ہے اور اس نے خود ایسی خود غرضی سیکھ لی کہ اس سے فاصلہ رکھا نہ اپنے پلان کے مطابق اسے پہلے یہ بتایا کہ وہ پاکستان میں اپنی بات پکی کروا کر آئی ہے۔۔۔

اس نے اسے انکار کیا نہ اقرار کے قابل سمجھا۔۔۔ اس نے اپنے اس پورے پلان پر بھی ٹھیک سے عمل نہیں کیا جس کے تحت انہیں صرف دوست رہنا تھا۔

اگر وہ اسے ہر حال میں انکار کرنے کا ارادہ ہی کیے ہوئے تھی تو اسے خود کو اتنا آگے نہیں لانا چاہیے تھا۔

ایک بار میں مکس کلاس کے مڈٹرم ایگزامز میں میں فیل ہو گئی' میں اتنا روئی اتنا روئی کہ بے ہوش ہو گئی' پھر ہوش میں آئی پھر روئی اور پھر سے بے ہوش ہو گئی۔۔۔ میرے رونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں فیل ہو گئی ہوں' خواب سچا ہو گیا۔۔۔ یعنی اب وہ خواب بھی سچا ہو گا جس میں میری گردن کٹی ہوئی ہے اور سمندر کے پانی کے اوپر تیر رہی

ہے۔۔۔"

عالیان اس کی شکل کی طرف کئی لمحطے دیکھتا رہا اور پھر اس کے قہقہوں کو تھمنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگا۔۔۔ اس نے سر پر ہاتھ رکھ لیا' ہنس ہنس کر اس کا سر درد کرنے لگا تھا۔

اس کی ایسی ہنسی دیکھنے کے لیے وہ اپنے ماضی کو کھنگال کر چند واقعات اس کے روبرو لائی تھی۔۔۔ وہ خود کو بھی ٹھیک سے یہ بتا نہیں سکتی تھی کہ جب وہ اس کی کسی بات پر ہنستا ہے تو اسے لگتا ہے اس نے ثواب کمایا ہے۔۔۔ اس کی بھوری آنکھیں پانی سے بھر جاتی ہیں تو مشرقی ساحرہ کو اپنے سحر پر پیار آنے لگتا ہے۔

وہ ہنسنے میں اپنے مصروف رہتا ہے کہ وہ اسے دیکھنے میں مشغول ہو جاتی ہے۔

"کیا تم مجھے ہمیشہ ایسے ہنسا سکتی ہو؟" وہ ہنسی کے درمیان پوچھتا ہے۔

وہ خاموش ہو جاتی ہے جیسے سوال سنا ہی نہیں۔۔۔ ایسے وقت وہ دوسرے حصے والی امرحہ بن جاتی ہے جسے معلوم ہے کہ انہیں ہمیشہ ساتھ نہیں رہنا۔۔۔

وہ بیک وقت خود غرضی اور خود ترسی کی انتہا پر پہنچ جاتی ہے۔

وہ خود سے بھی اقرار نہیں کرتی کہ وہ کیا چاہتی ہے اور۔۔۔

چینی خاتون نے ربن دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"اگر تم شادی شدہ ہو یا جلد ہی شادی کرنے والی ہو یا تم جانتی ہو کہ تمہیں کس سے شادی کرنی ہے تو تم اس کا نام ان پر لکھوا سکتی ہو۔۔۔"

امرحہ نے خاتون کو دیکھا اور مسکرا نہ سکی۔ کیا وہ اس کے دل کا چور پکڑنے کو ہیں۔

"میں چینی میں تم دونوں کے نام لکھ دوں گی۔" وہ پھر سے مسکرائیں جیسے چوری پکڑ چکی ہوں۔

اس سے سوال کیا جا رہا تھا۔۔۔ اس کا سر گھومنے لگا جو کام خود سے بھی چھپا کر کیا جا رہا تھا اس کا اقرار کسی کے سامنے کیسے کر لیتی۔۔۔ وہ پلٹ کر جانے لگی پھر جیسے اس نے اسے بدشگونی جانا۔۔۔ جب دل میں کوئی ہو تو دل سب شگونوں اور بد شگونوں کے حساب رکھنے لگتا ہے۔۔۔ وہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔۔۔ پھر وہ تہوار کا موقع تھا اور پھر تہواروں پر ویسے ہی بہت سی اجازتیں دے دی جاتی ہیں تو اس نے خود کو یہ اجازت دے دی۔۔۔ اور اسے یہ بھی لگا کہ آسمانوں سے اس سے پوچھا جا رہا ہے "کس کا نام لکھوانا ہے اپنے نام کے ساتھ امرحہ؟"

وہ جو پلٹ گئی تھی واپس پلٹی "میرا نام امرحہ ہے اور اس کا۔۔۔"

"اس کا؟" خاتون مزید مسکرانے لگیں۔

"وہ۔۔۔ اس کا۔۔۔ عالیان۔۔۔!"

خاتون نے سر کو جنبش دی اور دونوں کے نام چینی میں لکھ دیے۔

ان دو ربن کو لے کر اس کے لیے چلنا دوبھر ہو گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی کہ اسے لگا کہ وہاں موجود ہزاروں لوگ۔ جو ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں تو دراصل اسی کے دل کی دھڑکن کو تلاش کر رہے ہیں۔۔۔ اسی کو لے کر سرگوشیاں کر رہے ہیں۔۔۔ اسی پر مسکرا رہے ہیں۔۔۔ اور سرہلا کر اسے بتانا چاہتے ہیں کہ ہاں، ہم جان گئے ہیں تم کیا کر آئی ہو۔۔۔ دیکھو تم پکڑی گئیں۔۔۔

وہ مسکرائی اور مسکراہٹ غائب بھی کر لی۔۔۔ اسے یہ بھی لگا کہ اس نے کوئی بڑا گناہ کر لیا ہے۔۔۔ اور یہ بھی کہ زندگی میں اب اسے کوئی ایسی چیز ملی ہے جو اتنی قیمتی ہے کہ اسے دنیا کا ہر محفوظ کونا غیر محفوظ لگنے لگا ہے اور اسے لگنے لگا ہے کہ دنیا میں ہر کوئی اس کے ان ربنز کو چرا لینے کا ارادہ رکھتا ہے۔۔۔ اگر عالیان ڈریگن پریڈ میں نہ آتا تو وہ اگلے کئی دنوں تک خود ہی اس کا سامنا نہ کرتی۔۔۔ چینی اسٹالوں پر گھومتے اس نے بہت کچھ دیکھا۔۔۔ ادھر عالیان۔۔۔ ادھر عالیان۔۔۔ ہر آنکھ' ہر انداز' ہر مسکراہٹ عالیان' اس نے خود کو شیشے میں دیکھا اور وہاں بھی عالیان کو پایا۔۔۔

"ہم اچھے دوست بنے رہیں گے پھر میں پاکستان

چلی جاؤں گی اگر اس نے کچھ کہا تو میں کہہ دوں گی میری بات میرے کزن کے ساتھ طے ہے۔"

یہ تھا اس کا پلان جو اس نے ترتیب دے رکھا تھا اور اس پلان کی وجہ یا دینی تھی جو اسے عالیان کو دیکھ کر آیا کرتی تھی...

☆ ☆ ☆

"جب تک اسے کوئی نوکری نہیں مل جاتی۔ تم اسے رکھ لو واجد..."

"جب ایک بار کہہ دیا نہیں... تو نہیں۔"

"کیوں اتنے انتہا پسند بن رہے ہو...؟"

"جی میں ہوں انتہا پسند... اور کیا سننا ہے مجھ سے..."

"انسان کو اتنا سخت دل نہیں ہونا چاہیے۔"

"میرے اپنے اصول ہیں۔ آپ مداخلت نہ کریں بابا...!"

"اصول ہیں شریعت نہیں کہ بدلی نہ جاسکے۔"

"شریعت ہی سمجھ لیں..."

"شریعت ہی سمجھ لیں۔" یہ جملہ اس کے کانوں میں اس وقت ضرور گونجتا جب جب اس کی نظر عالیان پر پڑتی۔

ان کی کالونی کا چوکیدار عیسائی تھا اپنے بیٹے کی نوکری کے لیے پریشان تھا' جو ایک ٹانگ سے معذور تھا اور صرف بیٹھنے والا کام ہی کر سکتا تھا۔ اس کے دو بچے تھے اور اس کے گھر کے حالات ٹھیک نہیں تھے' جہاں وہ پہلے کام کرتا تھا وہ نوکری کسی وجہ سے جاتی رہی۔

چوکیدار دادا کے پاس کئی بار آیا تھا کہ بابا اسے عارضی طور پر اپنی شاپ پر رکھ لیں لیکن بابا نے لاکھ منت پر بھی نہیں رکھا۔ چند ہزار روپے دیے کہ اس کی امداد کر دیں۔

"امداد ہی لینی ہوتی تو نوکری کرنے کے لیے تڑپ نہ رہا ہوتا۔" دادا نے پیسے واپس کر دیے۔

جو اپنی شاپ پر ایک عیسائی لڑکے کو ملازم نہیں رکھ رہے تھے وہ ایک عیسائی عورت کے بیٹے کو گھر میں داماد ہونے کی حیثیت سے گھسنے دیتے... جسے نوکری نہیں دی تھی اسے بیٹی دیتے... جس کے لیے ضد نہیں توڑ رہے تھے اس کے لیے روایت توڑتے؟

وہ عالیان کو پاکستان لے جاتی اور اس کی تذلیل کرواتی۔

اور رات کے آخری پہر کی اتنی ہی کہانی ہے کہ گھٹنوں کے بل وہ زمین پر جھکی اس تصویر کو سینے سے لگائے رو رہی ہے جس میں نظر آتے اس کے مہیب عکس کو اس نے پنسل سے گہرا کر لیا تھا... وہ ڈریگن کے ماسک تلے بھی روتی رہی تھی... وہ جیسے جان گئی تھی کہ اب اسے رونا ہی ہے... وہ روتی رہی... روتی رہی کیونکہ وہ جانتی تھی اسے اس سے الگ ہی رہنا ہے... وہ اسے دوستی کے لیے منالے گی' محبت تک بات نہیں لائے گی۔

لیکن اب اس رات... برننگ مین کو اپنی پشت پر دور چھوڑتے وہ بات محبت تک لے آئی تھی... اس نے اس بار محبت کا ترازو ہاتھ میں پکڑا تھا' اور دونوں طرف عالیان کو بٹھایا تھا۔

خوف کو دل میں ہی لیے وہ بے خوف ہو کر آگے بڑھی تھی... ہاں اب تو... اب ہی تو اس نے وہ دھن تشکیل دینی شروع کی تھی جو عالیان کے وجود سے پھوٹتی روشنی سے مل کر رقص کناں ہونے کو تھی... اب ہی تو اس نے اس کی آنکھوں پر تنی کمانوں کے کناروں سے جا ملنے کی ٹھانی تھی۔ اس نے انہیں تصور میں کتنی ہی بار اپنی پوروں سے چھوا تھا... عالیان کو روک کر اسے ساکت کر کے اب ہی تو اسے سامنے بٹھا کر دیکھتے رہنے کا کنول آسن جمایا تھا۔

سسکیوں نے سناٹے سے ہم کلام ہونا چاہا۔

وقت نے بے دردی سے بھڑ جانا چاہا...

تقدیر نے ترحم کے آنسو ٹپکائے...

اندھیرے' آگے سے روشن ہوتے اس راستے پر چلتے "خلیفہ" نے اپنی داڑھی کو بھیگ جانے دیا... جسے

ساری عمر دیکھتے رہنے سے اس کا جی نہیں بھرنے والا تھا اب وہ اسے آخری بار دیکھ آیا تھا... وہ جو عشق مجازی میں آقا تھا وہ عشق حقیقی کی باندی کو چھوڑ آیا تھا... اب وہ محبوب کے محبوب کو پانے نکلا تھا... رات کے ایسے اَگ اَگ ہوتے پہر میں لامنزل چلتے خلیفہ نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا... اس کا دل دائمی جدائی کے خوف سے کرلا رہا تھا... اس کی سیاہ داڑھی سفید ہونے جا رہی تھی۔

"اور عشق... اس پر یہ جائز نہیں کہ غفلت برتی جائے۔"

نار کو پیچھے چھوڑتے نار کو وجود میں لیے اسے لگا وہ تب سے چل رہی ہے جب سے پیدا ہوتی ہے... آخر اس کا سفر کب ختم ہو گا... ہو گا بھی یا نہیں... اس کے پیروں کے ساتھ اس کے آنسوؤں نے جو سفر کیا ہے وہ کہاں جا کر رکے گا اب...

کئی ٹیکسیاں اس کے قریب سے گزر گئیں اس نے کوئی ایک بھی نہیں لی... وہ کوٹ کے کالر سے اپنی آنکھیں رگڑتی رہی۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کئی بار گرنے لگی تھی... اسے اپنی آنکھیں صاف رکھنی تھیں اس کی آنکھیں صاف ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔

اس کے کانوں میں لفظوں کی دھمال مچی تھی۔

"مجھ سے شادی کرو گی امرحہ... ؟ مجھ سے شادی کرو گی امرحہ ؟ شریعت ہی سمجھ لیں۔ حسب نسب لے کر بیٹھنا... اسے ایک شہزادی سے محبت ہوتی ہے لیکن شہزادی اس سے لاعلم ہے... میرے ساتھ روس چلو کیپا سے ملنے... میں تمہارا کھلونا نہیں ہوں۔ امرحہ... اب تمہیں جو کہنا ہے وہ سننے کے لیے

میں خود کو موجود نہیں پاتا... جن سے ایک بار دھتکار ملے ان کے پاس پلٹ کر جانے کا جرم نہیں کرنا چاہیے..."

اور اس کا وہ گیت، جو پورا بنا گیا تھا نہ آدھا، وہ سڑک پر اس کے قدموں تلے بکھرتا چلا گیا... لفظوں کی دھمال میں کرلانے لگا۔

"آغاز بہار کی آمد ہے...
سانسیں معطر ہونے لگی ہیں
مرتسم ہے دھنک بھی آنکھوں میں
نیا جہاں دل میں سجنے لگا ہے
اب وہ سجنے لگا ہے۔"

ٹیکسی کو بمشکل روک کر وہ اس میں بیٹھ سکی اور گھر آ گئی... اور اس سامان کو پیک کرنے لگی جسے ساتھ لے کر اسے پاکستان جانا تھا... اپنے سامان میں اس نے سب سے پہلے چھپا کر رکھے باکس کو نکال کر رکھا... وہ پہلی فلائٹ سے ہمیشہ کے لیے پاکستان جانے کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی... کیونکہ وہ جان چکی تھی اس نے اس شخص کو کھو دیا ہے جسے اب کوئی اور پا چکا ہے۔

امرحہ زندگی میں کبھی دوبارہ عالیان کو دیکھ سکے گی؟ کیا عالیان ہمیشہ کے لیے امرحہ کو اپنی زندگی سے نکال چکا ہے؟ امرحہ اس کے بغیر کیسے جی پائے گی؟

(باقی واقعات آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

وہ کیسی شوخ سہیلی تھی،

وہ کیسی شوخ سہیلی تھی
ہر لمحہ اک نئی پہیلی تھی
وہ بات بے بات قہقہے لگانے والی
وہ رنگِ محفل جمانے والی
اُس کی ہنسی میں کھنک تھی
اُس کے نینوں میں جیسے دیپ جلتے تھے
آج اک برس بعد مجھے وہ ملی تھی
قہقہوں کی جگہ آہ تھی
شوخی افسردگی میں ڈھل گئی تھی
وہ تو سراپا بدل گئی تھی
کتنی ویران آنکھیں تھیں
اُسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں
کہ وہ کن راہوں پہ آبلہ پا چلی ہے
کیسی آگ میں جلی ہے
یہ محبت انساں کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے
کیسے کیسے ان جانے، ان دیکھے
دکھوں کا پتا دیتی ہے

شبانہ یوسف

جس طرح دریا بجھا سکتے نہیں صحرا کی پیاس
اپنے اندر ایک ایسی تشنگی بن جائیے

دیوتا بننے کی حسرت میں معلق ہوگئے
اب ذرا نیچے اُتریے، آدمی بن جائیے

وسعتوں میں لوگ کھو دیتے ہیں خود اپنا شعور
اپنی حد میں آئیے، اور آگہی بن جائیے

جس طرح خالی انگوٹھی کو نگینہ چاہیے
عالم امکاں میں اک ایسی کمی بن جائیے

ایک پتنگے نے یہ اپنے رقصِ آخر میں کہا
روشنی کے ساتھ رہیے، روشنی بن جائیے

عالم کثرت کہاں ہے اب اکائی میں سلیمؔ
خود میں خود کو جمع کیجیے اور کئی بن جائیے

سلیم احمد

میں نے اے دل! تجھے سینے سے لگایا ہوا ہے
اور تو ہے کہ مری جان کو آیا ہوا ہے

کیا ہوا اگر نہیں بادل یہ برسنے والا
یہ بھی کچھ کم تو نہیں دھوپ میں سایا ہوا ہے

وہ کسی روز ہواؤں کی طرح آئے گا
راہ میں جس کی دیا ہم نے جلایا ہوا ہے

بس اسی بوجھ سے دہری ہوئی جاتی ہے کمر
زندگی کا جو یہ احسان اٹھایا ہوا ہے

افسردگی کے ہاتھوں جل جل کے تھک گئے ہیں
اے دل ذرا ٹھہر، ہم چل چل کے تھک گئے ہیں

جیسے کہ بے یقینی تعبیر ہو چکی ہو
ہم اہلِ خواب آنکھیں مل مل کے تھک گئے ہیں

کیا جانے کتنی گہری ظلمت میں ہے مقدر
کیا جانے کتنے سورج ڈھل ڈھل کے تھک گئے ہیں

واماندگی ہی ٹھہری حاصل سفر خضر کا
تم رک کے تھک گئے ہو، ہم چل کے تھک گئے ہیں

اس کنج عافیت سے دشمن کی قید اچھی

توہین

مشہور کامیڈین عمر شریف ایک مرتبہ ایک ٹی وی آرٹسٹ کے گھر گئے۔ باتوں کے دوران انھوں نے آرٹسٹ سے کہا۔ "اس گلی میں تمہارے علاوہ اور کتنے ناکارہ آدمی رہتے ہیں؟"

ٹی وی آرٹسٹ نے خفگی سے کہا۔ "آپ میری توہین کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" عمر شریف نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر مجھے تمہاری توہین کرنا ہوتی تو میں یہ سوال یوں پوچھتا کہ اس گلی میں تم سمیت کتنے ناکارہ آدمی رہتے ہیں؟"

نازش جاوید... وہاڑی

دادا جان

ایک صاحب کسی زمانے میں ماہر شکاری رہ چکے تھے، مگر بڑھاپے میں گزشتہ کئی برس سے پہیوں والی کرسی استعمال کرنے لگے تھے۔ پھر بھی یہ خواہش انہیں بے قرار کیے رکھتی تھی کہ صرف ایک مرتبہ وہ کسی ریچھ کو اپنی بندوق کا نشانہ بنائیں۔

ایک دن ان کے پوتوں کو ان کی خواہش پوری کرنے کی سوجھی اور وہ پہیوں والی کرسی کو دھکیلتے ہوئے بڑے میاں کو دس کلو میٹر دور گھنے جنگل میں لے گئے۔ اچانک ان کا سامنا ایک بڑے ریچھ سے ہو گیا۔ جونہی ریچھ نے انہیں دیکھا تو ان کی طرف لپکا۔

دونوں پوتے چیختے چلاتے گھر کی طرف بھاگے اور ہانپتے کانپتے اپنی والدہ کو بتایا۔

"غضب ہو گیا امی! دادا جان کو ریچھ نے مار ڈالا۔"

"چلانا بند کرو۔" ماں نے ڈانٹا۔ "تمہارے دادا جان تم لوگوں کے آنے سے پانچ منٹ پہلے ہی گھر پہنچ چکے ہیں۔"

مہرین جمال... حیدر آباد

مرنے سے پہلے

ایک میمن کی بیوی پر جان کنی کا عالم تھا۔ وہ ڈاکٹر کو لینے بھاگا۔ اسی وقت لائٹ چلی گئی۔ میمن نے موم بتی جلائی اور جانے لگا۔ کچھ یاد آنے پر پلٹا اور لب دم بیوی سے کہنے لگا۔

"میں ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہوں۔ کیا پتا دیر ہو جائے۔ اگر تم مرنے لگو تو مرنے سے پہلے موم بتی ضرور بجھا دینا۔"

سمی عرفان... اسلام آباد

بھنگ نوش

ایک بھنگ نوش نواب صاحب کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ انگریز فوجیں ان کی ریاست پر اچانک حملہ آور ہو گئیں۔ حاضر باش تو فوراً" بھاگ گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ بھنگی میں جنگی صلاحیتیں نہیں ہوتیں۔ نواب صاحب بھنگ کے نشے میں اپنے حرم میں بیٹھے داد عیش دے رہے تھے۔

افرا تفری مچی اور ایک انگریز سپاہی حرم خاص میں گھس آیا۔ کنیزوں نے فوراً" پکار بلند کی "ارے کوئی مرد ہے؟ ارے کوئی مرد ہے؟"

مارے گھبراہٹ کے نواب صاحب نے بھی یہی پکارنا شروع کر دیا۔ "ارے کوئی مرد ہے؟ کوئی مرد ہے؟"

ایک منہ چڑھی کنیز کہنے لگی۔ "سرکار! آپ خود بھی

تو ایک مرد ہی ہیں!"

سرکار نے فرمایا۔ "ہاں۔ خوب یاد دلایا۔ ہم خود بھی تو ایک مرد ہیں!"

اتنے میں انگریز کمانڈر بھی اندر گھس آیا۔ سب فرار ہو چکے تھے۔ اکیلے نواب صاحب تخت پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ کمانڈر نے پوچھا۔

"ویل نواب صاحب! تمہارا سب لوگ بھاگا۔ تم نہیں بھاگا؟" نواب صاحب نے بے چارگی سے جواب دیا۔

"ہمیں کوئی پاپوش پہنانے والا ہی نہیں تھا۔"

فوزیہ سعید۔۔۔۔ کراچی

بچے ہمارے عہد کے

دس سالہ بچہ خوشی خوشی گھر میں داخل ہوا۔

"کہاں تھے بیٹا! اتنی دیر سے؟" ماں نے پیار سے پوچھا۔

"ممی! میں پوسٹ مین بنا ہوا تھا۔" بچے نے جوش سے بتایا۔

"ارے واہ!" ماں کو بیٹے پر بہت پیار آیا۔ "مگر تم پوسٹ مین کیسے بن گئے۔ تمہارے پاس تو ڈاک تھی ہی نہیں۔" بات کے اختتام پر ماں مسکرائی۔

"ڈاک مل گئی تھی نا' جب ہی تو میں پوسٹ مین بنا۔" بچے نے فخر سے بتایا۔

"اور میرے بیٹے کو ڈاک کہاں سے مل گئی؟" ماں نے پیار سے بیٹے کے بال بگاڑے۔

"اسٹور میں پرانے ٹرنک کی تلاشی لے رہا تھا میں۔ اس میں آپ کے پرانے کپڑوں کے نیچے مجھے پنک لفافوں والا بنڈل مل گیا جس پر گرین ربن بندھا ہوا تھا۔ میں وہ سارے خط ایک ایک کر کے محلے کے سارے گھروں میں ڈال آیا۔" بچے نے داد طلب انداز سے ماں کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

ثوبیہ کاشف۔۔۔۔ کراچی

سمجھ داری

ایک دیہاتی نوجوان کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ دونوں نے آدھی رات کو کھیتوں میں ملنے کا ٹائم سیٹ کیا۔ وقت ہوا تو وہ لالٹین لے کر گھر سے نکلنے لگا۔ اسی وقت اس کے ابا کی آنکھ کھل گئی۔

"اوئے! آدھی رات کو کدھر جا رہا ہے؟"

"ابا! میں ایک لڑکی سے ملنے جا رہا ہوں۔" نوجوان نے باپ کو سچ بتانا ضروری سمجھا۔

"ارے پاگل! لڑکی سے ملنے جا رہا ہے اور ساتھ لالٹین بھی پکڑ لی۔" ابا اٹھ بیٹھا اور بیٹے کو ڈپٹا۔ "اس طرح تو پورے گاؤں کو پتا چل جائے گا۔ میں جب تیری ماں سے چھپ کر ملنے جاتا تھا تو کبھی لالٹین نہ لی اور دیکھ! آج تک کسی کو نہیں معلوم ہوا۔" کہتے کہتے ابا کا لہجہ فخریہ ہو گیا۔

"ابا! لالٹین نہ لے جانے کا نقصان بھی تو دیکھ۔" نوجوان نے قریب چارپائی پر سوئی ہوئی ماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اندھیرے میں پھر ایسی چیزیں ملتی ہیں۔"

سمیرا علی احسن۔۔۔۔ لاہور

وفاداری

مالک اپنے باڈی گارڈ سے۔ "تم میری جان بچانے کے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

باڈی گارڈ۔ "سر! میں آپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا نہیں دیکھ سکتا۔"

مالک خوش ہو کر۔ "اچھا تو پھر اگر کوئی مجھ پر حملہ کرے گا۔ تو تم کیا کرو گے؟"

باڈی گارڈ۔ "جناب میں اپنی آنکھیں بند کر لوں گا۔"

نازیہ منہاس۔۔۔ جہلم

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کوئی کتا یا تصویر ہو۔"
(بخاری و مسلم)
فائدہ:۔ فرشتوں سے مراد رحمت کے فرشتے ہیں۔ جن کی آمد سے گھروں میں اللہ کی رحمت و برکت نازل ہوتی ہے، ورنہ حفاظت و نگرانی پر مامور فرشتے تو ہر وقت ہی انسان کے ساتھ رہتے ہیں، وہ جدا ہی نہیں ہوتے۔

جب فنا ٹھہری،

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ملک الموت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ان کی روح قبض کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ جب وہ آئے تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تھپڑ مار دیا۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام رب تعالیٰ کے پاس گئے اور عرض کی۔
"تو نے مجھے جس بندے کی طرف بھیجا ہے، وہ مرنا نہیں چاہتا۔"
اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔"دوبارہ ان کے پاس جائیں اور ان سے کہیں کہ کسی بیل کی پشت پر ہاتھ رکھیں۔ ان کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آئیں گے، اتنے سال عمر (مزید) مل جائے گی۔"
ملک الموت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا پیغام پہنچایا۔ آپ نے فرمایا۔
"یا رب! اس کے بعد کیا ہوگا؟"
اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔"پھر موت آجائے گی۔"
موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔"تب ابھی۔"
(وفات کا حکم قبول ہے)

ایک شعر،

ایک عربی شاعر کے شعر کا ترجمہ۔
تیری ماں نے تجھے جنم دیا تو تو رو رہا تھا۔ چیخ رہا تھا اور تیرے آس پاس لوگ خوشی سے ہنس رہے تھے۔ تو اپنے لیے کوشش کر، تیرے مرنے کے بعد وہ رو رہے ہوں، تو خوش ہو اور ہنس رہا ہو۔"

رزق،

ایک شخص نے حضرت بایزید بسطامی سے کہا۔
"میری عیال زیادہ ہے اور معاش کم۔"
فرمایا۔"اپنے گھر میں جس کو تو دیکھے کہ اس کا رزق تجھ پر ہے، اس کو نکال دے اور جس کو دیکھے کہ اس کا رزق اللہ تعالیٰ پر ہے، اس کو گھر میں رہنے دے۔"

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دانش،

☆ انسان کی قدرت کا اندازہ اس کی ہمت سے، اس کی صداقت کا اس کی مروت سے، اس کی شجاعت کا اس کی حمیت سے اور اس کی پاک دامنی کا اس کی غیرت سے ہوتا ہے۔
☆ انسان کا قریبی وہی ہے جسے —— محبت نے قریب کر دیا ہو۔ اگرچہ نسب میں بعید ہو۔ بعید وہ ہے جسے عداوت نے بعید کر دیا ہو۔ اگرچہ نسب میں قریب ہو۔ دیکھو! جسم سے قریب تر ہاتھ ہے اور جب ہاتھ فاسد ہو جاتا ہے تو کاٹ کر علیحدہ کر دیا جاتا ہے اور جب کاٹ دیا جاتا ہے تو دارغ بن جاتا ہے۔

صومیہ نذیر، شمائلہ نذیر۔ ہری پور ہزارہ

دُعا

جس خطرے کا وقت سے پہلے احساس ہو جائے سمجھو کہ وہ ٹل سکتا ہے۔ اس کو روکنے کے لیے دُعا کا ہتھیار ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن خطرات سے بچائے جن کے قریب آنے کا ہمیں احساس تک نہیں۔

(واصف علی واصف)

نوال افضل گھمن۔ گجرات

خیال واصف علی واصف

- بادشاہ کو صرف نیک نہیں ہونا چاہیے بلکہ اہل بھی ہونا چاہیے۔
- منافق اُس انسان کو کہتے ہیں جو مومنوں اور کافروں میں بیک وقت مقبول ہو۔
- تذبذب اُس مقام کو کہتے ہیں جہاں آگے آنے کی ہمت نہ ہو اور واپس جانا ممکن نہ ہو۔
- طاقت ور شے جس شے کو خوف زدہ کرتی ہے، دراصل خود اس سے خائف رہتی ہے۔
- مستقبل کا خیال رہے تو انسان جوان ہے اور اگر صرف ماضی کی یاد ہی باقی ہو تو انسان بوڑھا ہے۔

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

مستقل مزاجی

ایک دن جلال الدین رومی اپنے شاگردوں کو لے کر ایک کھیت میں پہنچے۔ یہ ان کے پڑھانے اور علم سکھانے کا انداز تھا۔

اس کھیت میں ایک کسان بالکل کسی پاگل آدمی کی طرح زمین کھودنے میں مصروف تھا۔ دراصل وہ اپنے کھیت کے لیے کنواں کھودنا چاہتا تھا۔ مگر جب تھوڑی گہرائی تک پانی نہ نکلتا تو وہ اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ زمین کھودنے میں لگ جاتا اور اس طرح کسان نے آٹھ جگہوں سے زمین کھود ڈالی تھی مگر حاصل اسے کچھ بھی نہ ہوا تھا۔

مولانا جلال الدین رومی نے اپنے شاگردوں سے پوچھا۔ "کیا تم سمجھ سکتے ہو، اس کی ناکامی کی وجہ کیا ہے؟"

شاگرد خاموش رہے تو قدرے توقف کے بعد وہ گویا ہوئے۔

"اگر یہ آدمی اپنی پوری طاقت، قوت اور وقت صرف ایک ہی کنواں کھودنے میں صرف کرتا تو ابھی تک کافی گہرائی میں جا کر اسے اپنی محنت کا پھل مل چکا ہوتا۔ ایک ہی جگہ کھودتا تو پانی نکل آتا۔"

ایک چھوٹے سے عمل سے مولانا جلال الدین رومی نے اپنے شاگردوں کو ایک بڑا سبق دیا ہے۔

اگر آپ واقعی کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو ایک ہی جگہ اپنا ذہن اور اپنی توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔ نہیں تو مختلف جگہوں پر آپ کی قوت، طاقت، ذہانت بکھر جائے گی اور آپ کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

ناکامی، کامیابی کا زینہ ہے

مشہور موجد ٹامس ایڈیسن نے پانچ ہزار سے زائد بار کوشش کے بعد بجلی کا بلب بنایا تھا۔ ایک انٹرویو میں اس سے پوچھا گیا۔

"پانچ ہزار بار آپ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آپ کو کیسا محسوس ہوتا تھا؟"

ایڈیسن نے جواب دیا۔ "میں ناکام نہیں ہوا بلکہ میں نے پانچ ہزار ایسے طریقے سیکھے ہیں جن سے بجلی کا بلب نہیں بن سکتا تھا۔"

مدیحہ فہمید۔ کورنگی کراچی

خوشی

اطمینان قلب کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ ہم اپنی زندگی کو کس طرح خوشگوار اور پُرمسرت بنا سکتے ہیں اس کا جواب صرف ایک جملے میں پوشیدہ ہے۔

"دوسروں کو خوش رکھیے۔ آپ کو خود بخود خوشی ملے گی۔"

ندا، فضہ۔ فیصل آباد

اقوالِ دانش

- بے اعتبار وہی شخص نہیں جو کسی کی امانت کو مار لیتا ہے بلکہ وہ بھی ہے جو کسی کی بات دوسروں پر ظاہر کر دیتا ہے۔
- بے وقوف کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی ضرورت

نہیں ہوتی بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ کو ظاہر کر دے گا۔

٭ اگر سرپرستوں کی امداد ہی ترقی کا ذریعہ ہوتی تو کبھی کسی امیر کا بیٹا نالائق نہ ہوتا اور غریب کا بیٹا لائق نہ ہوتا حالانکہ زمانے میں اکثر اس کے خلاف دیکھنے میں آتا ہے۔

٭ عورت کی آواز بھی عورت ہی ہے (یعنی آواز کا بھی پردہ رکھے) (عرب اقوال)

٭ ایک ظالم حکمران لوگوں کی نگاہ میں شیر سے زیادہ خطرناک ہے۔

(کنفیوشس)

سدرہ بتول۔ ملتان

زندگی کے سات انمول سبق

کون ہے جو اچھی اور کامیاب زندگی کا خواہش مند نہیں۔ اگر آپ اچھی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو یہ بچوں سے سیکھیں۔ یہ سات اسباق ہیں جو بچے ہمیں سکھاتے ہیں۔

1۔ ماضی کی پریشانیوں اور مستقبل کے خوف کو چھوڑ دیں اور لمحہ حال میں رہیں۔

2۔ خود کو سیکھنے کا موقع دیں۔ اپنی غلطی کو فراخ دلی سے ہنس کر قبول کریں۔ غلطیاں بھی سیکھنے کا ایک مرحلہ ہیں۔ جب کوئی نئی چیز سیکھ رہے ہوں تو خود کو وقت دیں، اپنی غلطی پر مایوس نہ ہوں یقین رکھیں کہ سب کچھ ممکن ہے ہم جس چیز پر یقین رکھتے ہیں وہ یقین حقیقت میں بدل جاتا ہے۔ بچوں میں یہ یقین بالغ افراد سے زیادہ پایا جاتا ہے کہ سب کچھ ممکن ہے۔ وہ جو چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔

3۔ اپنے خوابوں پر یقین رکھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے بچوں کو یقین اور اعتقاد ہوتا ہے۔

4۔ کھل کر ہنسیں۔ بچے زندگی کے ہر ہر لمحے سے باقاعدہ طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں۔

5۔ بچے بہت شفاف احساسات رکھتے ہیں۔ جب بھی محسوس کرتے ہیں کوئی شخص انہیں اچھا لگ رہا ہے، تو بہت آسانی سے اس شخص کو مطلع کر دیتے ہیں۔ اگر آپ کسی کو پسند کرتے ہیں تو اس شخص کو بتا دیجیے۔

6۔ اگر حسد یا بغض جیسا بوجھ اٹھا رکھا ہے تو اسے اتار دیجیے کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بوجھ مزید بھاری ہوتا جائے گا۔

7۔ رکیے اور اس دنیا کو ایک بچے کی نظر سے دیکھیے۔ یہ واقعی بہت دلچسپ اور حیرت انگیز ہے۔

عذرا، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

سنہرے لوگ، سنہری باتیں

٭ برا آدمی کسی کے ساتھ نیک گمان نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ ہر ایک کو اپنے جیسا خیال کرتا ہے۔

(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

٭ کسی آدمی کی سب سے بڑی خوبی اپنے دشمنوں کے ساتھ نرم دلی کا برتاؤ ہے۔

(ابن عربی)

٭ محبت وہ کھیل ہے جس میں عقل ہار جاتی ہے۔

(مسولینی)

٭ وقت ہی سب کچھ ہے۔ میں جنگ ہار سکتا ہوں لیکن وقت ضائع نہیں کر سکتا۔

(نپولین)

٭ جہاں عورت کا احترام ہوتا ہے وہاں اللہ بھی خوش ہوتا ہے۔ (منو شاستر)

٭ ایک عورت کی تعلیم کنبے کی تعلیم ہے اور مرد کی تعلیم صرف اس کی تعلیم ہے۔

(نپولین)

٭ جنت بھی انسان کو تسکین نہیں دے سکتی اگر اس میں کوئی ساتھی نہ ہو۔

گڑیا شاہ، زینی۔ کہروڑ پکا

خالدہ جیلانی

نجبہ اکرم ـــــــ گاؤں کونیگی

یوں تو غیروں پہ بھی عنایت ہے
مجھ کو اپنا سمجھ کے بھول گئے
یاد میری بلا کرے ان کو
وہ مجھے کیا سمجھ کے بھول گئے

فری گل ـــــــ بنوں

ذرا سا بات کرنے کا سلیقہ سیکھ لو تم بھی
اِدھر تم بات کرتے ہو، اُدھر دل ٹوٹ جاتا ہے

ثنا عبدالقیوم ـــــــ بنکہ

کبھی تو ان کو بھی دیکھو جن لوگوں نے
عمر گنوائی اور سنوارا ایک خیال

صبیحہ شوکت ـــــــ لاہور

عشق بھی کھیل ہے نصیبوں کا
خاک ہو جائیں، کیمیا ہو جائیں

ثنا بدر خلیل ـــــــ مانانوالہ

کس قدر انوکھا ہے رابطہ محبت کا
کب نہ جانے ہو جائے معجزہ محبت کا
اپنی ذات سے بھی وہ اجنبی لگتا ہے
جس کے ساتھ ہو جائے حادثہ محبت کا

شنزا عثمان ـــــــ نیویارک

تیرے نام کی جو روشنی تھی اسے خود ہی تو نے بجھا دیا
نہ جلا سکی جسے دھوپ بھی اسے چاندنی نے جلا دیا
میں ہوں گردشوں میں گھرا ہوا مجھے آپ اپنی خبر نہیں
وہ جو شخص تھا میرا رہنما، اسے راستوں نے گنوا دیا

فرح عالی ـــــــ کراچی

ہم سے اگر ہے ترکِ تعلق تو کیا ہوا
یارو! کوئی تو ان کی خبر پوچھتے چلو

ہما بنگش ـــــــ کوہاٹ

مری واپسی کی سند نہیں مگر اک ذرا سی امید ہے
وہ رفیقِ راہ سفر ہے تو سفر یہ اتنا کڑا نہیں

کوثر ناز ـــــــ حیدرآباد

وہ جان سے ہی نہ گزر جاتے
دل لگی گر دکھاوا ہوتا

نوشابہ منظور ـــــــ بھریا روڈ

رسمِ سجدہ بھی اُٹھا دی ہم نے
عظمتِ عشق بڑھا دی ہم نے
دل کو آنے لگا بسنے کا خیال
آگ جب گھر کو لگا دی ہم نے

مدیحہ فہمید ـــــــ کراچی

آج سچ بولتے رہنا کوئی آسان نہیں
لوگ تو لوگ ہیں آئینے مکر جاتے ہیں

انجل ـــــــ ڈہرکی

اس شہر کے اُجڑے دامن میں کچھ روز جنوں کے بیت گئے
وہ رات گئی وہ بات گئی سکے ہار گئے دکھ جیت گئے

آمنہ اجالا ـــــــ ڈہرکی

یوں جرم کی سزا دیتی ہے دنیا
ہنستے ہوئے چہروں کو رُلا دیتی ہے دنیا
مرنے کی تمنا ہو تو مرنے نہیں دیتی
جیتے ہیں تو جینے کی سزا دیتی ہے دنیا

رابعہ اقبال ـــــــ حاجی داہ

یقیں مانو کوئی مجبوریاں نہیں ہوتیں
لوگ بس عادتاً وفا نہیں کرتے

صائمہ جیمی ـــــــ کراچی

ہر بار جدائی کی وہی پہلی سی خلش تھی
ہر ہجر کا صدمہ مجھے پہلا سا لگا تھا

ثمینہ کوثر ـــــــ گجرات

دن تو اس شہر کی رونق میں گزر جاتا ہے
یاد کچھ لوگ سرِ شام بہت آتے ہیں

گل افشاں صفیہ سہیل

وار

لیجئے جناب ایک اور بری خبر۔ ملالہ یوسف زئی پر اب فلم بن رہی ہے۔ دیکھا رکھاناں دل پر ہاتھ۔۔۔ خبر ہے کہ دنیا کی سب سے کم عمر نوبل انعام یافتہ شخصیت ۔۔۔ بی بی سی کے لیے گل مکئی کے نام سے اپنے شہر سوات سے ہفتہ وار ڈائری لکھ کریا لکھوا کر شہرت حاصل کرنے والی ملالہ (جو اکثر لوگوں کو ملال میں مبتلا کر دیتی ہے بلاوجہ کے ایوارڈ حاصل کرکے) کی زندگی پر ایک بھارتی شہری (بتائیے ذرا کیسا وار کیا ہے) فلم بنا رہے ہیں جن کا شمار ایک بڑے تعمیراتی ادارے کے سربراہ کے طور پر ہوتا ہے۔ اس فلم کی تیاری کے لیے وہاں سے لوگ آئیں گے (اور ہمیں انتہا پسند ثابت کریں گے) سوات میں ملالہ کے آبائی علاقے میں بھی اس کی شوٹنگ ہوگی۔ ویسے سوچنے کی بات ہے کہ عبدالستار ایدھی پر تو کسی بھارتی کو فلم بنانے کا خیال نہیں آیا، لیکن ملالہ یوسف زئی پر فلم بنانے کا خیال فوراً آگیا۔

مسئلہ

ہمارے یہاں اکثر خواتین صبح ناشتا نہیں کرتی ہیں یہ سوچ کر وہ موٹی نہ ہوجائیں ان کا وزن نہ بڑھ جائے لیکن ان کے لیے ایک بری خبر ہے کہ ناشتا نہ کرنے کی وجہ سے ان کا وزن کم ہو نہ ہو، لیکن وہ بہت جلد بالوں سے محروم اور یادداشت میں کمی کا شکار ہوسکتی ہیں۔ یہ بات بھارتی شہر ممبئی کے ایک کالج کی تحقیق سے سامنے آئی ہے۔ "نرملا نکیتن کالج" کی تحقیق کے مطابق ناشتا نہ کرنے سے بالوں کا گرنا، یادداشت اور نظر کی کمزوری جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سردرد، غذائیت کی کمی اور روزمرہ کے کاموں میں کارکردگی کے متاثر ہونے کا خدشہ بھی ہوتا ہے۔ یاد رہے ناشتا صبح کیا جاتا ہے یہ نہیں کہ صبح اٹھ کر چائے کا کپ بھر کر پی لیا اس کے بعد آپ دس گیارہ بجے پیٹ بھر کر ناشتا کر رہی ہیں، ناشتا صبح پہلی لی جانے والی خوراک کو کہا جاتا ہے۔

تبدیلی

پاکستان میں کنسٹرکشن آئی کون سمجھے جانے والے ملک ریاض پر فلم "ملک" بن رہی ہے۔ مالی طور پر پسماندہ ماضی اور اپنے ناخواندہ ہونے کا اعتراف کرنے والے ملک ریاض جو جملے اکثر اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں وہی فلم میں بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ

ان کی حقیقی زندگی کی کہانی ہے' جب وہ اتنے غریب تھے کہ اپنی تین سالہ بچی کا جو کہ شدید بیمار تھی علاج بھی نہیں کرواسکتے تھے کسی اچھے ڈاکٹر سے 'اور وہ بچی کو گود میں اٹھا کر میلوں پیدل چل کر سرکاری اسپتالوں کے چکر کاٹتے تھے۔ (تو پھر اتنے... بڑے کنسٹرکشن آئی کون کیسے بن گئے...؟)

ملک ریاض کا کردار ادا کرنے والے فنکار ہمایوں سعید ایک سین میں کہتے ہیں کہ "جس ملک کے دارالحکومت میں صرف دو پلاٹ تیرہ ارب روپے میں فروخت ہوں اس ملک کے حکمرانوں کو آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے قرض مانگتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔" (بھئی شرم تو نہ جانے اس ملک میں کس کس کو آنی چاہیے 'مگر خیر؟)

خواہش

بشریٰ انصاری ایک ایسی فنکارہ ہیں جنہوں نے ٹی وی پر مزاحیہ کے ساتھ ساتھ سنجیدہ اداکاری میں بھی کمال کیا 'اب وہ بڑی اسکرین پر بھی چھانے آرہی ہیں۔ جی ہاں ہمایوں سعید نے بشریٰ کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کی ٹھان لی ہے 'اور "وہ جوانی پھر نہیں آنی" کے نام سے ایک مزاحیہ فلم بنارہے ہیں۔ اس فلم میں بشریٰ انصاری کے ساتھ جاوید شیخ' حمزہ علی عباسی' مہوش حیات' احمد بٹ اور عائشہ خان بھی کام کررہے ہیں 'لیکن ابھی تک ہمایوں نے اپنا نام کاسٹ میں شامل نہیں کیا' جو کہ حیرت کی بات ہے 'کہ ہمایوں کی فلم میں ہمایوں کام نہ کریں؟ ہو سکتا ہے کہ شوٹنگ تک کاسٹ کے بھرپور اصرار پر وہ خود بھی اداکاری کے جوہر دکھانے کو تیار ہو جائیں (ویسے مزاحیہ اداکاری اور ہمایوں...؟)

مشورہ

بھلا بتایئے یہ کوئی بات ہے کہ کیسے کیسے لوگ کیسے کیسے مشورے دیتے ہیں۔ اب ذرا دیکھیں کہ گلوکارہ کومل رضوی کہتی ہیں کہ گلوکاری میری پہچان ہے (اور اداکاری...؟) مجھے فنی لحاظ سے پوری دنیا میں پرفارم کرنے کا اعزاز حاصل ہے اور کلاسیکل موسیقی' موسیقی کی بنیاد ہے۔ جسے فروغ دینے کی ضرورت ہے (پبلسٹی کا نیا انداز) انہوں نے پاپ گلوکاروں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ پاپ میوزک کے ساتھ ساتھ کلاسیکی موسیقی کے راگوں کو بھی اپنی گائیکی میں شامل کریں تو ان کے لیے اچھا ہے (اور آپ کے لیے؟)

یکسانیت

اداکارہ عائشہ خان کہتی ہیں کہ ہمارے فنکاروں کا بھارتی ٹی وی چینلز پر کام ملنا ان کی محنت کا پھل ہے کیوں کہ ہم نے بھارتی اور دوسرے چینلز کے ڈراموں کا مقابلہ کیا۔ آج اس کا پھل کھا رہے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ معیاری کام کے لیے فنکاروں کو وقفہ لینا ضروری ہے 'کیوں کہ زیادہ کام کرنے سے کارکردگی پر تو اثر پڑتا ہی ہے لوگ بھی اکتا جاتے ہیں ایک ہی طرح کے چہرے دیکھ دیکھ کر (کاش صبا پرویز بھی یہ خبر پڑھ لیں.....!) میں کرداروں کی یکسانیت سے بچنے کے لیے فی الحال ڈراموں کی ریکارڈنگ سے دور ہو گئی ہوں۔ (جی لیکن آپ فلموں میں مصروف ہو گئی ہیں۔)

ادھر ادھر سے

☆ اگر کسی ثقافت پر کوئی دوسری زبان مسلط کر دی جائے تو وہ ثقافت زرد پڑ جاتی ہے۔ وہ حاشیے پر چلی جاتی ہے اور اپنی داخلی اور حقیقی تخلیقی قوتوں کے اظہار سے قاصر ہو جاتی ہے۔ زبان ثقافت کا چہرہ ہے۔

(ناصر عباس نیر کے مضمون سے)

☆ عمران خان سندھ میں سیاسی شکاری بن کر آئے ہیں اور شکاری بھی ایسا جو اناڑی ہو۔ جو جنگل کی زبان نہیں جانتا۔ جو ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے کی بولی نہیں جانتا جو یہ نہیں جانتا کہ مٹی کی مہک سیاسی منشور سے زیادہ اہم کردار کرتی ہے۔

(اعجاز منگی۔ آواز حق)

☆ اکتوبر 99ء میں مشرف کے اقتدار پر قبضہ کے بعد دسمبر میں اچانک ایک خاتون شہناز شیخ سامنے آئی تھی جس نے یہ دعوا کیا تھا وہ شیخ رشید کی اہلیہ ہے۔ اس کہانی کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ شیخ رشید کے خلاف شہناز شیخ کا پہلا باقاعدہ تعارف کسی اور نے نہیں جناب علامہ طاہر القادری نے اپنی پریس کانفرنس میں یکم دسمبر 1999ء کو کرایا تھا۔ تب مشرف کا ظالم نظام تمام سیاست دانوں سے ان کے کمزور لمحات کا احتساب کر رہا تھا۔

(محمد طاہر۔ ساجرا)

☆ ملالہ سے ہمدردی کا یہ حال تھا کہ اس کے باپ کے بارے میں متنازع معاملات کو میڈیا نے اہمیت ہی نہ دی۔ جب ملالہ کو باہر بھیجا گیا تو حکومت کی جانب سے میڈیا کو یہ اطلاعات دی گئیں کہ اس کے باپ ضیاء الدین نے حکومت کو بلیک میل کرتے ہوئے یہ دھمکی دی ہے کہ اگر اسے لندن میں پاکستانی ہائی کمیشن میں نوکری نہیں دی گئی تو وہ اپنی پوری فیملی کے ساتھ وہاں سیاسی پناہ لے لے گا۔

(مرزا کاشف علی۔ صدر پرائیویٹ اسکولز فیڈریشن)

☆

طیفور خان

"کیسے ہیں آپ؟"

"اللہ کا شکر۔ آپ سنائیں۔"

"کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

"بس وہ ہی کام... جو ہمارا ہے۔ جھوٹ کو سچ کر دکھانا..."

"اچھا... تو ڈراموں میں جو کچھ ہوتا ہے جھوٹ ہوتا ہے؟"

"ارے نہیں... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ ہم وہ کچھ پرفارم کر رہے ہوتے ہیں جو ہم نہیں ہوتے۔"

"جی... یہ بات تو آپ نے بالکل ٹھیک کی۔ آپ نے ایک بار کہا تھا کہ ہمارا ڈراما بندھ کے رہ گیا ہے خواتین پر... ایسا کیوں کہا آپ نے؟"

دستک دستک دستک

شاہین رشید

"جی۔ میں نے کہا تھا اور کچھ غلط نہیں کہا تھا کیونکہ ہمارا ڈراما خواتین تک محدود ہو کے رہ گیا ہے۔ ہمارے ملک میں ایک بہت ہی محدود تعداد ان خواتین کی ہے جو محدود سوچ رکھتی ہیں۔ ڈراموں کے ذریعے ہمارے معاشرے میں تبدیلی کیسے آسکتی ہے کہ جہاں ذرا سی سخت بات کر دی عورتیں وہ ڈرامہ نہیں دیکھیں گی۔ مرد بھی اس ملک میں بہت مظلوم ہے۔ اسے تو نہ صرف گھر کے مسائل سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ باہر کے مسائل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ ایک بندہ دن کے آٹھ دس گھنٹے نہایت ایمان داری اور محنت کے ساتھ کام کرتا ہے مگر اسے دو دو مہینے تنخواہ ہی نہیں ملتی تو بتایئے وہ کہاں جائے' وہ بے چارہ گھر آتا ہے تو بجلی نہیں ہوتی۔ پانی نہیں ہوتا' اکثر گیس کا پرابلم بھی ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ سارے مسائل مرد کے ساتھ ہیں مگر ہم اس کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔ ایڈریس ہی نہیں کرتے... ہم عورتوں کے چند مسائل کے ارد گرد گھوم رہے ہیں۔"

"آپ ڈراموں تک کیوں محدود ہیں۔ کمرشلز یا ماڈلنگ کیوں نہیں کرتے؟"

"جب اس فیلڈ میں نیا نیا آیا تھا تو دل نہیں چاہتا تھا۔ البتہ اب دل چاہتا ہے اور اب اگر اچھی آفر آئی تو ضرور کروں گا ویسے میں نے ایک کمرشل کیا بھی ہے جو کہ رمضان المبارک میں چلا تھا' گھی کا اشتہار تھا۔ یہ ایک طرح سے ایکٹنگ ہی ہوتی ہے اس میں کام کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا مگر ارادہ ہے کہ سلیکٹو چیزیں کروں گا ہر چیز میں نظر آنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"اپنے ڈرامے شوق سے دیکھتے ہیں؟"

"پہلے نہیں دیکھتا تھا' مگر اب ضرور دیکھتا ہوں کہ

میں کس طرح پرفارم کر رہا ہوں۔ کیسا لگ رہا ہوں! ریگولر پھر بھی نہیں دیکھتا۔ ہاں جب کام میں تھوڑا گیپ آتا ہے تو پھر ضرور دیکھتا ہوں۔ ورنہ تو صبح گیا شام کو تھکا ہارا آتا ہوں تو پھر کچھ بھی دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"خوش مزاج ہیں... محفل میں رنگ جماتے ہیں؟"

"جی بالکل... خوش مزاج ہوں اور اس کے بارے میں آپ میرے اردگرد رہنے والوں سے پوچھ سکتی ہیں۔ میں نہ آؤں تو سیٹ پہ مجھے مِس کیا جاتا ہے۔ سیریس سین کے دوران بھی کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کر دیتا ہوں کہ سب بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میرے دوست مجھے شوٹ پہ بلا لیتے ہیں کہ یار بور ہو رہے ہیں اگر فارغ ہو تو آجاؤ۔"

"پھر تو آپ کو کامیڈی بھی کرنی چاہیے۔"

"آپ یقین کریں کہ مجھے بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ آپ کو کامیڈی رول بھی کرنے چاہئیں۔ کیونکہ نارمل لائف میں میری کامیڈی کی ٹائمنگ بہت اچھی ہے۔ ثمینہ احمد جیسی بڑی اداکارہ جو کہ کامیڈی بھی بہت اچھی کرتی ہیں۔ انہوں نے بھی مجھ سے کہا ایک دلچسپ واقعہ آپ کو سناؤں کہ ہمارے اسٹیج کے معروف کامیڈین افتخار ٹھاکر اور معمر رانا صاحب کے ساتھ میں لاہور میں ان کی طرف سے کرکٹ میچ کھیل رہا تھا۔ افتخار ٹھاکر صاحب سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ اچھی بات چیت اور ہنسی مذاق ہوتا رہا تو افتخار ٹھاکر بے ساختہ مجھ سے پنجابی میں کہنے لگے کہ "بھائی جان تسی غلط فیلڈ وچ کام کر رہے ہو تسی ایدر۔ ساڈے ول آؤ" اور ثمینہ احمد آپا نے مجھے بہت بار کہا کہ تم کیوں نہیں کرتے کامیڈی رول۔"

"تو پھر کیوں نہیں آجاتے آپ اس سائیڈ پہ؟"

"بدقسمتی سے جب شروع میں میں نے کامیڈی کرنے کی کوشش کی تو مجھے کام نہیں ملا۔ میں نے سٹ کام ٹرائی کیا تو مجھے کسی نے لفٹ ہی نہیں کرائی اور اب میں سوچتا ہوں کہ اگر اب میں کامیڈی کی طرف آیا تو ایک سنجیدہ اداکار کی حیثیت سے میرا جو امیج بن رہا ہے' وہ خراب ہو جائے گا۔ لیکن میں کروں گا ضرور کیونکہ مجھے بہت شوق ہے اور ہو سکتا ہے کہ میں خود سے پلان کر کے کچھ کروں۔ کامیڈی سیریل "کس دن میرا ویاہ ہووے گا" کی آخری اقساط میں میں نے ایک چھوٹا سا رول کیا تھا' وہ فیصل بھائی اور اعجاز بھائی کے ساتھ کیا تھا ماہین خالد میرے ساتھ تھیں' بڑا اچھا فیلڈ بیک آیا تھا لوگوں نے مجھے جاوید شیخ کے ساتھ ایسوسی ایٹ کیا تھا کہ لگتا ہے کہ جاوید شیخ جوان ہو کے واپس آگئے ہیں۔"

"اچھا... پھر تو آپ کو ضرور کامیڈی سائیڈ پہ آنا چاہیے۔ اپنے آپ کو فٹ کس طرح رکھتے ہیں؟"

"ایک زمانے میں میں کھانے پینے کا بہت شوقین تھا۔ اب بھی ہوں۔ مگر اس فیلڈ میں فٹ اور اسمارٹ رہنے کے لیے دل کو مارنا پڑتا ہے کیونکہ کیمرا بھی ہمارا اصل ویٹ سے زیادہ ویٹ دکھا رہا ہوتا ہے۔ اس لیے بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

"ہوں... ویسے کھانے میں پسند کیا ہے؟"

"ہر اچھا کھانا۔ لاہوری ہوں' پلاؤ' نہاری' سری پائے اور کڑاہی وغیرہ... سارے اچھے کھانے۔"

"لاہور اور کراچی... آنا جانا لگا رہتا ہے' گھبراتے نہیں سفر سے؟"

"نہیں سفر سے تو نہیں گھبراتا کیونکہ لاہور میں فیملی ہے اور کراچی میں کام... تو دونوں ہی جگہ میری پسندیدہ ہو گئی ہیں۔ فیملی میں رہ کر خوش ہوتا ہوں اور کراچی میں کمائی کر کے خوش ہوتا ہوں... یہ تو زندگی کا حصہ ہے۔"

"بالکل... ازدواجی لائف کیسی گزر رہی ہے؟"

"الحمدللہ بہت اچھی زندگی گزر رہی ہے۔"

"کبھی آپ کا فیملی انٹرویو بھی کروں گی؟"

"جی ضرور۔"

سلمیٰ حسن

"کیا حال ہیں؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"آج کل تو بھرپور کام ہو رہا ہے۔ کبھی نیگیٹو تو کبھی پوزیٹو۔ لوگ کس میں پسند کر رہے ہیں؟"

"لوگ؟ لوگ دونوں میں پسند کر رہے ہیں۔ میں نے زیادہ تر پوزیٹو رول کیے ہیں ماضی میں۔ اب تھوڑے نیگیٹو کر رہی ہوں تو لوگوں کو چینج اچھا لگ رہا ہے۔ ویسے ڈرامہ سیریل "کوئی نہیں ہے اپنا" میں پوزیٹو رول تھا اور لوگوں نے کافی پسند کیا۔ نیگیٹو تو کبھی کبھار ہی کرتی ہوں۔"

"آپ نے ہسٹری میں ماسٹرز ڈگری لی ہے۔ کام آئی؟ اور کیا بننے کا ارادہ تھا ہمیشہ سے؟"

"کچھ بننے کا ارادہ نہیں تھا' بس ڈگری لینی تھی اور ضروری نہیں کہ ڈگری لے کر جاب ہی کی جائے۔ آپ جس فیلڈ میں بھی جاتے ہو' آپ کی تعلیم آپ کے کام آتی ہے اور تعلیم آپ کو بہت کچھ سکھاتی بھی ہے اور ایسا نہیں کہ ڈگری بالکل کام نہیں آئی' کئی طریقوں سے کام آئی بھی ہے۔"

"اپنی زندگی میں خوش ہیں؟"

"ہاں ــــ بہت خوش ہوں' زندگی میں کرائسز آتے رہتے ہیں۔ ان کو لے کر یا سر پر سوار کر کے بیٹھ جائیں گے تو زندگی گزرے گی نہیں۔ اس لیے حالات کو فیس کرنا چاہیے۔"

"شوبز میں کیسے آئیں؟"

"ہوا یہ کہ امی کی کسی جاننے والی نے کہا کہ ہمیں ایک پروگرام کے لیے ایک ہوسٹ کی ضرورت ہے ــــ تو امی نے مجھ سے کہا کہ "این ٹی ایم" میں بچوں کا پروگرام شروع ہو رہا ہے تو اگر تمہاری کسی دوست کو دلچسپی ہے تو وہ آڈیشن دے دے ــــ تو میں نے کہا کہ دوست ہی کیوں؟ میں خود کیوں نہ کرلوں تو سب نے کہا کہ تم نہیں کر سکو گی تو میں نے ضد میں جا کر آڈیشن دیا اور کامیاب ہو گئی اور یوں میرا پہلا پروگرام "کڈز کلب" کے نام سے تھا جس کی میں نے ہوسٹنگ کی تھی۔"

"اچھا رسپانس ملا تھا؟"

"بہت اچھا اور پوزیٹو رسپانس ملا تھا۔ اس کے بعد ایک کمرشل کی آفر آگئی۔ ایک شیمپو کا کمرشل کیا اور پھر مجھ سے مہرین جبار نے رابطہ کیا اور میں نے اس کے ڈرامہ "دھوپ میں ساون" میں کام کیا اور یہ میرا پہلا ڈرامہ تھا۔"

"اداکاری خداداد صلاحیت ہوتی ہے یا سیکھنا بھی پڑتا ہے؟"

"اداکاری کے جراثیم تو خداداد ہی ہوتے ہیں مگر اس کو سیکھنا بھی پڑتا ہے کیونکہ اداکاری میں صرف ڈائیلاگ اور ایکسپریشن ہی تو نہیں ہوتے کچھ ٹیکنیکل باتیں بھی سیکھنی پڑتی ہیں کہ کیمرہ کس طرح فیس کرنا ہے' کہاں کرنا ہے' کہاں نہیں کرنا' کس طرف کون سا ایکسپریشن دیکھ کر دینا ہے۔"

"کس سے زیادہ سیکھا' ٹیکنیکل لوگوں سے یا ساتھی فنکاروں سے؟"

"میں اس لحاظ سے بہت لکی ہوں کہ مجھے بہت اچھے لوگ ملے۔ جو پہلا ڈرامہ میں نے کیا اس میں

میرے ساتھ نادیہ جمیل تھیں انہوں نے مجھے بہت سکھایا۔۔۔"

"اس ڈرامے نے شناخت دی؟"

"اصل میں شناخت تو این ٹی ایم کے "کڈز کلب" نے ہی دی تھی اور پھر میں نے دو تین کمرشلز کر کے چھوڑ دیا تھا۔۔۔ اور پھر ایک ڈیڑھ سال کے بعد واپس آئی کام کرنے کے لیے کیونکہ میں اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئی تھی۔ پھر جب واپس آئی تو سیریل "سب سیٹ ہے" اور "رابعہ زندہ رہے گی" کیا تو ان دو نے مجھے زیادہ شہرت دی۔"

"این ٹی ایم کا زمانہ کافی پرانا ہے۔ اس وقت کیا معاوضہ ملا کرتا تھا؟"

"ہاں' زمانہ تو پرانا تھا مگر معاوضہ اس وقت کے لحاظ سے بہت اچھا تھا۔ مجھے "کڈز کلب" کے ایک پروگرام کا معاوضہ دو ہزار روپے ملتا تھا اور وہ ویکلی پروگرام تھا اور اتنی خوشی ہوتی تھی کہ بیان سے باہر ہے کہ میں بھی کمائی والی ہو گئی ہوں۔"

"آپ اتنا کام کرتی ہیں' تھکن تو ہو ہی جاتی ہو گی؟"

"بالکل ہو جاتی ہے۔۔۔ اسی لیے رات ساڑھے بارہ بجے تک سو جاتی ہوں اور صبح ساڑھے چھ بجے اٹھ جاتی ہوں کہ مجھے بیٹی کو اسکول کے لیے تیار کرنا ہوتا ہے۔ اور میری یہ عادت ہے کہ ایک بار اٹھ جاؤں تو پھر دوبارہ گھنٹہ دو گھنٹہ بعد سونے کو دل نہیں چاہتا' بس سونے کے لیے رات ہی اچھی لگتی ہے۔"

"بیٹی کا ذکر آیا تو فیشن کا شوق کس کو ہے۔ آپ کی بیٹی فاطمہ کو یا آپ کو؟"

"بیٹی کو زیادہ شوق ہے۔ نت نئے کپڑے بنانا' فیشن کرنا اسے پسند ہے۔ میں تو شلوار قمیص میں بھی خوش ہوں اور مجھے اچھا بھی یہی لباس لگتا ہے۔"

"چلیں سلمٰی ان شاء اللہ پھر بات کریں گے۔"

"او کے جی۔"

☆

امت الصبور

ملکہ رضیہ سلطانہ

رضیہ سلطانہ خاندان غلاماں کے تیسرے فرماں روا سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی اور اسی خاندان کے پہلے سلطان قطب الدین ایبک کی نواسی تھی۔

رضیہ سلطانہ بچپن سے ہی بڑی ذہین و فطین تھی۔ التمش جو علم دوست حکمران کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ رضیہ نے ابتدا میں قرآن پاک پڑھا' پھر بڑے بڑے علما سے مروجہ علوم کی تعلیم پائی' اس کے علاوہ عربی' فارسی اور ترکی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ فنون حرب و ضرب بھی سیکھے اور شہ سواری' شمشیرزنی اور نشانہ بازی میں بھی طاق ہو گئی۔

اس کے اعلا اوصاف کی وجہ سے التمش اس کو بے حد عزیز جانتا تھا۔ اسے کاروبار حکومت چلانے کے گر بھی سکھاتا رہتا اور حکومتی امور میں اس سے مشورے بھی لیتا۔ اگر حکومتی امور کے سلسلے میں اسے دار الحکومت سے باہر بھی جانا پڑتا تو رضیہ کو اپنا جانشین بنا کر جاتا۔ حالانکہ اس کے بیٹے بھی موجود تھے مگر وہ بیٹوں کے بجائے بیٹی پر زیادہ اعتماد کرتا۔ اس کی عدم موجودگی میں رضیہ نہایت خوش اسلوبی سے امور مملکت انجام دیتی۔

یوں التمش کے زمانے سے ہی رضیہ سلطانہ کو سلطنت کے امور سے واقفیت ہو گئی تھی۔ حکومت کے بہت سے پیچیدہ مسائل میں اس کی رائے حرف آخر کا درجہ رکھتی۔ التمش کو اس کی فہم و فراست پر بے حد اعتماد تھا۔ گوالیار کی فتح کے بعد التمش نے اپنے چند خاص امرا کی موجودگی میں رضیہ سلطانہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا' ان امرا نے اس موقع پر التمش سے سوال کیا کہ۔

"آخر بیٹوں کے ہوتے ہوئے ایک بیٹی کو وارث تاج و تخت قرار دینے میں کیا حکمت ہے؟"

التمش نے جواب دیا کہ۔

"میں بیٹوں کی عادات و اطوار اور چال چلن سے اچھی طرح واقف ہوں' اس وقت جبکہ وہ ہر لحاظ سے میرے دست نگر ہیں' بری طرح مے خواری اور عیش و عشرت میں مشغول ہیں' اس وجہ سے میں انہیں حکمرانی کے قابل نہیں سمجھتا۔ رضیہ سلطانہ کو میں اپنے بیٹوں پر اس لیے ترجیح دیتا ہوں اگرچہ بظاہر وہ ایک عورت ہے لیکن عقل و پختگی کے لحاظ سے حقیقتاً مرد ہے۔"

رضیہ سلطانہ بلاشبہ بہادر اور جری خاتون تھی' وہ مردانہ لباس میں تمام ہتھیار لگا کر گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکلتی تھی۔ ہندوستان کے بادشاہوں کا دستور تھا کہ جب وہ شکار کو جاتے تو اپنے ساتھ حرم کی خواتین کو بھی لے جاتے۔ ایک مرتبہ التمش شیر کے شکار کو گیا' خواتین پیچھے تھیں کہ ایک شیر جنگل سے نکل کر بادشاہ پر جھپٹا عین اس وقت رضیہ برق رفتاری سے وہاں پہنچی اور تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ شیر وہیں پر ڈھیر ہو گیا' اگر وہ نہ پہنچی ہوتی تو بادشاہ بری طرح زخمی ہو گیا ہوتا۔ اس واقعے کے بعد التمش کی نظر میں رضیہ کی وقعت بڑھ گئی۔

التمش کے آٹھ بیٹے تھے' ایک بیٹا اس کی زندگی میں ہی انتقال کر گیا۔ باقی سات پر قابلیت اور حسن سیرت کے اعتبار سے وہ رضیہ کو ہی ترجیح دیتا' ایک روایت ہے کہ اس نے وفات سے پہلے رضیہ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس نے بستر مرگ پر

اپنے بیٹے رکن الدین فیروز شاہ کو تاج و تخت سونپ دیا۔ لیکن اس کی دلی خواہش یہی تھی کہ اس کے بعد رضیہ سلطانہ تخت پر بیٹھے۔

التمش کی وفات کے بعد امرائے دربار نے عورت کی حکمرانی کو ناپسند کرتے ہوئے رکن الدین فیروز شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ وہ پرلے درجے کا عیاش اور اوباش نوجوان تھا' ہر وقت نشے میں دھت رہتا۔ سلطنت کا انتظام اس کی ماں شاہ ترکان چلاتی تھی' وہ بڑی سنگ دل عورت تھی' وہ ایک ترکی لونڈی تھی جس نے التمش کے حرم میں داخل ہو کر التمش پر بڑا اثر ڈالا تھا۔

یہ عورت نہایت کینہ پرور تھی اس نے اپنے بیٹے رکن الدین کی عیش کوشی سے بہت فائدہ اٹھایا اور التمش کی بہت سی بے نکاحی بیویوں کو بڑی ذلت اور رسوائی کے ساتھ قتل کر ڈالا۔ التمش کے حرم کی ترک خواتین بھی اس عورت کی آتش حسد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

ترکان شاہ کے ظلم و ستم سے تنگ آکر یہ معزز خواتین مفلسی اور غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئیں۔ اس نے التمش کی اولاد پر بھی بہت ظلم ڈھائے التمش کا سب سے چھوٹا بیٹا قطب الدین شاہ ترکان کے اشارے سے قتل کیا گیا۔ شاہ ترکان کے ان مظالم کی وجہ سے دلی کا ہر چھوٹا بڑا شخص رکن الدین کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

آخر کار ۶۳۴ میں دلی کے عوام اور فوج کے ایک حصہ کی جانب سے رکن الدین فیروز کو معزول کر کے رضیہ کے ملکہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

رضیہ سلطان کا لقب اختیار کر کے بڑی شان و شوکت سے تخت شاہی پر متمکن ہوئی۔ حکمرانی کے فرائض کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لیے اس نے پردہ ترک کر دیا اور مردانہ لباس زیب تن کر کے دربار عام منعقد کیا۔ التمش کے عہد کے تمام ضابطے قوانین' جو طاق نسیاں ہو گئے تھے انہیں دوبارہ نافذ کیا۔ عوام الناس سے وعدہ کیا کہ ان کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ بھی اس کے بس میں ہے کرے گی۔

رضیہ سلطانہ لے اوصاف حمیدہ کے باوجود وزیر سلطنت نظام الملک محمد جنیدی' علاؤالدین شیر خانی' ملک سیف الدین کوچی' ملک اعزالدین کبیر خانی نے اس کو ملکہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے خلاف بغاوت کی تیاری شروع کر دی' ملکہ نے نہایت حکمت عملی سے ان میں پھوٹ ڈلوادی اور ان کو ایسا زچ کیا کہ وہ ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتے پھرے۔

رضیہ سلطانہ کا دور حکومت نہایت عادلانہ تھا۔ وہ امیر غریب' مسلم غیر مسلم' ہر ایک کے ساتھ انصاف کرتی تھی۔ مظلوموں کی فریاد سنتی' ظالموں کو سزا دیتی' شاہی ملازمین میں سے کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ رشوت لے۔ وہ ہاتھی پر بھی سوار ہوتی لیکن گھوڑے پر سواری اسے بہت پسند تھی' جنگ کے وقت فوج کو خود مرتب کرتی اور اپنے سپاہیوں کے دوش بدوش داد شجاعت دیتی۔ اس نے قاضی کبیر الدین' قاضی نصیر الدین' قاضی سعید الدین اور قاضی جلال الدین پر مشتمل ایک مجلس قضا قائم کی جس کے مشورے سے جملہ احکام صادر کیے جاتے تھے۔

رضیہ سلطانہ نے نظام سلطنت کو چلانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا' لیکن اس کو امن و چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا' کیونکہ بہت سے امرا اس کے خلاف سازشوں میں مصروف رہے' اس کی وجوہ یہ تھیں کہ وہ عورت کی حکمرانی کو اپنے لیے باعث توہین سمجھتے تھے۔ اس کے مردانہ لباس اور بے نقاب آنے کو وہ ناجائز سمجھتے تھے۔ تیسری وجہ ملکہ کا ایک حبشی غلام ملک جمال الدین یاقوت تھا جو شاہی اصطبل کا مہتمم تھا' اسے ترقی دے کر ملکہ نے میر شکار کے عہدے پر فائز کر دیا تھا اور اسے امیر الامرا کا خطاب بھی دیا گیا۔ اس عنایت خسروانہ کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک لڑائی میں اس نے ملکہ کی جان بچائی تھی' وہ قابل اور باصلاحیت آدمی تھا اسی لیے ملکہ نے اسے ترقی کا اہل سمجھا' لیکن ترک امرا نے اس کو غلط معنی پہنائے اور اس کی ترقی کو انہوں نے اپنے لیے توہین سمجھا اور ملکہ پر تہمت طرازی کی۔ یوں ملکہ کے اقبال کا ستارہ تاریکی

کے دامن میں آگیا۔

لاہور کے حاکم اعزالدین نے علم سرکشی بلند کیا۔ ملکہ خود لشکر تیار کر کے اس کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئی، حاکم لاہور کو مقابلہ کی جرات نہ ہوئی اور اس نے بغیر مقابلے کے اطاعت قبول کر لی۔ رضیہ کو اعزالدین کا یہ انداز اطاعت بہت پسند آیا اس نے خوش ہو کر لاہور کی حکومت کے ساتھ ملتان کی حکومت بھی اعزالدین کو سونپ دی۔ بھٹنڈہ کا حاکم ملک التونیہ جو "ترکان چہل گانی" میں سے تھا (ترکان چہل گانی التمش کے چالیس غلام تھے جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے) اس نے یاقوت حبشی کے اثر و اقتدار سے تنگ آکر رضیہ کے خلاف بغاوت کر دی۔

اس کے جواب میں رضیہ نے اپنی فوج کو تیار کیا اور بھٹنڈہ پر حملہ کر دیا۔ شاہی فوج ابھی راستے میں ہی تھی کہ ترک امرا نے اس پر چھاپہ مارا اور اس معرکے میں ترکوں کو فتح ہوئی یاقوت حبشی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور رضیہ سلطانہ کو قید کر کے بھٹنڈہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔

ملکہ کی نظر بندی کے بعد ان باغی امرا نے ملکہ کے بھائی اور سلطان التمش کے بیٹے معزالدین بہرام شاہ کو تخت نشین کر دیا۔

اسی دوران بھٹنڈہ کے حاکم ملک التونیہ نے رضیہ سلطانہ سے شادی کر لی۔ رضیہ اور التونیہ نے آپس کے صلاح مشورے کے بعد کھکھڑوں، جاٹوں، آس پاس کے دیگر زمینداروں کے لڑاکا قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک زبردست لشکر تیار کیا اور دلی پر حملہ کر دیا۔ معزالدین بہرام شاہ نے بھی اپنی فوج اعزالدین بلبن کی ماتحتی میں روانہ کی۔

اعزالدین بلبن التمش کا داماد تھا جو بعد میں الغ خان کے لقب سے مشہور ہوا۔ راستے میں ہی دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ ایک زبردست جنگ ہوئی اس کے نتیجے میں رضیہ سلطانہ کو شکست ہوئی، وہ میدان جنگ سے بھاگ کر بھٹنڈہ میں پناہ گزیں ہوئی۔

رضیہ اس شکست کے بعد آزردہ خاطر نہ ہوئی اس کی بے چین اور انداز پسند طبیعت نے اسے آرام سے نہ بیٹھنے دیا اور اپنے منتشر لشکر کو از سر نو مرتب کر کے ایک بار پھر دلی پر حملہ آور ہوئی اس بار بھی بہرام شاہ نے اعزالدین کو رضیہ کے مقابلے پر روانہ کیا۔ کیتھل کے گردو پیش کے علاقے میں دونوں لشکریوں میں معرکہ آرائی ہوئی۔ اس بار بھی رضیہ کو شکست ہوئی اور اعزالدین کامیاب رہا۔ رضیہ اور التونیہ دونوں میدان جنگ سے بھاگ نکلے، لیکن چند زمینداروں نے انہیں گرفتار کر لیا۔

رضیہ کی موت کے بارے میں دو روایات ہیں۔

ایک تو یہ کہ ان زمینداروں نے انہیں گرفتار کر کے معزالدین بہرام شاہ کے سامنے لایا گیا اور اس کے حکم سے ۲۷ رمضان المبارک ۶۴۰ کو دونوں کو قتل کر کے وہیں دفن کر دیا گیا بعد میں رضیہ سلطانہ کے چھوٹے بھائی سلطان ناصرالدین محمود نے دونوں کی قبروں پر ایک خوب صورت مقبرہ تعمیر کرایا۔ جو آج بھی کیتھل (ضلع کرنال مشرق پنجاب بھارت) میں کھنڈر کی صورت میں موجود ہے۔ اس سے ملحق ایک مسجد کے کچھ آثار باقی ہیں۔

دوسری روایت یہ ہے کہ اس جنگ میں ملک التونیہ کو قتل کر دیا گیا لیکن رضیہ جان بچا کر ایک جنگل میں چھپ گئی، جب بھوک پیاس نے تنگ کیا تو ایک دہقان سے کھانے کو کچھ مانگا۔ تھوڑی سی روٹی کھا کر وہ ایک درخت کے سائے میں لیٹ کر سو گئی۔ وہ اس وقت مردانہ لباس پہنے ہوئے تھی، لیکن نیند کی حالت میں کپڑے ادھر ادھر کھسکے تو دہقان کو معلوم ہو گیا کہ وہ مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔ اس نے زیوروں کے لالچ میں اسے سوتے ہوئے قتل کر دیا اور وہیں دفن کر دیا۔ جب وہ زیورات فروخت کرنے شہر گیا تو پکڑا گیا۔ پوچھ گچھ پر اس نے سارا واقعہ بتایا۔ چنانچہ ملکہ کی نعش کو وہاں سے نکال کر دلی کے قریب دریائے جمنا کے کنارے دفن کیا گیا۔ یہ قبر اب بھی موجود ہے اور لوگ اسے "امی کی درگاہ" کہتے ہیں۔

(بہ شکریہ بتول)

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چکن کارن سوپ

اجزا:

چکن	ایک پاؤ
بے بی کارن	ایک ٹن / ایک پاؤ
سیاہ و سفید مرچ	ایک ایک چائے کا چمچہ
کارن فلور	چار کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
سرکہ	تین کھانے کے چمچے
سویا ساس	تین کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

ایک لیٹر پانی میں چکن ڈال کر درمیانی آنچ پر چولہے پر چڑھا دیں۔ چکن گل جائے اور یخنی تین پاؤ کے قریب رہ جائے تو اتار لیں۔ چکن کی ہڈیاں الگ کر کے ریشے کر لیں۔ بے بی کارن یعنی مکئی کے کچے نرم دانے۔ (یہ ٹن میں بھی دستیاب ہے) موٹے موٹے کوٹ لیں۔ پھر یخنی میں کٹے ہوئے کارن، نمک، پسی ہوئی سفید و سیاہ مرچ، سرکہ اور سویا ساس ملا کر پکائیں۔ اس کے بعد چکن کے ریشے شامل کر کے درمیانی آنچ پر کچھ دیر پکائیں۔ کارن فلور کو آدھے کپ پانی میں اچھی طرح گھول کر ملا دیں۔ تیز آنچ پر مسلسل چمچہ چلاتے ہوئے انڈا پھینٹ کر شامل کریں۔ جب ساری چیزیں یکجان ہو جائیں تو چولہا بند کر دیں۔ مزے دار چکن کارن سوپ تیار ہے۔

گاجر کا حلوہ

اجزا :

گاجر	ایک کلو
دودھ	دو کلو
بالائی	ایک پاؤ
کھویا	آدھی پیالی
الائچی	دس عدد
چینی	آدھا کلو
کیوڑہ	دو کھانے کے چمچے
بادام پستہ	حسب ضرورت
پسا کھوپرا	آدھی چھٹانک

ترکیب :

گاجر چھیل کر کدوکش کر لیں۔ دودھ میں الائچی ڈال کر ایک جوش دے لیں۔ پھر گاجر ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ چمچہ چلاتی رہیں۔ دودھ ذرا خشک ہونے لگے تو چینی ڈال دیں۔ چینی کا پانی خشک ہونے لگے تو بالائی پھینٹ کر ڈال دیں۔ ساتھ ہی پسا کھوپرا بھی ڈال دیں۔ شیرہ گاڑھا ہو کر جذب ہو جائے اور سارا آمیزہ یکجان ہو کر خوشبو دینے لگے تو کیوڑہ ڈال کر چند منٹ کے لیے ڈھک دیں۔ پھر بادام پستے کی کریوں سے سجاوٹ کر کے پیش کریں۔

شلجم کا کھٹا اچار

اجزا :

شلجم	ایک کلو
رائی	چار کھانے کے چمچے
سرخ پسی مرچ	چار کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

شلجم چھیل کر گول گول قتلے کاٹ لیں۔ کھلے پانی میں ایک جوش دے کر ہلکی دھوپ میں سکھا دیں' تاکہ ان کا پانی خشک ہو جائے۔ ایک کورے برتن میں شلجم کے ٹکڑوں کے ساتھ رائی اور نمک ڈال کر اتنا پانی ڈالیں کہ شلجم کے ٹکڑے ڈوب جائیں۔ ڈھانک کر تین یا چار دن دھوپ میں رکھیں پھر استعمال کریں۔

سبزیوں کا پلاؤ

اجزا :

چاول	آدھا کلو
شملہ مرچ' گاجر	ایک ایک کپ
بند گوبھی' مٹر	ایک ایک کپ
سرکہ	چار کھانے کے چمچے
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
لہسن پیسٹ	دو چائے کے چمچے
پسی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ایک کنی چھوڑ کر چاول ابال لیں۔ تمام سبزیوں کو باریک کاٹ لیں۔ تیل گرم کر کے سبزیاں فرائی کریں۔ لہسن پیسٹ کے ساتھ نمک' پسی کالی مرچ' پسی سفید مرچ' سرکہ اور سویا ساس ڈال کر تیز آنچ پر تیزی سے مکس کریں۔ اگر آپ چکن شامل کرنا چاہیں تو وہ بھی کیوبز میں کاٹ کر ڈال دیں۔ تیکھا کھانے والے پسی ہوئی ہری مرچ شامل کریں۔ ابلے ہوئے چاول ڈال کر ہلکے ہاتھوں مکس کریں اور دم پر رکھ دیں۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- علینہ

میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافر ---------- موسیٰ رضا

ہیر ماسک سے اپنے بالوں میں چمک اور دلکشی پیدا کریں

موسم سرما کا آغاز ہو چکا ہے۔ خشک ہواؤں نے جہاں جلد پر اثرات مرتب کیے ہیں، وہاں بالوں کو بھی متاثر کیا ہے، بال خشک اور اڑے اڑے سے نظر آتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ جلد کے ساتھ ساتھ بالوں پر بھی توجہ دی جائے۔

سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ بالوں میں تیل لگایا جائے، سرسوں، ناریل یا زیتون کا تیل جو بھی آپ کو آسانی سے مل سکے اور آپ کے بالوں کے لیے موافق ہو، آپ اسے لگا سکتی ہیں۔ ہفتے میں دو بار تیل لگائیں اور آدھے گھنٹے تک مساج کریں۔ پھر تولیہ گرم پانی میں بھگو کر نچوڑ لیں اور اسے سر پر لپیٹ لیں اس کی حرارت سے تیل بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے گا۔

وہ خواتین جو بیوٹی پارلر نہیں جا سکتیں۔ وہ کچن میں موجود اشیا سے یہ ماسک گھر میں تیار کر سکتی ہیں اور ان کے استعمال سے ان کے بالوں میں چمک اور دلکشی پیدا ہو سکتی ہے۔ مختلف اقسام کے ہیر ماسک تیار کرنے کی تراکیب درج ذیل ہیں۔

☆ تین چائے کے چمچے شہد میں 5 کھانے کے چمچے زیتون یا بادام کا تیل مکس کر کے اسے بالوں پر خوب اچھی طرح لگائیں اس کے بعد بالوں کا جوڑا بنا کر ایک تولیے کو گرم پانی میں بھگو کر نچوڑ لیں، اس تولیے کو بالوں پر اچھی طرح لپیٹ لیں۔ آدھا گھنٹہ کے بعد نیم گرم پانی اور کسی معیاری موئسچرائزنگ شیمپو سے سر دھو لیں۔

ماسک بہترین ثابت ہوتا ہے، پپیتے کے دو بڑے ٹکڑے لیں، چھلکے اور بیج کو صاف کر دیں بلینڈر میں اچھی طرح بلینڈ کر لیں۔ اس میں آدھا کپ دہی مکس کر کے اس مکسچر کو اپنے سر کی جلد اور بالوں پر خوب اچھی طرح لگائیں، آدھا گھنٹہ کے بعد نیم گرم پانی سے سر دھو لیں، اس ماسک میں پپیتے کی جگہ کیلے کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔

☆ خشک اور بدرونق بالوں میں جادوئی چمک اور دلکشی پیدا کرنے کے لیے مایونیز میں شہد ملا کر بالوں میں لگائیں، آدھا گھنٹے کے لیے اس مکسچر کو بالوں میں لگا رہنے دیں، اس کے بعد نیم گرم پانی سے بالوں کو دھو لیں۔

☆ پکے ہوئے کیلوں کو میش کر کے اس میں روغن بادام ملا کر پندرہ منٹ کے لیے اس ہیر ماسک کو سر میں لگائیں اس کے بعد شیمپو کر لیں۔

☆ کیسٹر آئل میں شہد ملا کر بالوں میں اچھی طرح آدھے گھنٹے کے لیے لگائیں اس کے بعد نیم گرم پانی سے بالوں کو مسل مسل کر دھو لیں۔

☆ کچے دودھ میں ایک چمچہ شہد ملا کر بالوں میں اس مکسچر سے جڑوں سے سروں تک مساج کریں اور آدھے گھنٹے کے بعد نیم گرم پانی سے سر دھو لیں۔

☆ میتھی دانوں کو رات بھر پانی میں بھگو دیں، صبح ان بھیگے ہوئے میتھی دانوں کو پیس لیں اس پیسٹ سے سر پہ اچھی طرح مساج کریں۔ پندرہ منٹ کے بعد سر کو نیم گرم پانی اور شیمپو سے اچھی طرح دھو لیں۔ یہ ہیر ماسک خشکی، سکری، پتلے اور جھڑتے ہوئے کمزور بالوں کے علاج کے سلسلے میں ایک بہترین ماسک ثابت ہو گا۔

☆ ایک کپ کالی ماش کی دال میں ایک کھانے کا چمچہ میتھی دانہ شامل کر کے باریک پیس کر پاؤڈر بنا لیں اس پاؤڈر میں آدھا کپ دہی ملا کر اس ماسک کو سر کی جلد اور بالوں پر خوب اچھی طرح لگا کر دو تین گھنٹوں کے لیے چھوڑ دیں، اس کے بعد سر کو گرم پانی سے